

حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب

آلیٹ احادیث پر کُل اعراب اور تخریج تحقیق کے ساتھ [۱۲۰] خطبات کا مجموعہ

خطبات حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے تعلق اسلام کی تعلیمات کو یکجا اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و فکر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مُرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیٹ السلام
پبلشر: کراچی • پاکستان



حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۸

ایکٹ احادیث پر کلام اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۴۰ ایسا ان فروغ خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ

بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا ساجد محمود صاحب

مختص فی احادیث مایہ فاروقیہ کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب

مختص فی احادیث مایہ فاروقیہ کراچی

مولانا محمد اصغر صاحب

فاضل مایہ دارالعلوم کراچی

تقدیم و نگارنی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر: کراچی، پاکستان





قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید اکتوبر 2011ء
- تعداد 1100
- ناشر بیت السلام



بیت السلام
پبلشر، کراچی، پاکستان

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی - فون: 021-32711878

موبائل: 0321-3817119 ای میل: baitussalam_pk@yahoo.com

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب.....	11	مسئلہ اجتہاد.....	26
نفعت کبریٰ.....	11	مجتہد فیہ مسائل کا حل قوت فکر و عمل سے پیش کرنے کی	
مبارک احساس.....	11	ضرورت ہے.....	26
دارالعلوم کا امتیاز.....	12	ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل	
دارالعلوم کا تعارف.....	12	پیش کیا جاتا رہا.....	27
حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ.....	13	فکر و عمل کی یکسانی وحدت امت کا منو جب ہے.....	27
مستحکم رابطہ.....	14	انسانیت کو عالمی دین کی تلاش.....	28
مؤتمر اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ		اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالہ شبہات.....	29
تعالیٰ کا بصیرت افروز مقالہ.....	15	دائرۃ اجتہاد میں اتباع اسلاف.....	29
جامعۃ ازہر کی خوش نصیبی.....	15	عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت.....	30
مصر، اسلام کا نشان قوت.....	15	مصر کی صنعتی ترقی.....	30
حجاز مقدس مرکز عبادت.....	16	دارالقرآن کا سنگ بنیاد.....	31
شام..... عظمت اسلامی کا مظہر.....	16	مدینۃ الازہر.....	32
استحکام مصر عالم عرب کے امن کا ضامن ہے.....	16	ہزار سالہ علمی عظمت.....	32
جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ.....	17	صدر ناصر خدمات اور کردار.....	32
اسلامی تہذیب وثقافت اپنانے کی ضرورت.....	18	مصر کی عمومی مذہبی حالت.....	33
مقصد اجتہاد.....	19	اکرام ضیف.....	33
تجاذب.....	19	مصر کا سرکاری مذہب.....	33
اسلام کے تین مرکزی نقاط.....	20	اشتراکیت کا پروپیگنڈہ.....	34
اسلام کا اجتماعی دفاع.....	21	مصری قوم کی قرآن کریم سے والہانہ محبت.....	34
ادائے فرض.....	21	حفاظت قرآن کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری	
تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان		کارنامہ.....	35
ہند کے دلی جذبات کا اظہار.....	22	مغربیت سے مرعوبیت.....	35
بزرگان محترم.....	22	ممکن الہ وال خرابیاں.....	36
عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب.....	24	بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت.....	37
احوال واقعی.....	24	سفر حجاز.....	38
مؤتمر کے اغراض ومقاصد.....	24	مدینہ یونیورسٹی میں خطاب.....	39
مؤتمر کے زیر بحث مسائل.....	25	بے اصل بات.....	39

54		40	طریقت		اَلْاِبْطَةُ الْاِسْلَامِيَّةُ کے اجلاس میں شرکت
54		40	سیاست		دارالعلوم کا بین الاقوامی تعارف
56		41	اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں		مذہب اور سیاست
58		41	دین، سیاسی نظام کی حیثیت میں		پیش لفظ
59		41	دین اور سیاست کی علیحدگی		مخلصانہ شکر یہ
61		42	اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق		زمانہ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں
61		42	اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ		مذہب اور سیاست
62		42	حکومت الہی		جنگ کا آخری فیصلہ
62		43	الحکومت والجمہاد		آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیت
63		43	اسلامی جہاد کی غرض و غایت		ہندوستان کی صورت حال
63		43	ایک لمحہ غور و فکر		ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟
64		43	خلافت راشدہ کے بعد		جہل
64		44	ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال		ظلم
64		44	حضرت مولانا سلیع شہید رحمۃ اللہ علیہ		غلامی
64		44	حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ		قرآن حکیم کا فیصلہ
65		46	عصر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ		غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم
65		46	تحریریں عمل		عرب اقوام چودہ صدی قبل
66		46	اشاعت دین الہی		رحمت الہی کا ظہور علم نبوت، مکارم اخلاق،
66		46	تعلیم		اسوۂ حسنہ
66		47	قاسمی علوم اور فلسفہ		مسلمان بحیثیت فاتح عالم
66		50	مرکز علوم دارالعلوم دیوبند		زمانہ جاہلیت
66		50	مستقبل کا تعلیمی پروگرام		دورِ جہل
67		51	مسجدی تعلیم		فقدان اخلاق
67		51	درس قرآن		ثمرات غلامی
67		51	تبلیغ		دیانت و سیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد
67		53	تبلیغ ایک اجتماعی موثر کی حیثیت میں		تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال
68		53	مسلم سلاطین کا قصور		قرآن کا اصلاحی پروگرام
68		53	نقطہ اتحاد		شریعت

82	 مرکز جہاد و شہادت	68	 طریق تبلیغ
83	 اکرام ضیف	69	 تذکیر
83	 حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر	69	 عسکریت
84	 طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام)	70	 تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم
85	 اظہار تشکر	70	 صورت کا اثر سیرت پر
85	 پرسنل لاء کا مفہوم	70	 خانقاہیں
85	 دنیائے انسانیت کا قانون	71	 خلاصہ نقاط بحث اور قرآن حکیم
86	 بنائے تعصب	72	 اقامت حکومت الہی
86	 قانون فطرت	72	 حکومت الہی اور قانون الہی
87	 ذات انسان پر نفاذ قانون	73	 حفاظت نظام زندگی
87	 ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت	74	 دفاع ملی
88	 دور تربیت	74	 جمعیت علماء ہند کے پچیس سال
88	 نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون	75	 جمعیت علماء ہند تاریخ کے آئینے میں
89	 تعلیم فطرت	75	 بزرگان دیوبند
89	 اسلامی پرسنل لاء	75	 ۱۹۱۳ء کے مجاہدین
89	 پرسنل لاء کا تحفظ	76	 حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
90	 طریق تحفظ	76	 حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ
90	 ذرائع حفاظت کی سعادت	76	 تعمیر اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ
91	 دین اور رسی قوانین کا فرق	77	 کانگریس اور لیگ
91	 مسلم پرسنل لاء کا منشاء	78	 کانگریس کی تاسیس
92	 مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد	78	 کانگریس ۱۹۱۶ء میں
93	 نعمت تالیف قلوب	78	 ایک واقعاتی لطیفہ
93	 مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد	78	 مسئلہ پاکستان
95	 مبنی بر حقیقت قانون	79	 مخالفین پاکستان
96	 پرسنل لاء کی خدمت	80	 جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم
96	 دوام شکر	80	 جمعیت علماء ہند کی قدرو قیمت
97	 وحدت خیال و وحدت قلوب	82	 مسلم پرسنل لاء
98	 اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی	82	 حسن مقام

116	98	مطالبات اور تائید	بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی
116	99	فرانس کا ریوالیہ پن	شاہ جیش کی شکست
117	100	مطابہ آزادی کی مذہبی پوزیشن	پرسنل لاء میں مداخلت کی وجہ
118	100	استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار پر عتاب الہی	فریضہ مسلم اور ادائیگی شکر
118	102	آزادی، مذہبی اور انسانی حق	اسلام اور آزادی
118	102	جہاد آزادی میں شرکت	آزادی کا مفہوم
119	103	آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند	آزادی کا اسلامی نصب العین
119	103	شکریہ اکابر	آزادی ضمیر
119	104	نظریاتی فتن کا دور	آزادی عقل و فہم
121	106	متضاد عناصر کی ہمہ گیر رہنمائی	آزادی رائے
121	107	جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت	ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے
122	107	قومی تعمیر کی دفعات	باطنی آزادی
	107	سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی	ذلیل قسم کی غلامی
122	108	مستقبل کا تحفظ	صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے
123	108	نصاب تعلیم اور ذریعہ تعلیم	آزادی کا معیار
123	109	ذوق عربیت کی اہمیت	اسلامی آزادی کے آثار
124	111	تر بیت عوام	عروج و زوال
124	111	اصلاح معاشرت	عروج و زوال کا معیار
124	112	جمعیت کا منجائے نظر	معلم و امام اقوام
126	112	تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار	قلبی تمکین
126	113	بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ	عظیم تعمیری خدمت
126	114	جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت	تیونس و مراکش کی جدوجہد آزادی
127	114	سرمایہ جمعیت	احوال واقعی
129	114	نصاب تعلیم کی تدوین	حق خود ارادیت
129	114	پس منظر	آزادی کی حمایت
131	115	خلاصہ تقریر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ علیہ	تیونس کی صورت حال
132	115	صحیح تعلیم کے اسباب و عوامل	مراکش کا مسئلہ
133	116	نصب العین کی اہمیت	دونی سلطنتیں

149	133	قومی اور سرکاری اداروں کا نقطہ اشتراک
151	133	نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ
152	133	مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں
153	135	تاثرات تقریر
154	137	تصویر سازی کی مذہبی و تمدنی حیثیت
154	137	مہلک دستکاری
154	137	صورتحض و وسیلہ تعارف ہے
154	138	شرک کی المقصود
155	139	تصویر پرستی
155	139	تصویر بازی
156	140	سطح پرستی کی انتہاء
156	141	صورتحض پسندی کی آخری منزل
156	141	خزائن مخفیہ سے محرومی
157	142	شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ
157	142	تصویر سازی کا اخروی انجام
158	143	حقیقت الحقائق کی جستجو
158	143	توحید پسند کا تصاویر سے تنفر
159	143	حقیقت پسندانہ ذہنت
159	145	اشتراک مذہب
160	145	اشتراک ذہن
	146	تبدیلی اصول
160	146	اشتراک مذہب
161	147	عمومی مساوات
161	147	حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول
162	148	مہاتما بدھ کی پیشین گوئی
162	148	اجمالی ایمان
162	148	مذہب کی بنیاد
162	149	احترام انسانیت

173		نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک	پانی کی جملہ انواع
174		جھلک	163 ہوا کی جملہ انواع
174		توسعات شریعت	163 انواع جمادات
175		اتباع بلا حال	164 انواع حیوانات
175		تعظیم صاحب حال	164 آثار زلزلہ
175		توسعات شریعہ کا دائر کار	164 عقل و حکمت کے آثار
175		دولت دنیا کی مدح و ذم کا معیار	165 ستاروں کے آثار
176		استعمال دنیا	165 ملائکہ و شیاطین
176		محبت طبعی	165 عالم غیب سے تشابہ
178		دولت دین و دنیا	166 افادات علم و حکمت
178		اللہ میاں کے بنگلے	166 قرآن حکیم اور انسانی نفسیات
179		حضرت جابر کا تمول اور قلبی کیفیت	166 انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات
181		حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مال کے بارے	گائے علامت حیات ہے
182		میں انوکھا جھگڑا	167 تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت
183		دنیا آخرت کی کھیتی ہے	167 تعبیر خواب میں اعداد و شمار کا دخل
		کاشنکار کا فریضہ	168 روحانی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے
183		مقام آخرت	168 عالمگیر آثار
		تجارت میں مخفی آخرت	169 مادی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر
185		موت میں مخفی آخرت	170 آثار
		دوسرے کی نیکی ذریعہ ترقی	170 عالم آخرت میں رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے
186		دوسرے کی برائی ذریعہ عبرت	171 عالمگیر آثار
188		حضرات کا احترام	171 رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی آثار
188		دعاء	171 رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ازلی آثار
188		عالم اصغر	172 رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم
189		اقسام عالم اور ان کے حصص	172 حقیقت تو سل
191		عناصر رابعہ کی کار فرمائی میں کمال درجہ تشابہ	173 میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟
191		مٹی کی جملہ انواع	173 اکمال دین کا طریق
192		آگ کی جملہ انواع	173 تشہیر اکمال دین

192	مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نزاع کا خاتمہ	219
193	اجماعی مسلک	219
195	مقاہمت کی بنیاد	220
197	اجتماعی نقصان	220
199	مساعی طیبہ	221
199	قدر مشترک	222
200	حق گوئی اور انصاف پسندی	223
202	سکوت مصلحت	223
202	فروغی اختلاف کی حیثیت	224
204	خوشی کی لہر	224
205	اعتراف شخصیت	225
206	جذبات مسرت	225
207	کمال جامعیت	226
208	ایک حسین امتزاج	226
208	شیخ العرب والعجم	227
209	سیاسی نقطہ نظر	227
210	مرکب نصب العین	228
210	مینارہ نور	229
211	معنوی معیت	230
213	انثروپو	231
213	تقدیل راہنمائی	231
215	نفاذ اسلام کا مرحلہ ترتیب	231
215	علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت	232
215	نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری	233
216	نفاذ اسلام میں حکومت کا کردار	234
217	بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطہ نظر	234
217	اتحاد مسلم	234
217	اکابر دیوبند کا مشن	235
.....	اکمال دین کے بارے میں ازالہ تشکیک	
.....	خلق و کسب	
.....	قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ	
.....	تعیین مراد میں احوال متکلم کا دخل	
.....	عرش رحمت خاصہ کا مظهر و فہ	
.....	کیفیت استواء غیر معلوم ہے	
.....	پس منظر	
.....	عوام کا ادب	
.....	تلمیس ادب	
.....	کمال ادب	
.....	زیور علم	
.....	حدود ادب	
.....	تحفظ دین کا طبعی نظام	
.....	ذوق ادب کا نتیجہ	
.....	مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات	
.....	وسائل عبادت پر اجر و ثواب	
.....	تارک آداب تارک شریعت ہے	
.....	فقہاء کا مقام معرفت	
.....	ذوقی آداب	
.....	اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی شرہ	
.....	سرچشمہ ادب	
.....	نماز پورے اسلام کی میزان	
.....	نماز میں عبادت کا پہلو	
.....	نماز تمام کائنات کو جامع ہے	
.....	اوقات کی جامعیت	
.....	نماز سے انانیت نفس کا ازالہ	
.....	نماز میں فن تصوف کا موضوع	
.....	روحانی اور اخلاقی مقامات	

- 235 ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر
235 حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور قیام پاکستان
236 مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ مصر سے حج بیت اللہ شریف کے لیے جاز پہنچے، روضہ مبارک پر حاضری کے لئے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے ایام میں جامعہ مدینہ منورہ کے سربراہوں نے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء (مولانا منت اللہ صاحب رحمانی وغیرہ) کو جامعہ میں تشریف آوری کی دعوت دی۔ جامعہ کے ایک خاص اجتماع میں حضرت موصوف نے یہ تحریر پیش کی جس میں دارالعلوم دیوبند کے ضروری تعارف کے ساتھ جامعہ مدینہ منورہ کا خیر مقدم فرمایا گیا ہے۔

ادارہ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا مُهْدِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَذَٰعِيًا إِلَيْهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا.“

أَمَّا بَعْدُ !

نعمت کبریٰ..... یہ ساعت بڑی ہی مبارک ہے کہ میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا قلب جذباتِ تشکر و احسان سے معمور ہے۔ کیوں کہ آپ حضرات نے اپنی مخلصانہ دعوت کے ذریعہ مجھے اس عظیم الشان دینی ادارے میں شرفِ حاضری بخشا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میری مسرت و شادمانی دو گنا ہو گئی ہے۔ کیوں کہ میں ایک عظیم اسلامی علوم کے مرکز سے چل کر قابلِ قدر دینی مرکز میں پہنچ گیا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی پھلجلی پانی سے نکال کر دوبارہ پانی میں ڈال دی جائے تو اسے محض سرور و نشاط ہی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جسم میں ایک نئی روح کا فرما ہو جاتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی قسم کی تازگی اور نشاطِ روحانی محسوس کر رہا ہوں۔ جو فی الحقیقت ایک نعمتِ کبریٰ (بڑی نعمت) ہے جس کے لئے میں بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتا ہوں۔

مبارک احساس..... میں براعظم ایشیا کے ایک ممتاز اور زبردست اسلامی ادارے سے حاضر ہوا ہوں، جس کی تاسیس پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔

۱۲۳۸ھ میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر تسلط جمایا اور مغربی تہذیب کا طوفان ہندوستان کی ہر سمت

میں پھیلنے لگا، تو اس وقت علماء اُمت نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا جو اس تہذیب کے نتیجہ میں اُمتِ مسلمہ کو گھیر چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مغربی تہذیب کے اس خوفناک طوفان سے بچانے اور دین سے آشنا کرنے اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا احساس کیا۔ جو اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کے ذریعے صالح اور غیرت مند علماء کی ایسی جماعتیں تیار کرتا رہے۔ جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر میدان میں مغربی تہذیب اور مذہب دشمن تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو کر (ڈٹ کر) اُمتِ مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس دور کے خدائیدہ بزرگ اور عالم فاضل، شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کتاب و سنت کے زبردست عالم اور امامِ وقت تھے۔ جو دارالعلوم میں سب سے پہلے محدث ہوئے اور انہی کی سند پر دارالعلوم میں سلسلہ روایت و درایت حدیث جاری ہوا۔

اس وقت آپ کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین تھے، جن کے بعد اس مسند پر ہندوستان کی معروف شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ متمکن ہوئے۔ جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے ذریعے دارالعلوم میں درس حدیث نے نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا، اور آپ ہی نے اس دینی ادارہ کو علومِ ربانیہ کی تعلیم کے ذریعہ استحکام عطا فرمایا اور کتاب و سنت کی تعلیم سے اس کے درود یوار کو منور کیا۔

دارالعلوم کا امتیاز..... اس دارالعلوم کا طرہ امتیاز (امتیازی شان) یہ ہے کہ اس کے تمام شیوخ و اساتذہ مدرسین و طلبہ، کتاب و سنت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور کتاب و سنت ہی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وہ ایسے احکام و امور کی تاویلات نہیں کرتے جو مخالف کتاب و سنت ہوں۔ اسی بناء پر اہل بدعت، ہمیشہ اس ادارے اور اس کے شیوخ کے خلاف معاندانہ محاذ بنائے رہے۔ لیکن ان کی اس خصمانہ روش کے باوجود اس ادارے کے شیوخ و علماء نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے علوم کی ترویج و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت (نظر انداز) نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کتاب و سنت کی اشاعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شعار اور وظیفہ حیات بنائے رکھا جس پر آج پورا ائمہ اعظم ایشیا شاہد (گواہ) ہے۔

دارالعلوم کا تعارف..... اس وقت اس ادارے میں مختلف ممالک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ جو ہندوستان، افغانستان، پاکستان، انڈونیشیا، برما، جنوبی افریقہ، روس، ترکستان اور چین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، زیرِ تعلیم ہیں۔ اس ادارے میں بنیادی علوم جن کی تعلیم دی جاتی ہے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علوم عقلیہ و نقلیہ (قدیم و جدید) کی تعلیم دی جاتی ہے، ساتھ مدرسین تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں جو سب اسی ادارے کے فیض یافتہ ہیں۔

دارالعلوم کا انتظام و انصرام ۲۲ شعبوں پر منقسم ہے جن میں اہم شعبہ جات یہ ہیں: تعلیم، محاسبی اوقاف، مطبع، صفائی، بجلی، تعمیرات، نشر و اشاعت اور کتب خانہ۔ اس کے علاوہ دارالعلوم میں فضلاء قدیم کا بھی ایک شعبہ ہے جو ان کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور مختلف امور میں ان کی معاونت و راہنمائی کرتا ہے۔

دارالعلوم اپنے حسن کارکردگی اور عظیم الشان علمی و دینی خدمات کی بدولت ایشیاء میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے حتیٰ کہ اسے ”از ہر الہند“ کہا جانے لگا۔ پوری ایک صدی میں اس دارالعلوم سے بیس ہزار سے زائد علماء پیدا ہو چکے ہیں جن میں مفسر بھی ہوئے ہیں اور محدث بھی مفتی و فقیہ بھی ہوئے اور واعظ و مرشد بھی۔ جنہوں نے ہندو بیرون ہند میں ہر جگہ کتاب و سنت کے چراغ روشن کئے اور لاکھوں انسانوں نے ان کے ذریعے اپنی رشد و ہدایت کا سامان فراہم کیا۔

حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ..... میں اس عظیم دینی ادارے کے ایک خادم کی حیثیت سے آپ کی جامعہ اسلامیہ میں حاضر ہو کر سرور و انبساط کی ایسی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ جس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے نہ قلم سے۔ کیوں کہ الفاظ خواہ کتنے ہی معنی خیز و پر شوکت کیوں نہ ہوں، وہ صحیح جذبات اور مسرت آفریں احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کا مدینہ منورہ میں قیام ایک ایسا مبارک اقدام ہے جس کی خبر تمام علمی حلقوں بالخصوص حلقہ دارالعلوم میں انتہائی فرحت و مسرت کے ساتھ سنی گئی۔ کیوں کہ اس مبارک سرزمین میں صدیوں کے بعد ایسے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔

بلاشبہ حکومت سعودیہ نے جہاں حجاج کی راحت و آرام کے لئے تمام ضروری سہولتیں مہیا کیں اور حج کی تمام راہیں آسان بنائیں اور سعودی مملکت کو اقتصادی اور تعمیری، ہر اعتبار سے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا، اسی کے ساتھ تاسیس (قیام و بنیاد) جامعہ اسلامیہ بھی اس کا قابل قدر اور تاریخی کارنامہ ہے۔

حقیقتاً مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جو ان زریں کارناموں کی انجام دہی کے لئے مناسب ہو سکتا ہے اور یہی خطہ ارض وراثت نبوی کی اشاعت کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہیں سے علوم نبوت کے چشمے پھوٹے اور یہیں وہ علوم پروان چڑھے اور اسی سرزمین سے خلافت راشدہ کی شعاعیں نکلیں۔ اسی لئے مسلمانانِ عالم کے لئے یہ مبارک شہر ہمیشہ پر کشش رہا اور اسی کے خزانہائے علوم شریعت سے وہ مالا مال ہوتے رہے۔ جس طرح مکہ کے پہاڑوں سے نداءِ ابراہیمی کی گونج چار دانگ عالم (اطراف عالم) میں پھیلی، تو مسلمانوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے اور ان کے قافلے اس نداء پر لبیک کہتے ہوئے سرزمینِ پاک کی طرف ہر چہار سمت سے رواں دواں نظر آنے لگے۔ اسی طرح جب مدینہ منورہ کی وادیوں سے علوم نبوت اور تعلیماتِ الہی کی صدائیں بلند ہوں گی تو کون ہے جو اس طرف رواں دواں نظر نہ آئے گا اور اس صدائے علم پر لبیک نہ کہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے قیام کا ہندوستان کے تمام علمی اور دینی اداروں میں دلی خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے اپنے فرزند ان علم کو اس جامعہ میں بھیج کر اپنے لئے سعادت محسوس کی اور بلاشبہ ان فرزند ان علم کا جامعہ کے سرچشمہ ہائے علم سے فیض یاب ہونا، ان کے لئے مرتبہ سعادت و خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔ مستحکم رابطہ..... حضرات! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارس دینیہ، بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی تعلق دیر پا اور مستحکم ہو سکتا ہے تو وہ صرف علمی تعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں، اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہو، جو دونوں اداروں کے درمیان طلبہ اور اساتذہ کے تبادلے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اخیر میں میں آپ حضرات کے جذبہ اخوت اور اخلاقی کریمانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتری اور راست روی کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مؤتمّر اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ کا بصیرت افروز مقالہ

ذیل میں ہم وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے مؤتمّر اسلامی قاہرہ میں پیش فرمایا۔ اصل مقالہ عربی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ اس مقالہ میں حضرت حکیم السلام رحمۃ اللہ علیہ نے ان دینی اور فقہی مسائل پر ابتدائی بحث فرمائی ہے، جن پر علماء اسلام کو متحدہ غور و فکر کے بعد اپنا ایک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مقالہ ہندو پاکستان کے علماء اسلام کو بھی زمانہ حال کے مسائل کی طرف متوجہ کرے گا اور یہ حضرات زمانہ حال کی ان طبعی ضرورتوں پر شرعی رہنمائی فراہم کر سکیں گے۔ (ادارہ)

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ ، وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَوَسَدْنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كَاٰفَةِ النَّاسِ بَشِيْرًا وَنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّبِيْرًا .

اٰمَنَّا بِغَدَا

جامعہ ازہر کی خوش نصیبی..... بزرگان محترم! الحمد للہ: آج ہم علماء کرام کے ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو صدر جمہوریہ عربیہ، السید جمال عبدالناصر کے عہد میں جامعہ ازہر میں ادارہ بحوث اسلامیہ کی دعوت پر مختلف ممالک سے بعض اہم عصری مسائل پر غور و خوض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ عظیم الشان اجتماع جو درحقیقت زبردست اسلامی یکتائی کا نمونہ پیش کر رہا ہے، ایسے وقت میں جبکہ دشمنان اسلام، ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن سعی کر رہے ہیں۔ جامعہ ازہر کی خوش نصیبی اور عظیم کامیابی ہے جو اسے السید جمال عبدالناصر کے عہد میں حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ہم بارگاہ خداوندی میں شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے دشمنان اسلام کی تمام مساعی کو ناکام بنا کر ہم خادمان دین کو جسمانی و روحانی یکتائی کے ساتھ ملت اسلامیہ کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے باہمی ملاقات کا یہ زریں موقع عنایت فرمایا۔

مصر، اسلام کا نشانِ قوت..... بزرگان محترم! سرزمین مصر جہاں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہو رہا ہے محض سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے، بلکہ اسے زبردست دینی اہمیت بھی حاصل ہے جس کے باعث

مسلمانانِ عالم کا آپس میں ہمیشہ ایک قلبی رابطہ رہا ہے اور مصر کی اس دینی اہمیت کا اندازہ حدیثِ نبوی سے بھی کیا جاسکتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ”اسلام نے حجاز مقدس کو دین کا مرکز، ملک شام کو اسلام کا نشانِ عظمت اور ملک مصر کو اسلام کا نشانِ قوت قرار دیا۔“

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کو عبادت کا مرکز بنایا اور شام کو اسلامی شان و شوکت کا مظہر اور مصر کو افواجِ اسلامیہ کا مستقر (چھاؤنی) اور حلقہٴ بگوشانِ اسلام کی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

حجاز۔ مقدس مرکز عبادت..... چون کہ حرم مکہ مرکز عبادت تھا اس لئے اسے بلدِ مامون بنایا گیا تاکہ اس میں عبادت کرنے والے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ مصروفِ عبادت رہیں اور کسی قسم کا نزاع و فساد اور قتل و قتال اس کی فضاءِ عبادت کو مکدر نہ بنائے۔ اس لئے اس بلدِ مامون (پرامن شہر) میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:-

”بے شک مجھ سے پہلے اس (حرم) میں کسی کو قتال کی اجازت نہیں ملی صرف میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت میں قتال کی اجازت دی گئی تھی سو وہ اب بھی بدستور سابق خدا کا حرم ہی ہے۔ نہ اس کے درخت کاٹے جائیں

اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے اور نہ اس کا شکار بھگا یا جائے۔“ (اَوْ كَمَا قَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

شام..... عظمتِ اسلامی کا مظہر..... اور شام چون کہ عظمتِ اسلامی کا مظہر تھا اس لئے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ”اے شام تو میری شمشیر غضب اور میرا درۂ عذاب ہے، تو ہی منتشر کرنے والا اور تو ہی یکجا کرنے والا ہے۔“ ② اور شام ہی کے بارے میں دوسری حدیث ہے: ”میری اُمت میں ایک جماعت ایسی ہوگی جو دمشق، نواہج

دمشق اور بیت المقدس کے دروازوں پر برابر قتال کرتی رہے گی، اے کسی کی رسوا کن کوششیں رسوا نہ کر سکے گی۔“ ③

دوسری روایت میں ہے: ”کسی کی مخالفت اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی، وہ دشمنانِ خدا سے برابر قتال کرتی رہے گی ایک لڑائی ختم ہوگی تو دوسری شروع ہو جائے گی۔“ ④ معلوم ہوا کہ ملک شام کفار کے لئے عذاب کا کوڑا اور عتاب (غصہ) کی تلوار بنا رہا ہے گا جب تک کہ اہل شام اس کی امتیازی خصوصیت کو ختم نہ کریں۔

استحکامِ مصر عالمِ عرب کے امن کا ضامن ہے..... اور مصر چون کہ فوجی مرکز ہے اس لئے اس کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ”جب خدا تم کو مصر پر فتح عطا فرمائے تو تم اس میں زیادہ سے زیادہ فوج بنانا کیوں کہ وہ فوج روئے زمین کی

① الصحيح للبخاری، کتاب الجنائز، باب الاذخرو الحشیش فی القبر ج: ۵، ص: ۲۳۱۔

② کنز العمال، ج: ۱۲، ص: ۲۸۰، رقم: ۳۵۰۴۳۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد باب ماجاء فی فضل الشام

ج: ۴، ص: ۳۲۹۔ ③ کنز العمال، ج: ۱۲، ص: ۲۸۳، رقم: ۳۵۰۵۰۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب

ما جاء فی فضل الشام ج: ۴، ص: ۳۵۰۔

④ سنن ابن ماجہ، باب اتباع سنة رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۱۲۔

تمام افواج سے بہتر ہوگی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لئے کہ وہ اور ان کی ازواج قیامت تک حفظ و امان میں رہیں گے۔“ ①

معلوم ہوا کہ امن کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عظمت و شوکت قائم نہ ہو اور یہ عظمت و شوکت فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خطہ عرب کا امن و امان مصر کے استحکام اور اس کی فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں اور وہی تنہا ملک ہے جو حجاز و شام کا دفاع کر سکتا ہے۔ اس لئے ان تینوں ملکوں حجاز، شام اور مصر کا اتحاد ہی فی الحقیقت اسلام اور مسلمانانِ عالم کی طاقت و قوت کا نشان بن سکتا ہے۔

اس بارے میں صدر متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر جو مختصاً نہ سنی کر رہے ہیں وہ یقیناً لائقِ استحسان اور قابلِ ستائش ہیں اور سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور لائقِ آفرین بات یہ ہے کہ وہ جہاں عربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماء اسلام کو ایک نقطہ پر جمع کرنے اور موجودہ دور کے مسائل دینیہ کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے، وہ یقیناً باعثِ مسرت اور لائقِ امتنان ہے۔

جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ..... بزرگانِ محترم! مؤثر کے اجتماعات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے مسئلہ اجتہاد اور مسئلہ تلفیق اور بعض علمی و عملی ہیں، جن پر ان کے اصحاب نگارش یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے مسائل و مباحث جو زمانہ ماضی میں تنقیح و تحقیق کی مختلف راہوں سے گزر چکے ہیں، وہ اپنی علمی اور تحقیقی اہمیت کے باوجود موجودہ ضروریات کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جو روز بروز دنیا کی مادی ترقیات کے باعث نئی شکلوں میں ہمارے سامنے آرہے ہیں اور جن کا حل کرنا ہمارے لیے اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح آج سے پہلے ہر دور میں علماء و مفکرین امت نے اپنے عمومی مسائل کو حل کیا اور جس طرح کہ فقہاء امت نے اپنے اپنے ملکوں میں پیش آمدہ واقعات (پیش آنے والے واقعات) کے تحت اپنے فتاویٰ اور فقہی مسائل کے ذریعے امت مسلمہ کی رہنمائی کی۔ بلاشبہ آج ضرورت ہے کہ ایسے فقہی اصول کلیہ پر غور و خوض کیا جائے جن کے ذریعے کتاب و سنت کی روشنی میں امت مسلمہ کو پیش آمدئے مسائل کا حل کرنا آسان ہو اور اصول و قواعد جن دلائل کے ذریعہ مرتب کئے جائیں وہ بھی قرآن و حدیث سے مستفاد ہوں۔ تاکہ امت مسلمہ کے سامنے اسلامی شریعت کی راہ آسان ہو جائے اور کسی کے لئے عملی میدان میں عذر کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی یہ حجت ”قرآن کریم جو ہر چیز کے لئے ایک واضح بیان ہے“ بندوں کے لئے پوری ہو جائے۔

① کنز العمال، ج: ۱۳، ص: ۱۶۸، رقم: ۳۸۲۶۲، علامہ متقی الحنفی فرماتے ہیں: ابن عبدالحکم فی فہرست مصر، کو

وفیہ ابن لہیعۃ عن الاسود بن مالک الحمیری عن بحر بن داہر المعافری، ولم ار له الترجمة الا ان ابن حبان ذکر فی النقات انه یروی عن بحر بن داہر ووثق بحراً۔

منصب نبوت کا بیان کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ”ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل

کیا ہے تاکہ آپ لوگوں سے وہ احکام بیان فرمادیں جو ان کے لئے نازل کئے گئے ہیں۔“ ①

نیز بارگاہِ خداوندی میں مقبول بندوں کی اتباع کے سلسلے میں ارشاد فرمایا: ”آپ ان لوگوں کے راستے پر چلیں جنہوں نے میری طرف رجوع کیا۔“ ② اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے لوگوں پر اہل علم اور اہل فتویٰ کی اتباع لازم قرار دی۔ پس ان تین بنیادی امور کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اس میدان میں قدم اٹھائیں اور چوں کہ ہمارے تیار کردہ حل اور مرتب کردہ اصول و قواعد کی بنیاد یہی تین ماخذ ہوں گے اس لئے لامحالہ ہر شخص ان پر عمل کرنے کا پابند ہوگا اور اس بحث کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے؟ اسی طرح اجتہاد کلی اور اجتہاد جزئی کی بحث بھی بند ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ مسائل و مشکلات حیات کو شریعت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر منطبق کرنے کے سعی کی جانی چاہئے۔

اسلامی تہذیب و ثقافت اپنانے کی ضرورت..... بزرگانِ محترم! ہمارے اسلاف کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی ملک یا شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں کی تہذیب و تمدن، ادب، معاشرت اور زبان و علم پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ خود غالب ہوئے اور دوسروں کو مغلوب بنایا۔ اس طرح انہوں نے دین کی روح اور اسلام کے جوہر کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا، بلکہ ہر اس چیز کا استیصال کر ڈالا جو روح اسلام کے منافی نظر آئی۔ چنانچہ اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ واقعہ شاہد ہے کہ جب انہیں دریائے نیل میں ایک نوجوان لڑکی کو بھیٹ چڑھانے کی جاہلانہ رسم کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے متاثر ہوئے بغیر اس بھیٹ کے جاہلانہ اور بے بنیاد عقیدے کا استیصال کر کے اسلام کے صحیح عقیدے کا تحفظ فرمایا (کہ کسی دریا کا جاری ہونا یا نہ ہونا محض خدا کے ہاتھ میں ہے، لڑکی کی بھیٹ کو دریا کی روانی کا مدار بنانا غیر اسلامی اور جاہلانہ عقیدہ ہے)۔

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گرنا تو انہوں نے فوراً اٹھا لیا، اس پر ان کے فارسی غلام نے اسے معیوب سمجھتے ہوئے کہا کہ: ہمارے یہاں یہ بات معیوب اور نامناسب ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: کیا میں اپنے حبیب کی سنت ان احمقوں کی خاطر ترک کر دوں؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر کبھی بھی دوسروں کی معاشرت اور طور طریق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنی قوتِ علم سے دوسروں کی معاشرت پر اپنی معاشرت کو غالب کیا۔ اس لئے اگر ہم اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ ثقافت و تہذیب کو دل سے اپنالیں اور دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے لگیں تو لوگ ہماری تقلید و اتباع پر مجبور ہوں گے اور اگر بالفرض ہم مذکورہ تمام اوصاف پر عمل کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور

ہونا چاہئے کہ غیروں کی تہذیب و ثقافت سے صرف وہی اصول اپنائیں جو تعلیمات اسلام اس کی روح اور مزاج کے خلاف نہ ہوں اور ان کے ساتھ ہمارا تعامل انہی حدود میں ہو جو مخالف اسلام نہ ہوں نہ یہ کہ ہم ہر میدان اور ہر معاملہ میں انہی کے دوش بدوش اور انہی کے قدم بہ قدم چلتے رہیں۔

مقصد اجتہاد..... اور اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل تلاش کرنے کا (غیر صحیح) اجتہاد کریں کہ جس کا مقصد اپنے افعال پر قواعد و اصول دین کو منطبق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا اجتہاد محض خدمت دین ہونے کے لئے دنیا کو دین سے منطبق ثابت کرنے کی کوشش۔ جو شخص اپنا دین تباہ کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتا ہے دین اس کے پاس نہیں رہتا اور نہ اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔

بزرگان محترم! اس میں شک نہیں کہ دین کا دامن نہ تنگ ہے اور نہ اس میں دنیا سے بالکل علیہ تعلق ہٹانے والی رہبانیت ہے۔ لیکن علمی اور عملی زندگی میں اس کی کچھ خصوصیات ہیں جن کا مقتضی (غرض) ہے کہ وہ ہمیشہ ہر میدان میں واضح اور نمایاں رہیں۔ شریعت محمدیہ علی صا جہا الصلوٰۃ والسلام فی الحقیقت ایسے تمام آداب و اصول اور تعلیمات جامع ہے کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے عہد نبوت میں بعض مشرکین نے کہا: ”کیا تمہارا نبی تم کو ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کی بھی؟“ ① اس طرح انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے واضح نہ کر دیا ہو اور ایسے اصول عطا فرمائے کہ جن کی روشنی میں تمام معاملات کے حسن و قبح (بد صورتی) کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ادارہ بحوث اسلامیہ نے حقیقتاً علماء اسلام کو عصری مسائل پر غور و خوض کرنے کی دعوت دے کر ایک عظیم الشان دینی و ملی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے ہم اس ادارہ اور جامعہ ازہر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے شکر گزار ہیں۔ اس سلسلہ میں چند اہم تجاویز ادارے کے سامنے پیش کرتا ہوں، جو امید ہے کہ ادارے کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں گی۔

تجاویز..... ① ضرورت ہے کہ ایسے مسائل کو مرثب کیا جائے جو ہماری سوسائٹی اور معاشرے کا ایک جزو بن چکے ہیں اور ان کے بغیر زندگی گزارنا آج کے دور میں مشکل نظر آتا ہے، جیسے بینکوں کا سود، انشورنس اور بیمہ کے مسائل، مال کی درآمد و برآمد وغیرہ کے مسائل۔ یہ سب مسائل واقعاتی شکل و رنگ میں مرثب کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے فرضی احتمالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

② اس قسم کے سوالات مختلف ممالک کی نمائندگی کرنے والے علماء میں تقسیم کئے جانے چاہئیں۔ تاکہ وہ ان پر کتاب و سنت کی روشنی میں غور و خوض کرنے کے بعد جوابات اور تحقیقی مقالات پیش کریں، پھر جب تمام علماء کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ مقالات و جوابات مرتب ہو جائیں تو مجمع البحوث

① الصحيح لمسلم، کتاب الطہارۃ، باب الاستطابہ، ج: ۲، ص: ۷۶۔

الاسلامیہ ان علماء کے دستخطوں سے تمام ممالک میں اثنتائیس مسلحہ کے افادہ کے لئے ان جوابات و مقالات کو شائع کرے۔ اس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک متفقہ اور قابل قبول حل سامنے آ سکے گا۔

3 ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت مادی و مادی حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلط جما کر انہیں ایک نقطہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں اور تمام لوگ وحدت نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کریں کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلا امتیاز رنگ و نسل زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہو کر مساویانہ برتاؤ کرتا رہے۔ وہ جس طرح جمود تفکف (غریبی) سے دور ہے، ایسے ہی تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

اسلام کے تین مرکزی نقاط..... حضرات! اسلام کے تین مرکزی نقاط ہیں۔ اول: قرآن کریم جو کتاب آسمانی ہے اور دوم: جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور سوم: خانہ کعبہ جو قبلہ عبادت اور اثنتائیس مسلحہ کا ذریعہ وحدت نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ﴾ ① ”سب جہانوں کے لئے ذریعہ نصیحت“۔ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾ ② ”سب مخلوقات کے لئے باعث رحمت“، ﴿لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ ③ ”سب مخلوقات کو انجام سے ڈرانے والا“، اور خانہ کعبہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿هَٰذَا لِلْعَالَمِينَ﴾ ④ ”سب جہانوں کے لئے ذریعہ ہدایت“ اسی طرح گویا اسلام نے ایک عالمی بلکہ عالمین اثنت کو ان تین بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد اسے تمام انسانوں کے لئے ظاہر کیا اور اسی لئے اس وقت کے اجماع کو (دین میں) حجت قرار دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”میری اثنت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی“۔

پس جبکہ اس اثنت کی بنیاد ان مہتم بالشان امور پر ہے جو ہر قسم کے مادی، وطنی، قومی اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بلند و بالا ہیں تو ضرورت ہے کہ عام لوگوں میں ان کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

امید ہے کہ اس ضرورت کے لئے مجمع الجموح الاسلامیہ اپنا دائرہ کار وسیع تر کرے گا اور اس کام کے لئے مختلف ممالک میں عیسائی مبلغوں اور مشنریوں کی طرح وہ بھی اپنے دعوتی اور تبلیغی مشن اور وفود روانہ کرتا رہے گا۔ توقع ہے کہ ہر ملک کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ان تبلیغی وفود کا خیر مقدم کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اس دعوت و تبلیغ میں مخلصانہ تعاون بھی کریں گے اور اس دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں

① پارہ: ۱، سورۃ الانبیاء، الآیہ: ۹۰۔ ② پارہ: ۱، سورۃ الانبیاء، الآیہ: ۱۰۷۔

③ پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۱۔ ④ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیہ: ۹۶۔

اسلامی تعلیمات اور اسلامی رسم و رواج، مغربی تہذیب سے مس کئے بغیر رچ بس جائیں گے۔

ارشاد خداوندی ہے: ”تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں بہترین نمونہ زندگی ہے“ ①
اسلام کا اجتماعی دفاع..... حضرات! ہماری دلی تمنا اور دلی خواہش ہے کہ مجمع الجوٹ الاسلامیہ کی سرگرمیاں اسلام کے دفاع اور اس کے تحفظ میں تیز ہوں اور مستشرقین اور وہ دشمنان اسلام کے اعتراضات و جوابات کے لئے سرگرم عمل ہوں، نیز ہماری دلی خواہش ہے کہ مجمع الجوٹ الاسلامیہ اور ان حضرات مندوبین کے درمیان ایک دائمی اور مستحکم رابطہ قائم رہے اور اسلام پر مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے شبہات و اعتراضات ان تمام حضرات کے پاس بھی روانہ کئے جائیں تاکہ وہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق جوابات تحریر کر کے ادارے کو روانہ کریں اور وہ ان کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس طرح اسلام کا یہ دفاع یقیناً اجتماعی اور مضبوط ترین ہوگا۔

مناسب ہوگا کہ اگر تمام مندوبین حضرات میں سے بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی جائے جو اس قسم کے مسائل پر غور و خوض کرنے کی مکلف ہو اور پھر اس کمیٹی کی وساطت سے وہ سوالات ادارہ کو بھیجے جائیں تو اسلام کا یہ ایک شاندار عالمی نظام ہو جائے گا۔

ادائے فرض..... بہر حال ہمیں توقع ہے کہ مجمع الجوٹ الاسلامیہ ایسے مسائل کا ایک عمومی ادارہ ہوگا اور ان شاء اللہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے موضوع پر مفید تالیفات مختلف زبانوں میں شائع کرے گا۔

یہ چند خیالات مختصر الفاظ میں ذمہ داران ادارہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد میں سب سے پہلے صدر متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد رئیس اجتماعات مؤتمروں اور جناب ڈاکٹر محمود حسب اللہ صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمروں کی خدمت میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہند کے دلی جذبات کا اظہار

حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کی ایک تحریر

ذیل کی تجویز و تحریر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ نے غزہ (مصر) میں پیش فرمائی جس میں فلسطین کی ناجائز تقسیم اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار اور اسرائیل کے جارحانہ حملوں کے سلسلہ میں مصر اور دوسری اسلامی ریاستوں سے مسلمانان ہند کی دلی ہمدردی اور اپنے سرگرم تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔ وحدت اسلامی کا تقاضا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ ان کے جسم چاہے کروڑوں، اربوں سے متجاوز ہوں مگر روح ایک ہی ہو۔ امید ہے کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کی یہ تحریر وحدت اور اخوت اسلامی کی دعوت کو بھی زندہ کر سکے گی۔

(ادارہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بزرگان محترم..... مسلمانان عالم بالخصوص ممالک اسلامیہ کے لئے وہ حادثہ بڑا ہی المناک تھا، جب کہ حکومت برطانیہ نے یہود کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے فلسطین کے حصے بخرے کر دیئے اور یہود کے لیے یہودی وطن کا خواب پورا کر دیا۔ برطانیہ کی اس حرکت کے خلاف ہر ملک کے مسلمانوں نے صداء احتجاج بلند کی۔ حتیٰ کہ ان ممالک کے مسلمانوں نے بھی جو برطانیہ کے زیر تسلط تھے۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں اور برطانیہ کی ناگوار یوں کے باوجود احتجاجی ریزولیشن پاس کئے۔ چنانچہ اسی ذیل میں بمبئی میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔

میں نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ مسلمان تقسیم فلسطین کو کسی صورت بھی منظور نہیں کر سکتے۔ نہ دینی حیثیت سے، نہ جغرافیائی اور نہ تاریخی اعتبار سے بھی۔ اب یہ بات اسی طرح درست ثابت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ تاریخ نے دوسری بار اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ ایک طاقت اور ایک ملت ہیں کہ جس کی وحدت کو وطن

اور انسان کا اختلاف ختم نہیں کر سکتا۔ اس لئے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ مسئلہ فلسطین صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ پر جو سہ طاقتی جارحانہ حملہ ہوا، وہ درحقیقت دشمنان اسلام کے مخفی ارادوں کا انکشاف اور ”کفر ملت واحدہ ہے“ کا اظہار تھا۔

اس حملہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ عرب ممالک پر دوبارہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ وہ عربی اور اسلامی ممالک کو نوآبادیات بنانے کی اور اسرائیل کے لئے راستے صاف کرنے کی ایک نئی سامراجی چال تھی۔ لیکن خداوندی نصرت و تائید نے السید جمال عبدالناصر کو اس سہ طاقتی حملہ کے مقابلہ میں بے مثال اور عظیم الشان کامیابی عطا فرمائی اور دشمنان اسلام کو ایسی رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکنا پڑا جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

اس حادثہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے اٹھ مسلمان عربیہ کو اس کی غفلت سے چونکا دیا اور اس نے مغربی سمجھ لیا کہ فلسطین اور ایسے ہی دیگر اسلامی معاملات کا دفاع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سب مسلمان اس سلسلہ میں متحدہ و متفق نہ ہوں۔

میں ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ ”دارالعلوم دیوبند“ کے مہتمم کی حیثیت سے اور میرے رفقاء مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا مفتی اللہ رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار، ہم تینوں مسلمانان ہند کی جانب سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب مسئلہ فلسطین کی جدوجہد میں اخلاقی، مادی اور روحانی ہر قسم کی ممکنہ معاونت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

عمید دارالعلوم دیوبند (نزیل فلسطین غزہ)

عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ اہل اور مختصر راستہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
الْأَنْفُسِ وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ
اللَّهُ إِلَى كَلَّةِ الْبَشَرِ نَبِيًّا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ !

احوال واقعی..... حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو سفر مصر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے حجاز مقدس ہوتے ہوئے بعد فراغت حج ۱۹ مئی ۱۹۶۳ء کو ورو فرمائے دیوبند ہوئے۔ اسٹیشن دیوبند پر بسلسلہ استقبال طلبہ، اساتذہ کارکنان دفاتر اور اہل شہر کا جھوم تھا۔ طلبہ خوشی کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ملاقات، مصافحہ اور دعاء کے لئے خاص نظم قائم کیا گیا تھا جو حضرات اساتذہ کی نگرانی میں عمل آیا۔ طلبائے دارالعلوم کی درخواست پر ایک عظیم الشان جلسہ میں، جو دارالحدیث میں منعقد ہوا تھا اور حاضرین سے کچھ کھج بھرا ہوا تھا، حضرت ممدوح نے خطاب فرمانا منظور کر لیا۔

جلسہ کی صدارت حضرت مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دارالعلوم نے فرمائی۔ ابتداء میں طلباء اور بعض اہل شہر کی طرف سے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں۔ جن میں شاعر انقلاب علامہ انور صابری کی نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا مجمع پر کافی اثر پڑا۔ آخر میں حضرت ممدوح نے نعروں کی گونج میں ایک بلیغ اور جامع تقریر شروع فرمائی جو تقریباً دو اڑھائی گھنٹہ جاری رہی، آپ نے اس شاندار خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفر مصر و حجاز کے تاثرات اور عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ اور اجتماع مدینہ یونیورسٹی کے احوال و کوائف پر روشنی ڈالی۔

مؤتمر کے اغراض و مقاصد..... آپ نے فرمایا کہ: قاہرہ کی اس عالمی مؤتمر کے اغراض و مقاصد کی کوئی تفصیل

اس دعوت نامہ میں نہ تھی، اجمالی طور پر دعوت کا مقصد جدید تمدن سے پیدا شدہ مسائل کی شرعی تفتیح و تحقیق اور اس سلسلہ سے علماء عالم اسلامی کا ربط باہمی ظاہر کیا گیا۔ جس سے اتحاد بین المسلمین کا جذبہ مفہوم ہوتا تھا، نیز مصر کے مرکزی شہروں کی سیر۔ البتہ مؤتمر کے اجلاس اور رفتار عمل سے جو اغراض و مقاصد ہمارا ذہن اخذ کر سکا، ان کا خلاصہ یہ تھا:

1..... نئے تمدن اور جدید اکتشافات سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اصولی طور پر جامعہ ازہر کا موقف علماء کے سامنے رکھ کر ان کی فکر سے اس میں استفادہ۔

2..... بلاؤ مختلفہ کے علماء اور دینی حلقوں میں بین الاقوامی رابطہ کے ساتھ ساتھ مؤتمر سے ان کی علمی و ادنیٰ ہوتی کہ وہ پورے عالم اسلام کے عوامی اتحاد کا ذریعہ ثابت ہو۔

3..... جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کا سنگ بنیاد اور اس کی ہزار سالہ خدمت و عظمت کا تعارف

4..... حکومت مصر کے بعض اہم دینی اقدامات کا اعلان و تبشیر۔

5..... فلسطین کی ناجائز تقسیم کی مذمت اور مخصوص فلسطین کی عربوں کے حق میں بازیابی کے لئے ایک عالمی تجویز کی منظوری۔

6..... مصر کی جدید ترقیات اور مصری قوم کے شعور بیداری کا مطالعہ۔

7..... ان مقاصد کے ساتھ مؤتمر کا اجلاس مبنی محافظہ القاہرہ کے فلک بوس قصر میں شروع ہوا۔ جس میں ۳۸ ملکوں کے ستر نمائندہ علماء نے شرکت کی، مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ مجموعی طور پر سو اسو علمی نمائندے شریک جلسہ ہوئے۔ ہندو پاکستان کے نمائندے سب کے سب فضلاء دیوبند تھے، اجلاس کی کارروائی نہایت منضبط اور باقاعدہ تھی۔ پہلے ہی دن آرٹ پیپر کا ایک خوش نمائندہ برنانچ (پروگرام) کے نام سے طبع شدہ، مندوبین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ جس میں پہلے دن سے لے کر آخری دن کا نظام عمل بقید گفتگو و منٹ پیش کر دیا گیا تھا، اس کے مطابق کانفرنس چلی اور چلتی رہی۔ ہر روز کی کارروائی اور خواندہ مقالات و مباحث طبع ہو کر اگلے روز مندوبین کے سامنے آجاتے تھے جس سے رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

مؤتمر کے زیر بحث مسائل..... پہلے نمبر کے تحت مؤتمر میں جن مسائل کو بنیاد برنانچ اہمیت دی گئی اور ان پر حضرات خطباء نے خطاب کیا وہ یہ تھے:

1..... اسلام میں مالیات کا نظام تقسیم۔

2..... عرب اور اسلام کے عالم گیر نفوذ کے طبعی اسباب۔

3..... اسلام میں اراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔

4..... آغیاء کے مال میں غریبوں کے حصہ کی نوعیت۔

5..... اسلام میں حسبت (احتساب) یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام

6..... اسلام میں اجتہاد کا ماضی و حال۔

7..... اسلام میں دولتی علاقے۔

تقریباً ان سب ہی عنوانوں پر مقالے پڑھے گئے اور زبانی خطابات بھی ہوئے۔

مسئلہ اجتہاد..... لیکن نئے حوادث و مسائل و غور فکر کے سلسلے میں چھٹے نمبر (مسئلہ اجتہاد) پر زیادہ زور دیا گیا جو باوجود چھٹا نمبر ہونے کے، پہلے ہی دن کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی بحث میں کانفرنس کی پوری مدت کا دو تہائی حصہ صرف ہوا۔ مگر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اس وقت تک وقت کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہو سکیں گے۔ کیوں کہ آج کی صورت حال جدید اکتشافات کی وجہ سے بالکل نئی ہے۔ پچھلا نقش قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

اس موضوع پر اجتہاد کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے بطور تحریک الاستاذ علی عبدالرحمن ازہری وزیر سوڈان نے ایک پر مغز اور طویل مقالے سے اس کی ابتداء کی اور اس کے بعد اجتہاد، تقلید اور تلفیق سے متعلق مقالے اور مناقشات سامنے آنے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنا وقت لیا کہ کانفرنس کا زیادہ تر وقت اسی مسئلہ میں لگ گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کانفرنس کا بنیادی موضوع یہی ایک مسئلہ ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ناظم جامعہ اسلامیہ کراچی فاضل دارالعلوم و رئیس وفد پاکستان کا جوابی مقالہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو نہایت پر مغز اور محققانہ تھا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: دسویں دن (۱۲ مارچ ۶۳ء) کو ان کا نام پکارا گیا اور مقالہ پڑھنے کی خواہش کی گئی۔ یہ مقالہ تقریباً بیس منٹ میں پڑھا گیا۔ یہی وہ بیان تھا جو مقرر میں آپ نے ذمہ دارانہ طریقے پر بطور نمائندہ دارالعلوم دیا اور مصری اخبارات نے اس کے اقتباسات ”خطاب رئیس الوفد الہندی“ کے عنوان سے شائع کئے۔

آپ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں، میں نے امکانی حد تک تمام پیش شدہ مسائل کے بارے میں اجمالی اور اصولی طور پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس وقت مقالہ سنانے کا موقع نہیں ہے، وہ اپنے موقع پر شائع ہو جائے گا۔ مگر میں اس میں پیش شدہ امور آپ کے سامنے عرض کئے دیتا ہوں، گو اختلاف لغت و الفاظ سے عنوان اور اسلوب بیان کچھ مختلف ہو جائیگا اور اجمال و تفصیل کا بھی فرق پڑ جانا ممکن ہے، لیکن روح مقالہ کی قائم رہے گی۔

مجہد فیہ مسائل کا حل قوت فکر و عمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے..... آپ نے اس مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد و تقلید کی بحث میرے خیال میں موضوع سے متعلق نہیں ہے، گو اس سلسلہ میں خواندہ مقالات نہایت قیمتی اور پراز معلومات ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت یہ بحث اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیوں کہ

اجتہاد کا دروازہ بند ہو یا کھلا ہوا ہو۔ اور کھلے ہونے کی صورت میں یہ باب مفتوح اجتہاد مطلق کا ہو یا اجتہاد خاص کا، ضرورت اس بات کی ہے کہ آج جو مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں اور انہیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے ان کے ضمن میں ہر وہ شخص جو کوئی اجتہادی قوت رکھتا ہے، اسے عمل پیش کرے تاکہ اسے باب فکر و نظر اس قوت کو پرکھ کر کوئی فیصلہ دے سکیں۔ کیوں کہ اجتہاد مطلق ہو یا اجتہاد فی المذہب، ہر ایک کی شرائط کسب فن میں محفوظ ہیں جو اجتہاد کی صحت و سقم کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر کوئی اجتہاد فی الواقع اپنی ساری شرائط کے ساتھ کسی شخص کے پاس موجود ہے اور وہ مسائل کے ضمن میں سامنے آجائے جو مسائل کے اجتہادی حل میں اصول و تفقہ کے مطابق ہوگا تو کون جانتے بوجھتے اس سے انکار کر سکے گا اور اگر شرائط ہی نہ پائی گئیں تو کون اس کے اعتراف و تسلیم پر مجبور کیا جاسکے گا؟

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا پورا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے مسائل کے معنی و سوالات، واقعاتی سلسلوں سے مرتب کر کے کافی مدت پہلے سے مندوبین کے پاس بھیج دیئے جاتے یا اب بھیج دیئے جائیں۔ اگر مسائل کا مجوزہ تصفیہ پیش نظر ہے تاکہ متعلقہ مواد فراہم کر کے ہر شخص علی وجہ البصیرت بحث و تنقیح میں حصہ لے سکے اور مؤتمر کے بنیادی فیصلے تک پہنچ جائے۔

ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل پیش کیا جاتا رہا..... حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے خطاب کا یہ حصہ بھی پیش کیا جو مؤتمر میں پڑھا گیا۔ نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے نئے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور نئے نظریات و افکار نئے واقعات و احوال کی وجہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہر دور میں مفکر علماء اور مبصر مفتی اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصول فقہ اور منضبط مسائل کتب فقہیہ کی روشنی میں ان کے فیصلے دیتے رہے اور امت انہیں قبول کرتی رہی ہے۔ چنانچہ ہر دور کے فتاویٰ کا ذخیرہ اس کا شاہد عدل ہے، آج بھی نئے حوادث و مسائل کی تنقیح و افتاء میں علماء امت نے کوتاہی نہیں کی۔ ”حوادث الفتاویٰ“ اور ”آلات جدیدہ“ کے شرعی احکام کے نام سے مستقل کتابیں بھی منضبط کر کے شائع کر دیں۔ جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں، نیز جزیئی مسائل پر الگ الگ مقالات و رسائل بھی مرتب کر کے شائع کئے جو امت کے زیر عمل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

فکر و عمل کی یکسانی و وحدت امت کا مؤجب ہے..... البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی، کہ اب ایسے احکام کی اشاعت اور تنقیح مزید عالمی پیمانے پر ہو اور یہ اشاعت و تنقیح بجائے مقامی ہونے کے بین الاقوامی انداز میں سامنے لائی جائے۔ کیوں کہ وسائل نقل و حمل کی آسانیوں کی وجہ سے پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کی مانند

ہو گئی ہے۔ اس لئے آج کی ایک پورے ملک کی جماعتی بات بھی پوری دنیا کی نسبت سے شخصی اور انفرادی ہی بات کہلائی جا رہی ہے اور جب تک وہ بین الاقوامی نہ ہو جائے جماعتی نہیں بنتی۔ اس لئے موزوں ہوگا کہ ان جدید فتاویٰ کا موقف خواہ وہ کسی بھی ملک کے ہوں، پورے عالم اسلام کے سامنے آجائے اور عالمی فکر و نظر سے یہ احکام عالمی انداز سے اٹھ کے سامنے پیش ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع الجوٹ الاسلامیہ سے بہتر اور کون انجام دے سکتا ہے۔ وہی اپنے عالمگیر اثرات سے ملک کے جدید فتاویٰ، مقالات اور کتب کے ذخیرے فراہم کر کے، بذریعہ تراجم، اعضاء و متوکر کے سامنے رکھ سکتی ہے۔ تاکہ فکر میں عالیت اور یکسانی پیدا ہو کر اٹھ کے عمل میں بھی یکسانی کی جھلک آجائے جو وحدت اٹھ کے لئے ایک موثر ترین وسیلہ کا کام دے سکتی ہے اور یہی وہ عالم اسلامی کا مضبوط اتحاد ہوگا جو پائیدار بنیادوں پر قائم ہو کر پائیدار ثابت ہو سکے گا۔

انسانیت کو عالمی دین کی تلاش..... آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے مقالہ میں یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ہی جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ نفس اسلام سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔ جبکہ آج کی کائنات پسند دنیا ایک فطری اور جامع دین و دنیا مذہب کی تلاش میں خود بھی سرگرداں اور متلاشی ہے اور جبکہ وسائل نقل و حمل کی وسعت و سہولت کی وجہ سے پوری دنیا ایک خاندان کی مانند ہو گئی ہے جس کے تمام تمدنی امور میں یکسانی آتی جا رہی ہے، ملکوں کی مقامی خصوصیات مٹتی جا رہی ہیں اور اشتراک کی ایک وسیع فضا پیدا ہو رہی ہے جس سے دنیا کا پلیٹ فارم بھی ایک ہوتا جا رہا ہے اور جذبات کی رواں طرف آرہی ہے کہ تمدن و تہذیب سب کا ایک ہو، معاشرت ایک انداز کی ہو، حتیٰ کہ سیاست بھی سب کی ایک رنگ کی ہو اور ایک ہی پلیٹ فارم سے چلے اور آگے بڑھے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہوتا جا رہا ہے اور پوری دنیا ایک ہی عالمگیر تمدن اور ہمہ گیر معاشرت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

اس اشتراک فکر کی وجہ سے طبعاً دنیا کے جذبات ادھر بھی آرہے ہیں کہ مذہب اور دین بھی سب کا ایک ہو، دینی پلیٹ فارم بھی سب کا ایک ہو اور اسے کوئی ایسا عالمگیر دین ہاتھ آجائے جس میں نہ وطنی حد بندیاں ہوں، نہ قومی نسل اور وطنی تحدیدیں ہوں اور نہ لونی (رنگ کی) تخصیصات۔ بلکہ وہ نفس انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا نام لے کر پوری ہی دنیا کو آواز دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس نے یہی عالمگیر نعرۂ اخوت و مساوات لگایا اور دنیا کو دین میں پیوست کر دیا ہے اس لئے دنیا دوسرے لفظوں میں اسلام کو پکار رہی ہے اور اس کی خواہاں ہے۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہے اصل اسلام کو ان عالمگیر وسائل سے پورے عالم کا دین بنانے کی ہمت لے کر اٹھیں۔

ظاہر ہے کہ اس اہم ترین مقصد کے لئے جس قوت اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ مجمع الجوٹ کے پاس موجود ہیں اور غیر موجود کو باآسانی فراہم بھی کر سکتی ہے، جس کے لئے سارا عالم اسلام اس کے ساتھ تعاون کرنا

اپنا فرض منصبی سمجھے گا۔

اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالہ شبہات..... آپ نے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس سلسلہ میں جیسے اس مثبت پہلو پر کام کرنا ضروری ہے ایسے ہی منفی انداز میں یہ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام سے بے خبر یا باخبر معاندین خواہ وہ مستشرقین یورپ ہوں یا مستغربین ایشیا، جو شکوک و شبہات یا اعتراضات اسلام کے بارے میں پھیلا کر قلوب کو تشویش و تذبذب اور منافرت کا شکار بناتے رہتے ہیں ان کو بھی عالمی پیمانہ پر ہی دفع کیا جائے۔ جبکہ وہ شکوک کی رو بھی عالمی انداز میں بہار ہے ہیں۔ بلاشبہ علماء ازہر نے اس سلسلہ میں شاندار اور موقع خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن وہ لسان کی اجنبیت کی وجہ سے سب کے سامنے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خدمت بھی بین الاقوامی ہی رنگ سے ہو جس میں پورے عالم اسلامی کے علماء کے فکریات شامل ہوں اور جس طرح مختلف ممالک کے مسیحی بشرین ان شکوک کو عالمگیر انداز میں پھیلا رہے ہیں اسی طرح مختلف بلاد کے علماء کی طرف سے ان کے جوابات بھی عالمگیر ہی انداز میں سامنے آئیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت پورے عالم میں اسلام اور مسیحیت کی یہ نظریاتی اور فکری جنگ ہے، اس لئے اس کا مقابلہ بھی برابر ہی کے ہتھیاروں سے ہونا چاہئے جب ہی وہ مؤثر اور کارآمد ثابت ہوگا۔ اس لئے مجمع الجوٹ کے برنامہ میں یہ نمبر بھی مقصدی حیثیت سے شامل رہنا چاہئے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے فکر و اجتہاد کا دائرہ صرف فقہیات و جزئیات مسائل تک محدود نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ پوری دنیا کو سامنے رکھ کر پورے اسلام کی تعلیمات کی توسیع و اشاعت کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

دائرہ اجتہاد میں اتباع اسلاف..... حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اور مقالے کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ: ہم میں اجتہاد کی کچھ نہ کچھ قوتیں ہماری بساط کے مطابق آج بھی موجود ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا، اس لئے موجودہ اجتہاد کو استعمال کر کے اضافہ کا منتظر رہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہمیں اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہئے کہ ہم آج کے مغربی تمدن اور اس کی مصنوعی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کر لیں اور پھر قرآن و حدیث سے ان کے مؤیدات تلاش کر کے ان کو حدود و جواز میں لانے کی فکر کریں۔ جو آج ایک عالمگیر وباء کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ کتاب و سنت کا اتباع نہیں۔ بلکہ کتاب و سنت سے اپنا اتباع کرانا ہے جو علاوہ بے ادبی کے، ایک مہلک اور خطرناک حرکت بھی ہے۔

ہمارے لئے اس فکر و نظریاتی طریق استنباط میں جہاں اصول و قواعد فن کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی کے ساتھ ان کے ترکہ سے پہنچا ہوا وہی ذوق تھا مے رہنا بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا اور بطور توریث (وراثت) ہم تک پہنچایا۔ ورنہ اس کے بغیر دین کا وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو

”وَيُؤَيِّدُ بَيْنَهُمْ“ کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بخشا۔ اس لئے طبعاً ہم اجتہاد کے دائرہ میں رہ کر بھی اتباع سلف کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے۔ تا آنکہ ایک ایک سنّت اور ایک ایک اسوہ سلف ہمارے جہد و اجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہئے۔ اس پر حضرت مدوح نے مقالہ کی چند مثالیں بھی نقل فرمائیں جو مقالہ میں آپ پڑھ سکیں گے۔

عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بلا و مختلفہ کے علماء کے جمع ہونے سے قدرتی طور پر ربط و اتحاد کا ایک مظاہرہ ہوا جو خوش آئند تھا اور ساتھ ہی مؤتمر کے مقاصد میں بھی داخل تھا۔ آپ نے اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے زیادہ تر عرب اتحاد اور اس میں بھی خصوصیت سے مصر، شام اور حجاز کے اتحاد پر اہمیت کے ساتھ زور دیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے شرعی اشارات سے مصر و شام اور حجاز کی خصوصیات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم ان تین مرکزی ملکوں کو محض سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ دینی اور مذہبی حیثیت سے اہم اور مقدس جانتے ہیں۔ شریعت نے حجاز کو مرکز عبادت بتایا ہے شام کو مرکز شوکت کہا ہے اور مصر کو مرکز عسکریت فرمایا ہے۔ حجاز مرکز امن اس لئے رکھا گیا کہ عبادت بغیر امن کے نہیں ہو سکتی، شام کو مرکز جنگ و دفاع اس لئے رکھا گیا کہ شوکت بغیر مدافعت و هجوم کے قائم نہیں ہو سکتی اور مصر کو مرکز عسکریت اس لئے رکھا گیا کہ مشرق میں مغرب کے سیاسی اقدامات کی روک تھام بغیر عسکری قوت کے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تین ملک تین اقسام کی مخصوص مرکزیتوں کے حامل ثابت ہوئے۔ اس صورت میں ان کے باہمی ربط کی صورت حال خود بخود کھل جاتی ہے اور وہ یہ کہ امن عبادت کے لئے شوکت ضروری ہے اور شوکت کی بقاء کے لئے عسکریت ضروری ہے۔ تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حجاز کا تحفظ بلا و شام کی شوکت کے بغیر ممکن نہیں اور شام کی شوکت کی برقراری مصر کی عسکری قوت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے جب تک مصر کی فوجی طاقت مضبوط نہ ہو اور شام و حجاز سے ان کا اتحاد نہ ہو، نہ شام و حجاز کا تحفظ ہو سکتا، نہ خود مصر کا۔

اور جب کہ یہ تمام نقاط خود احادیث میں دکھائے گئے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نقاط بحث محض سیاسی یا جغرافیائی نہیں بلکہ دینی ہیں۔ اس لئے ہم مصر و شام اور حجاز کا باہمی اتحاد دینی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اندر میں صورت اگر آپ عالم اسلام کا اتحاد چاہتے ہیں تو اس کے لئے عرب اتحاد پہلا زینہ ہے اور عرب اتحاد کا پہلا قدم مصر و شام اور حجاز کا اتحاد ہے، آج جبکہ صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ السید جمال عبدالناصر نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگایا ہے اور بالفاظ دیگر اسلامی اتحاد کا پرواز ڈالا ہے تو ہمیں ان کے اس نعرے کی قدر کرنی چاہئے اور اس کے لئے یہ مؤتمر بلاشبہ ایک مبارک قدم ہے۔

مصر کی صنعتی ترقی آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: مؤتمر کے ان جلسوں کے دوران ہی دو تین دن کے بعد مصر کے مختلف مرکزی شہروں کے سفر کا پروگرام رکھا گیا تھا موٹر کاروں سے اور کہیں ہوائی جہاز کے ذریعے۔

سب سے پہلا سفر ”الْمَحَلَّةُ الْكُبْرَى“ کا ہوا جو مصر کا صنعتی مرکز ہے اور اس میں پارچہ بانی اور قالین بانی

وغیرہ کی مل اور فیکٹریاں ہیں۔ دوسرا سفر ”طنطا“ کا ہوا جو مصر کا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، تیسرا سفر نہر سوئز اور فلسطین کا ہوا جو مصر کی فوجی قوت کا مرکز ہے۔ اس سفر میں اولاً عریش آیا جو نہر سوئز کے کنارے ایک پر فضا شہر ہے اور اس سے ایک میل آگے بڑھ کر نہر سوئز ہے جس کے کناروں پر چلتی پھرتی گودیوں کا انتظام ہے۔ نہر سوئز مصر کی ایک عالمگیر شوکت کا قدرتی نشان ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اس سمندری نہر سے یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے جہاز گزرتے ہیں جن کا کسٹم لیا جاتا ہے اور تلاشی لینے کے بعد ڈیوٹی بھی وصول کی جاتی ہے۔

نہر سوئز سے گزر کر صحرائے سینا آیا جس سے گزرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے گزرنے کا تصور بندھا رہا اور اس مقدس وادی کی برکات سے قلب و روح متاثر ہوتے رہے۔ اس کے بعد غزہ آیا جو فلسطین کا آخری سرحدی شہر اور فوجی حیثیت سے ایک اہم مقام ہے۔ یہی شہر امام شافعی رحمۃ اللہ کا مولد و منشاء (جوان ہونے کی جگہ) بھی ہے۔ چنانچہ ہمیں وہ بلڈنگ دکھائی گئی جو آج حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکان ولادت پر بنی کھڑی ہے۔

غزہ میں فلسطینی عربوں نے ہمارا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ شب میں ہم وہاں پہنچے تو غزہ کے ایک پر تکلف اور وسیع ہوٹل میں طعام و قیام کا انتظام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک مختصر سا استقبالیہ جلسہ اسی ہوٹل میں ہوا۔ صبح کو ہم نے کئی لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی جموں پڑیاں دیکھیں جن میں فلسطین کے تباہ حال عرب مسرت و شگ کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر فلسطینی عربوں کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ان عالمی علماء کو ”مصر حبا“ کہا گیا، خیر مقدی نعرے لگائے گئے، تقریریں ہوئیں اور آخر میں تقسیم فلسطین کے خلاف ایک عالمی جموں پازاس ہوئی۔

واپسی پر موتر کے دو تین اجلاسوں کے بعد پھر ہوائی جہاز سے اسوان کا سفر ہوا، جہاں دریائے نیل پر بند باندھا جا رہا ہے اور جدید اسوان شہر کی تعمیر کی جارہی ہے، جس سے مصر کی ٹیکنیکل ترقی کا پروگرام سامنے آیا اور ہم نے دیکھا کہ پندرہ بیس میل کی حدود میں لوہے اور سیمنٹ کے ابار لگے ہوئے ہیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے وسیع پیمانے پر تعمیر ہو رہے ہیں۔

اس سفر سے واپسی کے بعد ”مجلسہ ہدایت النحویہ“ کا سفر ہوا جو مصر کی زراعتی ترقیات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں فوجی دستہ نے مہمانوں کو خیر مقدی سلامی دی، بچوں نے فوجی کرب دکھائے اور ورزشی کھیلوں کا مظاہرہ کیا، مہمانوں کو عطری شیشیاں پیش کیں اور یہ اجتماع چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ شام تک وہاں سے واپسی ہوئی اور صبح سے پھر بدستور موتر کے اجلاس جاری رہے۔

دارالقرآن کا سنگ بنیاد..... اعضاء موتر کے اس مبارک اجتماع کے موقع پر قاہرہ میں دو اہم اور عظیم الشان عوامی جلسے بھی منعقد کئے گئے، ایک دارالقرآن کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے جو جامعہ ازہر سے متعلق ہے اور اسے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے، تاکہ قرآن کریم کی تعلیم ذیلی اور ضمنی نہ رہے بلکہ ایک مستقل نصب العین کی حیثیت

سے سامنے آئے۔ اس جلسہ کی صدارت نائب صدر جمہوریہ السید حسین شافعی نے فرمائی۔ تلاوت، اور تائیس کے بعد اس جلسہ میں تمام مہمانوں کو مصر کے مطبوعہ قرآن شریف بطور ہدیہ پیش کئے گئے۔

مدینۃ الازہر..... دوسرا عظیم الشان جلسہ جامعہ ازہر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے مدینہ النصر میں منعقد ہوا جس کا پنڈال غیر معمولی طور پر وسیع اور پر شوکت بنایا گیا تھا اور اس میں تقریباً بیس سے پچیس ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ یہ پنڈال جھنڈیوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر مندوب علماء کی کرسیاں تھیں۔ اسٹیج کے نیچے ایک طرف مصری زعماء و علماء بٹھلائے گئے تھے اور دوسری جانب سفراء دول (ممالک کے سفیروں) کی نشستیں تھیں، صدارت کے لئے اعلان صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ السید جمال عبدالناصر کا تھا لیکن وہ بعض ہنگامی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آ سکے، تو ان کے امر سے سید حسین شافعی نائب صدر جمہوریہ نے ان کی نیابت کی اور جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ایک پورا شہر مدینۃ الازہر کے نام سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔ جس میں جامعہ ازہر کے تمام کالج، مدارس، دارالافتاء اور دفاتر یکجا ہوں گے جو اب منتشر ہیں اور جامعہ ازہر نے سولہ کروڑ روپیہ کا تخمینہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔

ہزار سالہ علمی عظمت..... اس اجتماع میں اجمالاً جامعہ ازہر کی ہزار سالہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی جس کا سب نے اعتراف کیا کہ اس ہزار سالہ جامعہ نے بلاشبہ بڑے بڑے ائمہ علوم و فنون پیدا کئے۔

ظاہر ہے کہ جب اس کے فضلاء اور فارغین میں جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے ائمہ علم و ہدایت ہوں تو اس کی زرین خدمات سے کون انکار کر سکتا تھا۔

صدر ناصر خدمات اور کردار..... اسی دوران ملک میں الیکشن کا ہنگامہ بھی برپا ہوا۔ نئی پارلیمنٹ چنی گئی اور اس میں السید جمال عبدالناصر صدر مملکت چنے گئے۔

نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس نئے صدر منتخب (السید جمال عبدالناصر) کی صدارت میں ہوا جس میں صدر مملکت نے تقریباً تین گھنٹے تقریر کی اور اس میں مصر کے جدید دور کی جو شاہیت کے خاتمہ کے بعد کا ہے، ترقیات کا مفصل تذکرہ کیا اور قوم نے بے پناہ محبت اور تالیوں کی گونج میں صدر کا خطاب سنا اور اس سے متاثر ہوئی۔

مصری قوم اپنے موجودہ صدر سے کافی محبت رکھتی ہے۔ اولاً صدر کی خدمات کی وجہ سے، جن میں سے عظیم ترین خدمت اتحاد ثلاثی (اسرائیل، برطانیہ، فرانس) کے حملہ سے مصر کو بچانا اور اندرونی طور پر مصر کو مہلک قسم کی سرمایہ داری اور جاگیر داری سے نجات دلانا، نیز پوری قوم کو یکسانی کے ساتھ ہر ممکنہ ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور مصر کو صنعتی، زراعی اور علمی ترقیات کے راستہ پر ڈال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے صدر کے ذاتی کردار کی پختگی اور سادگی کا مصر والوں پر خاص اثر ہے کہ جمال عبدالناصر نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے آج تک کوئی سرکاری عمارت استعمال نہیں کی اور جاہ و جلال کی رسمی نمائش سے الگ تھلگ رہے بلکہ ابھی تک وہ اپنے ہی قدیم ذاتی مکان میں رہائش رکھتے ہیں۔ جو شہر میں اور مکانات کے ساتھ ایک عام

مکان کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی اولاد اور بچوں کے لئے اسکول وغیرہ جانے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح یہ بچے بھی سائیکلوں پر اسکول جاتے آتے ہیں۔ اسکولوں کا عام قانون ان پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح قوم کے دوسرے بچوں پر۔

صدر مملکت خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مساجد میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں نہ کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے اور نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے جہاں جگہ ملتی ہے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ بیچ وقت نمازوں کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

مصر کی عمومی مذہبی حالت..... اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عمومی طور پر نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں۔ قاہرہ، طنطا، اسکندریہ اور غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آتی، مساجد کے نقشے نہایت پر شکوت اور تعمیریں معیاری ہیں، ساتھ ہی ان مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ ائمہ و موذنین حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں اور ہر وقت کی نماز میں نمازی جوق در جوق آتے ہیں اور مساجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد ائمہ مساجد آدھ پون گھنٹہ وعظ بھی کہتے ہیں۔

مصری قوم میں طنساری اور محبت کا مضمون کافی ہے، جب تک زبان وغیرہ کی اجنبیت رہتی ہے، بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ضامن سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

اکرام ضیف..... اکرام ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا مزاج ہی ہے۔ جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں، مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خوب طبیعت ثانیہ ہے۔ اعضاء مؤتمر کی مدارات و ضیافت میں بھی مصر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وزراء، امراء اور انجمنوں کی طرف سے دعوتیں عموماً ہوٹلوں میں دی جاتی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں ہوٹلوں کا انتخاب اور ترتیب خاص سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ہر اگلے دن کا ہوٹل پچھلے ہوٹل سے زیادہ عظیم اور عالی شان ہوتا تھا، ہر پہلا ہوٹل دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ اس سے بہتر ہوٹل دوسرا نہ ہوگا۔ لیکن اگلے دن کا دوسرا ہوٹل نگاہوں میں پہلے کو گرد نہادیتا تھا۔ شخصی طور پر بھی متعدد علماء و فضلاء کے لئے دعوتیں ہوئیں مگر سلیقہ مندی ہر حرکت سے محسوس ہوتی تھی۔ کاموں میں مستعدی اور اداء فرائض میں پختی نمایاں نظر آتی تھی۔ قوم کا علمی شعور عام طور پر بیدار ہے۔

مصر کا سرکاری مذہب..... سیاسی سوجھ بوجھ انفرادی حد تک نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی ہے، قومی الیکشن کے سلسلہ میں جن امور کی خاص طور پر مؤتمر کے اجلاس میں مندوبین کو بشارت دی گئی وہ یہ ہے کہ دستور مملکت میں مستقل دفعہ رکھ دی گئی ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے، اور سرکاری زبان عربی ہوگی۔

اشتراکیت کا پروپیگنڈہ..... یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کر لی گئی ہے اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں، ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کی بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں۔ جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا لیکن کمیونزم کا نہیں ہوگا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت و عمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے، کمیونزم نہیں کہلائی جاسکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کی ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو پیشینہ ناز کر دیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصہ جسے مصر جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے، وہ کم و بیش صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشنلائز کر دیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہر حال شخصی املاک کی افراط کو جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بڑا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو، ختم کر کے حدود اعتدال میں لے آنا قابلِ ملامت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابلِ ستائش کہا جاسکتا ہے۔ بہر حال مؤخر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔ مصری قوم کی قرآن کریم سے والہانہ محبت..... یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآن کریم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوت قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جا چکا تھا، قاری محمد خیری نے جو مصر کے مشہور مجدد (تجوید کے ماہر قاری) ہیں یہ تلاوت شروع بھی کر دی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں۔ جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور تجوید جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے۔ وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ السلیل، جامعہ شافعیہ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینت میں دوسرے ایک مشہور مجدد اس عمل کے پابند ہیں۔ اسی طرح اور تمام جوامع کا یہی دستور ہے۔ سماع قرآن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآن کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے عربی ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ایک سپاہی جو سڑک کے چوراہے پر پہرہ دے رہا ہے اسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسٹرنکال کر قرأت سننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جامعہ ازہر میں ہر مڈس کے انتخاب میں حافظ قرآن ہونے کی شرط رکھی گئی ہے۔ دارالقرآن کاسنگ بنیادی مستقلاً حفظ کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی ہے وہ دوسرے عربی ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

حفاظ قرآن کریم کے لئے مصری حکومت کاسنہری کارنامہ..... پھر نہ صرف تلاوت قرآن بلکہ حفاظت قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ یہود بے بہود نے اپنی روایت تلمیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کاسب سے بڑا مرکز ہے، ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلا دیا جس میں سے کئی سورتیں خارج کر دیں، کئی ہی آیتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بڑھادیئے تاکہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رو رک جائے اور جو مسلمان ہوں وہ غلط اور مخالف اسلام عقائد و اعمال کے حامل داعی ہوں تاکہ اسلام کی تعلیمات کون کر تو میں نہیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآن کریم چھپوایا اور اس کے سرورق پر یہود کی شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف یہی بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریائے دکر کے صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچا دیا۔ جس سے عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظت خداوندی کھل کر نمایاں ہو گئی۔

مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میرالیقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کو اس قرآنی شغف ہی نے تیرا رکھا ہے جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود ترقی ہوئی ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال مؤتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے، حکومت کی زبان لسان قرآن ہے، حکومت کا نصب العین اشاعت قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظت قرآن ہے۔ جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زائد مصر کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

مغربیت سے مرعوبیت..... مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کے لئے ان ساری مُسرتوں کے ہجوم میں کوفت اور سواہن روح کاسبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہو جانا ہے، جب تک ان کے ضمائر اور مانی الضمیر کا اندازہ نہ ہو، ظاہر طور پر قاہرہ و پیرس اور لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔ جہاں مساجد نمازوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دے گا۔ نمازیں بھی پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر، آداب شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے۔

اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے۔ عورت مرد کا اختلاط عام ہے، جلسوں بازاروں اور دفاتروں حتیٰ کے مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔

جامعہ ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا مستقل حلقہ تھا۔ جس میں وہ کھلم کھلا شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظر عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ ملی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن کو بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے مگر اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے، اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے سے یہ یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔

تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جانتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں۔ اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ قدیم فقہ یقیناً بہت سی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کرتا ہے تو سعادت میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے، اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا ہے۔ اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے حالانکہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صاف بات مغربیت سے سرعوبیت کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔

ممکن الٰہ وال خرابیاں ان فکری اور عملی بے راہ رویوں کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔ یہ تو سعادت در حقیقت فکر کی آزادی سے چلتے ہیں:

زند لنگر یا نش ہزار مرغ بہ سنج

چونیم بیضہ کہ سلطان ستم روادار

کا معاملہ سامنے آیا ہوا ہے، اس لئے جائزات کی تلاش بلکہ جائزات سازی کی کثرت ہے اور عوام کی حد تک کوئی ممنوع و مکروہ ناجائز کی حدود میں نظر نہیں آتا۔

گو اس میں امید کی کرن یہ ضرور نظر آتی ہے کہ اوپر کی ذکر کردہ خوبیاں اصلی ہیں اور یہ خرابیاں یورپ اور یورپیوں سے ہمہ وقتی قرب اور غلط ماحول کا نتیجہ اور اس کا رسوخ تنبیہ و اصلاح کی کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ سمجھانے پر قلوب متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور رفتار کے بدل جانے کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے مقالات و خطابات میں ان امور پر شائستہ انداز میں نکیر و ملامت کی۔ جس پر کسی بیزار نظر نہیں آئی، بجائے ہمیں شرمساری محسوس ہوئی۔ اس لئے اصلاح اور مصلح کے لیے یقیناً منجائشیں ہیں۔ مگر مصلح کی کامیابی صرف صحیح عمل کی نشاندہی سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ استدلالی قوت سے صحیح فکر کی نشاندہی نہ کی جائے اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کوئی علمی رنگ کا اقدام نہ کیا جائے اور وہ بھی مسلسل جب تک کچھ اہل دل خواہ ان کے پیچھے نہ لگیں اور استدلال و

نظر کے ساتھ اپنے عمل و تقویٰ کا نمونہ ان کے سامنے نہ رکھتے رہیں، اصلاح و تعدیل مشکل ہے۔
 بہر حال جیسے دنیا کی ہر قوم میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں، اسی طرح مصری قوم میں بھی کچھ خوبیاں ہیں جو کافی حد تک ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں مگر ممکن الزوال مؤثر کے عالمی رابطہ کو اس میں استعمال کیا جائے۔
 بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت..... حضرت محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بہر حال میں نے مصر پہنچ کر اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کر کے جو کچھ اندازہ لگایا، میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصری کے ساتھ مخصوص نہیں، اس غلبہ سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر و مغلوب ہو چکا ہے، کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ۔ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو ہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کے ساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو ہاں کی قدرتی آب و ہوا کا نتیجہ ہے، دونوں کی مضبوطی نے انہیں استحکام اور قیادت کے راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ ﴿وَإِذْ أَوْفَوْا بِالْعَهْدِ إِذْ عٰثَرْتُمُوهُمْ فَهَٰذَا فَسْقَتُهُمْ لِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ کے مصداق ہو کر (أَخْلَقُ بِالْمُلْكِ) کے حق دار بن گئے ہیں، اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا اثر و رسوخ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا چلا جائے گا اور بالخصوص مڈیسٹ کے ممالک کو ان کی اٹھائی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔

ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلاشبہ ان کے حسن تدبیر کی قابل ستائش مثال ہے۔

حضرت ممدوح نے اس تقریر میں مصر کے احوال و مشاہدات پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس بارے میں چونکہ حضرت موصوف کے مشاہدات مصر و حجاز سے آئے ہوئے خطوط میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس لئے مشاہدات کے بجائے اس تحریر میں تاثرات اور مقالات کو جمع کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جن میں بنیادی چیز آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے مؤتمر میں پڑھ کر سنایا۔

اس تقریر میں آپ نے اپنے اس مقالہ کے بنیادی نکات کی ضروری حد تک نشاندہی اور مزید تفصیل فرما دی مگر پھر بھی مقالہ میں جو تعمیری تجویزیں اور ضروری نکات مؤتمر کے سامنے رکھے گئے تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت ممدوح ہی کے اصل عربی الفاظ میں مع ترجمہ کے پیش کر دیا جائے تاکہ اس متن کے ساتھ، زبانی بیان کردہ حالات و مشاہدات اس کی شرح کی حیثیت سے سامنے آجائیں۔

اس عربی بیان کا سلیس ترجمہ ہمارے دارالعلوم کے مفسر عربی کے استاذ مولانا وحید الزمان صاحب نے کیا ہے جس میں اصل مقالہ کی روح کو پوری طرح باقی رکھا گیا ہے۔ (مقالہ رسالہ دارالعلوم کے اسی شمارے میں شامل ہے)
 اس سلسلہ میں فلسطین اور غزہ کے سفر میں آپ نے تقسیم فلسطین کے خلاف بھی اپنی رائے بذیل تحریر منضبط

فرمائی تھی۔ لیکن جبکہ فلسطین سے متعلق تجویز کے سلسلے میں وہ سب امور موجود تھے جو اس مقالہ میں درج کئے گئے تھے اور اس تجویز پر حضرت ممدوح کے دستخط بھی ہوئے، اس لئے مقالہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اس بارے میں حضرت موصوف کا زاویہ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ مقالہ بھی مع ترجمہ کے ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ (جسے خطبات کے صفحہ: ۷۷ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔)

سفر حجاز..... یکم اپریل ۶۲ء کو حضرت موصوف قاہرہ سے بقصد حج بیت اللہ حجاز مقدس روانہ ہوئے اور اس تاریخ میں براہ جدہ ہوائی جہاز سے اولاً مدینہ طیبہ پہنچے اور وہاں چودہ دن قیام کے کر کے ۱۶ اپریل کو مکہ مکرمہ پہنچے اور ۲۱/ اپریل کو ادینگی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اس تقریر میں آپ نے مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ کے اجتماعات کا بھی ذکر فرمایا جن کا اجمالی خلاصہ علمی دنیا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ: مدینہ منورہ کے قیام کے دوران اس دفعہ خصوصیت سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے متعدد اساتذہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے اور وسعت اخلاق کے ساتھ ملے۔

دوسرے روز مدینہ یونیورسٹی کے رجسٹرار الاستاذ اشغ عبد بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بغایت کرم و عنایت پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں انہوں نے یونیورسٹی کی طرف سے دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ خیر مقدم کے طور پر یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہوں اور آپ کچھ خطاب بھی کریں، حضرت ممدوح نے یہ کہہ کر کہ میں تو خود ہی جامعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، اس دعوت کو بعد شکریہ قبول فرمایا۔

مقررہ وقت پر کاریں آگئیں اور آپ اپنے رفقاء سفر خصوصیت سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمائی امیر شریعت صوبہ بہار، صاحبزادہ محترم مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالحق صاحب پیش کا اہتمام دارالعلوم کو ساتھ لے کر یونیورسٹی روانہ ہو گئے۔ یونیورسٹی کے وسیع صحن اور چمن میں الاستاذ عبود اور دوسرے حضرات نے خوش آمدید کہا اور یونیورسٹی کے نائب الرئیس اشغ بن باز کے دفتر میں پہنچایا جو ایک متعجب عالم اور قادر الکلام خطیب ہیں۔

شیخ بکمال شفقت و عنایت پیش آئے۔ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑا، حضرت مہتمم صاحب حالات بیان کرتے رہے جس سے شیخ متاثر ہوئے۔ شیخ بن باز نے متعدد قیمتی کتابوں کے ہدایا حضرت ممدوح اور ان کے تمام رفقاء کو عنایت فرمائے۔

پھر شیخ عبود نے یونیورسٹی کا معائنہ کرایا اور آخر میں یونیورسٹی ہال میں لے گئے جہاں تمام طلبہ، اساتذہ اور اشغ بن باز پہلے پہنچ چکے تھے، اولاً شیخ بن باز نے تقریباً نصف گھنٹہ تقریر فرمائی اور فرمایا کہ: میرا ارادہ تھا کہ میں اس خطاب میں مناسک حج پر روشنی ڈالوں۔ لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ رئیس دارالعلوم دیوبند ہم میں موجود ہیں۔ ہم بہ صد طوع و رغبت، ان کے افکار و خیالات سننے کے آروز مند ہیں۔ اس تقریر کے بعد صدر جلسہ نے حضرت مہتمم صاحب کا تعارف کرایا اور تقریر کے لیے ایما کیا۔

مدینہ یونیورسٹی میں خطاب..... حضرت ممدوح نے اسٹیج پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں شکریہ ارباب جامعہ کے بعد دیوبند کے حالات، تعلیمات، مسلک اور دینی رُخ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور آخر میں جامعہ مدینہ منورہ کے بارے میں ستائش کے وہ کلمات فرمائے جو اس مقدس یونیورسٹی کی شایان شان تھے۔

دارالعلوم کے حالات، معاملات اور مسلک کی تفصیل کے جملوں پر اکثر اسٹیج اور طلبہ کی طرف سے ماشاء اللہ اور الحمد للہ کے کلمات بلند ہوتے رہے۔ یہ مقالہ بھی دارالعلوم کے اسی شمارہ میں شامل کیا جا رہا ہے (جسے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

بے اصل بات..... اس مقالہ کے اختتام پر صدر جلسہ حضرت ممدوح کے شکریہ اور کلمات خطاب کی تحسین کے لئے اٹھے مگر خطاب شروع کرنے سے پیشتر اسٹیج پر اتر کر حضرت مہتمم صاحب کی کرسی کے پاس آئے جو شیخ بن باز کے پاس بھی ہوئی تھی، اور جھک کر اپنی ایک کچی یادداشت کو سامنے رکھ کر استفساری لہجہ میں فرمایا: ”کیا یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اہل حدیث طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے اور کوئی داخل ہوتا ہے تو اسے خارج کر دیا جاتا ہے چنانچہ ایک سال اس کا کھلا مظاہرہ بھی ہوا کہ آٹھ دس طلبہ اہل حدیث دارالعلوم سے خارج کر دیئے گئے۔ یہاں یہ پروپیگنڈہ عام ہے، کیا اس کی کوئی اصلیت ہے؟“ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے فرمایا: ”یہ بے اصل بات ہے جو جناب کے کانوں میں ڈالی گئی ہے، مسلک کے اختلاف کی بناء پر نہ کبھی اہل حدیث طلبہ کا داخلہ دارالعلوم میں روکا گیا ہے اور نہ کسی مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔

جس واقعہ کی طرف جناب اشارہ فرما رہے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ اہل حدیث اور حنفی طلبہ میں مسلکی تنازعہ ہوا۔ نوبت ایک دوسرے کے بزرگوں کے حق میں سخت کلامی بلکہ بدکلامی کی آئی اور اس نزاع کا اثر دارالعلوم کے عام ڈسپلن پر پڑنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ یہ معاملہ عام ہنگامہ کی صورت اختیار کر لے۔ تو نظم (ڈسپلین) برقرار رکھنے کے لئے ان جھگڑالو طلبہ کو جھگڑے کی بناء پر خارج کیا گیا، جن میں اہل حدیث بھی تھے اور حنفی بھی۔ اگر مسلک کے تفاوت کی بناء پر یہ اخراج ہوتا تو حنفی کیوں خارج کئے جاتے اور اگر مسلک اختلاف کی بناء پر اہل حدیث خارج کئے جاتے تو انہیں داخل ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پھر خارج کرنے کا بار سر لیا جاتا۔ اور اگر یہ سب کچھ مسلک کے اختلاف کی بناء پر ہوتا تو جو اہل حدیث اس نزاع میں شریک نہیں تھے، انہیں بدستور دارالعلوم میں کیوں داخل رکھا جاتا؟ اس لئے یہ واقعہ سرتاپا غلط ہے کہ ان طلبہ کے اخراج کی وجہ تفاوت مسلک ہے۔“ اس سے صدر جلسہ بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر اولاً حضرت مہتمم صاحب کے مقالہ کے بارے میں بھرپور تحسین کے کلمات فرمائے، پھر دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آخر میں اس واقعہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ:

”دارالعلوم دیوبند کے بارے میں جو یہ شہرت دی گئی اور بارہا کان میں پڑا کہ وہاں اہل حدیث کا داخلہ ممنوع ہے یا وہ اس بنا پر خارج کئے جاتے ہیں، غلط ہے ہم نے اسی وقت رئیس دارالعلوم سے اس کی تحقیق کی تو

شہرت بے اصل ثابت ہوئی۔ ایسی افواہوں کا پھیلا نا مناسب ہے۔“

حضرت مہتمم صاحب نے جب یہ تفصیل اپنے اس خطاب میں ارشاد فرمائی تو مجمع میں اس سے خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور افسوس اس کا ہوا کہ لوگ غیر ممالک اور بالخصوص مجازہ مقدس پہنچ کر بھی اس قسم کے غلط پروپیگنڈوں سے احتراز نہیں کرتے۔

لیکن حق تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان غلط شہرتوں اور تشہیروں کا پردہ خود ذمہ داردارالعلوم کی زبانی، ذمہ دارانِ مدینہ یونیورسٹی کے مواجہہ میں، خود مدینہ کی فضاء میں چاک کر دیا اور اصل حقیقت کھل گئی۔ حضرت ممدوح کا وہ جامع مقالہ جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھا گیا، وہ بھی اسی شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الرَّابِطَةُ الْإِسْلَامِيَّةُ کے اجلاس میں شرکت..... پھر آپ نے مکہ مکرمہ کے اس بین الاقوامی اجتماع کا ذکر فرمایا جو قصر الملک میں الرابطة الاسلامیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا کہ اس میں شرکت کی گئی اور رابطہ کے ذمہ داروں کے مقالات اور خطابات سنے گئے۔ جن میں خصوصیت سے قابل ذکر خطاب السید امین الحسینی مفتی فلسطین اور الاستاذ سعید رمضان کا ہے۔ نیز خصوصیت سے قابل ذکر عراق کے ایک بلیغ شاعر کا تاریخی قصیدہ ہے جس میں انہوں نے وقت کے حالات سنا کر عالم عرب کو بیداری کا پیغام دیا جس سے پورا مجمع متاثر ہوا۔

اجتماع کے بعد جدہ رابطہ کے سیکرٹری صاحب سے ایک دعوت میں جو سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سیکریٹری سفارتخانہ ہند کی طرف سے دی گئی تھی، ملاقات ہوئی۔ جس میں انہوں نے ”الرابطہ“ کے اغراض و مقاصد کے ضروری کاغذات اور اس کا دستور نامہ ایک ریٹھی رومال میں رکھ کر عنایت فرمایا۔

دارالعلوم کا بین الاقوامی تعارف..... بہر حال مجموعی حیثیت سے حضرت ممدوح کا یہ سفر شاندار اور کامیاب رہا اور اس مبارک سفر میں بین الاقوامی طور پر جواہم کردار آپ نے ادا کیا وہ دارالعلوم دیوبند کا بین الاقوامی تعارف تھا۔ جوڈیسٹ اور یورپین ممالک کے سربراہ اور وہ زعماء اور علماء کو کرایا گیا۔ آپ کے ساتھ دارالعلوم کی عمارتوں کے اہم کے نسخے بھی تھے جو ممتاز اور مشاہیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

صومالی لینڈ، کینیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز اکابر اس اہم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے جس سے بہت سے خطوں میں دارالعلوم جانا پہچانا ہو گیا۔

دارالحدیث دیوبند کے اس جلسہ میں طلبہ اور شہر کے لوگوں نے حضرت ممدوح کے ان اقدامات پر نظم و نثر میں مبارک باد دی۔ اس لئے یہ جلسہ حج کی مبارک باد سے زیادہ غیر ممالک کے ان قلوب کو ہموار کرنے کی حج اکبر کی مبارک باد پر مشتمل تھا جو اس سفر میں دارالعلوم کے لئے ہموار ہوئے۔ جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ تقریباً شب کے ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

مذہب اور سیاست

قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی) تھے۔ جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جو ارج کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلافتح ہوئے۔ عباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد، امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

پیش لفظ..... پیش نظر خطبہ صدارت حضرت فخر الامت، امیر البیان حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت صدر اجلاس جمعیت علماء صوبہ سندھ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو سندھ کے تاریخی شہر حیدر آباد میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے، ان کے علاوہ مجلس احرار مسلم لیگ اور جماعت خاکسار کے ارکان بھی موجود تھے۔ عام شرکاء میں ہر طبقہ، خیال کے افراد حاضر تھے۔ مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی، عرفانی، اصلاحی اور سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متاثر تھے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ خطبہ پڑھنے کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا: ”میں خطبہ صدارت سننے ہی کے لئے شریک اجلاس ہوا تھا، اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچا دیا۔“

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ بِحَمْدِهِ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يُّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَوَسَدْنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كَاثَرَةِ النَّاسِ بَشِيْرًا وَنَذِيْرًا، وَدُعَايَا اِلَيْهِ يَّادُيْهِ وَسِرَاجًا مُنِيْرًا.

اُمَّا بَعْدُ اَفْأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
مخلصانہ شکریہ..... بزرگان محترم! اللہ کی حمد و سپاس، اللہ کے آخری نبی پر درود و سلام اور آپ سب حضرات کے

کرم فرمایا نہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں نالائق کو بخشا گیا ہے، مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطور یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اکابر قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور و فکر میں مدد دے سکوں۔

زمانہ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں حضرات محترم! آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے۔ دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں الجھ رہی ہے، دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رد رہے ہیں۔ معمورہ ارضی کے وہ حصے جنہوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراج تحسین وصول کیا تھا، آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ ان پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسانیت اپنے نشان مزار پر کھڑی ہوئی رورہی ہے، اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہولناک نمونوں سے تھر رہے ہیں۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوسِ بندگی بنایا تھا، مگر شیطان اور اس کی ذریت نے اسے جنگِ غلامی کا جہنم بنا دیا ہے۔

گزشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنم تیار کیا تھا، آج اس کے شیدا اس میں جل رہے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، بچے، بوڑھے، سب کراہ رہے ہیں، اور ان کی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سی جا رہی ہے جو مذہبی رہنماؤں کی زُوح کو تڑپا رہی ہے۔

مذہب اور سیاست وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مذہب اور سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی، آج خدا سے آپ حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں اور جو لوگ خداوندِ عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے، زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں، بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ آج جب اس کی واپسی عمل میں آرہی ہے تو اس کے ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی، مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبرِ مطلق۔

جنگ کا آخری فیصلہ جنگ ہو رہی ہے، یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتیٰ کہ چرچل روز ویلٹ اور ہٹلر جو خود بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی، جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدانِ جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی ہے۔ عبادتِ ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں، مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبرِ اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں کہا تھا کہ: ”اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے، ہماری سلطنت اور ہمارا تہذیب بھی برباد ہو جائے گا۔“

واقعات سامنے رکھ کر دنیا اس قضیہ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی

جاری رہے گی۔ گوڈیلی میل نے اپنے مقالہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء میں لکھا ہے کہ: ”جنگ کے اچانک ختم ہو جانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے۔“ اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ کیوں کہ دنیا کے دو ارب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، دنیا کے مدبرین ان کو بہم پہچانے سے قاصر رہے ہیں۔

آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیت..... دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رُو سے کسی کمزور قوم کی آزادی سلب نہ ہو سکے۔ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کی بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو۔ دنیا کو اپنی ساری پیداوار کسی ایک ملک کی بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت ہے جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں۔ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیت کی بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین المللی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو سکے۔ اگر حتمی قومی (لڑنے والی قومیں) ان نکتوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہے گی اور اگر آج جنگ ختم بھی ہو گئی تو یہ خاتمہ ایک اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدمہ ہوگا۔ ہاں! مگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں خدا کی حکومت کرے گی اور اس کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہے گی۔

ہندوستان کی صورت حال..... ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک صدی سے بہانے تلاش کر رہی ہے، دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کی شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ و فحاش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبیر کو غلامی کی قوتوں کے سامنے مغلوب بنا دیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفان مصائب ہے جو علماء کے سروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان مرتب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع میسر آیا ہے تاکہ ہم اس ہمہ گیر درد دکھ کا کوئی ہمہ گیر مدداسوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی تھپیڑوں سے نکال لے جائیں:

گہے باشد کہ کار ناخدائی می کند طوفان کہ از طغیان موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟..... میں ایک سیاسی آدمی سے زائد ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم و فہم کے مطابق جہاں تک غور کر سکا ہوں، دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور گمن بن کر ان کی فلک بوس عمارتوں کو پوند خاک بنایا ہے، اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔ 1 جمل 2 ظلم 3 اور غلامی۔

جہل..... جہل سے حدودِ ایشیا نامعلوم رہ جاتی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، کوئی قانون زندگی سامنے نہیں آتا اور انسان اپنے اس اشیائی فرق کو منادیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حد فاصل کے

قائم فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ایک انسان بہائم میں مل جائے تو انسانی حلقوں میں اس کی کوئی پریش نہیں ہو سکتی۔
ظلم..... ظلم، عدل کی ضد ہے۔ اس سے میری مراد ظلم اخلاق یعنی اخلاق کا عدل و اعتدال پر قائم نہ ہونا اور جبلی افراط و تفریط ہے، جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل اخلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے، قوم کی ساکھ اکھڑ جاتی ہے۔ خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گر جاتی ہے اور بالآخر ان بد اخلاقیوں کے جراثیم سے پھر یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جاسکے۔

غلامی..... غلامی کی تباہ کاریاں فوضویت سے شروع ہوتی ہیں۔ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو، مرکزیت نہ ہو، اس کا کوئی سرگروہ باقی نہ رہے۔ قوم کا ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے۔ باہمی تعاون و تناصر ختم ہو جائے۔ اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقت و اقوام اس پر خروج کر کے مسلط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کے لئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھنکار ہے اور پھر اس غلامی سے بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ، کلچر، تہذیب، تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھتی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو اس طرح نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چند دے دنیا میں کوئی اس کے نقش پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔
قرآن حکیم کا فیصلہ..... قرآن حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں، جن میں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿حُضِرَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمُسْكِنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضَ مِنَ اللَّهِ ذَلِكُ بَانْتَهُمْ سَكَانُوا يَكْفُرُونَ بَابِئِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بَغِيرَ الْحَقِّ ذَلِكُ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ ①
”جہم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے وہ غضبِ الہی کے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکامِ الہیہ سے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان کے لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل نکل جاتے تھے۔“
ذلت و مسکنت کا فرد کمال یہ تھا کہ ان سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کر دی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں کے غلام، کبھی بخت نصر کے غلام، کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باج گزار، کبھی مسلمانوں کے زیر حکومت اور کبھی نصرانیوں کے۔ کہیں ہنر کے رحم و کرم پر اور کبھی امریکینوں کی لفظی ہمدردیوں پر۔

غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اس نے کبھی ان کی کوئی ایسی بھی تو قبر نہیں کی جو کم از کم آدمیت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انہیں جلا

وطن کیا ہے، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، ایک ایک کا مال و اسباب ضبط شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے مواقع پر بورڈ چسپاں کئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ برطانیہ نے انہیں پناہ ضروری۔ مگر ان کی کسی ادنیٰ تو قیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیوں کہ برطانوی مدبروں کے انداز سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجے کی ذلیل و رسوا قوم جانتے ہیں اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ ان کے ساتھ ہو، مگر کوئی اچھی رائے ان کے ساتھ نہیں۔ پس غلامی کے ساتھ انتہائی ذلت و مسکنت اور رسوائی بھی ان کے لئے قرآن نے مخصوص کر دی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآن حکیم نے عصیان بتلایا ہے جو عملی سیدہ کاری ہے اور اس کا سبب اعتداء فرمایا گیا۔ جس کی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہو یا ہو تو معاملہ ان کے ساتھ لاعلمی کا کیا جاوئے اور یہی وہ جہل ہے جس سے خیر و شر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

پس یہودی ذلت و مسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بد اعمالیوں سے اور بد اعمالیوں کا نفاذ ظلم اخلاق اور جہل نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی سے بڑی قوم کو برباد کرنے کے ضمانت دار ہیں، ظلم اور جہل اور غلامی لٹکے اور تینوں کا ایک ہی آیت سے ثبوت بھی ہو گیا۔

دوسرے مواقع پر قرآن حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے جس سے ان کی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت الہیہ کا حامل بناتے ہوئے اس کی بنیادی شرط ان دو چیزوں، ظلم و جہل کو قرار دیا ہے کہ انہیں کی اصلاح کے لئے اس جذبہ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہو گیا۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ ①

”ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی، سوانہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا۔“ یعنی اس میں ثبوت علمیہ اور ثبوت عملیہ (اخلاقی حسن) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت، اس میں علم اشیاء اور عدل اخلاق کی استعداد تھی جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دار فرمایا۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ غُلُوبًا وَهُوَ الْأَرْضُ وَلَا قَسْدًا

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ ②

”یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک شمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔“

ظاہر ہے علو و کبر شمرہ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو اور فساد و ضد صلاح ہے اور صلاح و رشد کا فقدان وہی ظلم نفس ہے۔ خواہ علمی ہو، خواہ اخلاقی، پس آثارِ جہل و ظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جاسکتی ہے تو وہی اس کا جہل و ظلم ہے گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زیر دستی پیدا کر سکتی ہے تو یہی ظلم و جہالت۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کر کے اس کی خلافت کے بارہ میں غلجیان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةًۭ ۚ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ ①

”اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگ جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے۔“ یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفاکی، حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے۔ پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔ غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم..... ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض میں غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو درحقیقت اسی ظلم و جہل کا ثمرہ ہے۔ بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ تَادُّنُ رَبُّكَ لِبَعَثْنٰۤی عَلَیْہِمۡ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَمَةِ مَنْ یُّسَوِّمُہُمۡ سَوَآءَ الْعَذَابِ ۚ﴾ ②.....

”اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتے رہیں گے۔“

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوء عذاب یعنی بدترین عذاب بتلایا ہے۔ بہر حال ان آیات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں۔ ظلم و جہل اور غلامی اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے بچھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل..... آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انہیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی مشنڈن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی بھلی قوم میں

شمار کئے جانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کی توبہ تو بے جا حالت نے ان میں سے خیر و شر کی تمیز اٹھا دی اچھے برے کا فرق مٹا دیا۔ حدود و اشیاء ان کے قلوب پر مخنی ہو گئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے۔ مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مان کر انواع و اقسام کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد (جمع) ہو گیا تھا۔ کعبۃ اللہ سینکڑوں بتوں کا بت خانہ تھا جو انسانی زندگی کے مالک تصور کئے جاتے تھے، انہی سے مرادیں مانگی جاتی تھیں، ان ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ان کے سامنے سرعہ بدیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور امتی کا فرق مٹا چکے تھے، رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دے دیا تھا اور سنن انبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیر دین کی تمیز اٹھ چکی تھی۔ دین کو غیر دین سمجھ کر الحاد کا شکار تھے اور غیر دین کو دین جان کر بدعات و محدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلم اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاق فاضلہ کا ان میں کوئی شمر (کم مقدار) باقی نہ رہا تھا۔ اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیار ہی تھی نہ غیرت، نہ ہمدردی تھی نہ مروت، نہ ایثار، نہ تواضع، نہ بے نفسی، نہ للہیت، نہ مہر و شکر، نہ اعتماد نہ توکل۔ ہاں رات دن کا شیوہ تھا، تفاخر و اتر اہٹ، بے رحمی و قسوت، شیخی و رعونت، کبر و نخوت، سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی، ہوسناکی و خود ستائی اور ان بد اخلاقیوں سے جن بد اعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا، وہ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت، زنا و شراب، جوا اور قمار، قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنہوں نے ان کی دینی و دنیوی زندگی کو تباہ کر ڈالا تھا۔

ادھر فوضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ ان میں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی، نہ قومی نظام تھا، نہ ملکی تمدن نہ شہریت تھی نہ شہری حقوق، نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ، پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا، جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ بدویت و بربریت، طوائف الملوکی اور بد نظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انہیں اسی ذلت و خواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہنچا دیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام، کبھی غیروں کے گرفتار اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم و جہل نے ان میں آثار نبوت مٹا دیے تھے اور فوضویت و غلامی نے ان میں آثار سلطنت محو کر دیے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی، نہ سیاست، جس کا خون انہی تین امراض، ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔ رحمت الہی کا ظہور علم نبوت، مکارم اخلاق، اسوۂ حسنہ..... آخر کار رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل، تاریک ہیکر، اور تاریک روش قوم پر ختم نبوت کا آفتاب جہاں تاب چکا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تیبانی علم جس سے جہل کا نور ہو۔ اپنا خلق عظیم جس سے ظلمت اخلاق دوز ہو اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے۔ چنانچہ اپنی یہی تین شاخیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں۔ ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے

ہوئے ارشاد فرمایا: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا.“ ① ”میں بلاشبہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ.“ ② ”میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کر دو۔“ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد الہی ہوا: ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.“ ③ ”البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم و اخلاق و عمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں۔“

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود و اشکاف ہوئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور ناروا کا امتیاز ہوا۔ اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے جائز اعمال کے دواعی دلوں میں ابھریں، عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمت حیات بخشی گئی ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس علم کا اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت و استقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جس میں مرکزیت کے ساتھ اس علم و اخلاق کی نشرو اشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت، مادی و روحانی طاقت اور غلبہ و تسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کر دے۔

بہر حال قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی) جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈال دی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان تین طاقتوں کے ذریعے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد، امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتح عالم چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی۔ فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج لیا اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا اہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہر قل شہنشاہ روم، مقوقس بادشاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوک عمان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیج کر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھانک

① السنن لابن ماجہ، المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵.

② السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب آداب القاضی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعاليها، ج: ۱۰، ص: ۱۹۲.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

کھلاتو لسان نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دور صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستِ حق پرست پر بہت سے بلادِ فارس (ملک) ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر متعدد بلادِ شام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر کتنے ہی بلادِ مصر فتح ہوئے۔ دور فاروقی (رضی اللہ عنہ) آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیارِ مصر، تمام اقلیمِ فارس اور روم و قسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلامی شعائر بلند ہو گئے، دولت عثمانی (رضی اللہ عنہ) کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی، زمین کے مشارق و مغارب تک یہ رودِ جا پہنچی۔

بلادِ مغرب سے اقصاءِ اندلس، قبرص، قیروان، بلادِ سبتہ اور بحرِ محیط تک۔ ادھر تاجیہ مشرق سے اقصائے بلادِ چین۔ اقصائے ایران اور مدائنِ عراق و خراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیش گوئی ارشاد فرمایا تھا کہ:

”إِنَّ اللَّهَ زَوَى لِي الْأَرْضَ فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَسَيَلُغُ مُلْكُ أُمَّتِي مَا زَوَى لِي مِنْهَا.“ ①

”اللہ نے ساری زمین مجھے دکھائی تو میں نے تمام مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امت کا ملک اس حد تک پہنچ کر رہے گا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں۔“

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق و مغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا، بہت سے وہ تاجیہ کو نے باقی رہ گئے جن تک نگاہِ نبوت پہنچ چکی تھی، اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتح کا سیلاب بڑھتا رہا۔ چنانچہ ہندوستان، افغانستان، جزائرِ شرقِ الہند، جاوا، سائر اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے۔ جن کے کچھ، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم ان کی ذہنیات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن پھر بھی نگاہِ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت و بر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں لے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾ ②..... ”وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت کی اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے (باعتبارِ حجت و دلیل بھی اور بلحاظ شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرن اول میں ہوا ”کَيفَا“ اور قرن آخر میں ہوگا ”كَمَا“)۔“

بہر حال یہ سب مادی و روحانی برکات اسی مقدس قوم کے دستِ حق پرست پر ظاہر ہوئیں، جنہوں نے برکاتِ نبوت سے متبرک ہو کر ہوا سے ظلم کو عدل و اخلاق سے، جہل کو علم نافع سے اور علم کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال

① مسند احمد، حدیث شداد بن اوس رضی اللہ عنہ، ج: ۳۳، ص: ۷۹، ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیہ: ۲۸۔

سے متغیر (روشن) کیا۔

زمانہ جاہلیت..... آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہیں جس کا قبل از بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تسمیٰ۔

و فوراً جہل..... و فوراً جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنہ جہل سے لبریز ہے۔ اسباب علم جتنے بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے اُمت کا جہل ترقی کرتا جا رہا ہے۔ آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنا دیا ہے۔ اصول اعتقادات تک میں شکوک و شبہات کے جراثیم سراپت کر چکے ہیں۔ کسی کو خدا کے وجود میں کلام ہے، کسی کو اس کی صفات میں، کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوت یعنی کلام الہی کے منزل من اللہ ہونے میں کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیت کے عدل و ثقہ میں، کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے اور کوئی سرے ہی سے اسے دل کے بہلاؤ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروغی اعتقادات اور اعمال کے سلسلے میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کمپری اور بے کسی کے عالم میں ہیں۔ اس سے کوئی ناواقف نہیں، دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں اور پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں، قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی ایک لاکھ ایک دوان کی قدر کرتے ہیں تو فی صدی ۹۹، علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی انہی ازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی مولوی کا غلط مذہب کہہ کر اس روش کو ہی اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنے کی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر کو اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ اس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری، اس سے زیادہ مہلک مرض ہے جو مسلمانوں میں سراپت کئے ہوئے ہے۔ اس صورت حال میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ ان پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟ اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک مختلف اور متضاد بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جماعتی و اجتماعی طاقت میں روز بروز خلل اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

فقدان اخلاق..... ادھر اخلاقی بے مانگی علمی تہی دستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رسی گدیاں اور تحصیل وصول (چندہ لینے) کی چوکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لے کر لوگ نکلیں۔ سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائر دین سے برگشتہ کرنے کے دوائی لے کر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب و سنت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے۔ عادت و عبادت کی بدعات و محدثات میں طابع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھ کر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ ان میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال و کیفیات اور نہ مقامات و اقوال جلیلی۔ پھر بد اخلاقیوں، حسد و ریا، کبر و حرص، اسراف و بخل، جبن و دودں ہمتی جاہ پرستی و جاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں رائج ہو جاتی ہیں۔ نہ ان کی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل و تنمیم جو مقصد نبوت تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اصول کی بجائے نفسانی جذبات اور ان کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے۔ اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سر پھٹول اور نا اتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے، اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سر پھٹول، باہمی نا چاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے، آج امت اس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص ان کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامہ قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع و جدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے، توافق اور توافقی کی راہ میں غم خواری۔ دوسروں کی دل داری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لیے شفقت و ایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمرات غلامی..... ادھر فوضویت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال و خودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے۔ نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت ہے۔ نہ معیشت، نہ تنظیم ہے، نہ قومی وحدت۔ طبقاتی انتشار دھوکس کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق و تخریب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقہ عمل کا بھی اختلاف آ جاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع و جدال بنے بغیر نہیں رہتا۔ پھر یہ اختلاف کسی اصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء و قیاسیات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولہ خود اسی کا ساختہ پر داختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعہ نزاع و جدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت و سیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد..... بہر حال قوم کا نظام علم و اخلاق جو مجموعہ دیانت ہے ایک طرف تختل ہے (درہم برہم) اور نظام آزادی جو خلاصہ سیاست ہے، دوسری طرف مضحل (کمزور) ہے۔ اس لئے

آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست، دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار بد نمایاں ہونے چاہیے تھے، وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے امن و سکون گھروں، شہروں اور قلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا (نایاب) ہو چکا ہے۔ بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار داگ عالم پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت و خواری اور پستی میں آ چکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلا دی حیثیت سے مسلط ہیں اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت و عیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اسے آسانی، ہم، زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے۔ نہ اسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دار فولادی بارش سے اسے سنگوا لیتے ہیں۔ نہ اسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تار پیڑ و تخت البحر یاں اسے اور زیادہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات، نباتات، حیوانات سب اس کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں۔

پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے تو طرح طرح کے امراض و مصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء (دشمن) اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اسے نجات نہیں ملتی۔ غرض انسان کے لئے نہ آج انسان کا آمد ہے نہ غیر انسان، حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جارہے ہیں:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ ① ”خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل ہی ہیں تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے تاکہ وہ باز آجائیں“۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ ”اور جو کچھ بھی تمہیں دکھ پہنچتا ہے سو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب سے“۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا، تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے ہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے؟ اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اس نے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ②

”اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے خدا کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی جانوں سے انہیں بھول میں ڈال دیا یہی لوگ نافرمان ہیں“۔

اور ظاہر ہے کہ ان تمام ممالک و مفاہد کی جز، بنیاد وہی تین غلطیاں نکلیں گی جو زمانہ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل، ظلم اور غلامی اور دوسرے لفظوں میں بدیناتی اور بدسیاستی، اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کے لئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا، وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کر سکتا ہے۔ بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ: ”لَا يَصْلُحُ آخِرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلَّحَ بِهِ أَوَّلُهَا“ ① ”اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی“۔

سوجب عرب جاہلیت کے ان امراض سے گانہ جہل ظلم اور غلامی کو ان کی تین اضداد علم احکام عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سے گانہ میں تین اجزاء نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہیں تین اجزاء کو قرآن نے مقصد بحث قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ ② ”وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کلی گمراہی میں تھے“۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جس کا تعلق قرآن حکیم کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے امت کی اصلاحی اسکیم کے تین تین بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلہ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر امت کے علم و فکر کی تکمیل و ترقی موقوف ہے۔

دوسرا مسئلہ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لا کر جن پر قلوب کی استقامت موقوف ہے، درست کیا جائے۔ تیسرا مسئلہ تلقین حکمت جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع (پیغمبر) کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ امت کے سامنے لے آنے کے ہیں، جس کے مجموعہ پر امت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام پس، قرآن کریم کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔ ۱۔ تعلیم احکام ۲۔ تہذیب اخلاق ۳۔ تنظیم اعمال۔ عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے، دوسرے کا طریقت اور تیسرے کا سیاست، گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں۔ جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت (راستہ طے کرنا) کیسے

ممکن ہے؟ طریقت سے اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر راہ روی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پر خار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے۔ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائے گی، منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے، طریقت قوت راہ روی ہے اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و غلبہ بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ:

طریقت..... طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مابانی و اصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعاً تخیلی و غلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے، اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح و فلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انہیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے، بہر حال خلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت بنا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اداء حقوق پر ہے۔ ہدایت و ارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا، ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھس کر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے، شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے۔ وہاں ”فراہ عن الخلق“ ہے اور یہاں ”ذہاب الی الخلق“۔ پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو، بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا۔ اسے درد ہو گا اپنے گھر پھر اپنے قبیلہ کا پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہو گا۔

سیاست..... ادھر سیاست کے دائر میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید و مدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر عبادت تک آیا تھا اور یہاں سیاست میں عبادت سے نکل کر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحراء و جبال، زمینوں اور ان کی پیداوار، دریاؤں اور ان کے بہاؤ، حیوانات اور ان کے منافع۔ غرض ساری کائنات کے اجزاء اور ان کی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظلوم الگ۔ حدود و قصاص الگ ہے اور جہاد و جان بازی الگ، احراز غنائم الگ ہے اور اسارت و عمار بین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا، مفسدوں کو دباننا اور مصلحوں کو سر بلند کرنا۔ مبطلوں (باطل والوں) کا زور توڑنا اور حقوں (حق والوں) کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی و روحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلابات کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور غلوت کہاں؟

یہاں تو عباد سے گزر کر بلاوا، انسانوں سے گزر کر حیوانات، حیوانات سے گزر کر نباتات اور سب سے گزر کر ایک ایک چپے زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کی جاتی ہیں، جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک خاص دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوت محض ہے۔ سیاست جلوت محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوت در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوت کا مخزن (طریقت) ہو اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع (سیاست) ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عضروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی احتراز کے مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پر پڑ جائے گی۔

اگر طریقت محض رہ جائے جس میں شریعت و سیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور خجالت محض ہے۔ اگر شریعت محض ہو جس کے ساتھ طریقت و سیاست نہ ہو تو وہ شدت و جمود محض ہے۔ اگر سیاست کے ساتھ شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ نخوت و تجبر محض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونے کی جامعیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے اور اسی لئے دین نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے، پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت و سیاست ہے۔ جن کی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے اور خلافت الہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر و قہر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت و طریقت کی کسمپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے سیاست: جس کی مادی شوکت ان دونوں کے لئے سرمایہ عظمت و حفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہو گئی۔ شریعت کے ذریعہ علم احکام اور تعلیم غیر کا جذبہ شفقت قائم ہو گیا اور سیاست و قوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے عمق و قدرت پیدا ہو گئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت و تجبر نکل کر وقار و خودداری اور شہامت (بہادری) آ جائے گی۔ طریقت میں سے رسم خلوت نکل کر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اور ادھر اتباع شریعت میں خشکی و جمود، تنگ نظری اور تقشف سے نکل کر وسعت نظر، جامعیت ہمہ گیر، تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات ابھر آئیں گے جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائے گا، جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔

جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عضروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیک دم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جا رہی ہیں اور ان کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گئے جا رہے

ہیں اور اس طرح شریعت و طریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مد مقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کل کر کسی ایسی طاقت کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں، جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں اور نہ صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم آمیختہ (یکجا) نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر فرد متشرع خالص، صوفی، صافی اور سیاسی مخلص ہو جائے اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطہ نظر سے کامیابی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں..... وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جزو علم اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اک کٹ کھنا اور جو رواستہ ادا کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور علی شرف الزوال ہو جائے گی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا کبھی امن و چین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالم بشریت کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پر امن ہوتا۔ کیوں کہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں، کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لیے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بننے اور بگڑتے رہتے ہیں، لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقعاتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسنا کی قانون کے دائر میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم و ستم خوب خوب سیکھتے جا رہے ہیں، اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہواؤ ہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے۔ پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی عمودہ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں اور عالم گیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت و خواری فقدان

سیاست سے نہیں بلکہ فقدانِ دیانت کے سبب سے ہے، جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو شخصِ سیاست اس کے دل و دماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلابِ ذہنیت صرف تہذیبِ اخلاق اور تعلیمِ کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعہٴ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم و اخلاق بلا شوکت بے بس کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبولِ عام اختیار نہیں کر سکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعفِ آور صورتِ حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فساد و فحار طبعیتیں جو شوکتِ دین سے دبی رہتی ہیں، ان حالات میں کھل کھلتی ہیں اور اسی استہزاء و تمسخر کی سٹھ سیہ کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ طبقہ جو گنہگار و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقویٰ و تقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو، وہ بھی فوجی کا غلبہ و استیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس بے بس رہ جاتا ہے۔ جن میں سے ضعفاءِ قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آ کر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے۔ غلامی اور محکومی کے منحوس آثارِ رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکتِ غیرے غالب آ جاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت و راست بازی کی کمی نہیں، بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار و مددگار اور زیرِ تشعّب و ملامت ہے۔

مولوی کا غلط مذہب، جذبات، اینٹی ملازم، تکفیر اہل حق، ازالہٴ اثراتِ علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد و شرک، بدعات، محدثات، منکرات و فواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترعیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی، یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے کھول دے اور جب چاہے بند کر دے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدانِ دیانت سے مادی مصائب موت و ہلاکت، طوفانِ زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے، تو یہاں فقدانِ سیاست سے روحانی خطرات الحاد، دہریت بے دینی شرک و بدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم و اخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن و چین کا سانس نہیں لے سکتی۔

اس لئے اسلام نے یدین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنتِ ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافتِ الہی کا جامہ پہنچایا، جس سے دیانت و سیاست کا ایک حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونی سیاست سے ختم ہوگئی اور سیاست کا جو رواج و استبداد دیانت سے پامال ہو گیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے ”الْمُلْكُ وَالِدِينُ تَوَآمَانٌ“ ① ”ملک اور دین دو جزواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے“۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ”بِعِفْثِ مَرْحَمَةٍ وَمَلَحَمَةٍ“ ② (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) ”میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ جو بنا کر بھی۔“

ایک جگہ ارشاد ہے: ”أَنَا الصُّخْرُوكُ الْقِتَالُ“ ③ ”میں بہت ہنس کھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی“۔ ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا: ”لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللَّهِ (أَيِ الدِّينِ) حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ. (أَيِ الْفَيْصَةِ) ④ الْجِهَادُ مَا ضَى إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ. “ ⑤ ”میراث میں ہمیشہ ایک قوم تاقیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی (میری امت میں) جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔“

قرآن نے نبوت کی بھی مدح سرائی کی، جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرمنشا ہے۔ ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَقُومُوا أَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلْ فِيمَكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ يَوْمَ تَكُونُ الْأَعْيُنُ عَلَى اللَّهِ غُلًّا ذَلِكُمْ مَالَكُمْ يَوْمَ تَكُونُ الْأَعْيُنُ عَلَى اللَّهِ غُلًّا ۖ﴾ ⑥

”اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے، یاد کرو جب کہ اللہ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہاں والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔“

دین، سیاسی نظام کی حیثیت میں..... اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں کلمہ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے، ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے، جماعت، سب، طاعت، ہجرت، جہاد۔

اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس، انسانی ذات البین اور قلوب و ارواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات و عبادات، اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے۔ وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا جس سے بین الملکی احوال درست ہوں۔ فتن کا استیصال اور قانون الہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص تعزیرات و کفارات، جہاد اور سد ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔

① علامہ صفائی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ الموضوعات للصفائی، ص: ۱، ص: ۲، ② حلیۃ الاولیاء، الجزء

الرابع، وھب بن منبہ، ج: ۲، ص: ۱۰۵ قال ابو نعیم: هذا حديث غريب من حديث الغوري، تفرد به حسن.

③ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ کسی راہب کی حضور کے متعلق دشمنی کوئی تھی دیکھئے۔ دلائل النبوة لابی نعیم، ج: ۲، ص: ۱۱.

(ومن الانصار في غزوة احد من الدلائل) ④ الصحيح للبخاری، کتاب المناقب، باب سوال المشركين ان يريهم

النبي ﷺ ج: ۱، ص: ۳۶۶. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الغزو مع الامة الجور، ج: ۷، ص: ۶۳.

⑥ ہارہ: ۶، سورة المائدة، الآية: ۲۰.

اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ، مگر اس اور امام بنادیا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری، دیوانی، نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ امامت جنازہ، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا وہیں بمنزلہ باپ اور مربی و استاذ کے بھی ہوگا تا کہ ان کی دیانت و سیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیت اللہ، خوف الہی، طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے، تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑ کر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں۔ اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دینا و آخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی..... بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے، جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات و لذائذ سے الگ کر کے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے۔ ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات، تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھریا، اولاد بنیاد عزیز و اقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر یا الہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کی جاسکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت نام تمام انسانیت بھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو، بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر اداء حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروؤں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا اور اسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی؟

پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہے اور مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب اور سیاست کی یہ تفریق ایسے ہی غلط ہے جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی جنہوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق، تمدنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو، اسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی مدد و معاون خادم ہے۔ ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے۔ البتہ اس سیاست کے معنی سیاست عصریہ کے نہیں، بلکہ سیاست شرعیہ کے

ہیں۔ جس کی بنیاد علم و اخلاق، تقویٰ و طہارات اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق و اعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں۔

یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جاسکتی، ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کی بقاء و استحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں جیسے نبی اسرائیل، وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ، شاذ و نادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانت کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لا کر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی، مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء و ترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے: ﴿الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّهٗمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَآمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِئِهٖ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ① ”یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔“

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض و غایت دیانت کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے۔ جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض و سماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا۔ اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سدا راہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔

علمی فتنہ کا نام فتنہ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنہ شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنہ شبہات جبکہ علم نافع میں خلل ہے، تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا اور فتنہ شہوات جبکہ عمل صالح میں خلل ہے، تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔ اس لئے فتنہ مجموعہ ظلم و جہل ہے اور امانت مجموعہ علم و اخلاق۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد چوں کہ امانت پھیلانا ہے، جس کی راہ میں یہ

فتنہ خلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا اور یہ فتنہ یعنی ظلم و جہل جبکہ انسان میں جہلی تھا، تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شہوات و شہوات سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ و پند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی، پس طاقت و دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق نبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا، تاکہ خلق خدا امن و سکون کے ساتھ اس علم و خلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت و عبادت الہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین زر اور ذاتی اقتدار۔ آج اس کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چوں کہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہذا اسے ملنا چاہیے، یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہئے یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا اقتدار قائم ہونا چاہئے، ورنہ پھر جنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین، دوسری صورت میں زر اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے، جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کی دو ملک آبادی انہیں تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ اسلام کے نقطہ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں، کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطہ زمین، کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خفیس اور بے وزنی ہیں۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے کا اسے حق ہو۔ زمین کے بارے میں ارشاد باری ہے: ﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ﴾ ① ”بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے۔“ یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وارث حصہ پاسکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ ② ”میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔“

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی، یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے، اس کی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے، ذاتی طور پر نہیں۔ مال کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَأَسْوَأُهُمْ مِّنْ مَّالِ اللَّهِ الَّذِي أَنكُم﴾ ③ ”اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا

① پارہ ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۲۸۔ ② پارہ ۱۰، سورۃ البقرۃ، الآیہ: ۳۰۔

③ پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیہ: ۳۳۔

ہے۔ یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے، جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے، ذاتی موجبات سے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَكُمْ﴾ ① ”اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا۔“

یہاں رازقیت اللہ کے لیے ثابت کی گئی ہے جو اس کی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کے دلیل ہے۔

حکومت الہی اسی طرح حکومت و اقتدار اور انتداب کے بارے میں فرمایا گیا کہ۔ ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ ② ”حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔“ اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ ③ ”اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں، کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ مرتع گمراہی میں پڑا۔“

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ اوامر الہی کے بعد بندہ کے چون و چرا اور ”لِمْ وَتَخِيف“ کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنی امر الہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تامل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔

قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت، آمریت، اور اقتدار، حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرما یہ صرف اسی کے حیطہ ملکیت (ملکیتی حدود) میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشا ہو، ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جدوجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر هجوم کریں گے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجبہاد چنانچہ قرن اول (پہلی صدی) کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ورنہ اعلان جنگ ہے، بلکہ کسی رقبہ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کرلو۔ یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعہ دیانت و سیاست اور چشمہ علم و اخلاق ہے، یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کرلو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الہی کے اقتدار کے نیچے آ جاؤ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب و

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۳۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۴۰۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶۔

سلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدا کی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کر لو اور اپنے ملک میں آباد رہو۔ ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الہی سے مکمل بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے تابان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض و غایت..... پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اس کے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا، خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دینا سے منوانا، اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

﴿لَتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ ①

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد، اشاعت دین الہی، اقامت حکومت الہی، حفاظت نظام الہی سے دنیا کی کون سی دانشمند قوم اعراض کر سکتی ہے۔ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساس مقاصد ہے۔ گریز اگر ہو سکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے جبکہ انسان، انسان اور اقوام، اقوام سب برابر ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے یا اسے غلام بنانے کے منصوبے کاٹھے۔ لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کر کے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی۔ بلکہ صرف اس لیے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو، اسے ملک گیری اور طمع جاہ و جلال سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ وہ ہزار ملک فتح کر کے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زور و جواہر نہیں بلکہ زہد و تقاضت سے دنیا کو ہمکنار کرنا ہے۔ اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے۔

تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع و فساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔

ایک لمحہ غور و فکر..... اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت، قومی اقتدار یا کسی خاص خطہ زمین پر مخصوص انتداب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لے کر کھڑے ہوں گے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی مقاصد نہ ہوں، وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان و تسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پرسکون ہو جاتا ہے اور خود

① الصصحیح للبخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب من قاتل لکون کلمۃ اللہ... ج: ۱، ص: ۶۲ (الطاف سنن).

مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرن اول کا تھا۔ یعنی قانون الہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت، اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں۔
تعلیم احکام، تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنی اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعویٰ میں معنی بھی پیدا ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آ جائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد..... میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قوی انحطاط و تنزل یا اقدامات میں جس قدر بھی ناکامی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے۔ یعنی ناکامی، یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تحت یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعد (جوان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا) مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں، پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے، پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زبردستی کے ایام آنے لگے۔

یہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی، یا رہی تو راہ مقصود نا معلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت نہ رہی، اور یا وہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض ان تینوں عنصروں علمی قوت، اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال..... تفصیلات کا موقع نہیں، لیکن اصولی طور پر اب اس کے مان لینے میں کوئی تاثر نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی باگ دوڑ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتاویٰ عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا۔ تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جہالت، ناتربیتی اور بد نظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ..... ۱۲۳۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اٹھے بڑھے اور شہید بھی ہو گئے۔ مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔
حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ..... ۱۸۵۷ء میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر پڑ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی، نا تجربہ کاری اور ناتیار سازی سامنے آئی۔ ملک تعلیم و تربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ..... ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کھل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم و تہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردہ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن و مصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلابات کے تحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم و اخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریریں عمل..... اس سے انکار نہیں کہ جذبات و عواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے۔ رفتار زمانہ نے انہیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں۔ لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزن فی شروع نہ کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انہی عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے، مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی: تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوہ حسنہ۔ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اشاعت دین الہی، اقامت حکومت الہی، تنظیم حیات انسانی۔

اشاعت دین الہی

تعلیم: اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔ جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں۔ یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔ کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔ اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھ کر مسلمان نونہالوں کو کتاب و سنت اور اس کے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کر سکیں۔

قاسمی علوم اور فلسفہ: میں اس میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھ کر نئی ضروریات نظر انداز نہ کی جائیں اور انہیں سامنے رکھ کر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔ صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اتر سکیں۔

مرکز علوم دارالعلوم دیوبند: ہم اپنے تجربہ اور سالہا سال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلادیا گیا ہو۔ اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللہ کی حکمتوں کا انچوڑ اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے، تو یہ اس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ یہ فکر شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چل کر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے۔ اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند ہے۔ ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجت اللہ البالغہ اور تقریر دل پذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

مستقبل کا تعلیمی پروگرام: اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم سیاست، مبادیات سائنس، سیاسیات حال کے اصول، اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تاکہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے ان پر رائے زنی کر سکیں۔

بہر حال یہ کام مدارس کا ہے۔ قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

مسجدی تعلیم..... مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارس تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے مدارس تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔ اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے، ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں میں ہوں، بلکہ دیہات میں بھی جا بجا قائم ہونے ضروری ہیں۔ مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کر دیں جن میں قرآنی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخل درس کر دیئے جائیں، جو ضروریات دین، عقائد و فرائض، اخلاقیات، معاملات و معاشرت اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں۔

درس قرآن..... بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن عوام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے۔ جس میں قرآن کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بے ذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بہ موقعہ بیان کئے جائیں تاکہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہ جائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

تبلیغ..... لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب و مساجد کی، بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لے کر جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لے کر نکلیں اور لوگوں کے کانوں تک کلمہ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں۔ جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے۔

تبلیغ ایک اجتماعی موثر کی حیثیت میں..... تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت و اکثریت کا فیصلہ کیا ہے۔ مکہ میں کلیت کفار کی تھی، تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی، پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی۔ مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی۔ ابتداء جمرہ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی، پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت۔ یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت و اکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اس کا حل کر دیا۔

ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہو گئی۔ غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر و اشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان، مسلم و غیر مسلم

کشاکشی سے نجات پاگئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھیں بند کر لی گئیں۔ جو تبلیغ سے ممکن تھیں، وہیں یہ کشاکش قائم ہے۔

مسلم سلاطین کا قصور..... اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت و اکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنہوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں۔ بلکہ باہم مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

نقطہ اتحاد..... بہر حال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئے گا۔ اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے لے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور مل کر متحدہ عمل شروع کر دیں۔ بہر حال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہے جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا، تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تہمید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انہیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کر دیا جائے، جو آئندہ دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈال دے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ ان کی تبلیغ میں موثر ہوں گی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزو اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ: ﴿وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجُورِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ① ”اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے۔“

اس کے لئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سکھ سکیں۔ جن کی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اصول پر قائم کیا جائے اور اس کی تدریجی آمدنی میں اس کی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اس اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے، جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانے پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے۔ تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بن جائے گی۔

طریق تبلیغ..... تبلیغ میں اسی اسوہ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اسے اصولاً پیش کیا یعنی تبلیغ الاقرب فالاقرب (جو قریب سے قریب تر ہو) کے قاعدہ سے ہو۔ اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے پھر اپنے اہل بیت کو، پھر اہل قربت کو، پھر اہل شہر کو، پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔

یہ صورت حال اس طرح ہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی

تذریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تذریجی رفتار تبلیغ قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنا دے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہئے بلکہ خاموش طریقہ پر عملی شکل میں۔

تذکیر..... اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاد دہانی کریں۔ موعظت و نصیحت کا بازار گرم ہو کہ ﴿وَذَكِّرْ لَهُ أَنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ①
”بار بار یاد دہانی کرو۔ کیوں کہ یاد دہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے۔“

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی، مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہر صورت اس میں ایک جزو اہم اور لازمی رکھا جائے اور وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر کرنا اور ان کی شان دار روایات سلف سے انہیں آشنا بنانا جس کا مرکز و محور سیرت مقدسہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو صورتیں ان کے دل و دماغ اور رگوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی اور ان میں آگے بڑھنے کا دلولہ خود بخود ابھر جائے گا۔ بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزو جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم و تبلیغ اور درس و تذکیر میں سکھایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ: ”دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا“ اور ”دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں“؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی، جن پر قابو پالینے کا راستہ بہ سہولت سامنے آ سکے گا۔

عسکریت..... ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس و مکاتب وغیرہ میں ایک اہم جزو کی اشاعت و ترویج بلکہ عملی مشق و ریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے۔ مگر جسے آج کے عیش افزہ تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے ست اور مضحک بنا دیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گد کا اور بوٹ وغیرہ کھلائے جانے کی ضرورت ہے، وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کما حقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ آج کل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈال کر صلح و جنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے۔ اس لئے

نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کون سا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا نشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر مسلمانوں کو ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا دفعیہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر ضرورت استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی

ضرورت ہے۔ وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہو سکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہو سکتی ہے، جس کی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے۔ یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے جس سے قرآنی نظریات امت میں پھیل سکتے ہیں۔ لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہے۔

تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم..... اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں، اگر یہ طاقت مضحکہ منجھل ہو تو علم بلا عمل کیا کارآمد ہو سکتا ہے؟ اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لا سکتے ہیں، جبکہ ان کے اپنے قلوب مرکی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تبلیغ، اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق و عفاف، للہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھ کر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے۔ آپ کا یہ سندھ، ہندوستان میں اسلام لانے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر..... مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گزرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ”یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔“ اس لئے اشاعت دین الہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیات میں سے غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی دفع ہو جائے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا أَمَانًا بِأَنفُسِهِمْ﴾ ① ”خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدلے۔“

خانقاہیں..... پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنی اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ و ریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند، عامۃً دوکانداری کے اصول پر قائم ہو گئی ہیں۔ رسی گدیاں ہیں جن میں مریدوں سے تحصیل وصول (چندہ) کے سوا کسی تربیت کا کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان کے نذرانے بدستور قائم رکھ کر کہ بہر حال ان کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے

خطبات مجسم الاسلام — اشاعت دین الہی

کہ ان کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں۔ جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو نہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت و ارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں۔ ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ و استغفار کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح اپنا شعار بنائیں۔ اپنے اعمال کا تفقہ اور نفوس کا محاسبہ کریں۔

علاوہ ازیں اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے۔ ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ و جلال کی ہوس، نفاق و مصلحت اور چالو سیوں کی خوئے بد نے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اسلامی فریضہ ہے لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقہ اور تحفظ کرے، جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا رہے۔ خلاف شریعت امور دیکھ کر صبر نہ کرے بلکہ پیار و محبت سے نصیحت کرے اور مخاطب کے دل کی راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزو اصلاح اخلاق ہے، ورنہ اس کی سیاست بھی اپنے حقیقی نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں (مصلح) نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد و اخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جدا گانہ بات ہے کہ انہوں نے طریق اصلاح میں الہام کی بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے۔ پس سیاسی مساعی میں تہذیب نفس سے چارم کار انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

خلاصہ نقاط بحث اور قرآن حکیم..... بہر حال یہ ضروری شعبہ اشاعت دین الہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جن کی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔

قرآن نے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ سے تعلیم کی ضرورت ﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾ سے تبلیغ کی ضرورت ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ يَتَذَكَّرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ① سے تذکیر کی ضرورت اور ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ② سے تعلیم و تربیت کی ضرورت اور ﴿وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ﴾ ③ اور ﴿يَعْمَلُونَ لَكَ مَا يَشَاءُونَ مِنْ مَّخَارِبٍ وَتَمَاثِيلٍ وَجِفَانٍ﴾ ④ سے تعلیم صنعت و حرفت کی ضرورت جو آج کی سائنس کا عملی موضوع ہے۔ ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ⑤ سے تصفیہ باطن کی ضرورت ﴿وَأُمرُّ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنَّهُ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ⑥ سے غریبوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت اور حدیث (الَّذِينَ النَّصِيحَةُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ) ⑦ سے جزئی روک

① ہارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵، ② ہارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۶۰، ③ ہارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء،

الآیۃ: ۸۰، ④ ہارہ: ۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳، ⑤ ہارہ: ۲۸، سورۃ الجمعة، الآیۃ: ۲، ⑥ ہارہ: ۲۱، سورۃ لقمان،

الآیۃ: ۱۷، ⑦ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ الذین النصیحة للہ وللرسول، ج: ۱، ص: ۲۵.

ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کھلے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے، جس پر صرف عمل ہی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ پروگرام بنانا یا موجود ہے، ہاں پروگرام کے لئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تاکہ قلوب کے لئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عملی دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الہی..... سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف وہی کر سکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو۔ اس لئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک پر جمع ہو جائیں کہ تو حید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت تو حید اعتقادی یا تو حید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کے لئے اپنا مرنا اور جینا متعین کر لے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔ ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہے گی۔ کیوں کہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی واحد ذات، اسی کے واحد کلام، اسی کے واحد کعبہ، اسی کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی، اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریت پر ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الہی پر جمنا، حکومت الہی کا پہلا قدم ہوگا۔ جس کے بغیر اقامت حکومت الہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الہی ”کتاب اللہ“ کی پیروی اور اخلاق الہی سے متعلق (اخلاق یافتہ) ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الہی کا دوسرا قدم ہے۔ کیوں کہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو، اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہو سکتی اور نہ ہر شعبہ زندگی میں وہ مشعل راہی بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ پھر اپنی خصوصیات اور منازعات میں اس کو حکم بنانا حکومت الہی کا تیسرا قدم ہے۔ جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محکمہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو۔ ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو، ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کر دے۔ اس حکم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنادیا ہو، آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچھری کی پادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ ہم مسائل جو قوت کے بغیر طے نہ ہو سکیں، گورنمنٹ سے محکمہ قضا کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ حکومت الہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الہی اور قانون الہی..... کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الہی کو جو حکمت الہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح و طلاق تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ اپنے گھر بار، جائیداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی سلسلوں میں بھی اس مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اس کے بالمقابل رواج

کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الہی کے ادعاء کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع و رغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون الہی سے بغاوت نہ رکھا جائے۔ پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو، وہ حکومت الہی کے عنوان کی دعویٰ رکس منہ سے ہو سکتی ہے؟

حکومت الہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں۔ ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جاسکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکھ رواں ہو۔ مگر

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد

حفاظت نظام زندگی..... ”آزادی“ اس نصب العین (حکومت الہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے۔ سو اس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبہ آزادی ہے، جو دلوں کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیوں کہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ جذبہ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رسی ماحول کے اثرات سے آزاد کر دینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت الہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ ساری آزادیاں اس میں پنہاں ہیں۔ آزادی ضمیر اس کا پہلا قدم ہے کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ رَسُولَ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ، وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا.﴾ ①
﴿لَا يَخْشَوْنَ لَوْمَةً لَّا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ ② ”یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ یہ سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے، پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔ (دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں)۔“ ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ ③ ”کفار پر سخت اور آپس میں مہربان۔“

بہر حال صلہ رحمی، تعاون باہمی، ایثار مروت، ہمدردی و محبت، غریبوں کی مدد، چھوٹوں پر رحمت، بڑوں کی توقیر، علماء سے حیا، ربانیوں کی تعظیم، اطعام طعام، تحیہ و سلام، عبادت الہی، شفقت علی الخلق، پڑوسیوں کی خبر گیری، یتامی و مساکین کی اعانت، بیماروں کی عیادت، جنازوں کی مشایعت، مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی بیخ کنی، اداء حقوق، دفع مظالم، سادگی بے تکلفی، قناعت و زہد، حب آخرت، طلب حق، انصاف و حق پرستی، امت مرحومہ کے

① ہارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۹، ② ہارہ: ۲، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۵۴،

③ ہارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹،

جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ، وہ ابواب ہیں جو اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی و تنظیم ہے۔

اس اسوۂ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کا فور ہو جاتی ہے۔ آزادی مذہب، آزادی ضمیر اور آزادی علم و عمل حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امت ہی ہو سکتے ہیں اپنی جماعتی قوت سے امت کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لا کر با آسانی کر سکتے ہیں، کہ وہ اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں ”اشاعت دین الہی“ اور ”اقامت حکومت الہی“ کی عرض کردہ دفعات شامل کر لی جائیں تو قوم اسی طرح عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرون اولیٰ میں پہنچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے ۱۹۱۹ء جب سے تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور ان پر عمل درآمد ہوا، جمعیت العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی راہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اس کے رابع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیت علماء ہند کے پچیس سال اس دوران آج تک کون سی تحریک ہے جس میں جمعیت علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چانگام سے لے کر سرحد یا پختونستان تک پہنچا دیا۔ جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ چلایا۔ جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی۔ جس نے شہر کی تحریک سنگھٹن کے ہنگاموں نہر و رپورٹ کی بے انصافیوں اور ساردا بل کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا؟ کیا وہ جماعت جمعیت علماء ہندی کی نہ تھی؟

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی، اس کا نصب العین مستقل، اس کا نظام عمل مستقل تھا۔ اس لئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھ کر اس نے رائے قائم کی۔ کسی ادارے سے اس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہو سکتی ہے۔ جو اصول شریعہ پر پوری اترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے۔ جو اس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اس پرواز پر اس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کا میاب کام کیا اور اب بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اس کے

کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جارہی ہیں۔

بہر حال جمعیت العلماء کوئی آج کی جمعیت نہیں ہے۔ اس کی تشکیلات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کا قوام آج کے سارے سیاسی اداروں سے قدیم ہے۔

جمعیت علماء ہند تاریخ کے آئینے میں جمعیت علماء ہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز شاداب درخت کی مانند ہے، جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو ”بعون اللہ“ حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعت کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالا کوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا اور شہادت کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی۔ اسی جماعت کے اکابر تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آتشیں کے موقع پر اپنے سوز سے آپ پکھل گئے۔ خانماں برباد ہوئے اور اس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔ کیوں کہ ماضی و حال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بزرگان دیوبند حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے جہوم میں ہم بالا کوٹ کے اس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جہاں خاندان ولی الہی کی چشم و چراغ چند جانباز ہستیاں رداء شہادت اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہو سکتی ہیں، جہاں حجت الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جاسکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے دوچار رہے۔ نہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جاسکتی ہے۔ جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گزاری اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیت علماء ہند کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۳ء کے مجاہدین ۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم و عمل میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا حبیب اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگاریں ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر گواہ ہے۔ آپ حضرات کا ناز پروردہ دل کو شیوں میں بیٹھ کر ان مصائب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو مدوح نے سرحد افغانستان سے لے کر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے منگیزیوں پر سر رکھ کر اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج بھی کابل میں اپنی جلا وطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونے کی امید میں گزار رہے ہیں۔ انہوں نے جواز، افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا۔ روس کا انقلاب ماسکو پہنچ کر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ

انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لمحہ اس ساری سیاست کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علماء کے وجود کو ختم کر دینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ..... حضرت شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں اور آپ کے قلوب ان کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نئی تال جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت محترم اس وقت جمعیت العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلہ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔

حضرت ممدوح اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہ مہاجر کی کے مجاز، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ ان کے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبہ اخلاص و ایثار سے ان کے مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ..... اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں، حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم و تدبیر کا روشن مینار ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم ان کی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پالیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیت علماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقع ہے اور زمانہ ان کی خدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہر حال جمعیت علماء کی رسی اور غیر رسی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتداء حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہر حال جمعیت علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اسی ساعت سے آزادی کے لئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی، گو اس کی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب جدا جدا رہے۔ آج کے دور میں اس کی وہی جدوجہد عسکری رنگ کی بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیت العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کر دوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیت کے سامنے پیش کرنے کے لئے۔ تاکہ ذمہ داران جمعیت اس پر غور و فکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ..... اشاعت دین الہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص، تعلیم عوام اور شہر و

دیہات میں اس کی ہمہ گیری، درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سہ گری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ، مسئلہ تذکیر و معظمت، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الہی کی تنفیذ۔ فصل خصوصیات محکمہ قضاء شرع، حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوہ حسنہ، توحید مطلب، عام شعبہ ایمان کی عملی ترویج جس سے بد نظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زامانہ لائے گا، لیکن اس کو چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے ہا ہی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگرام کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں، جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی پلیٹ میں لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسری انسان کی رائے کا تراجم ممکن ہے۔ لیکن الہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے، اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الہی پروگرام کو رکھا ہے۔ اس نے تمام بنیادی ازم مثلاً نیشنلزم، فاشیزم، کمیونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے، جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں، قومیں سب برابر تھیں، اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان، انسان سب برابر تھے۔ پھر ان میں حاکم و محکوم کی تفریق کیسی؟ اور اگر کی جاتی تو وہ نوع و رعیت سے چل کیسے سکتی تھی۔ بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الہی کا اعلان کر دیا، جس کا قانون اسلام اور عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعہ اتحاد مسلمانوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟

اس لئے اگر مسلمان خلوص دل سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوتوں کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں اور اختراعی اور دل آفریں نصب العین سامنے لا لاکر ان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کے چلانے کے لئے بہر حال جماعت اور اس کے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیت العلماء پر۔

کانگریس اور لیگ..... کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا، اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسلمانوں اور سوریہ ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اس کو پھل پھول گئے۔ گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر متعین آزادی کے سوانیزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت

مالویہ اور سوامی شردھانند نے اسے فرقہ پرستی کے بحرِ عظمت میں لے جا کر غرق کر دیا۔

کانگریس کی تاسیس..... کانگریس کا قیام درحقیقت ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا، حکومتِ برطانیہ دولتِ عظمیٰ بننا چاہتی تھی اور اسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی، جو ہندوستان کے انقلابی رجحانات کا رخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کر دے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا۔ چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز) چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہو گئی اور کانگریس ۱۹۱۲ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی۔

کانگریس ۱۹۱۶ء میں..... ۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اسے زندگی کا نصب العین دیا اور آزادی کا پر جوش دلولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے کٹن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہہ دیا جانا بے جا نہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس کے موجود کا کمال تھا کہ اس کے دونوں پلے نصف صدی گزارنے اور سو بار پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہے اس کی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلے میں جو نام پیدا کیا، مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں، مگر کما حقہ پھلوں کی فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ..... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست و گریبان ہے۔ یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجود بھی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلے میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں مخالف ہوا کے جھوکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں، دوسروں کے لئے اپنا پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہ جاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جس میں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ آج یہ جھولا پاکستان پر آ کر رکھا ہوا ہے۔

مسئلہ پاکستان..... ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے الہام نہیں ہے۔

دنیا میں جب کوئی اسکیم ابھرتی ہے تو اس کو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کر دیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم لیگی خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں، جن کا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے۔ لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر متعین تصور ہے۔ جس کی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔

تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کروں گا کہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اس کی تمام دفعات واضح کر دیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسے غور و بحث کے لئے پیش کر دیں۔ تاکہ جن مسلمانان ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے، وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

مخالفین پاکستان ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کروں گا کہ جب کہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفلکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نا اتفاقی اور اختلاف ہے۔ جب تک تمام ہندوستان متحد نہ ہو جائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا اصول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کر سکیں۔ اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انہیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کر لینا چاہئے، فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائے گا اور اسے چلتا ہوا دیکھ کر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے نیچے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں، اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائے گا۔ محض آپ کے مان لینے سے اس کی کوئی ہستی قائم نہیں ہو جائے گی۔ جب تک کہ خود اس کی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔

بہر حال یا اس کی توضیح و تشریح سامنے آئے تاکہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جاسکے اور یا اس کے ابہام و اجمال کے باوجود اس کی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کر کے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تاکہ منزل مقصود سامنے آئے اور اس کی حقیقت کو خود کھولنے کی بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھل کر یا دنیا کی سر آنکھوں پر آ جائے یا اس کے قدموں سے پامال ہو جائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ، سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر عرض کروں گا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان

ہی عائد ہوگی۔ کیوں کہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض ان کی خاطر یا بوجہ الاتحاد قبول کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع و ضرر کے وہ ہی ذمہ دار ہو سکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کر دیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بناء پر پھر بھی ذمہ داری انہیں پر ہے، جو نہ اسے واضح کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے کھلی منڈی میں کھول کر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس کی صحت و سقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کر لے تو پھر بلاشبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے جس کا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہو سکے گا۔ ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھول دینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور و فکر کر لیں، مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھ کر۔

لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہو جائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے۔ بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول و عدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے جس کو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کر سکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم اس لئے ناگزیر طریقہ پر اس شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کر سکتی ہے جو مسلم اقوام کی اسلامی تعمیر کی لائنوں سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے۔ جس نے اس وقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی راہنمائی کی، جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس لئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے تو سیاسی جہاد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیت العلماء کے اور کون ہے جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اس لئے بھی کہ تجربہ اور عمل پیہم اس کے ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب و سنت کے سوا اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہو سکتا اور کتاب و سنت کے صحیح علم کے لئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزاجہ (حقیر کوشش) کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں۔ کہ وہ اس کے کھرے کھولے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو ان عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کر دے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کر سکتی ہے۔ اس نے اب تک جس طرح دفاع ملی کی زیریں خدمات انجام دی ہیں، جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی مخفی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اب بلحاظ وقت و مصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیت علماء ہند کی قدرو قیمت ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب و سنت کے اصول پر ہو

اور پھر اسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کی جائے۔ بلاشبہ ان عظیمیات کے سلسلہ میں موانع، دوائی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پر حوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے هجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للہیت و بے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھ کر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں۔ یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند، کوسندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیا خبر ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہوا اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ ﴿وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ﴾

آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل و عقد نے مجھ تاجیز کو اس کا موقع دیا کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں مددوائے امت کا علمی میدان۔ یہ محض ان کی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرہ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آ رہا ہے۔

گداہ تخت نشانند و بادشاہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص و للہیت سے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

﴿لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَذٰلِكَ لَمَّا آتٰكُمْ عَلَيْهِ وَیَوْمَ یُزْجَعُونَ اِلَیْهِ لَیُبْتَبِّهَنَّہُمْ بِمَا عَمِلُوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ①

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء

مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو ”اسلامی معاشرت“ ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے سارے مل کر اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر۔ اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں، مگر اس قانون پر آج نہیں آسکتی۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا.

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿۱﴾ أَفْغَيَّرَ اللّٰهُ أَنْتَبَعِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمْ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ﴿۲﴾. صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ

حسن مقام..... بزرگان محترم! آپ کے اس عظیم الشان شہر میں جو اپنے حسن و خوبصورتی، فضا کی وسعت، آب و ہوا کے اعتدال اور مناظر کی خوبی کے لحاظ سے ہندوستان کے شہروں میں ایک ممتاز ترین شہر ہے اس کی طرف قدرتی طور پر قلوب اور طبائع کی کشش ہوتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر میں وزارت عظمیٰ سے ریٹائرڈ ہوا تو بنگلور میں جا کر قیام کروں گا، اس سے بہتر ہندوستان میں دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہر حال یہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک ممتاز شہر ہے۔

مرکز جہاد و شہادت..... سلطان ٹیپو کا یہ وطن ہے، ان کے مجاہدانہ کارناموں کا یہ مرکز رہا ہے۔ ان کی شہادت اسی مقام پر ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک سلطان وقت کی شہادت تنہا ایک کی شہادت نہیں ہوتی، معلوم نہیں کتنے

افراد کو انہوں نے جام شہادت پلایا ہوگا اور کتنے لوگ یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ ان ہی شہداء کی اولاد آپ ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے جذبات آپ کے اندر نہ ہوں۔

وہ دلولہ، وہ جوش جہاد، وہ شہادت کا ذوق آبائی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے خواہ آپ کو احساس نہ ہو ”الولد سر لایبہ“ باپ کے جذبات ہوتے ہیں وہ قدرتی طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ تو اپنی معنویت کے لحاظ سے یہ زمین جوش اور جذبہ اور دینی دلولہ بھی رکھتی ہے۔

اکرام ضیف اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہم لوگوں کے سامنے آئی وہ آپ کے اخلاق کی وسعت ہے۔ ہم لوگ حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ مہمانوں کی مدارات میں، ضیافت میں، اکرام اور توقیر میں یہاں کے لوگوں نے جو جذبہ دکھلایا ہے، وہ ایک ممتاز قسم کا جذبہ ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ﴿مَنْ كَانُ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ﴾ ① ”جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے۔“ اس تعلیم نبوت کے ماتحت آپ نے مدارات میں انتہاء کی خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کی خوبی کے ساتھ، مہمانوں کا قیام، ان کی آمد، ان کی توقیر، یہ ایک ممتاز صورت رہی ہے۔

یہاں اس سے بھی بڑھ کر عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ آنے والوں کا آپ شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں اور محض ظاہر داری کے طور پر نہیں بلکہ دلوں کے جذبہ سے حضرت مولانا ابوالسعود صاحب جو صدر استقبالیہ ہیں، انہوں نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے بھرپور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ تو حیرت یہ ہے کہ مالی قربانیاں آپ نے دیں، جانی محنت آپ نے کی، مہمانوں کو راحت پہنچانے میں انتہاء آپ نے کی۔ اوپر سے شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں یہ عالی ظرفی اور قدر شناسی کی انتہاء ہے کہ آدمی سب کچھ کرے اور پھر یہ کہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ بادل وہ ہے جو برسے اور گرماوے یعنی برس کر گر ماتا ہے کہ وہ پھر آبادہ ہے برسنے پر، اس کا جذبہ یہی ہے کہ میں مخلوق کو پانی دوں اور حیات بہم پہنچاؤں، دوسرا مصرعہ ہے کہ نخی وہ ہے جو دیوے اور شرماوے تو سب کچھ دے رہے ہیں اور شرما بھی رہے ہیں۔ ندامت کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے۔ لیکن ہمارا فریضہ بھی آپ ہی نے ادا کر دیا اب ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیا چیز ادا کریں اور ادا کریں بھی تو واقعہ یہ ہے کہ جتنے جامع طریق پر آپ نے مہمان داری فرمائی، جلسہ کو کامیاب بنایا ہمارے پاس الفاظ اتنے جامع نہیں ہیں کہ جو حاوی ہو جاویں آپ کے شکریہ کے اوپر۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر لیکن شکریہ کا ایسا طریقہ کیا ہو کہ جب انعام اور نعمت تو ہو بے انتہاء اور شکریہ کے الفاظ ہوں محدود۔ ایسے موقع کے لئے خود شریعت نے ہمیں بتلادیا کہ لا محمد و شکر یہ کس طرح ادا کر دیں۔

ایک طریقہ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بتلایا۔ حق تعالیٰ نے جب ارشاد فرمایا: ﴿اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ

شُکْرًا ① ”اے داؤد! میری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔“ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حقائق الہیہ کی جو سمجھ اور فہم انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں دی جاتی۔ بلکہ جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب ان کی ہی جوتیوں کے صدقے سے آتی ہیں اور ان ہی کی برکات سے آتی ہیں۔ تو داؤد علیہم السلام کو حکم دیا گیا کہ میرا شکر ادا کرو۔ انہوں نے عرض کیا، یا اللہ! کس طرح ادا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ جب ہی تو شکر ادا کر سکوں گا۔ اس کی طاقت بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق دینا، طاقت دینا خود ایک مستقل نعمت ہوگئی پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت پہلے نکل آئی، پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ تو ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں عاجز ہوں کہ شروع کس طرح سے کروں شکریہ کو اور ادا کس طرح سے کروں۔ ہر شکر سے پہلے ایک شکر اور ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو میں عاجز ہوں شکر ادا کرنے سے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اے داؤد! جب تم نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور تم شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے، کوں ہے جو شکر کا حق ادا کر سکے۔ ②

نعمتیں لامحدود اور شکر ہمارا محدود، طاقتیں ہماری محدود، ممکن نہیں کہ اللہ کا شکر کا حق ادا کر سکیں۔ اس لئے صورت یہی ہے کہ اپنے عجز کا اظہار کرے اور اپنے قصور کا اعتراف کر لے کہ بھائی ہم شکر کو ادا نہیں کر سکتے، تو یہی ادائیگی شکر ہے۔ یہ تو طریقہ داؤدی ہے جو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب شکر بہت سال لازم ہو جائے اور ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو اعتراف کو لو عجز کا کہ بھائی اعا جہ ہیں۔ نہیں ادا کر سکتے شکر کو، یہی شکر کا قائم مقام ہو جائے گا۔ طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ایک طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر نعمتیں لامحدود ہوں تو تم بھی لامحدود شکریہ ادا کرو۔ مگر بندہ ہے محدود، وہ لامحدود شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ تو الفاظ ایسے ارشاد فرمائے کہ وہ لفظ اس شکر کو لامحدود بنادیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور شکر ادا کیا کہ:

”اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ ذَوَامِكَ“ ”اے اللہ! تیرے لئے حمد ہے اور دائمی ہے جب تک کہ تو دائم ہے“ اور تیرے دوام کی کوئی حد نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی حد نہیں۔ اور فرمایا کہ: ”وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَعَ خُلُودِكَ“ ③ (الحديث) ”اور تیرے لئے حمد ہے جب تک کہ تو رہنے والا ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے“ ”تو میری حمد بھی ہمیشہ رہے گی تیرے ساتھ۔ اور فرمایا کہ: ”وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَهٰی لَهٗ ذُوْنَ مَشِيْئِكَ“۔ ”اور تیرے لئے حمد ہے ایسی حمد جو تیری مشیت کے ساتھ ساتھ چلے۔“ اور تیری مشیت کی کوئی

① پارہ ۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳۔ ② تفسیر روح المعانی، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳، ج: ۱۶، ص: ۲۷۳۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسماء محمد، ج: ۱۲، ص: ۲۷۳۔

انہما نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی انتہاء نہیں۔ تو آدمی جب پوری حمد اور پورا شکر ادا نہ کر سکے، تو اعترافِ عجز کے بعد یہ بھی کہہ دے کہ یہ حمد دوائی ہے، تو اللہ ان لفظوں کو ہی دوائی بنا دیتے ہیں اور وہ شکر بھی دوائی بن جاتا ہے۔

اظہارِ تشکر..... اس لئے کہ اگر ہم آپ لوگوں کا اس مہمانداری پر شکریہ ادا کریں اس لیاقت پر اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے پر، تو ایک تو یہ عرض کریں گے کہ ہم عاجز ہیں آپ کا شکر ادا کرنے سے۔ یہ تو ہے سنتِ داؤدی علیہ السلام اور ایک یہ عرض کریں گے کہ جب تک آپ باقی ہیں، آپ کی تسلیں باقی ہیں ہمارا شکریہ آپ کے ساتھ ہے، تو یہ دوائی شکر ہو گیا۔ اپنی طرف سے عجز کا اظہار بھی ہے اور دوائی شکر یہ بھی ہے۔ پھر ان شاء اللہ دوائی طور پر ساتھ بھی رہے گا۔

پرسنل لاء کا مفہوم..... بہر حال اس عظیم الشان شہر میں جس کے اندر غاہری اور باطنی خصوصیات ہیں، جس کے باشندوں کے اندر اخلاقی بلندیاں ہیں، اس عظیم الشان پنڈال میں یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ جس کا موضوع ہے مسلم پرسنل لاء، یہ جلسہ ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کا میں ابھی اپنے بزرگوں سے پوچھ رہا تھا کہ پرسنل کے حقیقی معنی کیا ہے؟ اس لئے کہ لفظ انگریزی کا ہے، ہم تو پوری طرح انگریزی جانتے نہیں۔

تو میں نے تحقیق کی کہ پرسنل کے معنی کیا ہیں۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ مخصوص قانون جو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو، اسے پرسنل لاء کہتے ہیں۔ مگر کہا یہ گیا کہ پرسنل کے معنی ذاتی کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذاتی قانون، مسلمانوں کا شخصی قانون۔ ان کے احوالِ شخصہ کے بارے میں مذہبی ہدایات پر مبنی قانون اس میں ذاتی قانون آجاتا ہے، ذاتی احوال و احوال کے متعلق بھی باتیں آجاتی ہیں۔ خاندانی اور عائلی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ نکاح ہو، طلاق ہو، بہہ ہو، میراث ہو، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں تو مسلم پرسنل لاء کے معنی یہ لکھے کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ذاتی قوانین، خاندانی اور عائلی قوانین یہ ہیں جن کا تحفظ آپ کو مقصود ہے۔ یہ مسلمانوں کا قانون کہا جاتا ہے۔

دنیاۓ انسانیت کا قانون..... لیکن میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون ہی نہیں۔ قانون درحقیقت اسلام کا ہے، مسلم قوم کا کوئی قانون ہی نہیں، جو مان لے۔ اس کا نام مسلم ہے۔ جو نہ مانے اس کا نام غیر مسلم ہے۔ لیکن قانون خود مسلمانوں کا شخصی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی قانون وضع کیا ہے نہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ قانون اسلام کا ہے اور اسلام کا قانون پوری دنیاۓ انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی مخصوص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ آپ کا قانون نہیں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کا قانون ہے۔ ان لفظوں سے کہ ”مسلمانوں کا قانون“ ایک تعصب اور ایک حد بندی چھپتی ہے۔ تو غیر مسلم کہے گا کہ مجھے اس سے کیا تعلق یہ تو مسلمان کا قانون ہے۔ اس سے تعصب چلے گا، وہ غور کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا۔ چوں کہ مسلمانوں کا قانون ہے میرا قانون نہیں۔ مجھے اس پر غور و فکر کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ مسلم قوم کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون نہیں، وہ تو خدا کا قانون ہے جیسے ہمارے لئے آیا ہے تمہارے لئے بھی آیا ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثَ إِلَى

النَّاسُ كَافَّةً“ ① ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ کسی پیغمبر کا دائرہ عمل خاندان ہوتا تھا جیسے نبی اسرائیل کے انبیاء کہ وہ بنی اسرائیل کے خاندان کے لئے آتے تھے۔ غیر اسرائیلی سے انہیں تعلق نہیں تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ”میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں، باقی دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں نہ اور قوموں سے میری غرض ہے میں تو اسرائیلیوں کی اصلاح کے لئے آیا ہوں“۔ تو بعض انبیاء تو خاندان کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے اور بعض انبیاء وطنوں کی اصلاح کے لئے بھیجا کہ حضرت یونس علیہ السلام، کہ چار شہروں کی اصلاح ان کے سپرد فرمائی تھی۔ تو ”كَانَ النَّبِيُّ يُعْتَصِلُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً“

ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ”وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً“ ”میں دنیا کی تمام اقوام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں“۔ اسی واسطے قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاں عبادت عامہ کی ہدایت فرمائی یا ایمان لانے کی ہدایت فرمائی، تو اس جگہ انسانوں کا لفظ استعمال فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ ② ”اے دنیا کے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو“۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ ③ ”اے دنیا کے انسانو! جو آج موجود ہیں یا آئندہ جو تمہاری نسلیں آئیں گی ان سب کے لئے میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں“۔ تو آپ علیہ السلام کسی خاص نسل خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، کسی خاص وطن کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آئے ہیں۔

بنائے تعصب..... اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو تعصبات ہیں اس کا مبنی یہی ہے کہ ان کا دین و مذہب ہی اس قوم کے لئے مخصوص ہو کر آیا ہے۔ تو وہی خاندان اپنے دین کو لئے بیٹھا رہا ہے۔ دوسرے خاندان والوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا تعلق، ان کے وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس پر عمل کریں، لیکن جب یہ اعلان کیا گیا کہ میں کسی خاص وطن یا خاص قوم کی طرف نہیں آیا، میں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آیا ہوں، تو اب دنیا کی قوموں کو دعوت مل گئی فکر کی کہ جب ہمارے لئے بھی یہی قانون ہے تو ہم بھی اس میں فکر کریں اور اطاعت کریں۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی محرومی ہوگی۔ پیغام اللہ کی طرف سے عام ہے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ کوئی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔

قانون فطرت..... بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ شخصی قوانین، تو مسلمان کا من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے۔ وہ خدا کا قانون ہے۔ ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچالے جائیں، نہیں

① السنن للنسائی، کتاب الغسل والتیمم، باب التیمم بالصعیذ، ج: ۲، ص: ۲۰۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح

وضعیف سنن النسائی ج: ۲، ص: ۶۲، رقم: ۵۷۶۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۲۱۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸۔

ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو خواہ وہ شخصی چیز ہو، خواہ خاندانی چیز ہو، اس لئے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں زبردستی کے قانون نہیں کہ عقل نہ مانتی ہو اور دل نہ مانتا ہو اور زبردستی اس کے اوپر ڈالا جائے، یہ بات نہیں بلکہ آدمی جب غور کرے گا، فطرت کے مطابق پائے گا۔ اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے۔ اس ماننے والے انسان کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک اور اس کے درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں، سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایت ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو۔

ذات انسان پر نفاذ قانون افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں۔ آج پیدا ہونے والا بچہ جو بالکل ہی مضعف گوشت (گوشت کا لوتھڑا) ہے نہ اسے عقل ہے نہ تمیز، مگر اسلام کا قانون اس پر لاگو ہوا کہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان دواور بائیں کان میں بکیر کہو۔ سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچاؤ اور کہو کہ اللہ اکبر، اللہ ہی بڑا ہے اور کسی میں بڑائی نہیں ہے اس کے دل میں بٹھا دیا جاتا ہے کہ عظمت خداوندی یہ تیرا جوہر ہے۔

”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ“ ”اللّٰہ کے سوا کوئی معبود نہیں“ ”اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔“ ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔“ جب آدمی ان بنیادی عقیدوں پر آگیا اور یہ بات ایک بچے کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب آگے عمل ہے، فرمایا کہ ”حَسْبِيَ عَلٰی الصَّلٰوۃ“ سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ عبادت خداوندی ادا کرو۔ جب یہ بھی اس کے دل میں جمادیا آپ نے، آگے عام زندگی کے بارے میں ہے ”حَسْبِيَ الْفَلَاحُ“ عام فلاح و بہبود کی طرف آؤ۔

ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت اب رہا یہ کہ وہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ آپ کو فائدہ کیا ہے کہ دائیں کان میں اذان کہیں اور بائیں کان میں بکیر کہیں، یہ تو ایسا ہے جیسے آپ نے کسی دیوار کے سامنے وعظ کہہ دیا، وہ دیوار کیا سمجھے گی۔ لیکن یہ چیز غلط ہے، بے شک اس بچہ کو عقل نہیں شعور نہیں، لیکن اس بچہ کا قلب ایک سفید تختی کی مانند ہے، جو اس پر چھاپو گے وہی چھپ جائے گا اور جب ہوش سنبھالے گا تو وہی کلمات کہتا ہوا ابھرے گا۔ جو آپ نے اس کے دل پر چھاپ دیئے ہیں۔ تو اگرچہ عقل و شعور نہیں مگر استعداد قبولیت کی ہے، جو کلمہ اس کے کان میں ڈالیں گے وہ چھپ جائے گا اس کے دل کی سفید تختی پر، جیسے یہ ریکارڈنگ مشین ہے، ہم جو تقریر کر رہے ہیں وہ اس میں چھتی جارہی ہے۔ اسے نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ ایک جامہ محض چیز ہے لیکن ساری تقریر اس میں جم جائے گی۔ جب آپ اس کی کل اینٹیں گے وہ ساری اگل دے گی جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے۔

تو کیا ایک انسان کے بچے کا دل اس مشین سے بھی گزرا ہے۔ انسان نے اپنی عقل سے اس کی تخلیق کی

ہے تو وہ عقل خود کتنی بڑی ہوگی اور اس بچے میں عقل تو ہے مگر نشوونما پائی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن جو ہر موجود ہے جو آپ اس کے کان میں ڈال دیں گے وہ اس کے دل میں چھپ جائے گا۔

دور تربیت اس سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ یہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ پانچ برس کا ہو تو مکتب میں بٹھا دو، اب تربیت شروع ہوتی ہے۔ نہیں، فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ مخاطب نہیں بن سکتا ہے۔ مگر ماں باپ کا کام ہے کہ ڈالیں اس کے اندر ایسی چیزیں کہ جو حقیقی اور سچی ہوں۔

تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے کوئی برا کلمہ نہ کہیں، جو کلمہ کہیں گے وہی اس کے قلب میں چھپ جائے گا، وہی نشوونما پا کر ابھرے گا اور وہی کہے گا۔ اس لئے جو بات بھی اس کے سامنے کریں وہ حقیقی اور سچی کریں، عمدہ کریں تاکہ اس کے دل میں وہی بات چھپ جائے، اسی طرح سے اس کی آنکھیں ایک آئینے کی مانند ہیں اس کے دل میں گوشور و احساس نہیں لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ماں باپ بچے کے آگے کوئی بے حیائی کی حرکت نہ کریں۔ اگر بے حیائی کے کام کرتے ہیں تو وہی اس کی آنکھ کے راستے سے جا کر اس کے دل میں چھپ جائیں گے اور جب وہ ہوش پائے گا تو وہ بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کرتا ہوا ابھرے گا۔ تو کان میں اچھی بات ڈالو اور آنکھ کے سامنے اچھے نقش پیش کرو۔ خیالات اس کے دل میں اچھے جماؤ تاکہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اچھا بنے۔ اقوال بھی اس کے اچھے ہوں، افعال بھی اس کے اچھے ہوں۔ تو تربیت کا زمانہ یہ نہیں کہ پانچ چھ برس کے بعد آتا ہے بلکہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں مخاطب ہیں ماں باپ کیوں کہ اس بچے کے اندر مخاطب بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اسلامی قانون ایک انسان کے صرف افعال پر لاگو نہیں ہوتا، بلکہ ذات پر بھی لاگو ہے، اس لئے کہ یہ بچہ افعال ادا کرنے کے تو قابل نہیں مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔

اسلام کا قانون اس کی ذات پر آگیا تو وہ قانون زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے اذان کہہ دی، تکبیر کہہ دی، اب نماز باقی رہ گئی۔ علماء لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ وہ نماز ہے اس نے اذان اور تکبیر کی۔ آج تو آپ نے تکبیر اور اذان کہی اور جاتے ہوئے اسے آپ نے نماز پڑھ کر رخصت کیا۔ تو ایک مسلمان کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان میں ہے۔ گویا ابتداء میں بھی اسے اللہ کے نام نے گھیر رکھا ہے اور انتہاء بھی خدا کی عبادت پر جا کر ہوئی تو ابتداء کرو اس کی اذان اور تکبیر سے اور انتہاء کرو اس کی نماز کے اوپر، تو ساری زندگی اس کی دو چیزوں کے درمیان آجائے گی، عظمت خداوندی، توحید خداوندی توحید الہی، اقرار رسالت اور نماز کا جذبہ اور ختم ہوگا وہ نماز کے اوپر تو ظاہر بات ہے کہ جنازہ کی نماز تو آپ ہی پڑھیں گے میت کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے وہ تو بیچارہ کفن پہنے لیٹا ہوا ہے مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔ نفس تو موجود ہے۔ تو اسلام کا قانون اس کی ذات پر لاگو ہوا۔ افعال تو بعد کی چیزیں

ہیں۔ تو جو قانون ذات پر لاگو ہو وہ افعال پر کیوں لاگو نہ ہوگا۔ وہ اقوال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا۔ وہ اعمال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا تو انسان کی ذات اور افعال سب گھرے ہوئے ہیں اسلامی قانون کے تحت۔
تعلیم فطرت..... ظاہر بات ہے کہ یہ قانون اگر غیر مسلم بلکہ سارے انسان تسلیم کریں تو کیا یہ کوئی برائی کی چیز ہے کہ ابتداء ہی میں خالق کی عظمت دل میں بیٹھ جائے۔ یہ تو ہر قوم کے غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ پیدا ہوتے ہی توحید الہی اور رسالت کی شہادت اس کے دل میں ڈال دو۔ ”حَسْبِيَ عَلَى الصَّلٰوةِ“ کہہ کر اسے عبادت خداوندی پر آمادہ کرو۔ معاذ اللہ یہ کوئی بری چیز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ فطرت کے مطابق تعلیم ہے اور یہ تعلیم قوم مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔ کوئی غور نہ کرے یہ اس کی محرومی کی بات ہے لیکن اسلام نے تو غور کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مگر جب آپ یوں کہیں گے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور وہ ہمارا قانون ہے، میری قوم کا قانون الگ ہے اور جب آپ یہ کہیں گے کہ نہ ہمارا قانون نہ تمہارا قانون۔ یہ تو خدا کا قانون ہے جس کے مکلف ہم سب قرار دیئے گئے ہیں، اب موقع آئے گا ان کے غور و فکر کا کہ جب ہمیں بھی پیغام دیا گیا ہے تو بھی اس پر غور کریں۔

اسلامی پرسنل لاء..... اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ماننے کے لحاظ سے یہ مسلم پرسنل لاء ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ اسلامی پرسنل لاء ہے، یہ خدا کا قانون ہے جو سب کے لئے عام ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر میدان حشر تک، اور میدان حشر سے لے کر جنت تک اور جنتوں میں داخل ہونے کے بعد ابد الابد تک یہی قانون چلتا رہے گا اور اسی میں ترقی ہوتی رہے گی۔ حشر میں اور ہوگی، جنتوں میں جا کے کچھ اور ہوگی۔ مگر بنیادی طور پر یہی قانون رہے گا اور انسان کی ترقی اسی سے ہوتی رہے گی۔

پرسنل لاء کا تحفظ..... بہر حال مسلم پرسنل لاء کا اصل مقصد یہ ہے کہ عائلی قوانین جو ان کی ذات پر لاگو ہیں ان کا تحفظ ہو، حقیقت یہ ہے کہ ہماری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہم کسی قوم سے لڑتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس قانون کو تم بھی اختیار کرو اور اگر نہیں اختیار کرتے تو کم سے کم ہم کو تو عمل کرنے دو، تم اس میں کیوں رکاوٹیں ڈالتے ہو؟

ان رکاوٹوں کا دور کرنا یہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہمیں عمل کرنے دو، اگر تم محروم رہنا چاہتے ہو اور نہیں عمل کرتے تو عمل کرنے والوں پر پابندیاں کیوں عائد کرتے ہو؟ کیوں اس میں رکاوٹ ڈالتے ہو تو مقصد اصلی ان قوانین کا تحفظ ہے۔

اب اگر اس تحفظ کے سلسلے میں آپ لفظوں سے دباؤ ڈال سکیں تو لفظوں سے دباؤ ڈالیں، کوئی اور تجویز ہو اثرات ڈالنے کی آپ اسے اختیار کریں، مگر مقصود اصلی حفاظت ہے اس قانون خداوندی کی تو اس کو ہم محسوس کریں اور اس کا احساس ہمیں ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قانون کوئی بت یا تصویر ہے، وہ رکھا ہوا ہو اور آپ شور

چائیں کہ صاحب! وہ ہے قانون پرسنل لاء کا، اس کی حفاظت آپ کریں۔ طریق تحفظ..... قانون کی حفاظت یہ ہے کہ آپ اس کو استعمال کرنا شروع کر دیں، پس وہ محفوظ ہو جائے گا اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ لیکن شور مچاؤ کہ وہ رکھا ہوا ہے قانون، تو قانون کوئی بت ہے جس کی حفاظت کر رہے ہیں یا کوئی وہ تصویر ہے؟ سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ آپ اسے اپنے اندر رکھ لیں، اس پر عمل درآمد شروع کر دیں تو قانون مجسم بن جائیں گے۔

ذرائع حفاظت کی سعادت..... پرسنل لاء کوئی مٹنے والی چیز نہیں ہے، کوئی کتابی مٹائے وہ خود مٹ سکتا ہے اس لئے کہ پرسنل لاء کے قانون کی جڑیں قرآن اور حدیث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اسلام ہے اور اسلام دوامی زندگی لے کر آیا ہے مٹنے کے لئے نہیں آیا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی ہے۔

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ① ”ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں“۔ تو حفاظت ہوگی اللہ کی، اس میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا ہے۔ ہمارے لئے سعادت یہ ہے کہ ہم ذریعہ اور سبب بن جائیں اس کی حفاظت کا۔ حافظ حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں لیکن اگر ہم وسیلہ بن گئے تو ہمیں سعادت حاصل ہو جائے گی ورنہ اگر ہم عمل نہ کریں اور نہ حفاظت کریں پھر بھی مٹنے والا نہیں ہے۔

﴿وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْ شَيْءٍ قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ مِنْكُمْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ مِنْكُمْ﴾ ② ”تم اگر سب مل کر اس دین کی حفاظت سے بھر گئے تو تمہیں نکال دیا جائے گا اس دین سے اور دوسری قومیں لا کھڑی کر دی جائیں گی“۔ وہ اس دین کی حفاظت کریں گی، اس لئے سعادت تو ہماری ہے اگر ہم سبب اور ذریعہ بنیں اس کی حفاظت کا۔ ہم خود حافظ نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ حفاظت کرنے والا حفاظت کر رہا ہے۔

اس قانون کے خلاف کتنے کتنے مصائب، کتنے بڑے بڑے دشمن کھڑے ہوئے، لیکن آج ان دشمنوں کا نام و نشان نہیں اور قانون خداوندی پھر اسی شان سے موجود ہے، قرآن بھی محفوظ، حدیث بھی محفوظ، فقہ بھی محفوظ ساری چیزیں اپنی جگہ ہیں، انکار کرنے والے گزر گئے، آج کوئی نقش پا بھی ان کا پتہ بتلانے والا نہیں یہ قانون تو اپنی جگہ رہے گا حفاظت خداوندی سے، ہم اگر ذریعہ بن جاویں اس کی حفاظت کا ہمیں سعادت حاصل ہو جاوے گی۔ انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو جاویں گے ورنہ یہ تو محفوظ رہنے والی چیز ہے۔

ہم جو شور مچا رہے ہیں وہ درحقیقت اپنی حفاظت کے لئے، پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے نہیں، وہ تو محفوظ ہے ہم جتنا اس کا دامن پکڑ لیں گے اتنا ہی محفوظ ہو جائیں گے کیوں کہ محفوظ کا دامن پکڑ کر آدمی خود محفوظ ہو جاتا ہے آپ سے پرسنل لاء کی حفاظت نہ ہوگی، بلکہ پرسنل لاء سے آپ کی حفاظت ہوگی تو ہم اپنی حفاظت کے لیے اسے دانتوں سے مضبوط پکڑیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کوئی خلل انداز ہو۔ ابھی تو ہم مد مقابل سے لڑنے کو تیار

ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر کوئی خلل ڈالے۔ حکم خداوندی یہی ہے۔

تو واضح ہو گیا کہ پرسنل لاء کا قانون اسلامی قانون ہے کسی مخصوص قوم کا قانون نہیں، ماننے والے کا نام مسلم ہے تو وہ مسلم قانون کہلائے گا نہ ماننے والے کا نام غیر مسلم ہے۔ تو غیر مسلم کا قانون نہیں رہا ورنہ وہ حقیقت میں انسانی قانون ہے، انسان کی برتری اور اس کی حفاظت اور ان کی خوبی اور دنیا و آخرت کے بھلائی کے لئے یہ قانون بھیجا گیا۔ دین اور رسی قوانین کا فرق اس قانون کا حاصل فقط یہی نہیں کہ آپ چند رسیں ادا کر لیں۔ بلکہ قانون کی حفاظت اور تحفظ کا حاصل یہ ہے کہ اس پر عمل درآمد کر کے آپ ظاہر افعال بھی ادا کریں، مگر ہر فعل میں قربت اور تعلق پیش نظر رہے، یہی فرق ہے دین میں اور رسی قانون میں۔

رسی قوانین جو سلطنتیں طے کرتی ہیں وہ صرف افعال پر لاگو ہوتے ہیں۔ لیکن خدائی قانون دلوں کے اوپر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا تو قانون اس کو سزا دیں گے۔ لیکن اس کے دل میں سے کوئی چوری کا جذبہ نکال دے۔ یہ کوئی دنیاوی قانون نہیں کر سکتا، جیل خانے میں جا کر بھی چور کا جذبہ یہی رہے گا کہ اب اگر چھ مہینے کے بعد چھوٹ جاؤں گا تو پھر اس سے بڑی چوری کروں گا۔ پھر چھ ماہ جیل میں رہوں گا۔ مگر اس کے بعد میں ایک اور زبردست ڈاکہ ڈالوں گا۔

تو بھائیو! دنیا کا قانون تو جذبات پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ ذات پر تو کیا ہو وہ تو اور بھی اوپر کی چیز ہے۔ صرف افعال پر لاگو ہوتا ہے۔ منظر عام پر وہ قانون چلتا ہے۔ لیکن دینی قانون اور انبیاء کا قانون وہ ہے کہ وہ فقط چوری ہی سے نہیں روکتا بلکہ چوری کی نفرت بھی دل کے اندر بٹھادیتا ہے۔ وہ ڈاکہ زنی ہی سے نہیں روکتا بلکہ ڈاکہ کی غلاطت اس کی سامنے ایسی آتی ہے جیسے پاخانہ کی غلاطت۔ تو جرائم کی نفرت بٹھادینا، جرائم سے بیزار بنادینا یہ قانون خداوندی کا کام ہے۔

مسلم پرسنل لاء کا منشاء مسلمانوں کا شخصی قانون ہو یا عائلی قانون ہو اس کا منشاء فی الحقیقت یہی ہے کہ ظاہر میں یہ عمل کرو اور باطن میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ قانون دونوں چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ تمہارے دلوں پر بھی، تمہاری زبانوں پر بھی، تمہارے ہاتھوں اور چہروں پر بھی۔ نہ فقط دل کی اصلاح، نہ فقط ہاتھ پیر کی اصلاح، نہ فقط زبان کی اصلاح بلکہ انسان کے مجموعے کی اصلاح پیش نظر ہے کہ اس کا ہاتھ پیر بھی درست ہو، اس کا قلب بھی درست ہو۔ ظاہر و باطن سے وہ اس پر عمل درآمد کرے، تو یہ شور مچانا محض اس لئے نہیں کہ چند رسیں ہیں جنہیں ہم پورا کرنا چاہتے ہیں یا چند رسی باتیں ہیں جن کی حفاظت کرنا ہمارا مقصود ہے نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جس کے پیش نظر انسان کی فلاح و بہبود ہے ہم اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ ہم اس کی حفاظت کر کے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ موازنہ اور مقابلہ کر کے دیکھ لو، ذاتی زندگی ہو یا افعال کی زندگی ہو یہ زندگی

بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو تم تجویز کر رہے ہو۔ یہ بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد..... تو پرسنل لاء کے خلاف ایک شواہد، اس سے لوگ پریشان ہوئے اور آل انڈیا مسلم بورڈ قائم کر دیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ شور مچنے نہیں ثابت ہوا گو وہ فی نفسہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ جنہوں نے پرسنل لاء کی مخالفت کی واقعی انہوں نے سخت غلطی کی۔ گویا ایک شواہد۔ مگر اس شر میں سے ہمارے لئے خیر نکل آئی۔

پہلی خیر تو یہ نکلے کہ سارے مسلمان متحد ہو گئے کہ ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ آج آپ کے سامنے یہ سربراہان مذاہب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے علماء موجود ہیں، ہر تنظیم کے سربراہ موجود ہیں۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں، اس شر میں سے ہی تو یہ خیر نکلے ہے۔ اگر پرسنل لاء کے مخالف نہ کھڑے ہوتے تو ان کے دل میں یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اتحاد جیسی نعمت اس شر نے ہمیں بخشی، تو یہ شر ہمارے لئے مضرت ثابت نہیں ہوا۔ ہم تو انہیں محسن سمجھتے ہیں جو ایک درجے میں پرسنل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہم میں جذبہ اتحاد پیدا ہو گیا۔

خدا شرے بر انگیز دکھ خیرے دراں باشد

بعض دفعہ شواہد ہے مگر اس شر میں سے خیر نکل آتی ہے۔ ہمارے لئے بھی اس میں سے خیر نکل آئی کہ ہم کو نعمت اتحاد ملی۔

یہ بات نہیں کہ رسمی طور پر ہم اتحاد کو اچھی بات سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ایک نعمت خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے نعمت فرمایا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ لڑتے تھے، آپس میں عداوتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، لڑائیاں ٹھنی ہوئی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر جنگیں اٹھتی تھیں۔ پانی پلانے پر جھگڑا، پہلے پانی کون پلائے، اس پر قبیلے لڑ پڑتے تھے اور یہ لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس جاری رہتی تھی، اور مرنے والے وصیت کر جاتے تھے کہ لڑائی بند نہ ہونے پائے، اسے جاری رکھنا ہمارے خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں مگر لڑائیاں بہت بڑی بڑی۔ عداوت دشمنی عام، آپس میں رقابتیں مزاج بن گیا تھا، اسلام نے آکر انہیں متحد کر دیا۔ تو اس اتحاد کو حق تعالیٰ نے ایک آیت میں نعمت فرمایا ہے کہ:

﴿وَإِذْ كُفِّرُوا بِنِعْمَةِ اللَّهِ عَلَيْهِمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً﴾ "اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، ایک دوسرے کے نام سے بیزار تھے۔" ﴿فَأَلْفَ بَيْنٍ قُلُوبِكُمْ﴾ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ ﴿فَأَصْبَحْتُمْ بِبِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ ① سو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ اس کی دی ہوئی نعمت تھی کہ تم خود آپس میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

نعمت تالیف قلوب تو اس اتحاد اور تالیف قلوب کو حق تعالیٰ نے انعام خداوندی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے ساری تنظیمیں آپ اکٹھی کریں مگر دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بایمکات کہ آپ کی تائید سے بڑھ کر اور کس کی تائید قوی ہو سکتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ: ﴿لَوْ أَنفَقْتُ مَالِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا آَلَفْتُ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ آَلَفَ بَيْنَهُمْ﴾ ① ”اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر زمین بھر کر بھی سونا خرچ کر دیتے تو دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے۔ دلوں کا جوڑنا اللہ کا کام ہے۔“

یہ جو ہمارے بزرگ جو بیٹھے ہوئے مختلف مسالک، مختلف فرقوں کے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کندھے سے کندھا ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ دل بھی ان کے جڑے ہوئے ہیں۔ دلی جذبہ بھی یہی ہے کہ واقعی ہم حفاظت کریں اپنے دین کی، تو تالیف قلوب یہ تو اللہ ہی کا کام تھا اور واقع جب ہوا، جب شر اٹھا اور پرسنل لاء کے مخالف کھڑے ہوئے، تو ہم کو اللہ نے اس شر سے ایک بڑی نعمت عطا کر دی اور اسلام کا شیوہ ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی وہ ابھرا ہے مخالفوں میں ابھرا ہے۔ اگر مخالفین نہ ہوں اور ان سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس کی برکتیں نہیں کھل سکتیں، اس کے اندر جو خیر کے پہلو ہیں وہ نمایاں نہیں ہو سکتے تھے۔

مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ترقی نام ہی ٹکراؤ کا ہے۔ اگر دنیا میں ٹکراؤ نہ ہو تو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پانی، ہے، ہزاروں برس سے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس میں کوئی ترقی نہیں کہ پہلے سمندر کی موجیں اٹھتی تھیں پہاڑوں کی شکل میں اور اب گلدستوں کی صورت میں آنے لگی ہوں، پھول بوٹے بن گئے ہوں۔ ویسی ہیں موجیں ہیں جیسی دس ہزار برس پہلے اٹھتی تھیں، ویسے ہی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کوئی ترقی نہیں۔ آگ ہے اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے لپٹ اٹھتی تھی ویسے ہی آج بھی لپٹ اٹھ رہی ہے۔ وہ پھول بوٹے نہیں بناتی، زمین ہے اگر تنہا چھوڑ دو تو اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے پامال تھی ویسے ہی آج بھی پامال ہے۔ آپ جیسے اسے روندتے ہیں روندی جاتی ہے۔ لیکن پانی کو اگر آپ ملادیں مٹی سے اور ٹکرا دیں تو گارا بنے گا اور گارا بننے کے بعد کہیں برتن بنیں گے، کہیں اینٹیں بنیں گی، کہیں سامان بنے گا۔ بس ترقی شروع ہوگئی۔

تو آگ پانی کے ٹکراؤ سے ترقی ہوتی ہے، الگ الگ رہنے میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ آگ کو آپ ہوا سے ٹکرا دیں تو جو (فضا) کے عجائبات پیدا ہوں گے کہیں گرج ہوگی، کہیں بادل ہوں گے، کہیں بجلیاں چمکیں گی۔ اگر ہوا اور آگ دونوں الگ الگ ہیں تو نہ بجلی نظر آئے گی نہ ٹرک نظر آئے نہ بارش برے گی۔ تو بہر حال ٹکراؤ ہی میں ترقی ہے۔

ایک بہت بڑا عالم ہے وہ ہزار ہا مسائل جانتا ہے لیکن پھر اس کے اندر ترقی نہیں۔ لیکن اگر اس کو کسی جاہل

سے ٹکرا دیا جائے اور وہ اعتراضات کرے، تو اعتراضات کے جواب میں نئی نئی چیزیں کھلیں گی اور نیا علم سامنے آئے گا۔ اس طرح سے ایک عالم کے علم کی ترقی شروع ہو جائے گی۔

تو جہالت بھی ایک نعمت ہے بغیر اس کے ٹکراؤ کے علم کے اندر ترقی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے کہ: ”الْقَلْبُ مَيِّتٌ وَحَيَاتُهُ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَيِّتٌ وَحَيَاتُهُ بِالْمَنَاطِرَةِ“ ”دل مردہ ہے اس کی زندگی ہے علم اور علم مردہ ہے اس کی زندگی بحث اور نظر اور ٹکراؤ سے ہے۔“

اور علم کی ٹکر جہالت ہی سے ہوگی۔ علم تو علم سے ٹکراتا نہیں۔ تو جتنا جاہل ٹکرائے گا عالم سے اتنا ہی اس کے علم میں وسعت شروع ہو جائے گی۔

ایک بہت زبردست پہلوان ہے، ہزاروں داؤ پیچ جانتا ہے جو اس کی جھولی میں محفوظ پڑے ہوئے ہیں، اگر کشتی لڑنے پر آجائے تو داؤ پیچ میں ترقی ہوگی وہ اپنے بچانے کے لئے نئے نئے داؤ پیچ ایجاد کرے گا۔ نئی نئی صورتیں پیدا کرے گا، تو جب تک دو پہلوانوں کی ترقی نہ ہو تو فن کی ترقی نہیں ہوتی۔ ترقی درحقیقت نام ہی تصادم کا ہے۔ اگر تصادم نہ ہو تو ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسی تصادم کو بھی فضل خداوندی ظاہر فرمایا ہے اور فرمایا کہ: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَئِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ ① ”اگر اللہ ایک قوم کو دوسری قوم سے نہ ٹکرائے تو زمین فاسد ہو کر رہ جائے اور تو میں بیٹھ جائیں۔“ ان کی ترقی رک جائے، لیکن اللہ ٹکراتا ہے ٹکرانے کے بعد پھرنے سے عجائبات متمدن کے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو جنگ کے بعد نئے نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ حمدنی ترقی ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم قوی ہے۔ تو اس ٹکرانے سے اس کی نخوت (بھرم بازی) ٹوٹتی ہے۔

اور جو ضعیف ہے اس کی غفلت ٹوٹتی ہے۔ تو دونوں فرقوں کی بھلائی ٹکرانے کے اندر ہوتی ہے۔ ٹکریں نہ ہوں تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔ تو پرسنل لاء کو ٹکرایا، لوگوں نے مخالفت کی، اعتراضات کئے۔ اس سے ہر فرقے کے علماء کھڑے ہوئے۔ ہر تنظیم کے سربراہ کھڑے ہو گئے، انہوں نے ان اعتراضات کے جواب دیئے۔ اس سے مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پھیل گیا اور اتنی شقوق کھل گئیں کہ اس سے پہلے ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنی شقوق ہیں۔ آج سینکڑوں رسالے شائع ہو گئے، سینکڑوں مضامین چھپ گئے۔ سارے پہلو کھول کر رکھ دیئے۔ پتہ نہیں تھا کہ اس پرسنل لاء میں اتنا علم بھرا ہوا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق علم نکالا۔ اتنے پہلو و اشکاف کئے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو کبھی یہ پہلو ہمارے سامنے نہ آتے بس، اتنا جانتے تھے کہ قانون اللہ کا ہے۔ بھائی عمل کر لو اس پر، مگر ٹکر سے آپس میں ترقی ہوئی، عجیب لطائف اور نکات پیدا کئے علماء نے۔ اگر یہ ٹکر نہ ہوتی تو پرسنل لاء کا مسئلہ واضح نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ اسلام کے کسی مسئلہ کو کھول کر واضح کریں تو جہلاء کو ٹکرا

دیتے ہیں کہ تم اعتراضات کرو اور مخالفت کرو، جتنی مخالفت ہوگی علماء اس کے جواب میں کھڑے ہو جائیں گے اور جو گوشے چھپے ہوئے تھے وہ کھل کر سامنے آجائیں گے۔

اسی لئے کفار کو نکر دی گئی مسلمانوں سے، فساق کو نکر دی گئی متقیوں سے، منافقوں کو نکر دی گئی مخلصوں سے تاکہ مخلص کا اخلاص کھل جائے، منافق کا نفاق کھل جائے اور جو چیز اصل ہے وہ کھل کر برسر عام آجائے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی مخالفت ہمارے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا اتحاد جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ نہ ہوتا۔ اس اتحاد سے جو حفاظت ہو رہی ہے پرسنل لاء کی وہ نہ ہوتی۔ اس حفاظت سے رعب کی جو کیفیت مخالفین کے دلوں میں پیدا ہو گئی وہ نہ ہوتی۔ ہزاروں مسلمان جو پرسنل لاء کو سمجھتے ہوئے نہ مانتے تھے وہ اچھی طرح مان گئے۔ تو ایک نعمت کیا ہزاروں نعمتیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے تو ہم شکر گزار ہیں مخالفت کرنے والوں کے کہ اگر وہ مخالفت نہ کرتے تو ہمیں یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ اور وہ زیادہ مخالفت کر کے دیکھیں، مسئلہ اور زیادہ واضح ہوگا۔

اور ممکن ہے کل کو اس کھلے ہوئے مسئلے کی لپیٹ میں وہ بھی آجائیں اور وہ بھی کہیں بھائی! وہی بات تو تھی جس سے لڑ رہے تھے، اسے دیکھو اور جب دیکھیں گے تو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تو یہ مخالفت ذریعہ بن جائے گی ان کی موافقت کا، یہی مخالفت ذریعہ بنے گی پیروی کرنے کا۔ تو ان کے لئے بھی راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

مبنی بر حقیقت قانون..... اور ہمارے لئے تو اللہ نے علمی اور نظری راستہ پیدا کر ہی دیا، بہت سوں میں اب استعداد پیدا ہو رہی ہے غور و فکر کی اور استعداد کے بعد جب وہ غور و فکر کریں گے تو فطری قانون پر آ کر رہیں گے۔ یہ مصنوعی قوانین سب ختم ہو جائیں گے۔

باپ کا بیٹا ہونا یہ کوئی فرضی بات تھوڑا ہی ہے کہ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ بیٹا ہے بس وہ بیٹا بن گیا۔ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ باپ ہے وہ باپ بن گیا۔ باپ بیٹا ہوتا ہے جزئیت کے تعلق سے کہ وہ باپ کا جزو ہے، اس کے نطفے سے ہے اس لئے وہ اس کا بیٹا ہے۔ محض منہ کے بولنے سے جز نہیں بن جائے گا۔ کسی شخص کا محض نام لینے سے بیٹا بنادینا درحقیقت فرضی اور مصنوعی بات ہوگی۔ حالاں کہ اس کا تعلق خلقت سے ہے۔ خدا ہی باپ بناتا ہے خدا ہی بیٹا بناتا ہے، وہی ایک کے اندر سے دوسرے کو نکالتا ہے، اس کے اجزاء منتقل ہوتے ہیں دوسرے کے اندر جس سے وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ بیٹی بن جاتی ہیں۔ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ”وہ مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے، ایک قطرہ پانی سے جو مردہ محض ہے۔“

زندہ انسان پیدا کرتا ہے اور اس زندہ انسان میں سے پھر وہ قطرہ آگے کو چلتا ہے تو زندہ میں سے مردہ کو نکال دینا اور مردہ میں سے زندہ کو پیدا کرنا، یہ تو اللہ کا کام ہے کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تو ایک انسان کا جزء بن جائے گا دوسرا انسان۔ وہ جزء زبان کی حرکت سے تھوڑا ہی بنے گا۔ وہ تو خلقت بنا ہوا ہے۔

جو بیٹا ہے وہ بیٹا ہے، جو باپ ہے وہ باپ ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جب اس حقیقت پر وہ غور کریں گے وہ خود نادام ہوں گے اگر عقل رکھتے ہوں گے کہ بھائی! محض منہ سے بیٹا کہہ دینے سے بیٹا کیسے بن گیا اور بیٹا بھی حقیقی کہ وراثت میں بھی شریک اور حقوق میں بھی۔ یہ سب فرضی کارخانہ ہے کہ ہم نے بیٹھ کر خیال کر لیا بس ہو گیا تو باپ بیٹا ہونا خیالات سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو خلقت ہے تخلیق خداوندی ہے، جتنی چیزیں قانون کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مصنوعی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جو آتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسری قومیں اپنے اقتدار کی وجہ سے، اپنے تحفظات کی وجہ سے قانون ایسے بناتی ہیں کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ دوسرا چاہے پامال ہو جائے لیکن اللہ کے تو سب بندے ہیں، وہ تو سب کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے وہ قانون بھیجتا ہے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے، اس لئے سب ہی بنی آدم کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

پرسنل لاء کی خدمت بہر حال اب اس لحاظ سے میں عرض کروں گا کہ اہل بنگلور نے جو مدارات کی ہے آنے والوں کی اور جو مہمانداری کی اور اخلاقی بلند یوں کا ثبوت دیا وہ فی الحقیقت ہمارے گوشت پوست کی خدمت نہیں۔ بلکہ وہ خدمت کی ہے پرسنل لاء کی۔ وہ خدمت کی ہے اتحاد طبقات کی، وہ خدمت کی ہے تمام فرقوں کے متحد ہونے کی، تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی انسان کے اوپر فرض ہے کہ شکریہ ہی ادا کرے اللہ کا بھی اور بندوں کا بھی۔ ”مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ“ ① ”جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں۔“

اس لئے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کیا ہے اللہ ہی کی توفیق دینے سے تو اولاً اللہ کا شکر ہوتا ہے پھر وسائل کا شکر ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم آپ کا شکر ادا کرتے یہ آپ کی عالی حوصلگی ہے کہ آپ ہمارا شکر ادا کر رہے ہیں۔ دے بھی رہے ہیں شکر بھی رہے ہیں

فی الحقیقت یہ شکریہ آپ کے لئے ہے اس وقت تک جب تک آپ کی تسلیں باقی ہیں، آپ کے لئے دعاء ہے، اس وقت تک جب تک دنیا میں آپ کا نام و نشان باقی ہے۔ تو اللہ آپ کو بھی دوا می کرے اور خدا کرے کہ ہمارا شکر بھی دوا می ہو۔

دوام شکر انسان تو ہے ہی دوا می، انسان ازلی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ ازلی تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا تو ہو گیا۔ اس سے پہلے انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا﴾ ② ”انسان پر ایک بڑا زمانہ گزر چکا ہے کہ لاشی محض تھا اور اس کا چرچا بھی نہ تھا زبانوں پر“۔ کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ زیر کون ہے اور بیکر کون ہے ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِّنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ﴾ ③ ”ہم

① السنن للترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک، ج: ۷، ص: ۲۰۹۔

② پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۱۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۲۔

نے پیدا کیا انسان کو ایک بوند کے لمحے سے، پلٹتے رہے اس کو۔

تو ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم معدوم تھے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنے عدم کا بھی علم نہ تھا۔ زمانہ دراز گزر چکا ہے کہ انسان نہیں تھا۔ اللہ نے پیدا کیا، لیکن جب پیدا کر دیا تو اب وہ مٹنے والا نہیں اب وہ ابدی ہے۔

موت کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ آدمی موت آنے کے بعد فنا ہو گیا، یا ختم ہو گیا ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے معنی منتقل ہو جانے کے ہیں۔ اس دار سے دوسرے دار میں، اس جہان سے دوسرے جہان منتقل ہونا۔ تو انتقال ایک دار سے دوسرے دار کی طرف، ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف یہ تو ہوتا رہے گا، مگر مٹ جائے انسان، یہ نہیں ہو سکتا، نو مہینے آپ ماں کے پیٹ میں رہے ایک عالم میں تھے۔ اس سارے عالم کی عمر نو مہینے کی تھی وہاں سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گئے۔ اب دنیا میں آپ کی عمر ساٹھ، ستر اسی سو برس کی ہے یہاں رہے، یہاں سے انتقال ہوا تو عالم برزخ میں پہنچ گئے، جسے آپ قبر کہتے ہیں۔ وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ اس میں کتنی مدت رہیں گے۔ قیامت تک تو رہنا ہی ہے۔ پھر قیامت آگئی تو آپ عالم برزخ سے عالم حشر کے اندر منتقل ہوں گے اور عالم حشر میں ایک دن قیام کرنا ہے اور وہ ایک دن ہوگا پچاس ہزار برس کا، لہذا پچاس ہزار برس اس عالم کی عمر ہے۔ اس عالم میں آپ پچاس ہزار برس گزر رہے ہیں۔

تو انسان مٹنے والا نہیں ہے۔ باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ سے چلا تو چلا رہے گا ابد الابد (ہمیشہ) تک۔ اس لئے آپ بھی باقی، ہم بھی باقی، آپ کے اخلاق بھی باقی، ہمارا شکر یہ بھی باقی۔ دونوں چیزیں دوامی ہیں جو چلتی رہیں گی اور جنت تک ساتھ جائیں گی۔

وحدت خیال و وحدت قلوب..... بہر حال آپ نے فی الحقیقت یہ خدمت مہمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسئلہ عظیم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے مسلم پرسنل لاء کی خدمت کی ہے، اس کو عام کیا، اس کو پھیلایا اور آپ نے چاہا کہ ساری پبلک اس سے واقف ہو جائے۔ اس کے لئے یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ درحقیقت وعظ و تقریر کا نہیں ہے۔ وعظ و تقریر میں ہوتی ہے تربیت۔ یہ جلسہ ہے اعلان کا کہ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو قانون کے اوپر آنے والے ہیں۔ ان کی بچاؤ کی صورتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں۔ ان صورتوں پر آپ متفق اور متحد ہو کر چلیں۔ یہ جلسہ اس اعلان کے لئے ہے، وعظ و تقریر کے لئے تو ہزاروں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں عبادات، معاملات وغیرہ سب چیزوں کی نصیحت بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ محض وعظ و نصیحت کا اجلاس نہیں یہ تو جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔ تو بہت سے خطرات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ فلاں مسئلہ کو اگر بدلا گیا تو یہ خطرات ہوں گے، پرسنل لاء کے مسئلے میں مداخلت کی گئی تو یہ خطرات رونما ہوں گے۔

ان خطرات پر تجویزیں آرہی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو یہ جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ آپ کا اتحاد باقی رہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اتحاد زبان سے نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا کہ میں آپ کا دوست

ہوں، میں نے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کا دوست ہوں۔ یہ دوستی قائم نہیں رہ سکتی کیوں کہ یہ تو لفظوں کی دوستی ہے، دوستی واقعی جب ہے کہ واقعی دل میں دوستی آجائے، مگر کے اندر پیوست ہو جائے وہ دوستی باقی رہ سکتی ہے، اور وہ دوستی کب ہوگی؟ جب وحدت خیال پیدا ہو۔ اگر خیالات بدلے ہوئے ہیں، آپ کا رخ ایک طرف میرا رخ ایک طرف، کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا اور جب خیالات میں آگنی وحدت تو خود بخود اتحاد پیدا ہوگا۔ تو پرسنل لاء اور قانون الہی اور قرآن کے ایک ایک جز کی حفاظت ایسی چیز ہے کہ اس کے اوپر سارے متفق ہیں۔ اس کے معنی میں چاہے اختلاف کریں، رائے الگ ہیں۔ لیکن نفس قانون قرآن وحدیث اس پر سارے متحد ہیں۔

تو اس وقت آج آپ کے میرے خیالات پر نہیں آرہی ہے اس وقت تو آج آرہی ہے کتاب وسنت پر ان کے مسائل پر لوگ تغیر وتبدل چاہتے ہیں۔ تو کون سا فرقہ رہ جائے گا جو اسے گوارہ کر لے قرآن وحدیث میں کوئی شخص تغیر کرے، اس واسطے سارے کے سارے متحد ہو گئے لہذا وحدت خیال بھی ہے اور وحدت قلوب بھی۔

اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی..... اور باہمی اخلاص بھی ہے ایک دوسرے سے، بغیر اخلاص کے اس طرح جمع نہیں ہو سکتے اور اخلاص اس لئے ہے کہ مقصد ہے مشترک، الگ الگ مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہی مقصد ہے کہ یہ قرآن وسنت ناقابل تغیر ہے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا ہے۔ تغیر وتبدل تو کیا کرتے اس کا حق تو خود صاحب شریعت کو بھی نہیں دیا گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد فرمایا گیا کہ آپ بھی اعلان کر دیں: ﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي اَنْ اُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْكَاءِ نَفْسِي﴾ ① ”میرے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس کے کسی شوشے کو بدل دوں۔“

میں تو ناقل اور امین اور داعی بن کر آیا ہوں، اللہ کی طرف سے، جو حق تعالیٰ فرمائیں گے بلا کم وکاست تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ اس کے اندر میری طرف سے کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی جس تغیر و تبدل کے مجاز نہیں، میں اور آپ اس کے مجاز کیسے ہو جاویں گے؟ اور جب میں اور آپ نہیں تو دوسری قومیں کیسے ہو جاویں گی؟ یہ تغیر وتبدل کرنے کھڑی ہوں گے، تو لامحالہ مقابلہ بھی ہوگا اور مقابلہ ہوگا تو ہماری مدد بھی ہوگی۔

بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی..... مدد حاصل کرنے اور لڑنے کا ایک خاص اصول ہے۔ اگر آپ ضعیف اور کمزور ہیں، مد مقابل ہے بہت قوی اور آپ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں اس سے۔ تو اصول یہ ہے کہ کسی قوی کو اس کے مقابلہ پر ڈال دیجئے۔ وہ لڑتے رہیں گے آپ بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہیں گے تو آج قانون پر آج آرہی ہے، آپ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اقوام کو اللہ سے بھڑا دو اور کہہ دو کہ یہ قرآن وحدیث میں تغیر کرنا چاہتے ہیں، قرآن والا خود ان کو سمجھ لے گا۔ لڑائی ان کی شروع ہوگی۔ ہم آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے، خدا کو کون مغلوب کر سکتا ہے؟ اس کے قانون کو کون نیچا دکھا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہی ہے کہ ہم آڑ لیں قرآن وحدیث کی۔ اپنی

طرف سے کوئی بات نہ کہیں۔ نہ ہماری عقل کوئی چیز ہے، نہ ہمارا خیال کوئی چیز ہے۔ ہم تو قانون کے حق میں امانت دار ہیں اس قانون کو پہنچائیں گے۔ قانون قانون والے کا ہے۔ اگر کوئی لڑے گا تو وہ قانون سے اور قانون ساز سے لڑے گا۔ ہم تو قانون ساز نہیں ہیں۔ ہم تو بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔

جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا۔ مقابلہ ہوا مشرکین مکہ سے ظاہر بات ہے کہ مسلمان تعداد میں بھی تھوڑے، سامان بھی ان کے پاس نہیں اور مقابلہ اس قوم سے کہ سارے وسائل زندگی اس کے ہاتھ میں ہیں، اقتدار حجاز کا اس کے ہاتھ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبْ بِهِذَا الْحَدِيثِ﴾ ①
”اے پیغمبر! مجھے چھوڑ دو اور میرے مقابلہ پر انہیں چھوڑ دو۔“

ہم نمٹ لیں گے تم بیٹھ کر دیکھو تو ہمارا بھی کام یہ ہے۔ بھائی تم ہماری جائیداد ہماری ذات پر حملہ نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو براہ راست قانون پر حملہ ہے اور قانون الہی ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے تو تم لڑ لو۔ اگر تمہارے اندر طاقت ہے اللہ میاں سے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم پیش کر دیں کہ یہ خدا کا قانون ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے پھر بھی کر دو گے تو مجرم ٹھہر دو گے خدا کے، ہمارا کوئی جرم نہیں کہ ہم خواہ مخواہ تم سے لڑیں، تم نمٹ لو۔

بہر حال اصول بھی یہی ہے کہ جب آپ کے اندر طاقت نہیں تو کم از کم اتنی طاقت ہے کہ اپنے دین کو مضبوطی سے سنبھال لیں اور دوسروں میں اعلان کر دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ ناممکن التغیر ہے، بس اتنا آپ کرتے رہیں۔ اب آگے جھگڑنے کے بعد کون مغلوب ہو کون نہیں۔ اس کو قانون والا اپنے آپ جان لے گا۔

شاہ حبش کی شکست آپ کے سامنے تو واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر جب دھاوا بولا ہے ابراہہ نے یہ یمن کا بادشاہ تھا اور اس نیت سے آیا تھا کہ بیت اللہ شریف کو منہدم کرے۔ (معاذ اللہ) تاکہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف سے ختم ہو کر اس مکان کی طرف ہو جائے جو اس نے یمن میں بنایا تھا، تو وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کا لشکر لے کر آیا اور مکہ کے ارد گرد اس نے گھیرا ڈال لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ معاذ اللہ بیت اللہ سمار کر دے اور ڈھا دے۔ تو اس نے عبدالمطلب کو اطلاع دی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو آ کر کہو۔ مکہ کے باشندوں کے تم سردار ہو۔ عبدالمطلب آئے، ان کی بڑی تعظیم کی، بڑی توقیر سے پیش آیا اور کہا کہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کہیں۔ انہوں نے کہا میرے چند اونٹ ہیں، میری چند اٹھاک ہیں، ان کی آپ حفاظت کریں۔ ان پر آپ ہاتھ نہ ڈالیں اور میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اسے حیرانی ہوئی کہ یہ اپنے چند اونٹوں کو لے کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ جیسی چیز کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ صاحب! اسے سمار مت کرو، اس پر حملہ مت کرو، تو اس نے عبدالمطلب سے کہا کہ آپ اپنے چند اونٹوں کے بارے میں آئے ہیں اور اپنی ایک شخص ملک کو سامنے رکھا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس مرکز کو ڈھا دوں جس سے آپ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔

تو عبدالمطلب نے کہا کہ بیت اللہ میری ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خدا کا گھر ہے۔ خدا آپ سے خود منٹ لے گا، میں تو اپنی ملک کے بارے میں کہنے آیا ہوں، خدا کی ملک کے بارے میں کہنے نہیں آیا۔ وہ جانے آپ جانیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس کے ہاتھوں کے پرچے چند چڑیوں کے ذریعے اڑا دیئے۔ بیت اللہ اسی طرح قائم رہا اس کے ہاتھوں کے اور اس کے لشکر کے پرچے اڑ گئے، ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہا۔

پرسنل لاء میں مداخلت کی وجہ..... ہم اور آپ اس چیز کے ذمہ دار ہیں کہ پہلے تو اس قانون پر ہم اور آپ عمل کریں اور اپنے اندر اس کو رچالیں، اس کے بعد اس کا اعلان کریں کہ یہ خدائی قانون ہے۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کو خدا کے مقابلے پر ڈال دیں کہ ہم تو اسی پر عمل کریں گے اور اسی کا اعلان کریں گے، جو تمہارا جی چاہے کر لو، تو حقیقت یہ ہے کہ کوتاہی ہماری ہے۔ عامل ہم نہیں۔ پرسنل لاء کے نام سے ہم واقف نہیں۔ شخصی اور عائلی قوانین کیا ہیں ان پر عمل درآمد نہیں، اگر عمل درآمد ہو تو دوسرے خود مغلوب ہو جاویں گے۔ لیکن خود آپ عمل نہ کریں تو دوسروں کو جرأت ہوتی ہے کہ دخل اندازی کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کو پتہ نہیں کہ پرسنل لاء کیا ہے۔ لہذا جس طرح سے چاہو اس کے روپ کو بدل دو۔

ہماری بد عملی نے یہ راستہ دکھایا ہے، اگر آج سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو اسلامی معاشرہ ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے۔ پھر کروڑ ہا کروڑ انسان جن کو سات کروڑ کہا جاتا ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ دس بارہ کروڑ سے کم نہیں۔ یہ سارے مل کر اگر عمل درآمد کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے جھکے چھوٹ جائیں گے۔ زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دے دی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں مگر اس قانون پر آج نہیں آسکتی۔

فریضہ مسلم اور ادائیگی شکر..... یہ اعلان کر دینا آپ کا فرض ہے، اس پر جم جانا آپ کا فرض ہے، اس لئے یہ جملے منعقد کئے جا رہے ہیں۔ پرسنل لاء کے مسائل کے بارے میں مجھے کوئی تحقیق عرض کرنی نہیں تھی۔ بلکہ مقصد آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور ایک یہ کہ پرسنل لاء کے اوپر آپ کو جم جانا چاہئے۔ علما بھی علما بھی اور اعلیٰ بھی اور اذن عام بھی آپ کریں، مطلع کر دیں کہ یہ قانون خداوندی ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس میں تغیر و تبدل گوارہ نہیں کر سکتے۔ یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ کوئی تقریر یا وعظ نہیں کرنا تھا۔

ایک خادم بورڈ کی حیثیت سے یہ بھی میرا فرض تھا کہ آپ حضرات کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کروں۔ اپنی طرف سے بھی اور ان سب بزرگوں کی طرف سے بھی۔ اصل میں تو یہی سارے بزرگ ہیں، انہوں نے مجھے لا کر آگے بٹھلا دیا ہے کہ تو یہ کام کر۔ صدر تو اصل میں وہی ہیں جو صدر بنا سکتے ہیں کیوں کہ وہ کرسی پر جسے چاہیں بٹھا

دیں۔ میں تو ایک علامتی نشان ہوں کام کرنے والے تو یہی سارے بزرگ ہیں جو کام کر رہے ہیں اور انہوں نے ہی کیا ہے۔ اس لئے ادا شکر کے اندر میں ان کی طرف سے نیابت کر رہا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔ آپ کے احوال میں برکت عطا فرمائے!۔ (آمین)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ.

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ.

وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرات کی فضاء پیدا کی، تاکہ اسی جرات و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے۔ اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں۔ بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا مناد (و عویدار) ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یُّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضِلّ اللّٰہُ فَلَا هَادِیَ لَہٗ . وَنَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَسَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ، اَرْسَلَنَ اللّٰہُ اِلَیْہِ کَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَنَذِیْرًا ، وَدَّاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّیْتِرًا .

اُمَّا بَعْدُ ا

آزادی کا مفہوم..... بزرگان محترم! اسلام آزادی کا سب سے بڑا حامی و علمبردار ہی نہیں، بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیوں کہ عقل کی تنگ و تاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک پیٹری، توس مکھن، کھیل تماشا، گانا بجانا، آلات لہو و لعب، نفسانی عیش و نشاط، ملکوں میں آمد و رفت، ہوائی یا بری و بحری سیر و سیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے خریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام و طبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے نہیں ہیں۔ ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ بلکہ آزادی کے معنی حق و صداقت، عدل و انصاف اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے بسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں۔ تاکہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور

قوی کو ظلم و زیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت و قدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے، جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست و پائی ختم ہو جائے۔

آزادی کا اسلامی نصب العین..... آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھئے تو وہ یہ ہے کہ: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا آلَهُهَا شَيْعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَذَّيْحُ آبْنَا لَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنَمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ﴾ ①

”فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف (پارٹیاں) بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کی بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا، ہم ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنادیں اور ان کو مالک بنادیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں۔ فرعون اور ہامان اور ان کی اہلی و موالیٰ کو (زوال قوت و شوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے، اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقت وروں نے زور قوت کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کئے جائیں۔ تاکہ کمزور آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون و ہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں، ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت و قوت کا یہی مقصد ہے اور بلاشبہ یہی ہے نہ کہ فراعنہ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جن کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گزری، تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت و اخلاق کے ساتھ دنیا میں لے کر آیا ہو؟

اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے نعرہ کے بعد، حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اٹھائی۔ پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن ان کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں، جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام بھی سامنے رکھا ہے۔ اس لئے دعوائے آزادی میں اسی کو سچا مدعی کہا جائے گا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادی ضمیر..... اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہو سکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیہ چھکارا میسر ہو اور یہ اس

کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل و دماغ اور ضمیر آزاد ہو، ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو۔ عقل و فہم اور شعور، ادراک آزاد ہوتا کہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر و قہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عمل درآمد کرے وہ اسی کا عمل درآمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں۔ یہ آزاد ہے تو اس کی پوری دنیا آزاد ہے، ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اس کی پوری دنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اس کے عقل و فہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا، مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فضل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اسے بھی دلیل نبوت تو ٹھہرایا ہے۔ لیکن دلیل صداقت کو مسائل نہیں بنایا۔ کیوں کہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجت و برہان سے واضح ہوتی ہے۔ خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی، بغیر حجت و دلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جیسے اکراہ و اجبار کہا جاتا ہے۔ جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اس کے رد و قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔ نکاح و طلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے، بیع و شراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز۔ امن و جنگ کے یہ اوقات و مواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں اور دلیل یہ بیان کر کے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اس کی معنوی قوت ضروری کھل جائے گی، مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتی اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گردا دینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کر لے۔ کیوں کہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے۔ خوارق سے پیغمبر کا منجاب اللہ ہونا تو ضرور واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ ان کا معقول اور موافق فطرت ہونا دلائل سے واضح ہوگا۔ معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔

آزادی عقل و فہم..... پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔ اور عقلی بصیرت کو استدلال کی راہ سے گزر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا، جس سے عقل کی آزادی میں فرق آ جاتا۔ دراصل یہ کہ اسلام نے عقل کو آزاد نہ سوچ بچار کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لئے خوارق کو نبی کی نبوت کی دلیل تو کہا گیا۔ لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انہیں دلیل نہیں ٹھہرایا گیا، بلکہ اس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادہ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادت ہی بہترین دلیل

بن سکتا تھا۔ حجت و برہان اور فراست و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تو لے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قمر طاس مستقیم ہے، چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوت یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ اسے غیر معقول بھی جانتا ہو، بلکہ یہ بیان کیا گیا کہ: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا﴾ ① ”اور یہ (مومن بندے) ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل و فہم کے ساتھ) متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ماننے کے ساتھ ان کا سمجھ لینا بھی ساتھ ساتھ رہے۔“

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہہ دینے کا ارشاد ہوا کہ: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ ② ”آپ فرمادیتے کہ یہ میرا طریق ہے، میں خدا کی طرف سے اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں۔ میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل مانے اور منوائے جاؤں)۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں برد و سلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوائے کے لئے بجائے خرق عادت کے، نمرود سے استدلالی بحث و مناظرہ فرمایا جو حجت و برہان کی لائن تھی۔ کسی معجزہ سے اسے چپ کرانے کی سعی نہیں فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصا اور ید بیضا کے چمکتے ہوئے خوارق عادت نشان پیش کئے تاکہ ان کا پیغمبر ہونا واضح ہو جائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ فرعون سے مکالمہ حجت و برہان سے کیا جس کی تفصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزار ہا معجزات دکھلائے ہیں۔ وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت و برہان اور عقلی وحسی طرق استدلال سے بھرپور ہے۔ بس آپ کو بوجہ خاتم النبیین ہونے کے طریق استدلال معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں۔ خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کو منوانا، ایک ایسا دباؤ ہوتا، جس سے عقل و خرد کی آزادی سلب ہو جاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا بند دینا برابر ہو جاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا، بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اس کے ضمیر کو آزاد کیا، اس کی عقل کو آزاد کیا اس کے فہم کو آزاد کیا اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تھم بودیا اور اسے مجسم آزادی بنا دیا۔ بہر حال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے۔ جس کے اوپر سے اس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

آزادی رائے..... آزادی ضمیر کے بعد مافی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیکھنا ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرت کا کام تھا۔ ضمیر کی آواز دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں ابھاری جاتی بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے ابھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کر دے۔ اس کی تصدیق و تکذیب یا تعویب و تردید کا حجت کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لیکن اسے ابھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں، اگر رائے کو آزاد نہ کیا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حد ہے کہ عام انسانی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں، بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا: تو میں آزاد ہوں۔ ① یہ رائے مانوں نہ مانوں اور بالآخر نہیں مانی۔ ایک طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہے جو خاتم الانبیاء ہونے کے علاوہ عقل الناس بھی ہیں۔ دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص عقل شمار کی گئی ہے۔ لیکن اسلام کی بخشش ہوئی آزادی رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہر حال اسلام کی آزاد فطرت نے انسان کی آزادی کے لئے سب سے پہلے اس کے باطن کو آزادی بخشی ہے، اس کی عقل اس کے ضمیر اور اس کی رائے کو آزاد رکھا ہے اور اس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا، جو اس کے فطری ابھار اور تقاضوں کو پامال کر دے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوت اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ تا وقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیر ہی کے رجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اسے واجب القبول نہ سمجھ لے۔ تو وہی اسلام اسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ، سونے چاندی اور زرو جواہر کی ڈھیروں کے دباؤ تیر و تفنگ اور بم و گیس کے دباؤ کسی کی رمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا اور برداشت کر سکتا ہے اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلواریں زور سے کسی کے اندر اتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور اتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اس نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ: ﴿لَا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ② ”دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔“

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ: ﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ ③ ”سو کیا

① السنن لابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب خيار الامه اذا اعتقت، ج: ۶، ص: ۲۶۰، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح وضعیف

سنن ابن ماجہ ج: ۵، ص: ۷۵، رقم: ۲۰۷۵، ② ہارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۶، ③ ہارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۹۹،

آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں۔“

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے، وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کرے گا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرون انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا اور انسانی ضمیر، انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں ابھرنے اور ابھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔ ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے..... ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے۔ بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو، لفظی ترجمانی نہ ہو، جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرون نفس میں آتی ہے پھر اس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے قرآن حکیم نے سائنٹفک (نفس) حقیقت و اشکاف فرمادی کہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا أَمَانًا بِأَنفُسِهِمْ﴾ ① ”واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے، جب تک وہ لوگ خود اپنے نفس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے۔“

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے، جب اندر آچکتی ہے، باہر انقلاب جب ہی رونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے، باہر غلامی اس وقت آتی ہے، جب نفس کے اندر سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی اس لیے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی۔ تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے اور اس طرح اسلام صرف رسی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا مناد ہے جس نے رسی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

باطنی آزادی..... پس باطن میں تو اسلام آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسوئی سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے۔ ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہر مانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آجائے۔ اگر یہ اختیار حق اور ردِ باطل ضمیر کا جو ہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے، تو ایسے ضمیر نے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستارانِ حق کا غلبہ ہو جائے گا اور پرستارانِ باطل کی شکست، صد یقیوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔

ذلیل قسم کی غلامی..... لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہے، یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں۔ بلکہ بیرونی اثرات سے متاثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے۔ گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اس نوع کی آزادی باہر نمایاں

ہوگی۔ فرعون و ہامان برسر اقتدار ہوں گے، صلحاء و صدیقین بے یار مددگار بن جائیں گے اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی۔ جس کو احادیث صحیحہ میں علامات قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے اور جو اقوام عالم اور عالم کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریل علیہ السلام نے علامت قیامت دریافت کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”أَنْ قَلِيلًا الْأَمَّةُ رَبَّتْهَا وَأَنْ تَرَى السُّحُفَاةَ الْعُرَاةَ رِعَاءَ الشَّيْءِ يَنْطَلِقُونَ فِي الْبُيُوتَانِ“ ① (”قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالکہ کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشت منزلی کی) اور سیاست مدن یعنی ملکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ) تم دیکھو کہ تنگ پیرے تنگ سرے (ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے چرواہے یعنی کمینے قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں۔“

یعنی کمینے برسر اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جو تیاں چٹاتے نظر آئیں۔ تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا، مگر بنگاہ غور ذلیل قسم کی غلامی ہوگا، جو غلامی حق کی بجائے غلامی نفس کی دل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔ بہر حال اسلام کی نگاہ میں آزادی باطن کے معنی ضمیر کی آزادی، عقل و خرد اور فہم و فکر کی آزادی ہے۔ جس سے انسان بذات خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جبری اور پیکا ہو جائے اور آزادی ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت و قوت پیدا ہو جانا ہے۔ جو امر حق کے نافذ کرنے میں کسی پس و پیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لُومۃ لآئیم کی پرواہ رہے نہ نُصْح ناصح کی۔

صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے..... اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا۔ بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا بلکہ بوطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس و شیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت، پھر اس منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے۔

پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہو اور وہی آزاد ہو اور جو اس سے آزاد ہو اور وہی غلام ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت و برہان سے پابند حق بن جانے کے ہیں۔ آزادی کا معیار..... آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا ملک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوق خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے۔ اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنچہ استبداد کو توڑ کر

اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سدراہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہوا و ہوس کا غلام ہے اور ظاہر ہے یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیر پا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزادی شدہ ملک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے، تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت، رنگ، نسل، وطن، ہوس زر، ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ ملک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیر پا بناتی رہے گی۔

پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں، اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعا میں رطب اللسان ہوں مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بہا ہو۔ ﴿يُرْضَوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَتَابِعُوا قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ① اسلامی آزادی کے آثار..... اسلام بھی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جو نبی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا وہیں پس ماندہ ابھر پڑے، پست بلند ہو گئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے، غلام اور آقا میں فرق نہ رہا، یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آ گیا۔ مظلوموں کی فریادیں عرش سے ٹکرائیں، صنف نازک باندیوں سے حرہ (آزاد) ہو گئیں۔ بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنہیں سونے کے لئے فرش خاک بھی مشکل سے میسر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے اور جو خود بیل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے، وہ خادم خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا، بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و تو کے قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیم یکسانی، مالی توازن، جاہی ہم رنگی، امیر غریب کے سنگم، اونچے اور تنچے کے ملاپ، آقا و غلام کی ہم آہنگی، شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا، جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے اور اس طرح ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کی بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزادروشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کیساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کارفرما تھا، جو خود انسان کے نفس کی عظمت اصطلاحی خودداری سے نہیں ابھاری۔ بلکہ ہر نفس کی مخفی

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیہ: ۸۔

عظمت کو منا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامی نفس یا غلامی غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامی حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے، لیکن اس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور باہم بعید تر ہیں۔

”اسلام اور آزادی“ کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیز ہو سکے۔

عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے، لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے، جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو۔ کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت و ثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں ہی، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْطِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضِلِّہٖ فَلَا هَادِیَ لَہٗ. وَنَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَنَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَنَ اللّٰہُ اِلَیْكَ کَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَدَّاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّبِیْنًا۔“

عروج وزوال کا معیار..... ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی و تنزل اور فناء و بقاء پہچانی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے۔ گرد و پیش کے حالات، ہنگامی حوادث یا شخصی آرام معیار کا درجہ نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج و زوال کو پہچانا جائے۔ پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آ سکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے۔ جس حد تک امت اس کے مطابق ہو اسے قوم کی بقاء یا ور کیا جائے گا اور اس میں اس کی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹتی ہوئی ہو، اسی کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور استبداد لئے کی سعی کی جائے گی اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر، ان کے سامنے مسائل اور بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی، چہ جائیکہ بدھے اور پھلے پھولے۔ لیکن استغناء کے معنی ایک سوئی انقطاع، گوشہ گیری اور علیحدگی پسندی نہیں بلکہ بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں کہ یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستثنیٰ بھی ہوں، مسائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے مشکلوں میں کدھے سے کدھا کھان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ مسائل بن کر نہیں محسن بن کر

اور ایثار پیشہ بن کر گھسیں، جسے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو، کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت و ثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

معلم و امام اقوام..... اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں۔ اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجہ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں صلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کی دعوت عام، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے۔ اس لئے اس کی ترقی و تنزل اور عروج و پستی کے پہچاننے کا بھی یہی معیار ہو سکتا ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں خواہ دیانت و سیاست ہو یا تمدن و معاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ و صلح، امن ہو یا بد امنی، سرمایہ داری ہو یا ناداری، وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے، نہ احسان و ایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

اب اگر مسلم قوم کا نظریہ محض کسی نقطہ زمین پر آرام و آسائش یا زیادہ سے زیادہ کچھ ٹھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے کے ساتھ گذر بسر کر لینا ہے تو اس ملک کی مختلف اقوام کے ہجوم میں اس کا نتیجہ اس کے حق میں رشک، احساس کمتری، حرص و آوار اور پھر اس سے قلبی بے چینی، اندرونی تشویشات، ماتم سرائی، اضطراب و گھبراہٹ اور پراگندہ خاطر کی صورت میں نمایاں ہوگا، جیسا کہ ہو رہا ہے اور وہ کبھی چین اور امن کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ اسی لئے اسلامی زندگی میں اس گذر بسر کے تصور کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں۔ جبکہ اس کے ساتھ وہ معیار جذبہ نہ ہو جس پر اس قوم کی بنیاد ہے اور جس کی خاطر دنیا میں اسے مبعوث کیا گیا تھا۔

قلبی تمکین..... ہاں اگر وہ ہے تو پھر ان مذکورہ خطرات کی بجائے قوم میں قلبی تمکین، اطمینان خاطر و دل جمعی اور استغناء اور تفوق (برتری) لازمی ہے اور اسی کے ہوتے ہوئے قوم کی امتیازی شان یا وجاہت، حیثیت عرفی اور اقوام کے قلوب میں اس کی ہیبت قائم رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسے بار بار دہرا چکی ہے۔

اندریں صورت اگر اس ملک میں دائیں بائیں بازو کے ساتھ ایک تیسری قوت مسلمان بھی ہیں تو انہیں اور ان کے تمام افکار و نظریات زندگی کو پہلے اسی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہوگی۔ جس معیار کی رو سے وہ مسلمان کہلائے۔ اس لئے سوالات کی یہ نوعیت باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کے کس خطے میں مسلمانوں کی اخلاقی یا سماجی حالت کیسی ہے یا دوسری اقوام سے ان کے تعلقات کیسے ہیں اور ان کی سیاسی پالیسی کیا ہے؟ یا وہ نادار اور بے روزگار ہیں یا سرمایہ دار اور برسر کار؟

بلکہ سوال کی صحیح نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں، وہ اس قوم کے بنیادی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہے تو ان کے دلوں میں ان کا بنیادی نصب العین کس طرح پیدا کیا جائے اور انہیں مختلف مصنوعی نصب العینوں سے ہٹا کر کس طرح اصلی اور حقیقی نصب العین کی طرف لایا جائے۔ غیر مسلموں کی نظر ہمارے حالات پر نہیں بلکہ کردار اور اخلاق اور قومی خصوصیات پر ہے جنہیں وہ تاریخ سے جانتے ہیں۔ عظیم تعمیر کی خدمت میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک موجودہ حالات اور کردار اور اخلاق کی گراؤ، نیز منصب سے روگردانی ہی نے انہیں اسلام کی اور مسلمانوں کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کردار و اخلاق معیار کے مطابق ہوتا اور اپنے منصبی فریضہ سے وہ غافل نہ ہوتے تو شکوک کی گنجائش نہ تھی۔ ہر شبہ کا جواب مسلمانوں کا کردار بن جاتا، جیسا کہ پہلے بتا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے بغیر ان کا مستقبل تاریک ہے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہ اتحاد بھی تجربہ اور قرآنی شہادت کی رو سے محض رسمی تنظیموں سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کی صورت بھی ایمان و عمل صالح اور بالخصوص دعوت الی اللہ ہی سے ہویدا (ظاہر) ہوتی ہے۔ جس حد تک ہماری مخلصانہ توجہ اغیار کی طرف ہوگی اور ہم اسلامی حلقوں کی توسیع کی طرف متوجہ رہیں گے، اس حد تک طبعی طور پر باہمی خلفشار سے بچے رہیں گے۔ اگر جناب ان سوالات پر بھی خود بھی غور فرما کر یا ملک کے اہل فضل و کمال سے ان کے جوابات طلب فرما کر ان کے حل کی طرف متوجہ ہو جائیں گے تو یہ یقیناً قوم کے امتیاز و تفوق اور اس کے کردار کی بلندی کی ایک عظیم تعمیری اور بنیادی خدمت ہوگی۔

سوالات گرامی دیکھ کر جہاں ان سے استفادہ کی توفیق ہوئی، وہیں یہ چند سوالات بھی ذہن میں ابھر آئے۔ گو طالب علمانہ ہیں مگر پھر بھی پیش کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی تربیت میں خواہ وہ سیاسی اور اقتصادی ہو یا مذہبی، اگر یہ معیار پیش نظر رہے تو امید ہے کہ ان کی حالت بدل جائے گی اور ان میں حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

والسلام
محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۳/ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

تیونس و مراکش کی جدوجہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدا نشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو، یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے، اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکش بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضِلِلْہٗ فَلَا هَادِیَ لَہٗ . وَنَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَسَیِّدَتْنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ، اُرْسَلْہٗ اللّٰہُ اِلَیْ کَافَّةٍ لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ، وَدَّاعِیًا اِلَیْہِ بِاَذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُنِیْرًا۔“

احوال واقعی..... بزرگان محترم! ہم یہاں انسانی تاریخ کے ایک اہم مرحلے پر ایک بڑے مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، میں خداوند برتر و توانا کا اور اس کے بعد آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقع پر صدارت کی عزت سے سرفراز فرمایا اور یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے دو قوموں کی آزادی کے معاملہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔

حق خود ارادیت..... زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہمارے میدان، ہمارے کھلیاں، ہمارے گاؤں کے چوپال اور بڑے بڑے شہروں کے ہال اس نعرہ سے گونج رہے تھے کہ آزادی ہمارا پیدا نشی حق ہے۔ آج جبکہ ہمارا ملک آزاد ہے اور اس کی آزادی کے ۶ سال گزر چکے ہیں تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدا نشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکش بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔

آزادی کی حمایت..... حضرات! ہم یہاں ملک کی مشہور اور مؤثر جماعت جمعیت علماء ہند کی ہدایت پر تیونس اور مراکش کی آزادی کی حمایت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملک کے قومی اور مذہبی رہنماؤں

نے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کا نعرہ لگایا تھا۔ آخر کار غلامی کی فوجوں نے ہندوستان چھوڑ دیا اور انگریزوں کو ہندوستان سے بوریا بستر باندھنا پڑا۔ آج ہم اس شہر میں فرانس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تیونس اور الجزائر کو چھوڑ دے اور یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح ”ہندوستان چھوڑ دو“ کا نعرہ کامیاب ہوا۔

تیونس کی صورت حال..... محترم حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیونس اور مراکش کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کر دوں، تیونس ۴۸ ہزار مربع میل کا اسلامی علاقہ ہے جو شمالی افریقہ میں بحروم کے کنارے اٹلی اور فرانس کے سواحل کے سامنے واقع ہے۔

یہاں آخری مردم شماری کے مطابق ۲۶ لاکھ انسان آباد ہیں۔ اب یہ آبادی اندازاً ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں ایک لاکھ آٹھ ہزار فرانسیسی موجود ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں۔ یہاں برائے نام ایک سلطان موجود رہتے ہیں مگر اصل راج فرانسیسی شہنشاہیت کا ہے۔ پچاس سال کا عرصہ ہو گیا کہ غیر ملکی طاقتیں تیونس کے معاملہ میں بے جا اور ظالمانہ طور پر دست اندازی کر رہی ہیں۔ تیونس کی جنگ آزادی نئی دستور پارٹی کی رہنمائی میں لڑی جا رہی ہے مجھے اس تحریک کے اسیر رہنا جناب حبیب بورقیہ سے گذشتہ سال اسی شہر بھینی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب کہ انہوں نے خلافت ہاؤس کے ایک نمائندہ اجتماع میں اپنے مطالبات آزادی کی شرح فرمائی اور مجھے ان کی تائید میں تقریر کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ اس مختصر تقریر میں انہیں یقین دلایا گیا کہ ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اور بالخصوص مذہبی حلقہ آپ کے مطالبات کی تائید میں ہے۔ آج ایک سال کے بعد اسی وعدے کو دہرانے کا پھر موقع مل رہا ہے، آپ کے شہر میں تیونس امدادی کمیٹی موجود ہے۔ جس کا اعلان آپ تین چار روز پہلے اخباروں میں دیکھ چکے ہیں جو ان نعروں اور وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔

مراکش کا مسئلہ..... تیونس سے زیادہ مراکش کا مسئلہ بین الاقوامی ہنگامہ آزادی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراکش شمالی افریقہ میں مغرب اقصیٰ کا ملک ہے۔ یہ ملک عرض البلد شمالی کے (۲۸) اور (۳۶) درجے کے درمیان اور طول البلد غربی کے (۳) اور (۱۴) درجے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحروم اور آبنائے جبل الطارق، مغرب میں اٹلانٹک سمندر، جنوب میں صحرائے اعظم اور شمال مشرق میں کوہستان واقع ہے، اس کا رقبہ ۵ لاکھ ۸۱ ہزار کلومیٹر مربع میل ہے۔

مراکش کو فرنگی اقوام نے جو بد قسمتی سے اس وقت جمہوریت کے نام پر دنیا کی ٹھیکیداری بنی ہوئی ہیں۔ تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کی سالمیت، طاقت اور صلاحیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ایک حصہ فرانسیسی مراکش ہے جو فرانس کی غلامی میں ہے۔ اس حصہ کا دار السلطنت فیض ہے اور اس کی آبادی ۸۴ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ دوسرا حصہ اسپینی مراکش ہے جو اسپین کی غلامی میں ہے، جس کا پایہ حکومت رباط ہے اور اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔

تیسرا حصہ سفید فام بین الاقوامی غلامی کے ماتحت ہے جس پر انگریز فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، امریکی، ڈچ

اور تنظیم شہنشاہیت پسند طاقتیں حکومت کرتی ہیں۔ اس کا دار الخلافہ طنجہ ہے اور اس کی آبادی دس ہزار ہے، ایک عام اندازے کے مطابق مراکش کی آزادی کا مسئلہ کم یا زیادہ ایک کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔
دوئی سلطنتیں..... پس آج شمالی افریقہ کے نقشہ پر اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر دوئی سلطنتیں ابھر رہی ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق اب دونوں قوموں کی آزادی ایشیا کی طاقت میں ایک نیا اضافہ کرے گی اور ان دونوں ملکوں کی آزادی سے دنیا کے امن کو ایک نئی ضمانت مل سکے گی۔

اس نقشے کے پیش نظر ہم آج یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آزادی کا وہ نعرہ جو ساری دنیا میں گونج رہا ہے، تیونس اور مراکش کو اس سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔

ہم دنیا کی رائے عامہ کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فرانسیسی شہنشاہیت کو تیونس، الجزائر اور مراکش سے دستبردار ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برطانیہ ہندوستان اور پاکستان سے، امریکہ فلپائن سے، اٹلی طرابلس اور حبش سے اور ہالینڈ انڈونیشیا سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

مطالبات اور تائید..... ہمارا یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ:

1..... تیونس کی نئی دستوری پارٹی اور مراکش کی استقلال پارٹی دونوں ملکوں کے عوام کی طرف سے آزادی کا مطالبہ کر چکی ہیں اور یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

2..... اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت تیونس اور مراکش کی آزادی، آزاد دنیا کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے اور اقوام متحدہ کی اسمبلی میں دو نئے ملکوں کے داخلہ سے خود اقوام متحدہ کی ساکھ بڑھے گی اور شکوک و شبہات کم ہو جائیں گے جن سے دنیا کے امن کو خطرہ درپیش ہے۔

3..... عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتیں تیونس اور مراکش کی آزادی کے لئے اقوام متحدہ کی راجد ہانی (دارالحکومت) میں سرگرم کار ہیں اور ان طاقتوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو سلامتی کونسل میں دونوں ملکوں کی آزادی کا مقدمہ پیش کر دیا ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ آزاد ہندوستان بھی شامل ہے، نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہے۔ اس لئے یہ ہماری قومی پالیسی کا بھی تقاضا ہے کہ ہم ان دونوں ملکوں کے جہاد آزادی میں پوری پوری حمایت کریں۔

4..... ۶ ستمبر کے اجلاس میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اقوام متحدہ میں عرب ملکوں کے نمائندوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ پر زور طریقہ پر پیش کریں اور اپنے دوست ممالک سے اس مسئلہ میں کمک حاصل کریں۔

فرانس کا دیوالیہ پن..... سیاسی واقعات کے اس صاف و صریح نقشے کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک تجویز کی صورت میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں جبکہ ابھی ماضی قریب میں پچاس کروڑ انسان (جو دنیا کی آبادی کا

پانچواں حصہ ہیں) اپنی آزادی کے مالک بن چکے ہیں۔ فرانس کا ایک کروڑ انسانوں کا غلام بنائے جانے پر اصرار کرنا اس کے سیاسی دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے، جسے آج کل کے دور میں آزاد قوموں کی منظوری نہیں ہو سکتی۔ اندریں حالات ہندوستانی عوام اور ان کی حکومت جنہوں نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اور آج مصر اور فلسطین کی آزادی کی حمایت میں ہموائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی تائید و حمایت سے بھی کسی طرح چشم پوشی اور سکوت نہیں کر سکتے۔

آج دنیا میں امن، انصاف، حق خود ارادیت، مساوات اور انسانیت کے الفاظ سب سے زیادہ یورپ کی آبادیوں کے زہان زد ہیں۔ اگر ان کے یہاں ان الفاظ کے کچھ معنی ہیں اور حقیقتاً یہ الفاظ مہمل اور بے معنی بنا کر استعمال نہیں کئے جا رہے ہیں، تو فرانس، اٹلی، بلجیم، اسپین، انگلستان، امریکہ اور تمام ان یورپین طاقتوں سے جو تیونس اور مراکش پر اپنا پنجہ استبداد (قبضہ) جمائے ہوئے مطمئن بیٹھے ہیں۔ ہم یہ اپیل کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انسانیت پروری کے دعویدارو! امن و انصاف کے ٹھیکیدارو! اور اے خود ارادیت اور انسانی حقوق کے علمبردارو! تمہیں تیونس اور مراکش کی آبادیوں کو غلام بنائے رکھنے پر آخر کیوں اصرار ہے؟

اگر تمہیں حقیقی امن و انصاف اور انسانیت کی لاج نہیں تو کم از کم اپنے ان لفظی دعوؤں ہی کی پاسداری کرو اور ایک کروڑ انسانوں کے ایک ایسے جائز مطالبہ کی راہ میں حائل نہ ہو، جن کی ملک پر پوری جمہوریت پسند دنیا کھڑی ہوئی ہے۔ مطالبہ آزادی کی مذہبی پوزیشن..... حضرات! مجھے چوں کہ ہندوستان میں بلکہ ایشیا کے سب سے بڑی مذہبی اور علمی مرکز دارالعلوم دیوبند سے ذمہ دارانہ تعلق ہے اور اسی کے ایک ذمہ دار اور خادم کی حیثیت سے میں نے اسلامی اخوت کا حوالہ دے کر تیونی لیڈر جناب حبیب بورقیہ کو یقین دلایا تھا کہ اس مطالبہ میں ہندوستان کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بے موقعہ ہوگا اگر میں اس اہم ترین مطالبہ آزادی کی مذہبی پوزیشن واضح کئے بغیر اس افتتاحیہ کو ختم کر دوں۔ جبکہ کسی بھی ایسے اجتماعی یا سیاسی مسئلہ میں جس میں مسلمان بالاستقلال یا دوسری اقوام کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں، اسلام نے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ صاف، واضح اور روشن ہدایات دی ہیں۔ جہاں تک کسی قوم کی آزادی اور عالم قوموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس کا سب سے بڑا حامی ہے۔ فرعون سے بنی اسرائیل کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ آزادی اس بارے میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔ اسرائیل کو مصر کی فرعونی حکومت نے غلام بنا رکھا تھا۔ انہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا، اقتصادی حالت ان کی زبوں (بدتر) تھی۔ اوپر سے انہیں پارٹیوں میں منقسم کر دیا گیا تھا تا کہ ان کی سالمیت اور اجتماعی صلاحیت ختم ہو جائے۔ اس کا زینہ اولادوں پر کنٹرول تھا اور پیدا ہوتے ہیں نہ تیغ کر دیا جاتا تھا تا کہ آئندہ بھی ان میں کوئی اولوالعزم سپوت پروان نہ چڑھنے پائے، جو اپنی قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر ابھر جائے اور اس غلام قوم میں کوئی صحیح لیڈر شپ قائم نہ ہو جائے۔ جو ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے، لیکن غاصب قوم کی اپنی سفاکیوں اور چالاکیوں کے اندھیریوں

میں بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مقدس ہستی اسرائیلیوں میں پیدا ہوئی اور ابھری جسے فرعون جیسے قاتل بنی اسرائیل کے دربار میں شاہانہ طریق پر بلوایا گیا۔ اور آخر انہوں نے قوم کی اس بے بسی اور بے بسی کو دیکھ کر فرعونی دربار میں اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ فرعون نے اپنے کچھ سابقہ احسانات پر رورش جتا کر اور نعمتوں کے تذکرہ سے مطالبہ آزادی کو ٹٹلانا اور لانا چاہا۔ جس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

”ہاں میری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے شاید یہی ہوگی کہ تو نے میری قوم کے لاکھوں افراد کو غلام بنا رکھا ہے، پھر اس نے دھکیوں سے مطالبہ آزادی کو دباننا چاہا جو ظالم قوموں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے اور کہا: ”اے موسیٰ! میں تجھے جیل بھیج دوں گا۔“ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ”اگرچہ میں روشن دلیلیں بھی اپنے مطالبات کے جواب میں پیش کر دوں یعنی جیل اور قید و بند کی دھکیوں سے ایک مدلل دعویٰ کا جواب تھوڑا ہی ہو سکتا ہے؟“

ان غلط حیلہ جوئیوں سے کوئی اثر نہ لیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرعون کے سامنے یہ مطالبہ آزادی رکھ دیا ہے کہ میں بحکم خداوندی کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ کر دے اور ان کو غلامی کا عذاب دینے سے دست کش ہو جا۔ در صورت خلاف ورزی فرمایا کہ: ورنہ پھر اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی اور حق و صداقت کے مطالبات جھٹلانے کا وبال جھٹلانے والے ہی کو بھگتنا ہوگا۔

اس واقعہ میں خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو مطالبہ آزادی دے کر بھیجنے سے واضح ہے کہ مظلوم قوموں کا مطالبہ آزادی ایک مذہبی حق ہے جس کو خدا کی طرف سے تائید ہی حاصل نہیں، بلکہ اس کا حکم اور امر شامل ہے جو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ ایسے مطالبات کو لے کر اٹھنے والا درحقیقت ایک مذہبی تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر جہاں تک کسی دے ہوئے وطن اور سرزمین کو غلاموں کے ناجائز قبضہ سے نکالنے اور حق دار کو قبضہ دلانے کا تعلق ہے۔ اسی واقعہ میں اس کی بھی صاف و صریح ہدایت ملتی ہے۔

استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار پر عتاب الہی..... سرزمین فلسطین پر عمالقہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور بنی اسرائیل کو جن کی وہ سرزمین تھی، اس سے محروم کر دیا تھا۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسرائیلیوں کو حکم بھیجا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارا حق ہے، اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرو اور عمالقہ کی غاصب اور جابر قوم کا قبضہ وہاں سے اٹھا دو۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ کے تن و توش اور ظاہری قوت سے مرعوب ہو کر تعمیل حکم میں پس و پیش کیا اور غاصب قوم کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر اپنے وطن میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک یہ جابر قوم ہمارے وطن کو خود نہ چھوڑ دے گی ہم اس میں داخل نہ ہوں گے۔ ﴿هَٰذَا لَوْلَا يُشْمَسُوْنَ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ

وَ اَنَا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا﴾ ①

قوم کو سمجھایا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس پر بھروسہ کرو، وعدہ ہے کہ جب تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تم ہی کو دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی بنی اسرائیل جی چراگئے اور استقامت وطن کے لئے جدوجہد کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر انہیں خدا کی طرف سے سزا دی گئی۔ ایک قویہ غلبہ و قبضہ چالیس برس مؤخر ہو گیا۔

اور دوسرے ۴۰ سال کی اس لمبی مدت میں بنی اسرائیل وادی حبیہ میں بھٹکتے پھرے، گویا سڑا کے طور پر گھر سے بے گھر بھی رہے اور معتبوب الہی بھی ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ظالم قوموں سے اپنی سرزمین کا چھڑانا ایک ایسا مذہبی فریضہ ہے کہ اس میں پس و پیش یا انکار کرنے سے اقوام معتبوب خداوندی ٹھہر جاتی ہیں اور انہیں مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس مقصد کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔

آزادی، مذہبی اور انسانی حق پس! آج تیونس اور مراکش کے باشندے اگر فرانس سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے ان سے اپنی سرزمین چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے ملک پر خود اپنا قبضہ چاہتے ہیں تو یہ ان کا شرعی اور مذہبی حق ہے جس کو انہیں بہر صورت حاصل ہی کرنا چاہئے۔ اور اگر ہم یاد دلائے اسلام کے تمام باشندے خواہ وہ عرب لیگ کے ممبر ہوں یا عرب ممالک کے سرکاری نمائندے اس مطالبہ آزادی کی حمایت میں فریضہ حکومت اور یورپین اقوام کے غاصبانہ اقتدار کے مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ان کا یہ فعل نہ صرف بین الاقوامی قانون، آزاد ممالک اور جمہوریت پسند اقوام کی مختلف خواہشات کے مطابق ہے، بلکہ مذہبی اصول اور اسلامی قانون کے منشاء کے بھی عین مطابق بلکہ اس کے امر و حکم کے تحت ایک شرعی فریضہ ہے۔

بہر حال تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی یہ حمایت خود ان ملکوں کی ذمہ دار عوامی جماعتوں، اقوام متحدہ کے چارٹر، عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتوں، عرب لیگ کمیٹی کی تجویز، ہندوستان کی جمہوریت پسند پالیسی اور بالآخر مذہب کی صاف و صریح ہدایت کے تحت نہ صرف واجبی بلکہ واجب اور انسانیت کے حقوق کی صحیح حفاظت ہے۔ جہاد آزادی میں شرکت ہم جمعیت علماء ہند کے شکر گزار ہیں کہ اس نے عین وقت پر اس ملک کے لوگوں کو، مساوات کا شور برپا کرنے والوں کو کہا، اگر تم واقعی ان الفاظ سے دنیا کو دھوکا نہیں دے رہے ہو ان کا قومی اور مذہبی فریضہ یاد دلایا۔ ہم ان تمام جماعتوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس عظیم مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور آئندہ کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں اس کام کو قانونی پوزیشن کی حد تک اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی اور اپنی قومی پالیسی کی رہنمائی میں جاری رکھنا چاہئے اور ہمیں اس کے اس نمائندہ اجلاس میں ایک مکمل اور جامع تجویز سلامتی کونسل میں بھیج کر شبلی افریقہ کے اس جہاد آزادی میں اپنی شرکت کا واضح یقین دلادینا چاہئے۔ نیز مجھے امید ہے کہ ذمہ داران اجلاس اس موقع پر اپنی سیاسی اور مذہبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بارہ میں ہندی عوام کے نقطہ نظر سے تیونس اور مراکش کے تمام باشندوں کو بھی باخبر کر دیں گے۔ (وَاللّٰهُ التَّوَفِیْقُ)

آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند

مجیدہ حالات میں متفاد عناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشاکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے، جو ان متضاد نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو جو سب کے قصینے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتا مذہبی جماعت ہو سکتی ہے جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں بیچ اور حقیر بن کر رہ جائے۔ مذہب اور بالخصوص ”دین فطرت“ (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَلَاةِ الْبَنَاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَّاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَبِرَاجِئَاتِهِ“

شکر یہ اکابر..... زرگان ملت واعیان اٹت! اس مقدس جلسہ کی صدارت کا یقیناً میں اہل نہ تھا۔ پھر بزرگان اور اکابر شیوخ کی موجودگی نے تو میری ذات ہی کو درجہ صفر میں پہنچا دیا ہے، اس صورت میں کسی نام نہاد اہلیت کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جرات نہیں ہوتی کہ اس مقام پر کھڑا ہوں چہ جائیکہ کچھ عرض و معروض کروں۔ ساتھ ہی اس مقام کی ذمہ داریاں اور وہ بھی بحالات موجودہ جن وسیع معلومات اور جس ہمہ گیر فکر و تجربہ کی متقاضی ہیں وہ اپنے اندر مفقود ہیں۔ اس لئے رہی سہی ہمت بھی جواب دے دیتی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ جن بزرگوں نے بنام صدارت یہ عزت افزائی فرمائی ہے وہی اس کی سرپرستی بھی فرما رہے ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہونے کی جرات کی اور اکابر واعیان کے شکریہ کے بعد ذیل کی چند معروضات پیش کرنے کے ہمت ہوئی۔

نظریاتی فتن کا دور..... حضرات محترم! آج کے حالات جن سے ہم گزر رہے ہیں نہایت مجیدہ اور نازک ہیں، سطح پر سکون ہے مگر سطح کے نیچے آب زیر کا مضمون ہے۔ اوپر سے سبزہ زار ہے مگر اندر خارزار، اگر کوئی تحملین سبزہ

زار میں گھس جاتا ہے تو نیچے کے چپے ہوئے خار اسے زخمی کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ خصوصیت سے مسلمانوں کا معاشرہ چند در چند فتن میں گھرا ہوا ہے شریعت نے دین کے بارے میں خبر دی تھی کہ دو فتن میں دین کا سنبھالنا ہاتھ میں چنگاری سنبھالنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن آج دنیا کا تھا منادین تھانے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ کشمکشوں اور مصادماتوں کا دور دورہ ہے۔ قوم میں باہم جماعتی کش مکش علیحدہ ہے قومی رجحانات اور ہیں اور سرکاری کچھ اور، کچھ ان دونوں لائنوں سے الگ ہو کر دونوں کے مد مقابل ہیں، افراد و جماعت ہی میں کش مکش نہیں بلکہ نظریات بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ ان کشمکشوں میں مسلمان ۔

”دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنون را“

کا مصداق ہے اور اس کی ہدف ہونے کی صورت یہ ہو گئی ہے کہ:

ہر بلائے کز آسماں آید بر زمین نارسیدہ می پرسد

خانہ انوری کہا باشد؟

یعنی مسلم آزار اغیار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر مسلم آزاروں کی فہرست تیار کی جائے لگے تو اغیار کے ساتھ مسلمان بھی اس میں نظر آئیں گے۔

متضاد عناصر کی ہمہ گیر رہنمائی..... ظاہر ہے کہ پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی رہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں، البتہ اس تضاد اور کش مکش کے میدان میں وہ جماعت آگے آ سکتی ہے جو ان متضاد نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو، اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو، سب کے قبیضے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدر تا قدر جماعت ہو سکتی ہے، جو مذہب کی لائن پر خود بھی کا مزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں پیچ اور حقیر بن کر رہ جائے، مذہب اور بالخصوص ”دین فطرت“ (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

اس ہندوستان کی سر زمین میں اگر حضرت سلطان الہند خواجہ اجیری، نور ہند خواجہ کلیری، قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ہر قرن کے علمائے ربانی و مشائخ حقانی قدس اللہ اسرارہم، نے ہر پارٹی ہر فرقہ اور ہر فریق کو آخر اپنی وسعتوں میں گم کر کے رکھ دیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سسٹم کا شرہ نہ تھا بلکہ پارٹی فیلنگ (سوچ) سے بالاتری کا کرشمہ تھا۔ آج بھی اگر مسلم اقوام کی صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے تو خواہ وہ کسی لائن پر ہو، انہیں اعیان امت کے اس ہمہ گیر رنگ اور انہی کے سچے چائینوں کے اسوہ پر کار آمد اور موثر ہو سکتی ہے۔

جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت..... جمعیت علماء اپنی اصل فطرت سے ایک خالص مذہبی

جماعت ہے۔ گو اس نے ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا۔ قربانیوں کا لگا تار سلسلہ صفحہ تاریخ پر ثبت کیا اور آزادی کے میدان جنگ میں نہ صرف یہی کہ کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سب سے آگے ہو کر کام کیا۔ لیکن پھر بھی اس کی بنیاد مذہب تھی اور مذہب ہی کے معیار سے اس نے یہ کچھ کیا۔ وقتی ضرورت ختم ہو جانے پر بالآخر اس نے پھر اسی اصل کی طرف رجوع کیا جو اس کی اصل سرشت تھی یعنی مذہب اور مذہب ہی روحانیت۔

جمعیت علماء نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے علیحدگی کا جو نظریہ قائم کیا وہ یقیناً قومی تعمیر کے لحاظ سے موزوں ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ نہ اس لئے کہ سیاست کوئی شجر ممنوعہ تھی یا وہ اسکے حق میں عدم جواز کے تحت میں آگئی تھی، بلکہ عام سیاسی مصالحوں کے علاوہ اس لئے کہ انقلاب کے بعد کسی قوم کو بنانے والے طبقہ کے لئے سیاسی الجھنوں سے یکسو ہونا ہی طبعاً ضروری ہوتا ہے اور وہ سیاسی اتار چڑھاؤ میں گھر کر تعمیری کاموں کے لئے وقت نہیں دے سکتا۔ قومی تعمیر کی دفعات..... قومی تعمیر کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام کو جو اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سمیت کر ذیل کے عنوانات کے تحت میں لاسکتے ہیں:

نظام تعلیم، نظام تبلیغ، اصلاح معاشرہ اور مذہبی و جمہنی حقوق کا سیاسی تحفظ۔ قومی تعمیر کی ان دفعات میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے جس سے کسی قوم کا دل و دماغ بنایا جاتا ہے۔ تمام کامیابیاں اور ہر نوع کی عزت و سربلندی کا ابتدائی زینہ علم ہے، حق تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کا سلسلہ اسی علم کی نظر و اشاعت کے لیے قائم فرمایا۔ اسلام میں سب سے پہلی آیت ہی ”اقرا“ نازل ہوئی جس کا حاصل پڑھنے پر ابھارنا ہے۔ اسلام سے قبل کا قریبی دور گو ساری ہی بشری خرابیوں پر مشتمل تھا مگر اسے ”دور جاہلیت“ کا نام دے کر یہ بتلایا گیا کہ ہمہ نوع شر و روآفات کا سرچشمہ جہل اور ہمہ نوع کمال و خوبی کا سرمنشا علم ہے، اس لئے دینی تقاضوں کے اعتبار سے سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔

سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ..... وقت کے لحاظ سے یہ بھی مسئلہ مسلمانوں بلکہ ہر مذہبی فرقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ توجہ طلب ہے، کیوں کہ جبری تعلیم کے قوانین کے تحت جو نصاب حکومت نے تیار کیا ہے اس سے سیکولر ازم کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا عام رخ بلکہ اس کے بہت سے اجزاء اسلام کے عقائد و اعمال پر براہ راست ایک مستقل زد ہیں۔ جس سے ایک مسلمان بچہ کا عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مسلمان باقی رہنا دشوار ہے۔ اس لئے بمقامضائے وقت بھی اس کی شدید کی ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی کفالت قومی طور پر کی جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی اکابر امت اور نبض شناسان قوم کی یہی اعلیٰ ترین سیاست تھی کہ وہ جاہلادینی مدارس قائم کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے سنبھال لیا۔ یہ مدارس آج بھی بھرا اللہ کامیابی کے ساتھ جاری اور اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان میں سے کتنے ہی مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہانپور، مدرسہ شاہی مراد آباد وغیرہ، ان مدارس کا مقصد جامع علماء تیار کرنا ہے، جو قوم کی ہدایت و رہنمائی کے فرائض انجام دیں۔ لیکن موجودہ دور اور اس کے حالات کے لحاظ سے ان مدارس کے علاوہ ایسے مکاتب کی بھی اشد ضرورت پیش آگئی ہے جو مختلف پراگندہ بلکہ گندہ لٹریچروں کے زہرِ پلے اثرات سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ اگر مدارس دینیہ علماء تیار کریں تو یہ مکاتب دینیہ پڑھے لکھے دین دار تیار کر سکیں جو گو عالم نہ ہوں مگر دین کی سمجھ رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم اور ذریعہ تعلیم..... جمعیت نے ان ہی مقاصد کی روشنی میں کافی عرق ریزی سے ایک جامع نصاب تیار کر لیا ہے جو ہندو متق ملک میں اپنی جگہ کرتا جا رہا ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبے جمعیت کے ساتھ اس بارے میں تعاون کریں اور اس کے پروگرام کے مطابق یہ نصاب رائج کرنے پر تمل جائیں تو بہت حد تک اس زہر کو نکالا جاسکتا ہے۔ جو ان غیر معتدل نصابوں یا مروجہ بلیک تعلیم (اندھی تعلیم) کے ذریعہ دل و دماغ میں پیوست کیا جا رہا ہے۔

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم اردو کے سوا دوسرا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ اسکا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اردو ایک ہلکی اور شیریں زبان ہونے کے علاوہ یہاں کی مادری زبان بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سے علوم و فنون کی خزانہ دار بھی بن چکی ہے، اس کا تحفظ علوم و فنون کا تحفظ ہے جو بہر حال مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی کی رکھی اور تفہیم اردو کی، اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی، بلکہ دنیائے اسلام کے ہزار ہا افراد ان مدارس کی بدولت اردو دان ہو گئے اور آج افغانستان، ایران، چینی ترکستان، روسی ترکستان، غازی، افریقہ، عراق، جاوا، سائرا وغیرہ دور دراز ممالک بھی اردو زبان سے بے گانے اور بے تعلق نہیں۔ اور اس لئے جتنے ادارے آج اردو کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں ہمیں ان سب کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو نے تحفظ اردو کے سلسلے میں جو کامیاب مہم شروع کی، جمعیت علماء اور مدارس دینیہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور تاجحد مقدور اس میں تعاون سے کام لیا جس کے اچھے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

ذوق عربیت کی اہمیت..... مجھے اس سلسلہ میں ادھر بھی توجہ دلانا ہے کہ جیسے اردو ہماری وطنی اور علمی زبان ہونے کی حیثیت سے اس ملک میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عربی زبان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یہ قرآن و حدیث کی زبان ہے جو ہمارے دین و مذہب کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس حد تک مذہب میں فنائیت کا مقام رکھتے ہیں، اسی حد تک وہ اس مذہبی زبان سے نابلد اور بے پرواہ بھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن اور اس کے محاورات سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی، جو بہت حد تک ان کے دینی ذوق کے لئے حجاب اور کتاب و سنت سے بے تعلق کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر اقوام و ملل اور دنیا کے ممالک میں ربط باہمی کا ذریعہ زبان کے سوا دوسرا نہیں تو کتاب و سنت کے نگاہ اور ربط پیدا کرنے کا ذریعہ بھی عربی زبان کے سوا دوسرا نہیں۔

ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمان بچوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بے گانہ نہ رکھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس ضرورت کو مولانا محفوظ الرحمن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سیکرٹری نے پورا کر دیا ان کے عربی نصاب کا پانچ کتب پر مشتمل سیٹ عربی کی ایک قابل قدر بیچ مچ ہے جس سے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ قلیل مدت میں قرنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھی اس اردو نصاب کے ساتھ جو جمعیت علماء نے مرتب کیا ہے مکاتیب کا جزو بنا دیا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو یہ اہم ضرورت پوری ہو سکتی ہے، جو کتاب وسنت ہی کی حد تک نافع ثابت نہیں ہوگی بلکہ دنیاے اسلام کے باہمی رابطہ کے لئے بھی موثر اور کارآمد ثابت ہوگی۔

تربیت عوام..... لیکن تعلیم پھر بھی تربیت خواص کا ذریعہ ہے اس سے تذکیر عوام کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس کا ذریعہ تبلیغ ہے۔ بشرطیکہ وہ جماعتی خصوصیات کی نہ ہو کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور مسائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خالص اسلامی مسائل کی نشر و اشاعت اور الہام فلاہم کے قاعدے سے جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں انہی کے مناسب حال شریعت کے مسائل سے دماغوں کو روشنی بخشی جائے۔

جمعیت علماء اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی اس کی رپورٹوں میں تبلیغی خدمات کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے۔ فی الحال ایسے مبلغ تیار کئے جانے کی ضرورت ہے جو جھگڑا لوند ہوں، ضدی نہ ہوں، سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ مسائل کو سلجھا کر دماغوں میں سلجھاؤ پیدا کر دیں۔ آج جبکہ پرچار اور تبلیغ کے نام پر بہت سے پرانہ خیالات اور غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں، اشد ضرورت ہے کہ صحیح مسائل کو پیش کر کے دلوں کو تشنہ و پرگندگی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ اصلاح معاشرت..... آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عامۃً مسلمانوں کی معاشرت غیر اسلامی ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا رہن سہن چال چلن رفتار گفتار وغیرہ غیر اقوام کے نمونہ کا ہوتا جا رہا ہے۔ روحانی آداب کے بجائے جذبات نفسانی دل و دماغ پر چھاتے جا رہے ہیں۔ شادی غمی کے اجتماعات اور خانگی زندگی میں غیر اسلامی رسوم اور منکرات بطور جزء زندگی کے داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلم قوم کا صحیح کیریئر اور مقام مشخص (خاص) نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

اور وہ محض وعظ و پند یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہر ہر مقام پر برادر یوں میں سے بااثر لوگوں کو جن کر ان کی عملی کمیشیاں بنائی جائیں۔ برادری کے بڑوں کی اصلاح پر زور صرف کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ اس اثر کو پھیلا دیا جائے جس میں عملی مشقت اور جدوجہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جمعیت علماء قیام مکاتیب اور تبلیغی نظام کے سلسلہ میں یہ خدمت باحسن اسلوب انجام دے سکتی ہے۔ پس قیام مکاتیب اور تنظیمی مساعی کے وقت اس اصلاحی تنظیم کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہ سہولت کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ اصلاحی کام خود اتنا وسیع اور اہم ہے کہ جو طبقہ بھی اس کام میں ہمت تن لگ جائے گا، اسے دوسرے میدانوں میں کودنے کا وقت نہیں مل سکتا۔

بنابراین ان امور کے لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔ قومی کاموں کے سینکڑوں شعبے ہیں اگر کارکنوں کا ایک ہی طبقہ سارے کاموں کو سنبھالنے کی فکر میں لگ جائے تو کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تقسیم عمل کے اصول پر کارکنوں کی جماعت کو بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔

جمعیت علماء ان تعمیری خدمات میں لگ کر یقیناً سیاسی میدانوں میں پہلے کی طرح نہیں اتر سکتی، لیکن اس کے معنی کلی یکسوئی کے بھی نہیں۔ اگر جمعیت علماء مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور عام اجتماعی خدمت کے لئے کمر بستہ ہوگی تو لامحالہ مثبت پہلو کے ساتھ اسے منفی پہلو بھی سامنے رکھنے ہوں گے اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حقوق پر کس راستہ سے زد پڑ رہی ہے؟ اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ اگر قانون ان حقوق پر اثر انداز ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا اور اسے اپنی پوری آئینی جدوجہد سے بدلنے کی سعی کرنا بھی اسی کا کام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس منفی پہلو کی روک تھام کے لئے اسے سیاست اور سیاسی رفتار سے کلی علیحدگی کئے بغیر، اس پر گہری اور تنقیدی نظر بھی رکھنی پڑے گی اور ساتھ ہی سیاسی حلقوں سے کچھ نہ کچھ قریب بھی رہنا ہوگا۔ اس لئے جمعیت علماء کے سیاست سے کلی علیحدگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاسی میدان سے اس حد تک تعلق اس کے ۱۹۴۷ء کے اعلان علیحدگی سیاست کا مخالف نہیں، کیوں کہ سیاست سے اس کا اتنا تعلق کسی عام عملی جدوجہد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹری سیاست کا تعلق ہے جس سے جماعتی علیحدگی کا اعلان ۱۹۴۷ء میں کیا گیا ہے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ گزارش کئے بغیر نہ رہوں گا کہ خاص افراد کو چھوڑ کر کم از کم جمعیت کے عام عہدیداران اور اس نظریہ میں عملی ہم آہنگی قائم کرنی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صورت حال غلط اور صحیح ہر قسم کے الزامات کا منشاء بنتی رہے گی۔

جو جماعتیں خالص سیاسی یا دفاعی لائنوں پر کام کرنا چاہتی ہیں، ہمارے لئے ان سے الجھنے کا کوئی موقع نہیں۔ تعمیری کام کتنے بھی ضروری ہوں، دفاعی ضرورتوں سے خالی نہیں رہ سکتے۔ بالخصوص جبکہ دور ہی کشاکشی اور کش کش کا ہو۔ تقسیم عمل کے اصول پر اگر کوئی جماعت اپنے اندرونی دواعی اور سچے ارادوں سے ایسی کوئی لائن اختیار کرتی ہے تو اس کے مسائل پر ہمیں جانچ اور تنقید کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن خود اس کیونٹی یا جماعت کو رد کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ اگر وہ آئین کے دائرے میں اپنے کام کے لئے کوئی وجہ جواز رکھتی ہو تو مکملہ خیر کہہ دینے کا بھی مضا لفظ نہیں۔

جمعیت کا منہبہائے نظر..... جمعیت علماء اپنے نام و رسم کے اعتبار سے اہل علم کی جماعت ہے، جس کا منہبہائے نظر مذہب اور دین ہے۔ اس لئے نہ صرف اپنے ہی حلقہ کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام کارکن جماعتوں کے لئے ایک مفتی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لیے اس کا اخلاقی ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی آئینی ربط بھی ملک کے ذی رائے طبقہ اور مسلمانوں کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے قائم رہنا مناسب ہوگا۔ تاکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی مذہبی ضروریات اور ان کی مواقع و مشکلات خود ان ہی حلقوں کی زبانی براہ راست جمعیت علماء کے سامنے آتی رہیں اور ادھر

جماعتی مسائل میں جمعیت کو بھی ہر طبقے سے فکری مدد ملتی رہے۔ اس سلسلہ میں اگر جمعیت کے انتخابات کی صورتیں امرکافی حد تک رسمیات سے آزاد ہو کر سادہ اور بے تکلف رہیں تو ان میں ہمہ گیری بھی بڑھ جائے گی۔ خود اس عوام کی کشش میں بھی اضافہ ہوگا اور کسی طبقہ کو بھی عقیدت سے اس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار..... ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء کے ذمہ دار کارکنوں نے مسلمانوں کے پرسنل اور مخصوص معاملات کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں نہ وہ نظر انداز کی جاسکتی ہے اور نہ ہی صفحہ عالم سے مٹ سکتی ہیں۔ ایسے معاملات کا سلسلہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک برابر قائم رہے گا جب تک کہ حالات کلیہ سازگار نہ ہو جائیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ججان اور زائرین حرم کے پاسپورٹ کے ساتھ انکم ٹیکس کے فارم کی خانہ پری کی قید بھی ہے جو اس سال سے لگائی جا رہی ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے ججان کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوگی اور اس کا اثر زائرین کی تعداد اور حج کے ابھرتے ہوئے ذوق و شوق پر بھی پڑ سکتا ہے۔

امید ہے کہ جمعیت علماء اس بارے میں پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے حج کے پاسپورٹ سے اس قید کو اٹھا دیئے جانے کی پوری پوری جدوجہد کرے گی۔

بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ..... اس سلسلہ میں ایک مسئلہ مسلمانوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ہے جو ان کے لئے باعث تشویش و پریشانی بنا ہوا ہے۔ اس میں الجھ کر کبھی ان میں ترک وطن کے وساوس ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی آئندہ نسلوں کے بارے میں پریشان کن خیالات انہیں ستاتے ہیں اور یوں بھی بے کاری بہت سے فتنوں کی آبیاری (افزائش) کی جڑ ہوتی ہے۔ برسر کار اور باروزگار ہو جانے سے خود ہی بہت سے مفاسد کا سد باب ہو جاتا ہے۔ جمعیت علماء اس کی کوئی ذمہ داری تو نہیں لے سکتی۔ لیکن اگر زیر غور مسائل میں یہ مسئلہ بھی سامنے رکھ لیا جائے تو قوم کے اغنیاء یا حکومت کے ذریعہ غرباء کی بیکاری کا مسئلہ حل کرنے کی کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس مسئلہ میں مسلمانوں کو تسلی دلائی جاسکے اور ان کے اطمینان خاطر کا کم از کم استدلالی سامان ہی فراہم کیا جاسکے۔

قیام مکاتب اور اصلاح معاشرت کی مساعی کے سلسلہ میں اگر یہ مسئلہ سامنے رہے تو ہر جگہ کے اغنیاء اور غرباء کے ارتباط (رابطہ) سے اس مشکل کے آسان ہونے کی صورتیں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوں گی۔

جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت..... بہر حال جمعیت علماء کی سابقہ بیش قیمت خدمات کے ساتھ آج بھی اگر اس کے تعمیری پروگرام اور کام کو سامنے لایا جائے تو اس کی وسعتیں سابق سے کم نہیں ہوں گی۔ یہ کہنا کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا کہ اگر جمعیت علماء نے سیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، تو اب اس کے مشکول میں کچھ باقی نہ رہا اور اس کی کائنات ختم ہو گئی اگر اس کی سیاسیات حقیقاً مذہب کے ماتحت اور بلاشبہ تھیں تو یہ کہا جاسکتا

ہے کہ پہلے بھی وہ مذہب ہی کا کام کر رہی تھی اور آج بھی مذہب ہی اس کے سامنے ہے۔ ضرورت ختم ہو جانے یا بدل جانے پر کام کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے، اصل موضوع و مقصد میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور اس لئے آج بھی اس کے نصب العین کا دامن پہلے ہی کی طرح بھرپور ہے اور اس لئے جس طرح ۱۹۷۷ء سے پہلے اس کے نظام میں شامل ہونے کی ضرورت تھی، اسی طرح آج بھی ہے۔

بالخصوص اس کے تعلیمی پروگرام کو عملاً جاری کرنے اور پھیلانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان جمعیت علماء کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور پوری امیگ اور حوصلہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔

۱۹۷۷ء کے بعد جمعیت علماء ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم پر مسلمان اپنے تمام دینی، معاشرتی، تمدنی اور دوسرے تمام جماعتی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک شان دار تاریخ ہے جو سب کے سامنے ہے، کل کی طرح آج بھی اس سے بے اعتماد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے نئی نئی جماعتیں بنانے کی بجائے یہی زیادہ بہتر ہے کہ اس بنی ہوئی جماعت سے کام لیا جائے۔ اس کے نظام کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نظام سے وابستہ ہو کر اسے کامیاب بنایا جائے۔

راہوں کے تفاوت اور اختلاف خیال سے نہ کوئی ادارہ خالی رہ سکتا ہے نہ کوئی جماعت۔ لیکن یہ کسی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مغل نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کا عزم ہو اور نیت صادق ہو، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جمعیت علماء کے مقاصد مسلمانوں کی کسی خاص جماعت یا خاص پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتے، اس لئے تمام مسلمان اس ارادہ کو بلا تفریق خیال و مشرب اپنا سکتے ہیں۔

سرمایہ جمعیت..... جمعیت علماء اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتی ہے۔ اس کے نظریات ہندوستان کے ان چیدہ علماء کے ذہنوں کا سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کامیاب خدمت اور تربیت کی ہے۔ اس لئے اس کے نظریات کی حد تک بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ اس کے کسی بھی نظریہ کو مان کر مسلمانوں کو چھٹانا نہیں پڑا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے نظریات اور ہمارے اعتماد و تعاون میں کوئی خلیج حائل نہیں ہو یا ہم اس کی تنظیم میں شامل ہونے سے کوئی جھجک محسوس کریں، اگر رکاوٹ کی کوئی وجہ بھی سامنے ہو تو اس کے دفعیہ کا طریق بھی اعتراض یا دور بینہ کر کچھ کہنے سننے کی بجائے یہی زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ یگانگت کے ساتھ قریب ہو کر اس کی اصلاح کی جائے۔

جو چیزیں اس وقت عرض کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں، پہلے بھی بارہا کہی جا چکی ہیں اور ان کا بہت سا حصہ خود جمعیت علماء کے پروگرام میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ مقصد صرف تذکیر و توجہ اور آپ سے طلب عمل ہے، کسی آئین و اصول کی خوبی کھلنے کا راستہ صرف عمل ہے، اگر عمل نہ ہو تو قرآنی اور قطعی اصول بھی اپنی جگہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں، نافع ثابت نہیں ہو سکتے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ جزوی آراء و قیاسات کے اختلافات کو یکہ قلم ترک کر کے راہ عمل پر قدم بڑھائے

جائیں، بلکہ اب اس کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جمعیت علماء لوگوں کو بلانے اور کام میں لگنے کی بار بار اپیل کرے بلکہ لوگ از خود اپنی خدمات پیش کر کے اس کا ہاتھ بٹائیں، اگر بالفرض کارکنان جمعیت کے عمل میں کوتاہی اور فروگزاشت بھی ہے جس سے کوئی فرد اور کوئی جماعت بری نہیں، تو وہ بھی آپ حضرات کے مستعد ہو جانے اور عمل کا مطالبہ کرنے پر رفع ہو جائے گی جس سے اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

بزرگان جمعیت علماء کی یہ صدارت بخشی اپنے ایک کمر بستہ خادم کی تحض حوصلہ افزائی ہے، ورنہ اس مجمع اکا برواعیان کے سامنے ایک ناکارہ و نا اہل کا کرسی صدارت ہی نہیں بلکہ اس صف کی کسی کرسی پر آ بیٹھنا بھی جرأت و بے ادبی ہے۔ میں اس بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ان سطور کو ختم کرتا ہوں اور ”جمعیت علماء زندہ باد، کہتا ہوں۔“

نصاب تعلیم کی تدوین

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور تھا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا۔ جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔ آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو میں بطور خلاصہ ان الفاظ میں لکھتا ہوں کہ ”مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں“ ہم ان ہی ٹھٹھ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ)

عربی و فارسی نصاب تعلیم کے متعلق اسمبلی ہال لکھنؤ میں

حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی معرکہ الآراء تقریر

پس منظر..... حکومت ہند نے مدارس عربیہ کی تنظیم اور ترمیم و اصلاح نصاب تعلیم علوم مشرقیہ کے متعلق جو قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور لائق تشکر و امتنان ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے ۷ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ کو ایک مفصل مکتوب عالی جناب حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وزیر تعلیمات انٹریم گورنمنٹ ہند کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا جس میں دارالعلوم دیوبند کی سند فراغ اور سند تکمیل کو معتبر اور موثر قرار دیئے جانے کے متعلق موصوف کو خصوصی توجہ دلائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آج اگر فضلاء دارالعلوم اپنی معاشی ضروریات کے ماتحت حکومت کے کسی محکمہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو وہ خواہ کتنی ہی بہترین استعداد رکھتے ہوں، انہیں مولوی فاضل یا اسی کے مساوی کوئی سرکاری امتحان پاس کئے بغیر سرکاری ملازمت کا موقع میسر نہیں آتا۔ حالاں کہ دارالعلوم کے فضلاء علمی قابلیت کے اعتبار سے ہر حیثیت سے یونیورسٹیوں کے رسی ڈگری یافتہ لوگوں سے لائق و فائق ہوتے ہیں، اگرچہ دارالعلوم کی تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمتوں کا حصول نہیں ہے، مگر جو لوگ ضروریات سے مجبور ہو کر اس کے خواہش مند ہوتے ہیں ان کے حقوق مولوی فاضل، بی اے، ایم اے کے مساوی اور سند تکمیل کو ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مساوی تسلیم کئے جانے میں حکومت کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ دارالعلوم ہر حالت میں اپنے نظام تعلیم، امور انتظامی اور حکومت کی امداد سے جس طرح اب تک بے تعلق اور آزاد رہا ہے یہی پالیسی اس ادارہ کی مستقبل میں بھی بدستور رہے گی۔

حضرت مہتمم صاحب کے اس مفصل مکتوب کے جواب میں مولانا آزاد صاحب کی جانب سے جواب موصول ہوا کہ میں خود اس بارے میں جناب والا سے ملاقات اور مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا، چوں کہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اسمبلی ہال لکھنؤ میں عربی و فارسی نصاب تعلیم کے متعلق ایک سرکاری تعلیمی کمیٹی کے زیر سرکردگی ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوگی۔ جس میں دارالعلوم کے نمائندے بھی شریک ہوں گے، اسی میں جناب والا سے بھی اس معاملہ میں تبادلہ خیال ہوگا۔ براہ کرم اس موقع پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔

چنانچہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اس تعلیمی کانفرنس میں دارالعلوم کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم، حضرت مولانا اعجاز علی صاحب مفتی دارالعلوم اور دیوبند شریک کانفرنس ہوئے۔ ان حضرات کی معیت میں مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب مدرسین دارالعلوم، مولانا عزیز احمد صاحب مبلغ دارالعلوم اور احقر خلیق احمد صدیقی مدیر ماہنامہ دارالعلوم، مبلغ و ناظم شعبہ صنعت و حرفت دارالعلوم بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یوپی کے مختلف مشرقی تعلیمی اداروں کے نمائندوں سے اسمبلی ہال بھرا ہوا تھا۔ حکومت یوپی کے وزیراعظم اور دیگر متعدد وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری صاحبان بھی شریک کانفرنس تھے، ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کانفرنس مولانا آزاد صاحب نے ایک مبسوط (جامع) تقریر صدارت تقریر پڑھ کر دو گھنٹہ فرمائی جس میں تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کے علمی تفوق اور اس کے تنزل کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی، اور بتلایا کہ اس طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں۔ جنہیں بہت جلد پورا کر دینے کی ضرورت ہے، طریق تعلیم اہل ہونا چاہئے۔ کتاب کی پابندی ایک فضول اور مضر چیز ہے۔ جس سے علم چند سطروں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ نظر و فکر اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہونا مفقود ہو چکا ہے۔ مولانا کی اس تنقید سے بعض حضرات علماء پر گرانی کا اثر ہوا اور وہ ایک حد تک بجا تھا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ختم تقریر پر خود مولانا آزاد صاحب نے بھی اس کو محسوس فرمایا کہ موصوف اس تنقید میں حدود سے ایک حد تک تجاوز فرما گئے ہیں۔

اور انہوں نے فرمایا کہ: مجھے ابھی اور بھی کچھ کہنا تھا اور پھر آپ حضرات کی آراء سے مستفید ہونا تھا لیکن چونکہ وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کانفرنس کا ایک دوسرا اجلاس کل ۲۳ فروری کو ڈیڑھ بجے سہ پہر سے اور رکھ لیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ٹھیک ڈیڑھ بجے سہ پہر کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم اور دوسرے حضرات علماء کرام، اسمبلی ہال میں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ تقریر پڑھ کر دو بجے مولانا آزاد صاحب نے تقریر صدارت کا سلسلہ شروع فرمایا جس میں نصاب تعلیم کے مسئلے کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج علم کو محض علم کے لئے جو طبقہ پڑھتا ہے جس کی غرض علم سے کسب معاش نہیں ہے، بلکہ صرف علم اور علمی کمال پیدا کرنا ہے۔ وہ صرف یہ قومی مذہبی آزاد مدارس ہیں۔ جو دینیات کی تعلیم انتہائی استغناء اور لاغر خانہ

طریق پردے رہے ہیں۔ جن میں خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند ایک اعلیٰ ترین مرکزی درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے گزشتہ اسی (۸۰) سال میں نہایت شاندار علمی خدمات انجام دی ہیں، اس مرکزی علمی ادارے نے مشرق و مغرب میں اپنے علمی آثار پھیلانے اور افغانستان، بخارا، بلخ، جاوا، سامٹرا، عرب، ترکستان، وغیرہ تک اس کے فضلاء پھیل گئے جنہوں نے اسلام کی سچی اور حقیقی خدمت انجام دی۔

میرے پاس اس بارے میں ایک سچی تلی تحریر بھی پہنچی ہے جس میں یہی دکھ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان فضلاء دارالعلوم کو ان کی اعلیٰ ترین قابلیت کے باوجود آخر وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے وہ اہل اور مستحق ہیں (یہ اشارہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اس خط کی طرف تھا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) یہ خود میرے دل کی آواز ہے۔ مگر ضرورت اسکی ہے کہ وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے آگے بڑھیں اور ان کی تعلیمی زندگی میں کچھ خفیف سا تغیر ہو۔ ان کے نصاب تعلیم میں وقت کے تقاضوں کو کچھ پورا کیا جائے۔ زیادہ نہیں بہت تھوڑا سا تغیر کافی ہوگا۔ نصاب کی اصلاح، طریق تعلیم میں قدرے تغیر اور تعلیمی رنگ کی ذرا سی تبدیلیاں۔ بہر حال اس طرح مولانا آزاد صاحب نے آج کی تقریر میں درد مندانہ انداز میں علمائے کرام سے اپیل کی کہ وہ اصلاح نصاب تعلیم کے مسئلہ پر غور کریں اور پہلے دن کی تقریر میں جو شدت آگئی تھی اس کی کافی حد تک تلافی فرمادی۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے بعد مصلح ہی خان بہادر مولوی مہدی حسن صاحب شیعی مدارس عربیہ لکھنؤ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کے لئے بااجازت صاحب صدر کھڑے ہوئے اور انہوں نے تحریری یادداشت سامنے رکھ کر مولانا آزاد کی حرف بحرف تائید کی۔ صرف انگریزی زبان کی تعلیم پر بحیثیت زبان ثانوی مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانے کی مخالفت کی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (جو تمام علماء دیوبند، علمائے مظاہر العلوم سہانپور اور مراد آباد کی طرف سے اس بارے میں اظہار خیال کے لئے نمائندہ بنائے گئے تھے) اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور صدر محترم مولانا آزاد سے تقریر کی اجازت چاہی۔

صاحب صدر نے نہایت خوش دلی اور آرزو مندانہ انداز کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کو تقریر کی اجازت دی۔ چونکہ ابتداء میں آواز کسی قدر دھیمی تھی جسے صاحب صدر نہیں سن سکے۔ اس لئے صاحب صدر نے فرمایا کہ جناب! میرے پاس اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور یہاں سے تقریر فرمائیے۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اسٹیج پر مولانا آزاد کی کرسی کے قریب کھڑے ہو کر اپنے مخصوص خداداد دلنشین انداز میں نہایت فصیح و بلیغ جامع مانع تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

خلاصہ تقریر حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ..... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الْاَہْلِیْنَ اَصْطَفٰی (اس کانفرنس میں صرف اسی تقریر کی خصوصیت تھی کہ وہ اللہ کے نام سے شروع کی گئی) صدر محترم و معزز حاضرین! تعلیمی کمیٹی کا یہ عملی اقدام جو عظیم الشان کانفرنس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے اور کانفرنس میں صدر گرامی قدر کے

ارشادات جوکل سے اب تک آپ نے سنے ہیں، ایک نہایت ہی مبارک اقدام اور تعلیمی سلسلہ میں مستحسن قدم ہے۔ صحیح تعلیم کے اسباب و عوامل اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی برتری اور ترقی اس کی بھلائیوں بلکہ اس کا قیام جس بنیاد پر استوار ہے، وہ صرف صحیح تعلیم ہے۔ صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصابِ تعلیم موزوں ہو، طریقِ تعلیم موثر ہو، ذریعہٴ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظامِ تعلیم درست ہو۔ اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہو تو یہ ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی، نصابِ تعلیم اگر غلط ہو تو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہو سکتا، طریقہٴ تعلیم غلط ہو تو تعلیم کا پورا اثر نہیں ہو سکتا۔

استاذِ قابل نہ ہو تو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا۔ سب کچھ ہو اور نظامِ تعلیم درست نہ ہو تو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزاء کا ہونا از بس ضروری اور یہ تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت و سقم پر ان سب امور کی صحت و سقم موقوف ہے اور وہ ہے ”تعلیم کا نصب العین اور مقصد“ اس نصب العین کی خوبی و خرابی سے ان بنیادوں میں خوبی و خرابی پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور بنیادوں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے۔ اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال و نقصان کا فیصلہ کیا جائے۔

نصب العین کی اہمیت نصب العین کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثلاً گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری تعلیم گاہوں کا نصب العین ملازمت قرار دیا تاکہ اس تعلیم کے ذریعے سستے کلرک اور محرر یا دفتری کارکن تیار کر لئے جائیں۔ یقیناً حکومت برطانیہ کا نصب العین انسانیت کی خدمت یا دیانتداری اور حق و صداقت کی خدمات نہ تھا، اس لئے ہم سرکاری اداروں کو اسی کے نصب العین کے ماتحت پرکھ سکتے ہیں۔

ہمیں سرکاری اداروں سے نکلے ہوئے لوگوں کو اس معیار پر جانچنا ہی نہ چاہئے کہ وہ کس قدر سچے اور کتنے ہی خواہ ملک و قوم ہیں۔ پس خود اپنے مقرر کردہ معیار سے گورنمنٹ اور اس کے ادارے کا میاب رہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے معیار سے ان کو جانچیں۔ ہاں ہمیں اعتراض کا حق اس سرکاری نصب العین پر ہو سکتا ہے نہ کہ اس کے پروردہ افراد پر کہ وہ تو اپنے معیار پر کامیاب ہیں۔

اس کے بالقابل قومی اداروں اور دینی درس گاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی، نہ کرسی بلکہ تہذیبِ نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو انسانیت کے سچے خدمت گزار ہوں، اور عالمِ بشریت کی ہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ان افراد کی کامیابی اور ناکامی اور ان اداروں کے کمال و نقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیدیں کریں۔

قومی اور سرکاری اداروں کا نقطہٴ اشتراک قومی اداروں کے فضلاء اور حکومت کے تعلیمی اداروں یا عام

سرکاری حکموں میں آئندہ باہمی ربط کیا رہے گا؟

اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ آج ایک تیز رفتار انقلابی ہوا چل رہی ہے اور اقتدار بدل رہا ہے۔ موجودہ حکومت قومی حکومت سے تشکیل پا رہی ہے۔ سو اس کے تعلیمی اداروں کا نصب العین اگر وہی ہوگا جو بدیسی حکومت کا تھا کہ چند کلرک، چند سرکاری مشین کے کل پرزے حکومت کی دفتری مشین کے لئے تیار ہو جائیں تو مدارس کے طلبہ کا جو رویہ سابق حکومت کے ساتھ رہا ہے وہی اس حکومت کے ساتھ بھی رہے گا۔ لیکن اگر موجودہ گورنمنٹ کا نصب العین تعلیمی دفتری کارکن تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے ذہن و طبیعت کے لوگ تیار کرنا ہے جو حقیقی انسانیت سے آراستہ ہو کر انسانیت کے سچے خادم ہوں، آشتی و مسالمت اور پریم و صلح کے خوگر (عادی) کر ملک کو آسمان ترقی پر پہنچا دینے کے جذبات رکھیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصب العین ان قومی مدارس کے قریب آجائے گا اور یہ ایک نقطہ سنگھم کا پیدا ہو جائے گا۔ تعاون کے لئے قرب ضروری ہے اور قرب اس اشتراکی (مشترک) نقطہ پر ممکن ہوگا۔ اس لئے میرے خیال میں دینی عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کو تبدیل کیا جائے۔ یہی ایک مشترک نقطہ ہے جو سرکاریت اور قومیت کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتا ہے۔ اس صورت میں قومی مدارس کو اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ کسی سرکاری ڈگری یا امدادی طرف جھکیں بلکہ شاید خود گورنمنٹ کو اس کی حاجت ہوگی کہ وہ وہاں کے فضلاء کی خریدار بن جائے اور ان کی تلاش میں رہے۔ سو اس صورت میں دینی مدارس ہر اخلاقی امداد کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی آزادی کو برقرار رکھ کر وہ جیسے ہمیشہ سے آزاد رہے ہیں اب بھی ان کی تعلیم اور نظام تعلیم دونوں آزاد رہیں گے۔ یہ ان کی آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ جب حضرت مولانا آزاد نے آزادی سے انہیں اور ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ اگر وہ آزاد نہ ہوتے تو قابل ستائش بھی نہ ہوتے اور جو آؤٹس انہیں یہ مقام حاصل بھی نہیں۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ..... اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہو سکتا ہے۔ کہ جن تعلیمات کا وحی الہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے۔ باقی جو فنون یا کتابیں قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، اس دور میں تصوف کا زور رہا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو بطور خلاصہ ان الفاظ میں لاسکتا ہوں کہ

مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں..... ہم ان ہی ٹھٹھ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔ پس تبدیلی نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کر دیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جاسکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ اس لئے وقت

کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی۔ خود درس نظامی کی تدوین ہی تبدیلی نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے، کیوں کہ بہر حال یہ نصاب قرن اول کا نہیں ہے۔ وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے۔ جب اس کے آغاز کے وقت تغیر و تبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔ نصاب کا مسئلہ بہر حال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ میں نے خود ۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلہ میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلی نصاب کے متعلق اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔

بہر حال نصاب تعلیم میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں۔ جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں ہاں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سرکاری اداروں کے لئے قابل تقلید ہونا چاہئے، جس سے وہ قومی مدارس کے قریب لائے جاسکتے ہیں۔

نصاب کا تغیر و تبدل ہر دور میں ہوتا آیا ہے جو اس امر کی مستقل دلیل ہے علماء میں فکر و نظر کو ہر زمانہ میں اہمیت حاصل رہی ہے اور ہر دور میں مفکر و مبصر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنہوں نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ قرون اولیٰ، قرون متوسطہ، اور قرون اخیرہ میں اہل فکر و نظر کی اُمت میں کمی نہیں رہی اور نہ ہو سکتی ہے کیوں کہ خود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”بَشَلْ أُمَّتِي كَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا يُذْرَى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ۔“ ① جس سے واضح ہے کہ اہل نظر کسی خاص قرن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خلف میں سلف کے ہم رنگ ارباب نظر پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب شریعت (فداہ ابی وای) نے ارشاد فرمایا: ”يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمُ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عَدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَخْرِيفُ الْعَالِيْنَ وَانْتِحَالُ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاوِيلُ الْجَاهِلِيْنَ۔“ ② اسی طرح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”إِنَّ السَّلَةَ يَبْعَثُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا۔“ ③ اور دین کا حاصل جبکہ ایمان عقائد، اسلام و احکام، تزکیہ اخلاق اور اعلائے کلمۃ اللہ تو ناممکن ہے یہ مجدد اس سے نا آشنا ہوں یا ان کے زیر تجدد یدتر بیت یافتہ مفکر نہ بنیں، اس لئے بہر حال فکر و نظر کا دروازہ ہر آن کھلا رہے گا۔ مگر ہاں اپنی ہی بساط اور اپنی ہی استعداد کے مطابق ہم حدود سے گزرے ہوئے فکر کو فکر و نظر نہیں بلکہ توہم کہیں گے۔

بہر نوع بنیادی چیز نصب العین ہے۔ اس سے ادارے بنتے ہیں اور اس کے بگڑ جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔ اس نصب العین کے ماتحت پھر وہ بنیادی چیزیں ہیں جن کی تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے۔

① مسند ابی یعلیٰ الموصلی، ثابت البانی عن انس، ج: ۷، ص: ۴۹۵، رقم: ۳۳۸۱۔ بزار کے طریق سے یہ روایت حسن ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الامۃ ج: ۳، ص: ۳۵۶۔

② السنن الکبریٰ للبیہقی، ج: ۱۰، ص: ۲۰۹۔ (جماع ابواب من تجوز شہادۃ ومن لا تجوز۔)

③ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یدکر فی قرن المئۃ، ج: ۱۱، ص: ۳۶۲۔

میں اپنے ذہن میں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات پاتا ہوں، لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں کیوں کہ جناب صدر محترم ان تفصیل پر بحث کرنے کے لئے خود ہی ایک کمیٹی کا تقرر منظور فرما رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس میں آسکتی ہیں۔ اس لئے اس اجمال پر قناعت کیا جانا کافی خیال کرتا ہوں۔

تاثرات تقریر..... حضرت حکیم اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر مسئلہ تعلیم کے ہر پہلو پر اصولی حیثیت سے اس درجہ جامع تھی کہ بعد کے آنے والے مقررین کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ تعلیم کے بنیادی نقطوں میں حضرت موصوف کی تقریر کا حوالہ دے کر پرزور تائید کریں۔ چنانچہ حضرت موصوف کی تقریر کے بعد مولانا محمد رضا صاحب فرنگی محل نے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کی طرف سے تقریر فرمائی، جن کی اصل تقریر کا حاصل مناظرانہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پر غم و غصہ کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب تعلیمی نقطہ کی بات آئی تو انہوں نے بالآخر حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی پرزور تائید کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبد الحلیم صاحب عربی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی والے نے بھی مناظرانہ انداز میں تقریر فرماتے ہوئے مولانا آزاد کی تقریر پر نکتہ چینی کی اور آخر میں حضرت مہتمم کی تقریر کا بنیادی نقطہ تعین نصب العین لے کر اس کی تائید و تصویب نہایت پرزور الفاظ میں کی۔

آخر میں علامہ سید سلمان صاحب صدر قاضی و ڈائریکٹر علوم مشرقیہ ریاست بھوپال تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور موصوف نے ایک نہایت مفصل و مدلل تقریر فرماتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کا یہ جملہ دہراتے ہوئے کہ ”مسائل پرانے اور دلائل نئے ہوں“ فرمایا یہ کہ اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تعمیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔

علامہ موصوف کی تقریر کی بعد مولانا عبد المجید صاحب بنارس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تقریر فرماتے ہوئے نہایت پر شوکت الفاظ میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی تائید کی۔

سب سے آخر میں مولانا آزاد صاحب نے اختتامی تقریر فرمائی اور حضرت مہتمم صاحب کی تقریر سے اس حد تک اپنے تاثر کا اظہار فرمایا کہ گویا اپنی اختتامی تقریر صدارت کا متن حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کو قرار دے کر اس کے مختلف جملوں کو بار بار اپنے الفاظ میں دہرانا شروع فرمایا جیسا کہ ابھی مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا اور یہ مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل بجا درست فرمایا۔

مولانا آزاد صاحب نے فرمایا کہ محمد طیب صاحب کی تقریر کا یہ جملہ کہ ”مسائل قدیم ہو اور دلائل جدید ہوں، ہمارے ان تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرمیں کرتے چلے جائیں، تفصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔

مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہاں! مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل درست اور نہایت ہی بجا فرمایا کہ مدارس عربیہ کو اپنے نصاب تعلیم اور نصب العین میں اصلاح کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ سرکاری تعلیمی اداروں کو

ضرورت ہے۔ یہ اگر اپنا نصب العین اور طریقہ تعلیم و تربیت درست کر لیں تو وہ قومی مدارس کے قریب آجائیں گے۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ ان قومی اور دینی مدارس کا تفوق ان کی آزادی اور آزاد روش پر منحصر ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ ان کا آزاد رہنا ہی ان کا اونچا اور بلند مقام ہے اور انہیں اسی مقام پر رہنا چاہئے۔

پھر مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے صحیح فرمایا کہ تعلیم کی غرض و غایت اگر محض کلرک اور محریا دفتری لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کم مرتبہ غرض کوئی دوسری نہیں ہو سکتی اور یہ ملک کی کوئی صحیح خدمت نہ ہوئی۔ بہر حال حضرت مولانا آزاد صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے جملہ جملہ کو لے کر اس کی شرح نہایت وقیع اور شاندار انداز سے اپنے الفاظ میں فرمائی جس سے مولانا کے تاثرات قلبی کا اظہار ہوتا رہا اور جس کا تمام حاضرین نے نہایت اچھا اثر قبول کیا۔

ہم جملہ وابستگان دارالعلوم کے لئے بالخصوص انتہائی مسرت و خوشی کا مقام ہے کہ اس پوری تعلیمی کانفرنس کا ہیرو دارالعلوم دیوبند رہا اور دارالعلوم کے حلقہ میں پوری کانفرنس کے ہیرو حضرت مہتمم صاحب رہے۔ جن کی تقریر کے ہر ہر جملہ بلکہ ایک ایک لفظ کو سنجیدہ اور باہوش علماء کرام نے دہرایا۔ پر زور تائیدیں فرمائیں اور تقاریر میں اس کی تشریح و تفصیل کرتے رہے اور ایک مرکزی تعلیمی ادارے کی تعلیمی لائنوں میں جو حیثیت ہونی چاہئے تھی وہی رہی۔

”فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْجَنَّةُ“

خاتمہ تقریر پر مولانا آزاد صاحب نے اعلان فرمایا کہ میں ایک عملی تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں وہ یہ کہ ۲۱ تا ۱۵ ارکان پر مشتمل ایک تعلیمی کمیٹی بنا کر جلد سے جلد نصاب تعلیم کی اصلاح و ترمیم کا عملی کام شروع کر دیا جائے۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی اور نہایت خیر و خوبی کے ساتھ یہ تعلیمی کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

احقر: خلیق احمد صدیقی

مدیر ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند)

تصویر سازی کی مذہبی و تمدنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ، دیوتاؤں کی رنگیں تصویروں کے غلام بنے، مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے، ایران کے مجوسی یزدان و اہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز ختم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا۔ (از: حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ)

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا مُدْرِي لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كَثَاةٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَّاعِيًا إِلَيْهِ بِأَذْنِهِ وَبِسِرَاجِ مُنِيرٍ. أَمَّا بَعْدُ! مہلک دستکاری..... بزرگان محترم! آج تصویر اور صورت سازی اپنی غیر معمولی شیوع کی بدولت موجودہ تمدن کا ایسا جزء لاینفک بنی ہوئی ہے کہ اس کا کوئی شعبہ اپنی رونق کو تصویر کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا۔ مکان، دوکان، خطوط، کتب، رسائل، سکے، تمغہ، رقعہ، دستاویز، تلوار، ہتھیار، چھری، چمچ، لیول مار کہ کوئی چیز نہ تصویر سے خالی اور نہ تصویر بغیر اس میں کوئی کشش ہی محسوس کی جاتی ہے۔ پس جاذبیت کی ساری ہی طاقتیں آج تصویر کے ایک رخ میں پنہاں ہو چکی ہیں اور تقریباً دنیا کی ہر قوم بلا استثناء اپنی پوری ہی گردید و گی و شغف کے ساتھ تصویر کی طرف پروانہ دار دوڑتی چلی جا رہی ہے۔

اقوام متحدہ (اقوام عالم) کے اس اجماع میں جو تصویر کے ساتھ فدائیت پر منعقد ہو چکا ہے، ہم تصویر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس اجماع کے خلاف ہم ایک ایسے نظریہ کے ماتحت تصویر کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے تصویر نہ صرف بدترین مگر ہی دکھلائی دیتی ہے جسے معروف کی لائن سے کوئی مناسبت نہیں۔ بلکہ ایسی مہلک اور مخرب دستکاری نظر آتی ہے جسے ایک مسلم کی مسلمانہ ذہنیت تبدیل کر دینے میں کافی مداخلت حاصل ہے۔ صورت محض وسیلہ تعارف ہے..... یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کا ظہور اور اس کے لئے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیائے صور و اشکال میں کوئی حقیقت بغیر صورت کے شناسا نہیں ہو سکتی۔ پس

صورت ایک درمیانی خادم ہے جس کا منصبی فرض صرف حقیقت تک پہنچا دینا ہے اور بس۔

زید اور عمر کی صورتیں، حیوانات اور نباتات کی جینیں (شکلیں) صرف اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ دنیا کو اپنے باطنی حقائق سے شناسا بنادیں۔ جس کے صاف معنی یہ نکل آتے ہیں کہ کوئی صورت بلا حقیقت یا بلا ترجمانی ہی نہیں کہ صورت محض نہ بذاتہ مقصود ہے اور نہ مقصودیت کی شان رکھتی ہے۔

اس اصول پر یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ مقصود واقعی صرف حقیقت ہے صورت نہیں۔ صورت وسائل تعارف میں سے ایک وسیلہ ہے، اگر بالفرض ہم بلا صورت ہی کسی حقیقت پہنچانے پر قادر ہو جائیں تو شاید پھر صورت کی طرف التفات بھی ہم پر شاق گزرنے لگے اور ہم اسے اضاعت وقت سمجھنے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صورتوں کی طرف توجہ کرنا فی الواقع حقیقت پر براہ راست قدرت نہ پانسنے کا ثمرہ اور ہمارے تصور ادراک کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ہم تاج محل آگرہ کا اصلی نقشہ آنکھوں میں رکھنے کے لئے اس کی تصویر سامنے رکھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ذریعے سے ہم خود تاج محل کو یہاں اٹھا کر لاسکتے ہوں یا ہمہ اوقات ہر جگہ سے اسے دیکھتے رہنے کی قدرت رکھتے تو شاید ہمارا دھیان اس کاغذی تاج محل کی طرف کبھی بھی نہ منعطف ہوتا۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ صورت وہیت سامنے رکھنا اصل کی یاد آوری کا ایک ذریعہ اور ساتھ یہ صورت بین کے تصور ادراک کا ثمرہ ہے کہ وہ براہ راست اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس جب کہ ایک ایسی صورت بھی جو کسی واقعی حقیقت کا عنوان یا ترجمان بھی بنی ہوئی ہے۔ واسطہ محض سے زائد کوئی درجہ نہیں رکھتی تو وہ تصویر جو صورت ہی صورت کی ترجمانی کر رہی ہو اور حقیقت سے اسے کوئی بھی واسطہ نہ ہو یا تصویر ہی فرضی ہو جس کے نیچے کسی واقعی صورت کا بھی وجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بے اصل محض، بے وزن محض اور بے التفات محض ہونی چاہئے، کہ وہ حقیقت کی بجائے باطل اور بے بنیاد شے یا لاشے محض کی ترجمانی کر رہی ہے۔ پھر بھی اگر ایسی بے بنیاد اور باطل صورتوں کو مرکز توجہ بنالیا جائے تو یہ مقصود سے اعراض اور وسائل میں شغف کے سوا کون سے لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور کون نہیں جانتا کہ مقصود کے ہوتے ہوئے وسائل محض میں انہماک و شغف رکھنا یا بالفاظ دیگر اپنے تصور ادراک اور عجز تصور کو باوجود ازالہ کی قدرت کے پالتے رہنا، دانائی کی بجائے انتہائی سادہ لوحی بلکہ اس سے بھی آگے ہی کا درجہ ہے۔

شرک فی المقصود..... پس اسی قلب موضوع سے کہ وسائل مقصود کا درجہ حاصل کر لیں اور خود مقصود غیر اہم ہو جائے، شرک فی المقصود کی بنیاد پڑتی ہے۔ جس کی ذمہ داری تنہا تصویر پر عائد ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب قلب جو باطن اور غیبی امور میں منہمک ہو کر ذوقی مشاہدوں کا شائق بنایا گیا ہو۔ تصویر آرائی کے ذریعے گرفتار صورت بنادیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی جمیت کھو کر کچھ باطن کا ہو رہے اور کچھ ظاہر کا ہو رہے۔ کچھ حقیقت کی طرف مائل ہو اور کچھ صورت کی طرف۔ گویا اپنی اصل جبلت سے تو غیبات اور حقائق کی طرف جھکے اور ان غیر جملی تو اسرے ظاہری نمود اور صورت و اشکال کی طرف مائل ہو اور اس طرح توحید

مطلب کے بجائے تعدد مطالب کا مجرم ہو جائے جو شرک کی حقیقت ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مقصود کے مقصود باقی رہتے ہوئے شرک فی المقصود سے نہ بچنا، عقل کی گمراہی اور فہم سلیم کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ ہاں جس درجہ کا مقصود ہوگا، اسی درجہ غیر مقصود کا اس میں سما جھاکا قائم کرنا خلاف فطرت اور جرم ہوگا۔

تصویر پرستی یہاں پہنچ کر دنیا کی قوموں کے دور استے ہو گئے۔ ایک طبقہ نے جو تلاش معبود میں سرگرداں اور تعارف غیب کا دلدادہ تھا، اپنی خوگر محسوس ذہنیت سے مغلوب ہو کر تصویر کو خدائے برتر و توانا کے تعارف کا ذریعہ قرار دیا اور معرفت رب کے لئے ابتداء تصویر کو مرکز تصور بنایا۔ لیکن عادت جاریہ کے موافق انسان کی خوگری احساس اور مغلوبیت عقل و معرفت نے پہلے تصویر کو اس کا ساجھی بنایا اور پھر رفتہ رفتہ تصویر میں مقصودیت اور معبودیت کی شان پیدا کر دی۔ وہ تمام افعال عبودیت، رکوع و سجود، نذر و نیاز، جھینٹ اور قربانی وغیرہ جو اس بے چون و بے چگون ذات کے لئے ہوتے۔ اب اس کی نام زد صورتوں اور فرضی مجسموں کے لئے ہونے لگے۔ کل تک جو حفظ و کیف اس کے نام اور اسی کے لطیف دھیان سے روح میں پیدا کیا جاتا تھا۔ آج اس کی فرضی صورتوں سے حاصل کیا جانے لگا۔

دنیا کی سب سے پہلی بت پرست قوم (امت نوح علیہ السلام) جس نے پانچ مردان حق (ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر) کی تصویروں کو ذریعہ خدا شناسی بنا کر اپنے معبودوں میں نصب کیا۔ آخر کار انہی محسوس نے اس خوگر محسوس قوم کی ذہنیت پر فتح حاصل کر لی اور ایک لطیف و خیر خدا کی جگہ پانچ کثیف الاجسام معبود جم گئے اور ایسے جے کہ پھر مستظلاً انہی سے استمداد (مدد طلب) کی جانے لگی۔ وہی اولاد ہندہ شمار ہوئے۔ وہی ابرو باراں کے مالک ٹھہر گئے اور انہی کی سنگین صورتوں سے ہر ایک مراد مانگی جانے لگی۔ جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ قوم حقیقت الحقائق تک تو کیا پہنچتی، عام حقیقتوں سے بھی محروم ہو کر محض صورت پرستی کے جال میں پھنس گئی۔ اور اس کی ذہنیت غائر ہونے کی بجائے اس درجہ سطحی ہو کر رہ گئی کہ نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ و ہند (وعظ و نصیحت) سے سوائے چند روزہ ظاہر داری کے، کوئی ایک عبرت اور کوئی ایک انجام بنی بھی ان کے دل و دماغ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر نہ صرف قوم نوح بلکہ ہر تصویر کی پجاری قوم جو قوم نوح کے نقش قدم پر گامزن ہوئی، اسی سطح پرستی کا شکار ہوئی۔

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کی رنگیں تصویروں کے غلام بنے۔ مغرب کے مثلیٹ پرست کنواری مکے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے۔ ایران کے جموی یزداں و اہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رعبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا اور خالص شرک کے راستہ پر لاکھڑا کیا۔ جس سے یہ اشرف المخلوقات اپنی توحید مطلب کو یکسر فنا کر بیٹھا اور قلبی پراگندگی و تشتت کے مہلک جال میں پھنس کر اپنی طمانیت و بشارت خاک میں ملا دی۔

تصویر بازی دوسری قوم کو اپنی تصویر بازی اور صورت پسندی کے ذریعے خدا کی تلاش نہ تھی اور نہ انہوں نے

تصادیر سے مظاہر غیب کی جستجو شروع کی۔ تاہم تمدن و معاشرت کے سلسلہ میں ساری کائنات کو اس کی تصاویر کے ذریعہ پہنچانے کے جذبہ نے ان کو بھی اصل سے ہٹا کر نقل پسندی، اور پھر خالص صورت پرستی یا حقیقت سے بے تعلقی میں الجھا دیا۔ یہ قوم پہلے سے بہت ادنیٰ اور ذلیل مرتبہ پر آکر رہی۔ پہلی قوم نے اگر صورتوں اور محسوسات کو قبلہ استقبال بنایا تو خدا شناسی کے لئے گویا حقیقت رسی کم از کم جذبات میں تو مرکوز تھی۔ گویا تلاش حقیقت ہی کے سلسلہ میں صورتوں کے ساتھ انہیں شغف پیدا ہوا۔ لیکن دوسری قوم کی تصویر بازوں میں ابتداء ہی سے حقیقت بینی کا کوئی جذبہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کے تصویری جذبات صرف تزئین و آرائش یا نمائش و زیبائش ہی تک محدود ہیں۔ جس کا تعلق صورت در صورت ہی سے ہے اور بس۔

یعنی اس قوم کے یہاں تصویروں سے کسی مستور اور غیبی حقیقت کا ظہور تو کیا مطلوب ہوتا اس مشاہد کائنات کی بھی صرف صورتوں ہی سے شناسا ہونا منہجائے مقصود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کائنات کی حقیقت و صورت میں صورت کا درجہ خود فانی اور عارضی تھا اور جب کہ فانی کا بھی، فانی درجہ، یعنی تصویر کو منہجائے مقصود بنادیا جائے تو ایسی قوم صرف واقعیت ہی سے دور نہیں ہوگی۔ بلکہ باطل سے باطل اور بے حقیقت بنیاد پر کھڑی ہو کر اپنے وزن اور طاقت اور جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کمزور کر دینے کی مرتکب ٹھہرے گی۔

یورپ کی تمدن پرست قومیں اسی باطل سازی اور تصویر بازی کی لعنت میں سب سے زیادہ گرفتار ہوئیں۔ ان اقوام کو اس بنیاد و صورت پرستی اور نمائش پسندی نے اس درجہ سطحی اور بے بنیاد قوم بنایا، کہ آج وہ کسی حقیقت تک تو کیا پہنچتیں اپنی مصنوعی صورتوں کے سامنے قدرتی صورت کے ساتھ پورا شغف قائم نہ کر سکیں۔ کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو واقعیت کی شان ضرور تھی۔ ان کی ذہنیت اور جذبات کا بہت بڑا حصہ اپنی ہی خود ساختہ صورتوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ تصویروں کی ساخت و پرداخت اور خریداری پر لاکھوں روپیہ صرف کرنا تصویریں سامنے رکھ کر عالم خیال میں ان سے باتیں کرنا، عشق و محبت کے جذبات کا غد کے رنگین عکوس پر بچھا کرنا ان کا شعار ہو گیا۔

سطح پرستی کی انتہاء..... آج عریاں تصویروں کو سامنے رکھ کر شہوانی جذبات اس طرح مشتعل کئے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی اصل صورت کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے مجسمے صرف بازاروں ہی کے چوک میں نصب نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اس درجہ گھس چکے ہیں کہ ان کی کسی ادنیٰ توہین پر اسی طرح ازالہ حیثیت کے مقدمات چلائے جاتے ہیں، جس طرح اصل شخصیت کے بارہ میں مقدمہ چل سکتا ہے۔

آخر لارنس کے بت کا مقدمہ دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ وکٹوریہ کے بت کی توہین پر تحقیقاتی پولیس کا مقرر کیا جانا اس دور صورت پرستی کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ حالاں کہ اصل کا آج کوئی پتہ نشان بھی نہیں، یہ تمام معاملات صرف مصنوعی پیکروں کے ساتھ اسی شد و بد سے کئے جا رہے ہیں، جس طرح قدرتی مجسموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض نایاب اور پرانی تصویری شاہکاروں کی قیمتیں اسی مقدار میں اٹھ جاتی ہیں کہ شاید اس

مصور کو اگر نیلام کیا جاتا تو اس کے عشر عشر بھی دام نہ اٹھ سکتے۔ حتیٰ کہ ان تصویری جذبات نے فلم سازی کا ایک مستقل فن ہی پیدا کر دیا جس کے لئے خزانوں کا ایک مستقل حصہ وقف ہے۔ ایک ایک فلم پر ہزار ہا روپیہ کی لاگت ہے، فلم سازوں کی بیش قرارت خواہیں اور سینما کی قیمتی عمارتیں، باب ٹمڈن کا ایک نہایت ہی شاندار اور خوشگوار اضافہ سمجھی گئیں۔ آدمیوں سے وہ اثر نہیں لیا جاتا جو سینما کی محرک تصویروں سے لیا جا رہا ہے۔

نمائش و سطح پرستی کی یہ وہ انتہائی حد ہے کہ آج کا انسان گویا خود بھی اپنے نزدیک اس لئے باطل محض ہو گیا کہ اس کے مشغل کے لئے خود اس کی قدرتی شکل بھی کافی نہ رہی، جب تک کہ اس صورت کی بھی خود ساختہ صورت اس کے سامنے موجود نہ ہو۔ غرض حب و بغض، نفرت و رغبت، عشق و محبت اور خرید و فروخت کے تمام وہ معاملات جو ایک سطح پسند انسان، انسان کی اصلی اور قدرتی صورت سے قائم کرتا، آج اس سطح کی بھی نقلی اور فرضی سطح و صورت کے ساتھ جوڑتا جا رہا ہے، کیا یہ صورت پسندی کی انتہا نہیں ہے؟ اور جب ایسا ہے تو کیا یہ حقیقت سے بے خبری اور بیگانگی کی بھی انتہا نہیں ہے؟ اور پھر ایسی قوم کے حق میں جو حقائق سے بے گانہ محض بن کر محض صورتوں اور صورتوں کی بھی نقالی میں الجھ کر رہ جائے، عقل و دانش کیا فیصلہ کرے گی؟

صورت پسندی کی آخری منزل..... بہر حال قوموں کے ان دونوں طبقات میں تصویر نے اپنی طبعی رفتار کے ماتحت اصل کو پردہ لسیان میں چھپا کر زبردستی اس کی جگہ سنبھال لی۔ اور اس طرح دونوں جگہ اس تو حید مطلب کی جڑیں اکھاڑ کر شرک کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا۔ تمدن اقوام میں شرک عبادت پیدا کر دیا اور متمدن اقوام میں شرک عادت۔ پھر یہ شرک بھی اس تصویر پسندی کا درجہ اول ہے۔ صورت پسندی کی آخری منزل یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے صورتیں ہی حقائق کی جگہ سنبھال کر بالاستقلال خود مقصودیت کی شان پیدا کر لیں۔ چنانچہ مذہبی اقوام کے سامنے اصنام ہی مستقل حاجت روا بن کر قبلہ قلوب ہو گئے، اور ٹمڈن فی قوموں کے سامنے فوٹو اور تصویریں ہی مستقل محبوب و مطلوب بن گئے۔

آج کوئی ڈیزائن اور نمونہ مقبول نہیں جس میں تصویر کو دخل نہ ہو، کوئی رسالہ جاذب نظر نہیں جب تک تصاویر اور خصوصاً عریاں تصاویر سے مزین نہ ہو، گویا ادبی رسالوں کی جان اب بجائے علوم مضامین کے، رنگینی تصاویر قرار پا گئی ہے۔ علم میں طاقت نہیں کہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے کھینٹ سکے۔ مگر تصویر اپنی خالص محبوبیت کی بناء پر یہ جذب و کشش ضرور رکھتی ہے کہ تجارتوں کو فروغ دے سکے، دوکانوں کی رونق بڑھائے اور لوگوں کا وقت اپنے اوراق کے لئے خرید سکے۔

خزانہ مخفیہ سے محرومی..... خلاصہ یہ نکلا کہ تصویر بالجامہ حق پسندی سے ہٹا کر بہ سہولت باطل پسندی کی ذہنیت پر لے آتی ہے، واقعی جذبات کو بے ثمرہ بناتے ہوئے انجام کار عاقبت کی بہرہ مند یوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہے، پس کہاں تو انسان غیب سے نکل کر عالم شہود میں اس لئے آیا تھا کہ ہر حسی شاہد سے کنارہ کش ہو کر غیب کی قلبی مشاہدوں

میں مصروف ہو۔ ہر صورت سے اعراض کر کے حقیقت کی طرف جائے، اور ہر باطل سے نگاہ ہٹا کر حق کی طرف دوڑے تاکہ اس کا لگاؤ فانی کے بجائے باقی سے ہو اور اس طرح وہ خود بھی باقی بن جائے اور اسے اپنی اصل سے وابستگی رہے۔ اور کہاں ان تصاویر کی بدولت اس کج راہی میں گرفتار ہوا کہ غیب کے ہر مرتبہ سے کنارہ کش (الگ) ہو کر اس نے محسوسات ہی کو اپنا قبلاً نظر بنالیا۔ مخفیات کے ہر خزانہ سے محروم ہو کر حسیات ہی کو منظور نظر کر لیا اور روحانیت کے تمام لذیذ مشاغل سے بے پرواہ ہو کر مادیات کی کٹافنوں میں دھستے رہنا ہی اپنا سب سے زیادہ لذیذ مشغلہ قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ جب باقیات صالحیات سے اعراض کر کے فانی چیزوں میں جا پھنسا تو اپنی اصل سے منقطع ہو کر خود بھی بے اصل بن گیا۔

شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ..... اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر بارگاہ حق کے حقیقت شناس اور ان کے حقیقت رس قلوب صورتوں سے بے لگاؤ اور تصویروں سے متنفر ہوں تو کون سی جائے تعجب ہے؟ ملائکہ جیسے حقیقت شناسان بارگاہ حق تصویروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ ”لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَیِّنًا فِیْهِ کَلْبٌ وَلَا تَصَاوِیْرُ“ ① ”جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے۔“

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حقیقت شناس بارگاہ قدس کا ان رسوم و نقوش کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ ”اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَكُنْ یَتْرُکْ فِیْ بَیْتِہٖ شَیْئًا فِیْہِ تَصَالِیْبُ الْاِنْقِصَۃِ“ ② (راویہ البخاری) ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی شے جس میں تصویر ہو بلا توڑے نہیں چھوڑتے تھے۔“

تصویر سازی کا اخروی انجام..... حق تعالیٰ شانہ تصویر سازوں کے ساتھ یوم آخر میں کیا طریق عمل اختیار فرمائیں گے؟ اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَمَةِ الَّذِیْنَ یُضَاهَوْنَ بِخَلْقِ اللّٰہِ ③ (وَفِیْ رِوَاۓ) الْمَصْوَۃُ ④ ”یوم قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی شان تخلیق میں اپنے کو اس جیسا بنانا چاہتے تھے (یعنی مصورین)۔“ یہ تو صورتوں کی تصویروں کے متعلق ارشادات شریعت تھے۔ لیکن حقائق کی تصویریں خود ہماری صورتیں ہیں، ان کے متعلق بھی منشاء حق یہ ہے کہ ہم انہیں مستقل مرکز التفات نہ بنادیں۔

”اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرُکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَیَیَّاتِکُمْ“ ⑤ ”اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے (جو تم میں غیب کی چیزیں ہیں)۔“

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کا بلا شرکت غیرے اصل وجود اور اپنی حسی کائنات کی اصل الاصول کی

① الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب التّصاویر، ج: ۲، ص: ۱۶۷۹۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب

نقض الصور، ج: ۲، ص: ۱۶۷۸۔ ③ الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ما وطنی من التّصاویر، ج: ۱۸، ص: ۳۳۲۔

④ الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب عذاب المصورین یوم القیامۃ، ج: ۱۸، ص: ۳۲۶۔ ⑤ الصحیح

لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره، ج: ۱۲، ص: ۲۲۷۔

خطبات مجسم الاسلام ————— تصویر سازی کی مذہبی و تمدنی حیثیت

فکر و دھیان میں رہنا جب ہی ممکن تھا کہ صورتوں سے اپنی حسی آنکھ بند کر کے فہم و فراست اور قلب کی آنکھ کھولے تاکہ غیبی وجود اور مخفی اسرار اس کے مشاہدے میں آسکیں۔

حقیقت الحقائق کی جستجو..... پس اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ نکلا کہ صورتوں کی تصویریں تو بالکل ناقابل التفات اور تفتت کی جڑیں ہیں۔ رہیں قدرتی صورتیں سو گو کچھ نہ کچھ عارضی واقعیت رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی تم کائنات کی اس حسی اور صوری خوشنمائی سے یکسو ہو کر اس کی حقیقی خوبی کو تو جہات کا مرکز بناؤ۔ بلکہ پھر ان حقائق سے بھی قطع نظر کر کے اس حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی سعی کرو جو تمام کمالات و جمالات کا سرمنشاء اور حقیقی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے شہود سے ہٹا کر غیوب کی طرف انسان کو بڑھانا چاہا ہے، اجسام سے ہٹا کر حقائق کی طرف اور بالآخر مخلوقاتی حقائق سے بھی ہٹا کر حقائق الہیہ کی طرف لانا چاہا ہے۔ جن کا مشاہدہ بجز صورتوں سے قطع تعلق کئے ہوئے دشوار و ناممکن تھا۔

پس کہاں اسلام کی یہ حقیقت رسانی اور حق نمائی کہ بطون در بطون اور غیب در غیب کی طرف بڑھا کر انسان کو حقیقت سے ہم کنار کر دیا، اور کہاں انسانی تخیل کی یہ کج راہی کہ نمائش و زیبائش اور نمود در نمود کی طرف دھکیل کر انسان کو حق اور حقیقت سے بعید و بے گانہ محض کر دیا۔ حقیقت الحقائق سے جدا کر کے جزوی حقائق پر اور ان سے بھی بے بہرہ بنا کر صورت و اشکال پر اور پھر ان سے بھی ہٹا کر تصویر ی غد و خال پر لا کھڑا کیا۔ پس وہاں اگر اصل الاصول تک پہنچ جانے کی وجہ سے توحید در توحید حاصل ہوتی تھی تو یہاں غیر حق کی طرف بڑھتے چلے جانے سے شرک در شرک پیدا ہو گیا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تصویر اشراک (شرک) کی جڑ ہے اور صورت پسندیاں انسان کی توحید کو بجائے خود کبھی باقی نہیں چھوڑ سکتیں تو یہ ایک بجا اور مطابق واقعات دعویٰ ہوگا۔

توحید پسند کا تصاویر سے متنفر..... اس لئے اگر توحید پسند طبقہ مطلقاً تصویر کا دشمن اور اس سے متنفر (نفرت کرنے والا) ہو تو یہ اس کا ایک قدرتی جذبہ اور فطری حق ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام جیسے کامل موحدین نے انسان کو انہماک صورت و اشکال سے دور دور رکھنا ہی اپنے مسلک کا ایک جلی اور روشن نشان قرار دیا ہے اور انہوں نے:

- 1 تصویر ذی روح کو حرام قرار دیا۔ 2 ملائکہ کی نفرت اس سے ظاہر کی۔ 3 خود اپنا بغض اس سے بتلایا۔
- 4 تصویر سازی اور مصور (فوٹو گرافر) پر لعنت کی۔ 5 تصویر بنادینے جانے پر اس کے منادینے کی تعلیم دی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شجرۃ الرضوان جیسے متبرک شجرہ کو کٹوا دیا کہ کہیں اس سے صورت پرستی کی بنیاد نہ پڑ جائے۔ مطاف مقدس میں حجر اسود کو یہ جتلا کر چوما کہ: ”میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ ضرر، اگر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز نہ چومتا۔“

حقیقت پسندانہ ذہنیت..... پس اسی لئے حقیقت شناسان باطن نے تصویر پسندوں اور صورت دوستوں کو ایسے مظان (گمان) سے بھی بچانے کی سعی کی ہے جہاں ان کے گرفتار صورت ہو کر بعید از حقیقت ہو جانے کا ذرا سا

بھی خطرہ تھا۔

سالک ابتدائے سیر الی اللہ میں جبکہ حقائق کو مختلف باطنی صور و اشکال کے جامدہ میں مشاہدہ کرتا ہے جو خود بھی ایک حد تک غیبی ہی چیز ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی غیب ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا راہنما اور مربی اسے ان صورتوں سے بے التفات بنانے کی سعی کرتا ہے، کہ کہیں ان نقوش کی رنگینیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے بے گانہ نہ رہ جائے۔

کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

غرض صورت پسندی، تصویر دوستی، تصویر سازی، تصویر بازی اسلامی مقاصد کے منافی اور اس کے بنیادی مقصد رجوع الی الغیب یا سیر الی اللہ کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ہے۔ اس لئے کم از کم مسلم قوم کو اپنی حقیقت پسندانہ ذہنیت چھوڑ کر صورت پرستانہ جذبات پیدا کر لینا بلاشبہ قلب مابہیت (حقیقت کو بدلنا) اور قلب موضوع (مقصد سے ہٹنا) ہے۔

حق تعالیٰ توفیق دے کہ ہم صحیح اسلامی جذبات کا احترام کریں اور کم سے کم ایسی پگنڈیوں سے کترا کر چلنے کی سعی کریں جو اسلامی شاہراہ سے دور پھینک رہی ہوں اور منزل مقصود کو بعید سے بعید تر بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہوں۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقِ

اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا، وہی کامیاب ہوگا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ)

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَفَّافَةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. آمَنَّا بِعَدْلِهِ

اشتراک ذہن..... بزرگان محترم! اس وقت آپ جانتے ہیں کہ سائنس نے پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر بہت مختصر بنا دیا ہے۔ پوری دنیا ایک چھوٹا سا کنبہ بن گئی ہے۔ ایجادات نے ملنا جلنا اور چلنا پھرنا سہل بنا دیا ہے۔ پہلے تیل گاڑی وغیرہ کے سفر میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے سے حج کے لئے پیدل چلنے میں دو تین سال لگتے تھے۔ دوسری سواریوں میں نو مہینے لگتے تھے، لیکن آج سائنس کی ترقیات نے سفر کو سہل بنا دیا۔ رتھوں اور تیل گاڑیوں کی جگہ ریلیں چلیں اور اب تو ہوائی جہاز چلنے لگے جو بمبئی سے جدہ تک ۹ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں، حالاں کہ دریا کے راستے سے یہ سفر (۹) دن میں ہوتا ہے اور اب تو ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز چلانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ یعنی انسان بالکل پرندوں جیسے ہو جائیں گے اور گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے ہوگی۔ اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بات کہنے کے لئے کہیں جائیں، کسی شہر میں جلسہ ہو تو مقرر وہیں پہنچ کر تقریر کرے بلکہ ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے خطاب کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا ہے اور سارے ممالک مخلوق کی حیثیت میں ہو گئے ہیں۔ ان ایجادات کا اثر یہ پڑا کہ ملکوں کی خصوصیات مٹتی چلی گئیں اور ایک ملک کا اثر اور اس کے رجحانات دوسری جگہ اثر انداز ہونے لگے۔ خیالات میں بھی اشتراک پیدا ہوتا جا رہا ہے یعنی جذبات ایک سے، افکار ایک سے، خیالات ایک سے یعنی ساری دنیا یہ چاہتی ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں۔ براہ کے وزیر محبت ہمارے یہاں آئے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا دہلی کیسے تشریف لانا ہوا تھا، تو انہوں نے

فرمایا کہ: ہمیں حکومت ہند سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک اپنے داخلی معاملات میں بھی خارجی ممالک کی پالیسی کے ماتحت ہے۔ گویا کہ سیاست داخلی سیاست خارجی سے پوری طرح متاثر ہے۔ چنانچہ یونائیٹڈ نیشن کا ادارہ (یو این او) یعنی مجلس اقوام متحدہ قائم ہے جو اشتراک ذہن کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی قوموں کے تعصبات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ حد بندیاں اور خصوصیات ختم ہو رہی ہیں۔

تبدیلی اصول..... چنانچہ اب یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اگر عالمی امن چاہتے ہو تو جھوٹ جھات مٹاؤ اور امتیازات کو ختم کرو، اسی وقت امن قائم ہوگا۔

گانڈھی جی جب دلی میں آتے تھے بھنگی بستی میں قیام کرتے تھے۔ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب امتیازات ختم کرنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

پنڈت پنت صاحب جب رنکھنڈی میں آئے تو انہوں نے ایک ہریجن کے مکان پر قیام کیا اور اس کے گلاس میں دودھ پیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوا کہ تمام قوموں کے اصول بدل رہے ہیں۔

پہلے عوام تابع تھے خواص کے اور اب خواص تابع ہیں عوام کے، پہلے چراغ تلے اندھیرا تھا اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہے۔ پہلے جو چیز چھپانے کی تھی وہ اب برسر عام آگئی، مثلاً دولت، عورت، پہلے خواص کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ اب عوام کی رائے کو اہمیت ہے، لہذا خواص کو نیچے اترنا پڑے گا اور عوام کو اوپر اٹھنا پڑے گا۔

اشتراک مذہب..... حالات یہ بتا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائیگی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو، جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا وہی کامیاب ہوگا۔ چنانچہ ایک مذہب نے اعلان کیا کہ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى﴾ ① الخ۔ گویا تمام اقوام مل کر ایک بدن کے اعضاء ہیں۔ ”بنی آدم اعضاء یک دیگرند الخ“۔

”ہم نے تم میں قبیلے بنائے تاکہ پہچان باقی رہے نہ اس لئے کہ تفاخر کا ذریعہ ہو۔ تم میں نسل کے اعتبار سے کوئی بڑائی چھوٹائی نہیں، البتہ عمل کے اعتبار سے بڑائی چھوٹائی رہے گی، پیدائشی اعتبار سے کوئی چھوٹائی بڑائی نہیں، آفتاب اگر چمکتا ہے تو وہ روشنی تقسیم کرنے میں اونچ نیچ نہیں برتا بلکہ سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق روشنی سے مستفید ہوتے ہیں، شیشہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے روشن ہوتا ہے اور کالا تو اپنی صلاحیت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ عبادت گاہیں کسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ جو زیادہ خشوع سے عبادت کرے گا وہ بڑھ جائے گا اور جو ایسا نہ کرے گا وہ نیچا رہے گا۔

عمومی مساوات..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اگر میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا“ ①۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ سنا اور مانو! ایک بڑھے نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے، تم خائن ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میں نے کیا خیانت کی؟ تو اس نے کہا، بیت المال سے سب کو ایک ایک چادر ملی ہے لیکن آپ کے بدن پر دو چادریں ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا عبد اللہ دے گا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اپنے باپ کو دے دی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر اعتراض کر سکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر پر اعتراض کر سکتا ہے۔ غور کی بات ہے کہ آج کے دور میں یہ اعلان مناسب ہوگا کہ اے انسانو! تم ایسے کام کرو جن میں سب کے لئے نفع سب کے لئے عزت سب کے لئے راحت ہو۔

یاد اعلان مناسب رہے گا کہ اے ہندو! اے عربو! تم صرف اپنا نفع دیکھو، بہر حال اونچ نیچ جو کچھ بھی ہے عمل کے امتیاز سے ہے، لہذا وہی مذہب چل سکے گا جس میں عمومی مساوات موجود ہو۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس وقت دنیا نے اسی اصول مساوات سے استفادہ کیا ہے۔ لہذا اب زمانہ کا تقاضہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی اور روحانی ہر اعتبار سے یکسانیت ہو، جو کہ وہ پہلے ہی سے اس ہمہ گیر ذہنیت کو لے کر چل رہا ہے۔ اسے کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی، وہ سب کو اپنے اندر سمو سکے گا۔

حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول..... بہر حال تعصب سے بچنا پڑے گا۔ تعصب مختلف اسباب سے قوموں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ اس سے بھی تعصب پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مقتدا کو برا کہا جائے۔ لہذا سب سے پہلے اس آیت قرآنی میں یہی کہا گیا ہے کہ ”ہم نے مان لیا اللہ کو اور اس کی کتاب کو جو ہماری طرف اتری ہے“۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ پہلوں پر نازل ہوا اس کو برا کہو بلکہ یہاں تک ہے کہ جو کچھ نبیوں، رشتیوں، مینیوں پر نازل ہوا ہم ان سب کو بھی ان کے وقت کے لئے سچا سمجھتے ہیں۔ حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول یہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں جتنی سچائیاں ہیں انہیں قبول کرے اور کتابوں کو سچا سمجھے اور جو کچھ ان لوگوں نے بعد میں اضافہ یا ترمیم کی ہے، اس کو رد کرے۔ قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام اقوام میں رسول بھیجے ہیں، شام، دمشق، عرب وغیرہ میں پیغمبر آئے۔ پھر کیا ہندوستان میں کوئی پیغمبر نہیں آیا؟ ضرور آیا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام ہی آئے جو لڑکا میں اترے۔ گویا مذہب کی ابتداء ہندوستان سے ہوئی ان کی کنیت ابو البشر ہے (یعنی مہادیو) ان کے بیٹے حضرت شیت علیہ السلام کی قبر جو دھیا میں ہے، پھر ہر ملک اور قوم میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے، تو

① السنن للنسائی، کتاب قطع السارق، باب ذکر اختلاف الفاظ الناقلین لخبر الزہری، ج: ۱۵، ص: ۶۱۔

حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۱۰ ص: ۳۶۶ رقم: ۴۹۶۶۔

گویا ہندوستان سے پیغمبری کی ابتداء ہوئی اور عرب پر ختم ہوئی۔

مہاتما بدھ کی پیشین گوئی..... حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک دو جگہیں بہت مقبول ہیں، ایک وہ جگہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام اترے، دوسری وہ جگہ جس میں کعبۃ اللہ ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ”النبی الخاتم“ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہندوستان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی تھی۔

چنانچہ بدھ کی جانکئی کے وقت بدھ کے ایک شاگرد زندانے ان سے پوچھا کہ تمہارے بعد اب ہماری راہنمائی کون کرے گا؟ تو مہاتما بدھ نے کہا کہ ہم سے پہلے بہت بدھ آچکے ہیں اور اب ایک آخری بدھ آئے گا جس کا لقب متریا ہوگا۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا چاہئے۔ متریا کے معنی ہیں رحمت کے۔ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کہا گیا ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب والوں نے اکثریت سے اسلام کی تعلیمات قبول کیں۔

اجمالی ایمان..... قرآن پاک میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل فرمایا گیا، مولانا مناظر احسن نے اس کے متعلق اپنے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے یہ مقام کپل ہے اور کپل وستواسی سے بنا ہے کفل اور کپل میں زیادہ فرق نہیں، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہر حال مشرقی ممالک نے اس بشارت کو قبول کیا اور مغربی ممالک مادیات میں پھنس کر تباہ ہو گئے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سر ہند شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہاں دو پیغمبر ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گنگا کے پانی میں خصوصی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ گنگا کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی تلاش میں چل دیئے اور گنگوتری پہنچے، وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس آ کر فرمایا کہ جہاں گنگا کا دہانہ ہے وہاں کسی پیغمبر علیہ السلام کے انوار نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ گنگا کسی پیغمبر کی دعا سے نکلی ہو۔ جیسے زمزم کا چشمہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی برکت سے جاری ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کو براست کہو۔ ممکن ہے یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں، اس لئے نام لے کر انہیں کبھی برا نہ کہو۔ چنانچہ ان کے پیغامات میں بہت سی باتیں حق ہیں۔ ممکن ہے بعد کے لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہو۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تعلیمات میں خلط کر دیا ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ جن کا نام قرآن وحدیث میں صراحتہ موجود ہے ان کا نام لے کر مانو اور جن کا نام نہیں آیا ان پر اجمالاً ایمان لاؤ۔

مذہب کی بنیاد..... اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی بنیاد ماننے پر ہے، یعنی تصدیق پر مدار ہے تکذیب پر نہیں۔ بخلاف اس کے یہودیوں کا مدار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر ہے اور عیسائیوں کا مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر۔ مگر اسلام نے اپنی بنیاد ماننے پر رکھی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب کی بنیاد ماننے ہی پر ہو سکتی ہے نہ ماننے پر نہیں، یعنی مذہب کی بنیاد مثبت پہلو پر ہونی چاہئے منفی پہلو پر نہیں۔

بہر حال چوں کہ پوری دنیا ایک قبیلہ بن گئی ہے اس لئے اب حد بندیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہی حال روحانی

خیالات اور عقائد کا بھی ہے۔ لہذا سب سے پہلے تعصبات مٹانے پڑیں گے اور تفریق ختم کرنی ہوگی اور وطن کی حد بندی ختم کرنی ہوگی۔ مدار ملک کا کلی امور پر ہوتا ہے، جزوی امور پر نہیں ہوتا۔ اور کلی امور عالمی امور ہیں۔ ان ہی پر ملک کا دار مدار ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی ملک والے کو دوسرے ملک والے پر فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

احترام انسانیت..... انسانیت کا احترام اسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح مذہبیت کا احترام، لہذا چھوت چھات اور تعصب کو مٹانا پڑے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ بن اسہم شاہ غسان مسلمان ہو کر طواف کر رہا تھا، اس وقت کسی اعرابی کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس اعرابی کو طمانچہ مار دیا۔ اعرابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ اعرابی اپنا بدلہ اس طرح لے سکتا ہے کہ جبلہ کے ایک طمانچہ لگائے۔ یہ وہی مساوات کا معاملہ تھا۔ جبلہ نے اس حکم کو سن کر کہا کہ مجھے مہلت دی جائے، جب اس کو مہلت دی گئی تو وہ بھاگ گیا اور پھر کفر کو اختیار کر لیا۔ لیکن اسلام نے بڑے اور چھوٹے، اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کے لئے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

مذہب واحد..... بنی اسرائیل کو ہر طرح کی دولت اور حکومت دی گئی تھی۔ انہوں نے عیش پرستی میں زندگی گزارنی شروع کر دی۔ پیغمبروں نے بہت سمجھایا، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر عراق کے بادشاہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور ان کا قتل عام کیا اور کئی لاکھ بنی اسرائیل گرفتار کئے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر بھی اسیروں میں سے تھے ان کی دیانت و امانت و راست بازی، صدق و صفا اور عبادت و زہد کو دیکھ کر حکام جیل ان کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے اور کمال احترام سے پیش آنے لگے۔ اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اس کے دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے دربار کے کاہنوں اور ساحروں کو طلب کیا اور اپنی قلبی بے چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھیں، ان سے خواب کی تعبیر طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ خواب بیان فرمائیے کہا، کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے کہا کہ پھر ہم تعبیر کیسے بتلائیں؟ اس نے غضبناک ہو کر کہا کہ۔ ”میں نے تمہیں اسی قسم کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس رتبہ تک پہنچایا تھا (جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟) جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اگر تم نے اس مدت میں خواب اور تعبیر بتلا دی، ورنہ تم سب قتل کر دیئے جاؤ گے۔“ اس واقعہ کا چرچا ہو گیا شدہ شدہ یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی۔ آپ علیہ السلام نے جیلر سے فرمایا جو ان کا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دے۔ کیوں کہ میرے پاس اس کے خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تیرا رتبہ اور منصب بڑھ جائے گا اور میری رہائی کی صورت نکل آئے گی (جس سے میری قوم اس قید و بند کے عذاب سے چھٹکارا پاسکے گی) جیلر

نے کہا، مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصہ کا ڈر ہے کہ کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے فرما رہے ہیں یا واقعی آپ کو علم ہے۔ حالاں کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے۔ فرمایا، تم میرا خوف نہ کھاؤ اور بے فکر ہو کر بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دو (میں قطعاً اس کے خواب اور تعبیر خواب کو جانتا ہوں) جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے ان باتوں کی خبریں دے دیتا ہے، جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جیلر نے بادشاہ سے جا کر تذکرہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیال علیہ السلام کو طلب کر لیا اور وہ شاہی دربار تک پہنچا دیئے گئے۔ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا، بادشاہ کو سجدہ کرے۔ لیکن دانیال علیہ السلام داخل دربار ہو کر کھڑے رہے اور سجدہ نہ کیا۔ تھوڑے وقفہ سے بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور تخیلہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ فرمایا: اس کی وجہ ہے کہ میرا ایک رب ہے، اس کا حکم ہے کہ میں اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کروں۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کر لوں اور وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے سلب کر لے، تو میں تیرا خواب نہ بتلانے کے سبب تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں اور تو مجھ سے اس علم کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور مجھے قتل کر ڈالے۔ اس لئے میں نے ترک سجدہ قتل سے آسان سمجھا اور ترک سجدہ کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اس بے چینی میں مبتلا رہے۔ جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب مبتلا ہے، پس میں نے ترک سجدہ کو تیرے اور اپنے دونوں ہی کے لئے مفید سمجھا۔

بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ اپنے الہ و معبود کا وفادار دوسرا نہیں اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے رب کے عہد و پیمان کو پورا کرتے اور وفادار رہتے ہیں۔ ہاں تو کیا تیرے پاس میرے خواب اور اس کی تعبیر کا علم ہے؟ فرمایا: ہاں ہے۔

”تو نے خواب میں دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک عظیم الشان بت معلق ہے۔ جس کے پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں اور سر آسمان میں۔ اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے، درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے، ٹانگیں لوہے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ تو اس کی خوبصورتی، حسن و جمال اور بے نظیر ساخت کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت کی ٹوٹی پر آ کر اس زور سے پڑا کہ یہ بت پاش پاش ہو کر سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا۔ اس کا سونا، چاندی، تانبہ، لوہا اور مٹی سب ایک رل ہو کر اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہو گئے کہ یہ سب دھاتیں رل رل کر ایک ذات ہو گئیں اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اب اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کر دیں تو نہیں کر سکتے۔ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو (یہ دھاتیں پس کر اس درجہ سرمہ ہو گئی ہیں

کہ ہوا بھی ان ذرات کو اڑا سکتی ہے۔

اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر (اس بت کو پس دینے کے بعد) اچانک فضا کے آسمانی میں پھیلنا شروع ہوا، اور پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہو گیا کہ پوری زمین پر چھا گیا، اور زمین اس سے چھپ گئی یہاں تک کہ آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

بخت نصر نے کہا بالکل درست، یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر فرمائیے! حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا (سنیے) وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں (مختلف درجات و مراتب کے ساتھ آئیں گی اور) موجود ہیں۔ سو اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے جس پر تو حکمرانی کر رہا ہے اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے، جس پر تیرا بیٹا حکمرانی کرے گا۔ اور تانبے کا حصہ رومی قوم ہے اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے۔ اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکمرانی کریں گی۔ ایک مشرقی یمن میں اور ایک مغربی شام اور وہ پتھر جو اس خوش نمابت کے اوپر آسمان سے پھینکا گیا، وہ دین ہے جو کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آ دیں گے وہ اور ان کی امت اس دین کو ان قومیتوں کے بت پر پھینک مارے گی تاکہ اس دین کو تمام اقوام کے ادیان پر غالب کر دے۔ (قومیتوں کی اونچ نیچ کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دے) پس اللہ تعالیٰ ایک نبی امی کو عرب میں مبعوث کرے گا جو تمام امتوں قومیتوں اور متخالف مذہبوں کو توڑ پھوڑ کر مذہب واحد کر دے گا۔ جس طرح اس پتھر نے بت کی تمام اونچی نیچی دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا (اور پھر وہ آخری دین) اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ جس طرح وہ پتھر بت کو توڑ کر خود ساری فضا میں چھا گیا۔

حق تعالیٰ اپنے دین کو خالص کر دے گا، باطل کا سر نیچا ہو جائے گا، راہ ہدایت سامنے آ جائے گی۔ ضلالت گم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ امیوں (ان پڑھوں) کو اس دین کی تعلیم دے گا اور دین کے ذریعہ ضعیف کو (جنہیں اچھوت بنادیا گیا تھا) قوت عطا کرے گا۔ ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کو اس سے مدد ہوگی۔

(بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے) عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا، جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت (دہشت و بے چینی) کو اس طرح چھانٹ دیا ہو اور اب میرے دربار میں آپ سے زیادہ کوئی بارتبہ نہ ہوگا۔ میں آپ کو اس احسان عظیم کے بقدر ہی صلہ دوں گا۔ ①

دین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم..... اس حدیث صاف سے واضح ہے کہ خاتم الانبیاء کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہوگا (جیسا کہ ہو چکا ہے) ان تمام قومی نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا اور اس

① تفسیر الطبری، سورة الاسراء، الآية ۷۰، ج ۱۷، ص ۷۷۰، ۳

طرح دنیا کی متفاوت قومیں اور اونچی نیچی ذاتیں رل مل کر ایک ذات ہو جائیں گی۔ چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ وہی قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات تھا، خود اپنے اس مذہب پر لعنتیں بھیجنے لگیں گی۔ حتیٰ کہ سارے رجعت پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو نہیں لوٹا سکیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہوگی، ایک ازم ہوگا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہوگی۔

پھر جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو چکی کہ سارے عقلاء و مدبرین اصول مساوات کو تہذیبی، معاشی اور معاشرتی حیثیت سے قولاً و عملاً و قلباً قبول کرتے جا رہے ہیں اور اس کے فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں۔ تو جس اسلام میں اس کی مکمل تعلیم تیرہ سو برس سے موجود ہے۔ اس مذہب کے دوسرے اصول بھی قابلِ غور ہو جاتے ہیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ چیز پیش کر رہا ہوں کہ یقیناً اسلام کے تمام اصول اسی طرح مکمل اور بہترین ہیں۔ پھر جس طرح دنیاوی ضروریات کے لئے سب نے وصولِ اسلام کو قبول کر لیا ہے تو کیوں نہ روحانی حیثیتوں سے بھی اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے۔ تعصبات سے ہٹ کر سنجیدگی سے گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ اسلام ہی ایسا مذہب ظاہر ہوگا جو شخصی جذبات کو تو نہیں، لیکن سلیم الطبع ہر مدبر و سنجیدہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا و آخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گز نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: **الدُّنْيَا مَرْزَعَةٌ الْآخِرَةُ** ① ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے“۔ جیسا بیج یہاں ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل آئے گا۔

گندم از گندم برود جوز جو
از مکافات عمل غافل مشو

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ)

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا مُهَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كُلِّ نَفْسٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ فَنَاغُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. ﴿وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهُوٌّ وَلَعِبٌ، وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَا إِلَهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۝ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوا، فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ ② صَدَقَ اللَّهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ

احوال واقعی..... بزرگان محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی تقریر کرنی نہیں ہے۔ وقت بھی تھوڑا ہے۔ اور میں بھی اس وقت تھکا ہوا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوں اور عوارض کے لحاظ سے بھی۔ اس لئے زیادہ بولنے کی ہمت نہیں، مختصر طریق پر اس آیت کریمہ کی روشنی میں ”چند باتیں“ آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کرنی ہیں۔

① علامہ مجلسی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم اقف علیہ مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وقال

القاری: قلت معناه صحیح مقبوس من قوله تعالى ”من كان يريد حرث الآخرة نزد له في حزنه“ ویکھئے: کشف

الخفاء ج: ۱ ص ۴۱۲ ② ۲۱: پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۲۳، ۲۵، ۲۶.

تذکرہ دنیا کا مقصد..... اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ، نے دو عالموں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت۔ عالم دنیا کا ذکر اس لئے کیا کہ ہم اس میں آباد ہیں۔ ہمارے فرائض بتلانے کے لئے دنیا کا ذکر کیا گیا ہے، دنیا کو منوانے یا دنیا پر ایمان لانے کے لئے تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔ ”انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی چیز کو ماننا“ یہ ایمان ہے آنکھ سے دیکھ کر ماننا یہ ایمان نہیں ہے یا عقل سے سمجھ کر مان لینا، اسے ایمان نہیں کہتے۔ کوئی یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایمان لایا کہ دو کا دگنا چار ہوتا ہے۔ یہ ایک عقلی چیز ہے، ایمان لانے کی چیز نہیں، محسوسات میں سے ہے، یا جب صبح آفتاب نکلے تو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ میں ایمان لایا کہ سورج نکل آیا ہے وہ ایمان لانے کی چیز نہیں، وہ تو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے۔ غرض ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی پیغمبر کے منہ پر اعتماد اور اطمینان کر کے جیسے وہ فرمائیں ویسے مان لینا اسے ایمان کہتے ہیں۔ بہر حال اس آیت کریمہ میں دنیا کا ذکر ایمان لانے کے لئے نہیں فرائض بتلانے کے لئے کیا۔

تذکرہ آخرت کا مقصد..... اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا ہے کیوں کہ وہ آنکھوں کے سامنے موجود نہیں۔ آخرت کی پہلی منزل ”عالم برزخ“ ہے جسے قبر کہتے ہیں۔ اس کے حالات کو نہ عقل معلوم کر سکتی ہے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ بجز اس کے کہ خبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خبر پر اطمینان کیا جائے اور کوئی صورت نہیں۔ عالم آخرت کا برپا ہونا، میدان محشر کے حالات، جنت و دوزخ کا وجود، پل صراط اور میزان کا وجود آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ عقل نے دریافت کیا۔ اس کو ماننا یہ ایمان ہے۔ غرض دنیا کا ذکر احکام کو بتلانے کے لئے کیا گیا ہے اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا گیا ہے۔

آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان..... جن قوموں نے آخرت کو عقل سے سمجھنا چاہا ہے، انہوں نے بہت ٹھوکر کھائیں اور وہ حقیقت حال نہیں سمجھ سکیں کیوں کہ عقل غیبی امور کا ادراک نہیں کر سکتی۔

عقل تو ان محسوسات میں آنکھ سے دیکھی چیز، کان سے سنی چیز یا ناک سے سونگھی چیز ان میں سے کچھ نتائج نکالتی ہے۔ لیکن غیبی امور کو پالینا یا پرکھ لینا یہ عقل کا کام نہیں ہے یہ وحی کا کام ہے اور وحی ہی یہ خبر دے سکتی ہے۔ کہ غیب کیا چیز ہے؟ عالم غیب میں کیا واقعات پیش آئیں گے؟ اس میں عقل درکار نہیں ہے نہ عقل کا رآمد ہے نہ عقل اس میں چل سکتی ہے، غرض جن قوموں نے آخرت کو محض نشانہ بنایا، انہوں نے ٹھوکر کھائیں۔

منکرین آخرت کا نظریہ..... بعض قوموں نے تو یہ سمجھا کہ آخرت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، صرف دنیا ہی کا عالم ہے، آگے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں جب آدمی مر گیا تو فنا ہو گیا، اب وہ نہ آئے گا نہ پہلے تھا، نہ آئندہ ہوگا، بس قصہ ختم ہوا۔ وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں کہ جزا و سزا ہوگی، حساب و کتاب ہوگا اور اللہ کے آگے بندوں کی پیشی ہوگی۔ وہ نہیں مانتے۔ اس لئے کہ کرام انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اطمینان نہیں رکھتے بلکہ وہ عقل پر پرکھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ عقل مرنے کے بعد کی چیزوں کی کوئی خبر نہیں دے سکتی، اس واسطے انہوں نے انکار

کر دیا۔ اور موت کے معنی ”فناء محض“ کے سمجھ کہ بس گیا سو گیا، جیسے پہلے نہیں تھا ویسے ہی آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ غرض بعض اقوام نے ایک نظریہ یہ قائم کیا کہ جو کچھ ہے معاذ اللہ وہ دنیا ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔

دنیا کو فقط ”راہ گزر“ ماننے کا نظریہ..... بعض قوموں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اصل آخرت ہے، دنیا اس کا راستہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی عالم آخرت آئے گا۔ جو دنیا میں نہیں آیا، پیدا نہیں ہوا اس کے لیے آخرت بھی نہیں۔ جو دنیا میں آ گیا، پیدا ہو گیا پھر اس نے انتقال کیا اس کے لئے عالم آخرت ہے۔ غرض دنیا ایک راستہ اور راہ گزر ہے، آنے والی چیز آخرت ہے۔ وہی اصل منزل و مقصد ہے وہیں جانا ہے۔ تو ایک یہ نظریہ کہ آخرت کو مانا مگر اس کے ساتھ دنیا کو محض ایک راہ گزر مانا۔

پہلے نظریے کے دنیوی آثار..... ان دونوں نظریات کے اقوام پر دو اثر پڑے، جنہوں نے کہا کہ فقط دنیا ہی کا عالم ہے آخرت آنے والی نہیں۔ وہاں سے تمدن کا غلو برپا ہوا۔ انہوں نے کہا جب دنیا ہی دنیا ہے تو عیش اڑانے میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

بابر بہ عیش کوش کہ ایں عالم دوام نیست

کھانا، پینا، پہننا اور رہنا سہنا، نیز کوشی اور بچھے، یہی ان کی دنیا ہے اور یہی ان کی آخرت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ نہ ان کو حلال اور حرام کی تمیز کی ضرورت۔ جب دنیا ہی دنیا ہے آگے کہیں جانا نہیں۔ کوئی حساب دینا نہیں۔ اس لئے جائز و ناجائز کی بحث ہی نہیں آتی، بس جس طرح سے ہو عیش اڑاؤ۔ اس طرح سے تمدن کا غلو اور تمدن میں مبالغے برپا ہوئے کہ فقط یہی نہیں کہ آدمی اچھا کھالے، پی لے اور اچھا پہن کر گزر کر لے۔ بلکہ کھانے اور پینے میں اتنا مبالغہ اور اتنے تکلفات بھی جہاں عقل بھی نہ پہنچے، وہ تکلفات بھی پیدا کئے جارہے ہیں۔ غرض دنیا کو سجادینے کا نام زندگی ہے۔ وہ نہ سمجھتے تو انسان کی زندگی نہیں ہے۔ تو تمدن کے مبالغے، عیش و آرام کی چیزیں، کھانے اور پینے کے سامان، رہنے اور سہنے کے سامانوں میں مبالغے اتنے ہوئے کہ پچھلوں کی عقل میں بھی نہیں آ سکتے تھے کہ دنیا ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جائے گی، عیش و آرام کے اتنے سامان برپا ہو جائیں گے۔ غرض اس نظریے کے تحت تمدن کا غلو پیدا ہوا کیوں کہ دیانت اور دین کوئی چیز نہ رہا۔ اللہ کے آگے حاضری اور حساب دینے کا کوئی سوال نہ رہا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی تو جس طرح سے چاہو اس کو برپا کر لو۔ جتنا چاہو اس میں عیش اڑاؤ، بقول شاعر کہ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوام نیست

جتنی عیش اڑانی ہے اڑا لو آگے کچھ نہیں ہے۔ تو تمدن و مدنیّت اور تمدنی سامانوں کی افراط پیدا ہوئی۔ اس لئے جو لوگ اس تمدن کے موجد ہیں انہیں شاید بھول کے بھی موت کا خیال نہیں آتا۔ بھول کر بھی قریباً آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ ایک ہی تصور ہے کہ دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، بس جس طرح چاہو اسے چلاؤ۔ غرض ایک نظریہ تو یہ تھا اور

اس کا یہ اثر پڑا کہ دین ختم ہو گیا، دنیا رہ گئی۔ آخرت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، فقط دنیوی سامان سامنے رہ گئے۔ دوسرے نظریے کے دنیوی آثار..... دوسرا نظریہ یہ تھا کہ آخرت ہے اور وہی مقصود ہے۔ دنیا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر جانا ہے۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ نہ صرف یہ کہ تمدن اختیار نہ کرو۔ بلکہ جتنا جسم کو عذاب دو، جتنا اسباب عیش کو ترک کرو، جتنی رہبانیت اختیار کرو وہی آخرت بنانے والی ہے۔ تو بعض اقوام نے یہی کیا۔

چنانچہ ہم نے برامیں دیکھا کہ ان کے جو مذہبی پیشوا ہی جنہیں ”ہکھشو“ کہتے ہیں، وہ نہ گھر بناتے ہیں، نہ نکاح نہ شادی نہ بیاہ۔ بلکہ کھانا پینا بھی خود نہیں پکاتے، بھیک بھی نہیں مانگتے۔ ان کا کام یہ ہے کہ صبح کو وہ نکل گئے، قوم جانتی ہے کہ کھانے کے لئے آئے ہیں۔ تو ہر گھر میں کھانے سے پہلے ایک آدھ روٹی ان کے نام کی رکھ لی جاتی ہے اور کچھ سالن رکھ دیا۔ جہاں وہ آئے انہیں دے دیا۔ یہ ان کا کھانا ہے۔ پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے ہیں۔ ایک دھوئی انہوں نے باندھ لی اور وہی اوڑھ لی۔ اور کہتے ہیں دنیا راہ گزر رہے۔ جتنا اس میں تکلف کیا جائے گا اتنا ہی آخرت فراموش ہو جائے گی۔ اور ہے اصل میں آخرت۔ بہر حال یہاں تمدن سرے سے ختم ہو گیا۔ پہلے نظریے کے تحت تو تمدن ہی تمدن رہ گیا تھا اور دوسرے نظریے کے تحت سرے سے تمدن ختم ہو کر دنیا لاشی، بیچ اور فانی بن گئی کہ اس کے اندر ذرا سا بھی آرام کرنا یہ گویا آخرت کو کھود دینا ہے۔

عیسائیت اور دنیا..... عیسائیوں میں دیکھا گیا، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جتنا بدن کو تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی آخرت فنی ہے۔ چنانچہ ان میں بعض رہبان دیکھے گئے، تاریخوں میں یہ موجود ہے کہ ایک گڑھا ہے اور اس میں گارا ہے اس میں پڑ کے برس گزارتے ہیں اور بڑی کھیاں انہیں کاٹ رہی ہیں، بدن کے اوپر ورم چڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ گارے کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم آخرت میں جا رہے ہیں، دنیا سے ہمیں کوئی سرور کار نہیں ہے۔ شادی بیاہ سے غرض نہیں، مکان بنانے سے غرض نہیں۔ اگر گر جائیں کوئی عورت ”نن“ (NUN) بن کے گئی تو وہ یہ عہد کر کے جاتی ہے کہ نہ شادی کرے گی نہ بیاہ کرے گی۔ لذات دنیا سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مرد جاتا ہے تو وہ عہد کر کے جاتا ہے نہ نکاح کرے گا نہ عورت اس کے گھر میں آئے گی، نہ گھر در ہوگا۔ غرض ایک نظریے کے تحت تمدن اتنا رہا ہوا کہ آخرت فراموش ہو گئی۔ اور ایک نظریے کے تحت تمدن اتنا مٹا کہ دنیا بے رونق ہو گئی۔ بس آخرت ہی آخرت پیش نظر ہے۔ وہ فنی ہے یا نہ بنے، یہ الگ بات ہے۔ یہ دو متضاد نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے، آخرت ہی ایک چیز ہے۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہے دنیا ہے، آخرت کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ..... اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو راستہ ہے، یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: ”الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ مِنَ الْاُولٰٓئِیۡہِ“۔ ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل۔

گندم از گندم بروید جوز جو از مکافات عمل غافل مشو

گیہوں کا بیج ڈالو گے تو گیہوں اگے گا، کیکر کا بیج ڈالو گے تو کانٹے دار درخت اگے گا۔ سینڈھ کا بیج ڈالو گے بد بو دار درخت اگے گا۔ غرض جیسا یہاں کروے گا ویسا ثمرہ سامنے آ جائے گا۔ تو آخرت سے دنیا بنتی ہے، یہ نہیں ہے کہ دنیا کا تعلق آخرت سے نہیں اور آخرت کا تعلق دنیا سے نہیں۔

دنیا میں رہنے کا انداز..... اب یہ کہ دنیا میں کس طرح سے رہو؟ تو اسلام نے یہ نہیں بتلایا کہ تم پھٹے حال سے رہو، تم بھک مٹنے بن کر رہو، گھر گھر بھیک مانگ کر معاذ اللہ اپنا پیٹ پال لیا کرو۔ فرمایا: ”اَلَيْدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنْ اَلَيْدِ السُّفْلَى“ ① ”اوپنچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے“۔ مانگنے والا ہاتھ وہ کم رتبہ ہے اور عطاء کرنے والا ہاتھ بہتر ہے۔

اور فرمایا: ”كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ“ ② ”حلال مال کا کمانا ایسا ہی فرض ہے جیسا نماز روزہ فرض ہے“۔ آدمی کا فرض ہے کہ وہ کمائے، وہ مانگ کر نہ کھائے، بلکہ دس کو کھلا کر کھانے کے بھی قابل ہو اس درجے پر آئے۔ غرض مسلمان کوئی بھک مٹنا نہیں بنایا گیا، کوئی سائل بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ بھکاری بنے۔ بلکہ عطاء کرنے والا بنا کر بھیجا گیا کہ دنیا کی اقوام کو کچھ دے، ان سے مانگنے کا روادار نہ ہو بلکہ معطی بنے، عطاء کرے اور وہ چیزیں دے جس کی دنیا محتاج ہے۔ ان کو دین کی طرف دعوت دے، اس دین کی طرف جس میں دنیا بھی برابر کی ہے اور آخرت بھی برابر ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّرَى اَقْرَبُ نِعْمَتِهِ عَلٰى عَبْدِهِ“ ③ ”اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس کے اوپر کچھ آنا چاہئے۔ کچھ ڈھنگ کا لباس ہو، کچھ ڈھنگ کا کھانا پینا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو۔ ڈھنگ سے ہو اور جمال کے ساتھ ہو۔ مبالغہ کو تو روکا ہے کہ حدود سے مت گزرو۔ جیسے دین کے بارے میں فرمایا: ”لَا تَغْلُوا فِىْ دِيْنِكُمْ“ ④ ”دین میں زیادہ مبالغہ مت کرو کہ تحمل سے باہر ہو جائے۔ اتنا ہی عمل اختیار کرو جسے عمر بھر بھرا دو“ اسی طرح دنیا کے بارے میں فرمایا کہ اتنا مبالغہ مت کرو کہ وہ آخرت کے بھلانے کا ذریعہ بن جائے۔ اتنی دنیا اختیار کرو کہ عیش و آرام سے گزر بسر کرو۔ دوسرے کو کھلا کر خود کھا سکو۔ یہ ضرور کرو۔ مگر اپنی آخرت کو مت بھلاؤ کہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جاؤ کہ دل سے موت کا تصور ہی نکل جائے۔ اس سے روکا ہے۔ یہ غلو اور مبالغہ ہے۔

دولت و عبادت کا باہمی ارتباط..... حدیث میں فرمایا گیا (جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے) تم اس طرح

① الصحيح لمسلم، كتاب الزكوة، باب بيان ان اليد العليا خير من اليد السفلى ج: ١، ص: ٣٣٢.

② شعب الايمان للبيهقي، الستون من شعب الايمان وهو باب في حقوق الاولاد، ج: ١٨، ص: ١٢٦.

③ السنن للترمذی، كتاب الادب، باب ماجاء ان الله تعالى يحب ان يروى، ج: ١٠، ص: ٢٠.

④ پارہ: ٢، سورة النساء، الآية: ١٤١.

زندگی بسر کرو اور زہد و قناعت کے یہ معنی سمجھو کہ جب دنیا سے جاؤ تو کوئی چیز پیچھے چھوڑ کے نہ جاؤ، (اور نہ یہ کہ) اولاد بھک منگی ہو۔ فرمایا۔ ”یہ بہتر نہیں ہے“۔ یہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے لئے کچھ سامان کرتے جاؤ۔ یہ جیسی تو ہوگا جب آدمی کچھ کمائے گا، کچھ دولت فراہم کرے گا، کچھ بچوں کے لئے چھوڑے گا، کچھ ان کی خدمت کرے گا، کچھ عزیز و اقرباء کی خدمت کرے گا۔ ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں، آپ زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ تو ایک فرض سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں مال نہیں حج کیسے کریں گے؟ توجہ کی دولت سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں تو غرباء کی خدمت کیسے کریں گے؟ تو عطایا سے آپ محروم ہو گئے غرض ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جو مساجد میں آپ نماز پڑھ رہے ہیں یہ بھی تو دولت پر موقوف ہے، دولت ہاتھ میں نہ ہوتی تو اتنی خوشنما مسجد کہاں سے بنتی؟ اللہ کا گھر اتنا آراستہ کیسے ہوتا؟ اور یہ بہترین قالین کی جانمازیں جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر کو سجا رکھا ہے۔ یہ دولت ہی کا تو کرشمہ ہے۔ تو دولت پر نماز بھی موقوف، حج بھی موقوف، زکوٰۃ بھی موقوف اور صدقات بھی موقوف، ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اسلام جامع دین تھا وہ دولت کو حرام کیسے قرار دیتا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی کو ساری عبادتوں سے محروم بناتا۔ اس واسطے اس سے حکم دیا۔ ”کُنْ سَبَّ الْحَلَالِ فَرِيضَةً بَعْدَ الْفَرِيضَةِ“ ”حلال کی کمائی کرنا انسان کے اوپر ایسا ہی فرض جیسا نماز روزہ فرض ہے“۔

مقصد تو یہ ہو کہ میں کسی کا محتاج بن کے نہ رہوں اتنا کمائے، مگر اب اللہ برکت دے اور لکھ پتی بنادے تو اس کی اجازت بھی نہیں دی کہ اس مال کو ضائع کر دو یا سمندر میں بہا دو۔ اس کو اس کے مصرف میں جائز اور حلال طریق پر خرچ کرو۔ غرض حلال ہی طریق پر کماد اور حلال طریق پر اسے صرف کرو تو یہ صرف کرنا اور کمانا یہ سب عبادت میں داخل ہوگا۔ اس لئے کہ یہ عبادت کا وسیلہ ہے۔

وسائل عبادت کا حکم..... اور وسیلہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقصد کا ہوتا ہے، جب مقصد عبادت ہے تو اس کا وسیلہ بھی عبادت ہے۔ آپ جو نماز پڑھ رہے ہیں اس کا وسیلہ وضو ہے اس لئے وضو بھی عبادت میں داخل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وضو پر کوئی ثواب نہ ملے۔ البتہ نیت شرط ہے۔ بلا نیت وضو کریں گے تو پاکی تو حاصل ہو جائے گی، نماز بھی جائز ہوگی، مگر وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ جب تک آپ یہ نیت نہ کریں کہ اس لئے وضو کر رہا ہوں کہ یہ نماز کا وسیلہ ہے، تو وضو بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز کا وسیلہ ہے۔

دنیا وسیلہ آخرت..... اسی لئے ساری دنیا مسلمان کے لئے دین کا وسیلہ بنائی گئی ہے۔ ”إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ“ ① ”دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو،۔“

① شعب الایمان للبیہقی، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵۔ حدیث منقطع

ہے۔ دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۷۔

تو دنیا آخرت کے لئے کماؤ۔ خدمت و اطاعت کے لئے۔ اور یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ غرض کمانا اور خرچ کرنا یہ سب طاعت میں داخل ہے، بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور رضائے خداوندی مقصود ہو۔ اسی لئے قرآن کریم میں بعض آیتوں میں تو مذمت کی گئی ہے اور بعض میں مدح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔ ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ① ”یہ تمہاری اولادیں اور یہ تمہارے مال تمہارے لئے فتنہ ہیں اور آزمائش کی چیزیں ہیں“۔ تو اس سے ایک گونہ مذمت نکلی۔ دوسری جگہ حدیث میں ارشاد فرمایا۔ ”بِغَمِّ الْمَالِ الصَّالِحِ لِلْوَجَلِ الصَّالِحِ“۔ ② ”اچھے انسان کا اچھا مال وہ بہترین متاع اور بہترین پونجی ہے“۔ تو یہاں مال کی تعریف کی ہے۔ غرض ایک جگہ ہے مذمت اور ایک جگہ مدح ہے۔ مذمت اس لئے ہے کہ رضائے خداوندی اور جائز طریق پیش نظر نہ ہو۔ مدح اس لئے کہ رضائے خداوندی مقصود ہے اس کے لئے آدمی بڑھ رہا ہے اور اس کے دائرے میں رہ کر کما رہا ہے۔ وہ مال بھی مبارک اور کمانے والا بھی مبارک۔

اگر مال مطلقاً مذمت کی چیز ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی دولت مند نہ ہوتا۔ حالاں کہ ان میں لکھ پتی بھی ہیں، ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، ہزار پتی بھی ہیں۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کے اندر کروڑ پتی، لکھ پتی لوگ موجود ہیں۔ کروڑ پتی امام..... آپ ہی کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن کی فقہ پر آپ چل رہے ہیں، کے ہاں ریشمی کپڑے کی تجارت تھی اور یہ نہیں کہ کوئی ایک آدھ دکان لگی ہوئی ہو کہ ریشمی کپڑا فروخت ہو گیا، بلکہ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے اور ملکوں میں کپڑا سپلائی ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے امام صاحب گویا کروڑ پتی تھے، حتیٰ کہ وفات ہوئی تو مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے خزانے کے اندر کروڑوں روپیہ جمع تھا جس میں کچھ وصیتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ اولاد پر تقسیم ہوا۔

تجارت میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط..... بایں ہمہ کمانا بھی انتہائی حلال کا تھا۔ چنانچہ ان کے واقعات میں موجود ہے کہ امام صاحب نے ایک شخص کو تجارت کے لئے وکیل بنا کر بھیجا اور فرمایا مصر میں جا کر اس مال کو بیچو۔ اول تو اس شخص نے یہ کیا کہ بیچنے میں کچھ تاخیر کی کہ ذرا مانگ کچھ بڑھ جائے اور مال کچھ گراں ہو، جب بیچوں۔ چنانچہ مہینہ بھر کے بعد قیمت چڑھ گئی تو ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ کمایا، کافی نفع ملا۔ دوسرا اس نے یہ کیا کہ جب مانگ بڑھی تو اس نے ایک پیسہ فی روپیہ اس کی قیمت بڑھادی۔ گاہک زیادہ تھے تو دو لاکھ کے اڑھائی لاکھ وصول ہوئے۔ یہ رقم لاکر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدمت میں پیش کی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اندازہ یہ تھا کہ ستر، اسی ہزار روپیہ نفع ہوگا، وہاں اڑھائی لاکھ نفع سامنے آیا۔ فرمایا اتنا نفع کیسے ہوا؟ اس نے کہا، اول تو میں نے بیچنے میں تقریباً ایک ماہ کی تاخیر کی تاکہ کچھ مانگ بڑھ جائے، کچھ گراں ہو جائے

① پارہ: ۲۸، سورۃ النعین، الآیۃ: ۱۵۔

② مسند احمد، حدیث عمرو بن العاص، ج: ۳۶، ص: ۱۶۵۔

اور اس کے ساتھ میں نے ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا دیا۔

فرمایا: ”نعوذ باللہ!۔ پہلی صورت ”احتکار“ کی تھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کرو تا کہ گاہک مجبور ہو کر خریدے۔ تو گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یہ حرام خوری ہے۔ غرض احتکار کیا جو شریعت میں ممنوع ہے کہ مال بیچنے میں اس لئے تاخیر کرو کہ اس کی قیمت زیادہ اٹھے گی۔ بلکہ اپنے وقت پر بیچو۔ عام طور سے جتنی قیمت ہے اس پر فروخت کر دو۔ مال کا انتظار میں رکھنا کہ قیمت چوگنی ہو جائے، شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔“ پھر فرمایا کہ۔ ”ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا کر تم نے غبن فاحش کیا، شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔“ فرمایا۔ ”اب یہ تو مشکل ہے کہ تمہیں اڑھائی لاکھ روپے دے کر بھیجوں کہ لوگوں کو واپس کرو، خدا جانے کوئی گاہک کہاں کا ہوگا کوئی کہاں کا؟ لہذا ایک پائی بھی میرے خزانے میں داخل نہ کی جائے۔ ابھی اس مال کو غریبوں پر صدقہ کر دیا جائے۔“ تو اڑھائی لاکھ روپے اسی وقت غریبوں میں تقسیم کر دے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ کمائی کی صورت تھی کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فروختی ہوئی اور مال کمایا جاتا۔

مصارف سے مدخل کا اندازہ..... جب جائز طریق پر مال آتا تھا اس کے بعد میں تو جائز ہی طریق پر خرچ بھی ہوتا تھا۔ جیسے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ”میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مدخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ جس جگہ صرف ہوتا ہے سمجھ لیتا ہوں کہ اگر یہ اچھی جگہ ہے تو آیا بھی اچھے طریق سے ہے۔ اگر حرام جگہ صرف ہو رہا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ حرام ہی کی کمائی ہے۔ غرض مصرف دیکھ کر اس کے مدخل کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس طرح سے آیا ہوگا۔“ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مال پاک اور انتہائی پاکیزہ طریق پر آتا تھا تو خرچ بھی ایسے راستوں میں ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں..... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس بنائی جس میں تقریباً چار، پانچ سو علماء کرام اور محض علماء نہیں بلکہ اپنے اپنے فن کے امام اس میں جمع کئے۔ کوئی تفسیر کا امام، کوئی حدیث کا امام، کوئی لغت کا امام اور کوئی فقہ کا امام۔ ان سب پر مشتمل مجلس بنائی اور فقہ کے مسائل مرتب ہونا شروع ہوئے۔ اجتہاد اور استنباط سے مسائل نکالے گئے۔ ایک مسئلہ اس مجلس میں پیش ہوتا اور ہفتوں اس پر بحث ہوتی۔ گھر گھر کر جو اخیر میں نکھری ہوئی بات نکلتی ہو، مرتب کر کے لکھی جاتی کہ یہ قرآن و حدیث سے قریب تر ثابت ہے۔ یہی آپ کا فقہ حنفی ہے۔ تو ان چار، پانچ سو علماء کرام کی تنخواہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خزانے سے دی جاتی۔ کسی کے ایک ہزار ماہوار مقرر، کسی کے دو ہزار اور کسی کے تین ہزار اس طرح لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ اس پر ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا غرباء پر خرچ..... پھر یہ الگ تھا کہ صدقات و خیرات کے اندر کونے کے جتنے گھرانے تھے، ان کی فہرستیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں لکھی ہوئی تھیں کہ فلاں گھر میں اتنے بڑے

ہیں، اتنے بچے ہیں، اتنی عورتیں ہیں اور اتنے مرد اور غریب ہیں۔ بس روز روز کا کھاپی لیتے ہیں اور پس اندازہ (بچایا ہوا) اور پیچھے کچھ چھوٹا ہوا نہیں۔

ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے اور کونے کے اندر جتنے غریبوں کے گھر ہیں سب کے لئے لباس ان کی قد و قامت کے مناسب رمضان میں تیار ہوتے۔ عید کا چاند دیکھا گیا اور فجر کی نماز سے پہلے ہر گھر میں گھر کے افراد کی تعداد کے مطابق لباس پہنچ جاتا تھا۔ تو غرباء کہتے تھے کہ ہم غریب نہیں، ہماری عید بھی امیروں کی سی ہے۔ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ غرض یہ خرچ الگ تھا کہ کوئی غریب گھر انہ خالی نہ رہتا تھا کہ ان کی عید نہ ہو۔ اعلیٰ ترین لباس جتنا اس کے مناسب حال ہے پہنچتا تھا تو علماء پر لاکھوں کا یہ خرچ تھا اور غرباء پر یہ خرچ تھا۔

ایک مقروض سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ..... پھر اوپر سے قرض کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ قرض لیتے تھے۔ کسی کو پچاس ہزار کی ضرورت ہے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ دے دیتے تھے، تیس ہزار کی ضرورت ہے تو دے دیتے تھے۔

اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ لینے کے بعد ان کی نیت بدل گئی، دیئے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ ایک شخص نے پچاس ہزار کا قرض لیا۔ اب یا تو یہ کہ دینے کی قوت نہیں رہی تھی یا یہ کہ اتنی بڑی رقم کیسے واپس کروں۔ تو کترانا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے ہیں تو کسی گلی میں گھس گیا۔ پھر دیکھا کہ ادھر سے آ رہے ہیں تو دوسری گلی میں گھس گیا۔ سامنے نہیں ہوتا تھا، شرمندہ ہوتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے کہ اس کی نیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے تھے وہ دیکھ کر دوسری گلی میں گھسا۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ لپک کر اسی گلی میں گھسے اور جا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

”بھائی! ہم نے کیا قصور کیا جو ہم سے کترانے لگے؟ ہم کوئی اچھوت اقوام میں سے ہیں کہ ہم سے کنارے کنارے چلو؟ آخر کیا وجہ ہے؟“ اب وہ چپ، کیا کہے دل میں چور تھا ہی۔ فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے پیسے واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا۔“ یہ نہیں فرمایا کہ پاس نہیں ہیں۔ وہ خود مال دار آدمی تھا۔ یہ فرمایا کہ قرض ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کترانے کی یہ وجہ ہے۔ فرمایا: مال بھی ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے تعلقات خراب کیے جائیں؟ پچاس کا پچاس ہزار روپیہ بالکل معاف۔ مگر تعلقات پہ پانی نہیں پھیرنا چاہئے۔ آمد و رفت ویسی ہی جاری رکھنی چاہئے۔ بالکل معاف ہے۔ تمہیں ایک پائی بھی دینی نہیں پڑے گی۔“

سینکڑوں واقعات ہیں کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قرضے معاف کر دیئے۔ یہ سخاوت کا دریا جاری تھا۔ تو کمانا بھی انتہائی احتیاط کا اور خرچ کرنا بھی انتہائی احتیاط تھا۔

عبادت مالیہ کی توفیق کا معیار..... اس لئے شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میں مال کے مصرف کو دیکھ کر اس کے آنے کے راستہ کا پتہ چلا لیتا ہوں، اگر مصرف صحیح ہے تو آیا بھی صحیح راستہ ہے اور اگر مصرف غلط

ہے تو آیا بھی غلط راستہ سے ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

جو ناجائز یا غیر محتاط طریق پر کمایا جاتا ہے وہ خرچ بھی ایسے ہی مصارف پر ہوتا ہے، اس مال کے لئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو ناجائز طریق پر کمایا گیا ہو۔

اظہار نعمت کا موقع..... بہر حال میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام نے دنیا کو لاشی اور ہیچ نہیں قرار دیا کہ آخرت کو پیش نظر رکھو اور دنیا میں بھک مٹنے بن کے رہو، دنیا میں بالکل ڈولید (پریشان) حال ہو کر رہو اور پھٹے حال سے رہو، یہ نہیں فرمایا بلکہ: ”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ يُرَى آثَرُ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ“ ① ”جس بندے کو اللہ نعمت دے تو اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا کچھ اثر آئے“

کچھ لباس ڈھنگ کا ہو۔ کچھ کھانا بھی ڈھنگ کا ہو۔ کچھ رہنا سہنا بھی ڈھنگ سے ہو۔ اور کچھ معاشرت بھی اچھی ہو۔ یہ نہیں کہ پھٹے حال سے رہے۔

شخصی احوال قابل اتباع نہیں..... اب بعض کو یہ شبہ ہو گا کہ بعض احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے تو ثابت تک پہنچا ہے۔ اچھے کپڑے چھوڑ دیئے۔ وہ ان کا حال قانون نہیں ہوتا۔ یہ قانون شریعت ہے، باقی کسی پر زہد و قناعت کا حال غالب آجائے اور وہ سارا مال دولت صدقہ کر کے قبرستان میں جا بیٹھے، وہ اس کا حال ہے۔ اسے برا نہیں کہا جائے گا۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے لیکن اسے قانون نہیں بنایا جائے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے۔ دعوت اس چیز کی دی جائے گی جس کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قانون غیبی پیش کیا، قانون وہی رہے گا۔ لوگوں کے احوال قانون نہیں بن سکتے، ان لوگوں کی عظمت کی جائے گی، ان کی عزت کی جائے گی۔ ان کے اس فعل کو برا سمجھا جائے گا، مگر قانون نہیں بنایا جائے گا کہ اس فعل کی آپ تبلیغ کریں کہ فلاں نے سارا گھر چھوڑ دیا تھا لہذا تم بھی چھوڑ دو۔ غرض یہ قانون نہیں، شخصی حال ہے۔ آپ کے اندر وہ حال آجائے گا، آپ اس پر عمل کریں پھر کوئی روکنے والا نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی اتباع..... بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کو اپنا مذہب قرار دیا۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان وہ ہے کہ کون ان کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سید الانبیاء ہیں، تو آپ کی زندگی اور بھی اونچی ہے اور بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے ہر ایک اس کے اوپر چل نہیں سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ گئے چنے ہیں جو اس شان پر چلے ہیں، جو خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی شان تھی اس لئے وہ شہروں میں نہیں رہ سکے۔

چنانچہ ابو زہرہ غفاری رضی اللہ عنہ، صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا زہد و قناعت مشہور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ

عزہ کا دور خلافت تھا۔ یہ شام میں گئے اور شام میں تمدن و تکلفات اور کھانا، پینا خوب تھا۔ وہ غریبی تھوڑا ہی رہی تھی جو عربوں میں تھی۔

مکانات اور بلڈنگیں بھی ہیں کھانے پینے کی بھی متعدد چیزیں ہیں، لباس بھی عمدہ ہے۔ اب جس کے ہاں دیکھا کہ دسترخوان پر دو کھانے تھے، بس ڈنڈا لے کر وہاں پہنچے اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر کب دو کھانے آئے؟ ابھی صدقہ کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین ڈر کے مارے صدقہ کر دیتے تھے۔ کسی کے گھر میں ایک لباس کے علاوہ دوسرا جوڑا بھی موجود ہے، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دوسرا جوڑا کب تھا؟ تو تمہارے لئے رکنا کب جائز ہے؟ یا کسی کے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کب دولت جمع تھی جو تم نے جمع کی، ابھی صدقہ کرو“ حتیٰ کہ لوگ عاجز آ گئے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ: ”انہوں نے ہماری زندگی تنگ کر دی۔ ہم قانون شریعت پر چلتے ہیں، قانون میں گنجائش ہے، توسعات ہیں۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک..... اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت اعلیٰ عزیمت کی زندگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہو، ہو اس کی پیروی کر سکے۔ ہر ایک کی قوت نہیں۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ”مغرب کی تکبیر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلے پر تھے، تکبیر ہو چکی نماز شروع کرانے سے پہلے ایک دم گھبرا گئے اور گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑے سے وقفے کے بعد تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھائی۔“ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ”آج خلاف عادت تکبیر کے بعد کچھ وقفہ کیا، گھر میں تشریف لے گئے پھر واپس تشریف لائے، کچھ دیر لگی کیا وجہ پیش آئی؟“ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے طاق میں ایک دینار پڑا ہے اور نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے گھر پر رات گزرے اور سونا، چاندی اس کے گھر میں ہو۔“ وہ ایک دینار تھا جو سات درہم کا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ہمارے لحاظ سے دواڑھائی روپے کا سونا تھا۔ فرمایا: ”جا کے اسے صدقہ کیا، گھر کو اس سے پاک کیا تب آکر میں نے نماز پڑھائی نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ نبی کے گھر پر رات گزرے اور سونا یا چاندی اس کے گھر میں ہو۔“ ① تو آج کون ہے جو اس ذاتی چیز پر عمل کرے کہ بیوی کا سارا زیور لے کر ابھی صدقہ کرے، جو کچھ تجوری میں رکھا ہے سب غریبوں کو بانٹ دے۔ یہ کس کی مجال ہے اور کس کی ہمت ہے؟

تو سعادت شریعت..... شریعت نے جب اجازت دی کہ زکوٰۃ دے دو، صدقات دے دو، بقیہ مال تمہارے لئے حلال ہے، عام لوگ تو اسی پر چلیں گے۔ اب یہ کیفیت کہ ایک پانی گھر میں نہ رہے، یہ جب حال ہوگا کیفیت

① السنن للنسائی، کتاب السہو، باب الرخصة للامام فی تخطی رقاب الناس، ج: ۵، ص: ۱۹۱۔

حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی، ج: ۳، ص: ۹۰، رقم: ۱۵۰۹۔

ہوگی اور حال کسی کا حجت نہیں بنا کرتا، وہ قانون نہیں بنا کرتا، حجت قانون شریعت ہے۔ ہاں اللہ تمہیں وہ حال دے دے سبحان اللہ! تم یہ کام کرو، تمہاری بھی تعظیم کریں گے، لیکن تم قانون بنا کر اس کو اسٹیج پر پیش کرنے لگو کہ سارے گھر کی چیزیں ابھی صدقہ کر دو یہ جائز نہیں ہوگا، بلکہ یہ قانون کا مقابلہ ہوگا۔ بہر حال شرعی توسعات الگ چیز ہیں اور لوگوں کے ذاتی احوال الگ چیز ہیں، ہر کس و نا کس کے لئے جو پیغام ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا۔ حال اس کے لئے حجت ہوگا جو صاحب حال ہے، وہ عمل کرے، اس کی عظمت کی جائے گی۔

اجتماع بلا حال ورنہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ایک شیخ طریقت جن کے بہت سے مرید تھے۔ شیخ بیمار ہوئے اور اطباء نے کہا اگر آپ نے وضو کیا تو بیماری بڑھ جائے گی یا کھڑے ہونے کی قوت نہیں تھی، تو شریعت نے اجازت دی ہے، انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

اگلے دن مریدین نے اعلان کیا کہ شیخ نے بیٹھ کر نماز پڑھی ہے لہذا آج سے سب لوگ بیٹھ کر نماز پڑھا کریں گے اور قیام جو فرض تھا وہ ترک کر دیا۔ یہ حرکت کی جو بالکل ناجائز تھی۔

اس لئے کہ فعل میں نقالی کی۔ نقالی فعل پیغمبر کی ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کے فعل کی۔ پھر یہ کہ اگر نقل اتارنی تھی تو شیخ کی سی بیماری کا حال بھی اپنے اندر پیدا کرتے اتنی بیماری آنی چاہئے تھی، جو شیخ پر آئی تھی تو انہیں بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی۔ بیماری تو اندر دھپے کٹے اور فعل میں شیخ کی نقل اتاری۔ تو ایسی نقالی محض روپ بنانا ہے۔ حقیقت اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی قانون ہی سب کے لئے حجت ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اسی پر چلا جائے گا۔ تعظیم صاحب حال البتہ صاحب حال کی تعظیم کی جائے گی۔ اس پر کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی، اللہ ویسا حال سب کو نصیب کر دے تو وہ خوش نصیبی ہوگی۔

توسعات شریعہ کا دائرہ کار بہر حال شریعت اسلام نے وسعتیں اور گنجائش دی ہیں۔ صرف یہ کہا ہے کہ ایک تو حرام کے دائرے میں مت پڑو، حلال کے دائرے میں رہو۔ دوسرے یہ کہ سامانوں میں مبالغہ مت کرو، اتنا رکھو کہ زندگی بھی آراستہ اور اچھی ہو اور قلب بھی اٹکا ہوا نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ آدمی ان سامانوں کا بندہ بن جائے۔ ایسے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعادی ہے۔ فرمایا: **تَعَسَّ عَبْدُ الْبَرِّ لَهِمْ تَعَسَّ عَبْدُ الْخَمِيصَةِ** ① ”بر باد ہو پیسے کا بندہ، بر باد ہو گنتی یاد، ہم مراد (سونے کا سکہ) کا بندہ، بر باد ہو شمالی چادروں کا بندہ۔“

یعنی جس کا دل ان چیزوں میں اٹکا ہوا ہے کہ ان میں پڑ کر نہ موت یا نہ آخرت یاد نہ فراموش یاد۔ ایسی دولت تو وبال جان ہو جائے گی۔ تو ایسے آدمی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعاء دی ہے۔ لیکن جائز حدود میں رہ کے۔ ”جمال پسندی“ جو انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ چھٹے حال سے رہنا پسند نہیں کرتا، بلکہ خوبصورتی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کھانا زمین پر ڈال کے اور منہ لگا کے کھالے بلکہ رکابی ہو، پھر رکابی ذرائع اور کچھ اچھی بھی

ہو، دیکھنے والوں کی نظر میں نہ چھپے۔ تو تھوڑا بہت جائز حد تک تکلف بھی کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ مبالغہ نہ کرے کہ صبح کی رکابیاں اور ہوں، شام کی اور ہوں دو پہر کی اور۔ اسی طرح رات کے سونے کا لباس اور، دو پہر کا اور یہ تو لباس کی اور برتن کی بندگی ہے حالانکہ بندگی اسے اللہ کی کرنی تھی۔

دولت دنیا کی مدح و ذم کا معیار..... بہر حال مطلب یہ ہے کہ دولت دنیا کی مذمت بھی آئی ہے اور مدح بھی آئی ہے، اس دنیا کی مذمت آئی ہے جو آخرت سے غافل کر دے اور اس دنیا کی مدح آئی ہے جو آخرت تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔ اسی لئے عارف رومی نے مثال دی ہے کہ جیسے ایک سمندر ہے تو کشتی جب اس میں پڑی ہوئی ہو تو پانی اگر کشتی سے باہر باہر ہے تو کشتی کے لئے مددگار ہوگا۔ کنارے پر جا لگائے گا اور منزل آجائے گی۔ لیکن اگر پانی کشتی کے اندر آ گیا تو کشتی بھی ڈوبی اور کشتی والے بھی ڈوبے، دونوں کی تباہی ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ انسانی قلوب کشتیوں کی مثل ہیں اور دنیا کی دولت اور سامان مثل دریا اور سمندر کے ہیں۔ تو قلب سے جب تک دولت باہر رہے گی، وہ قلب کو کنارے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی اور اگر اندر آ گئی تو قلب بھی ڈوبا اور قلب والا بھی ڈوبا۔

استعمال دنیا..... مطلب یہ کہ ایک دنیا کا استعمال ہے، اس کی شریعت نے ممانعت نہیں کی۔ ایک دنیا کی محبت ہے کہ اس میں پڑ کر محبت خداوندی رہ جائے، محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہ جائے اس کی مذمت کی گئی ہے۔ محبت طبعی..... پھر یہ بھی ہے کہ قرآن کریم نے توسع کر دیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ مال کی محبت بالکل نکال دو، یہ تو طبعی بات ہے کہ جب آدمی کمائے گا تو کچھ نہ کچھ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے، اپنے سامان سے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ بالکل محبت نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

یہ تو طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو چیز انسان کے پاس ہے اس سے تھوڑی بہت محبت ہو جاتی ہے، اجنبی بھی اگر پڑوسی بن جائے اور چند دن رہنا سہنا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے، تو اپنے گھر اور مکان سے تو طبعاً محبت ہوگی تو قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

کیوں کہ ایک مطلقاً محبت ہونا ہے، یہ ممنوع نہیں ہے۔ ایک ہے ایسی محبت ہونا جو فرائض اور واجبات میں خارج ہو جائے، اس سے بچو، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ﴾ ①

”حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم! (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے فرما دیجئے یہ تمہارے آباء و اجداد، یہ تمہاری آل و اولاد، یہ تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے بیوی اور بچے، یہ تمہاری دولت اور مال تجارت جس کی

کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار مندا نہ ہو اور رات دن جوڑ توڑ میں ہو کہ نفع زیادہ ہو اور یہ تمہاری بلڈنگیں اور مکانات جن کے اندر تم راحت اٹھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں اگر ”احب“ بن جائیں اور اتنی محبوب بن جائیں کہ خدا اور رسول سے غفلت پیدا کریں، تو عذاب خداوندی کا انتظار کرو کہ یہ دولت چھٹنے والی ہے۔ لیکن اگر یہ نہ ہو کہ ”احب“ نہیں بلکہ مطلق محبت ہے تو وہ فطری اور طبعی ہے، اس کو شریعت نے نہیں روکا کہ فطرتاً اپنے مال اور گھریار سے تھوڑی بہت محبت تو ہوگی، تو مطلق محبت کو منع نہیں کیا، احبیت کو روکا ہے۔ ”احب“ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مجھے صرف یہ محبوب ہے، نہ خدا محبوب نہ رسول محبوب نہ فرائض محبوب، نہ واجبات۔ اس محبت کو روکا ہے۔ لیکن اگر اتنی محبت ہے جو طبعی ہے اور ساتھ میں دین کی محبت بھی دل کے اوپر چھائی ہوئی ہے کہ دولت بھی ہے اور ساتھ میں نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔ روزے بھی رکھ رہا ہے، حج بھی کر رہا ہے، اور ذکر میں بھی مصروف ہے، یہ دولت ممنوع نہیں نہ اس کی فی الجملہ محبت ممنوع ہے۔

دولت دین و دنیا..... خدا کا شکر ہے کہ ہم افریقہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دین بھی دی اور دولت دنیا بھی دی ہے، تجارتیں بھی ہیں، منافع بھی ہیں، گھریار بھی اچھے ہیں، پہننا، رہنا سہنا اچھا ہے اور اس کے ساتھ میں مساجد بھی ہیں اور نمازیں بھی ہیں۔ بلکہ مساجد کو اتنا آراستہ کیا ہوا ہے کہ شاید لوگوں نے اپنی کوشی بنگلوں کو بھی اتنا نہ سجایا ہو۔ قالینوں کی جانمازیں پچھی ہوئی ہیں۔ راحت کا ہر سامان موجود ہے، جتنا اپنے گھر کی فکر ہے اس سے زیادہ اللہ کے گھر کی فکر ہے کہ وہ بھی آراستہ ہوں اور سچے سجائے ہوں۔

اللہ میاں کے بنگلے..... میں نے تو یہاں آکر کہا کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے، میں نے کہا یہ اللہ کے گھر نہیں یہ تو اللہ میاں کے بنگلے ہیں، آراستہ پیراستہ قالینوں سے سجے ہوئے۔ بجلی کی روشنی اور چھتیں بھی منقش اور آراستہ۔ یہ گھر تھوڑا ہی ہیں۔ گھر تو ہم جیسوں کے ہوتے ہیں، یہ تو بنگلے ہیں۔

ہمارے ہاں جو مسجدیں ہیں وہ تو اللہ میاں کے گھر ہیں۔ یہاں جو مسجدیں ہیں وہ اللہ میاں کے بنگلے ہیں، جو بنگلے بنانے والے ہیں وہ اپنے لئے بنگلے بنالیں تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی مضرت نہیں ہے۔ جو اللہ کے گھر کو سجا رہے ہیں وہ تھوڑا بہت اپنے گھر کو بھی سجائیں، اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح اپنے لباس کو بھی سجائیں، اللہ کے گھر میں قالین بچھائے۔ اگر اپنے گھر میں بھی قالین بچھالیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ بس یہ ہے کہ مبالغہ نہ ہو اور اتنا تعلق نہ ہو کہ اس سے دینی کاموں میں خلل پڑیں گے۔ ورنہ اگر یہ چیزیں بھی ممنوع ہوتی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہ میں ایک بھی متمول نہ ہوتا۔ حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مال دار لوگوں میں سے ہیں، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بڑے مال دار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔

حضرت جابر کا متمول اور قلبی کیفیت..... مگر قلب کی کیفیت کیا ہے؟ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن گھر میں تشریف لائے، کچھ اداس، غمگین اور چہرہ اترا ہوا۔ تو بیوی نے پوچھا آج آپ غمگین کیوں ہیں؟

فرمایا: ”خزانے میں دولت اتنی جمع ہوگئی ہے کہ میرے دل کے اوپر بار پڑ رہا ہے اور میرا قلب پریشان ہو رہا ہے۔“ وہ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ انہوں نے کہا پھر آپ نے کیا کیا؟ فرمایا: ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ فرمایا: ”گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، صدقہ کرنا شروع کر دو، غریبوں کو دینا شروع کر دو۔“ فرمایا: ”واقعی تدبیر تو اچھی بتائی۔“ چنانچہ جا کر خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم شروع کر دو۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں غرباء کے اوپر چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو آ کر یہودی کے ہاتھ جوے کہ اللہ تجھے جزائے خیر دے کیسی اچھی تدبیر بتائی، میرا دل ہلکا ہو گیا۔ تو اتنے دولت مند بھی تھے، مگر قلب متوجہ الی اللہ تھا، زیادہ دولت بڑھتی تھی تو ان کے دل پر بار پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں کم ہو جائے تو دل پر بار پڑتا ہے۔ زیادہ ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ وہاں قصہ الٹا تھا اور واقعہ بالکل برعکس تھا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا..... حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوسری صحابی سے زمین خریدی۔ قیمت ادا کر دی زمین قبضے میں آگئی عمارت بنانے کے لئے جو بنیاد کھودی تو ایک بہت بڑا دیگ لکھا جس میں سونا اور چاندی بھرا ہوا تھا۔ گویا لاکھوں روپے کا مال نکلا۔ اسے لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی۔ اور فرمایا: ”یہ آپ کا دیگ ہے؟“ انہوں نے کہا:

”کیسا دیگ ہے؟“ فرمایا: ”وہ جو زمین میں نے خریدی تھی اس میں سے نکلا ہے اور میں نے زمین خریدی تھی، دیگ تو ہوا اسی خرید تھا۔ یہ آپ کا حق ہے۔“ انہوں نے کہا: ”جب میں نے زمین بیچی تھی، زمین میں تحت الٹری تک جو کچھ تھا وہ سب بیچنے میں آگیا، لہذا یہ آپ کا حق ہے میرا حق نہیں۔“ اب لڑائی اس پر ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا حق ہے۔ انہوں نے کہا نہیں میرا حق نہیں یہ آپ کا حق ہے۔ آخر کو وہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟“ تو ایک کے ہاں بیٹا اور ایک کے ہاں بیٹی تھی۔ فرمایا: ”دونوں کی شادی کر دو اور اس میں اس دولت کو خرچ کر دو! بس سکون ہو گیا۔“ ① ہمارے ہاں تو اس پر لڑائی ہوتی ہے کہ میرا حق ہے تمہارا نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا حق ہے۔ وہاں لڑائی اس پر تھی کہ آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ دوسرے کہہ رہے ہیں آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ ان میں اور ہم میں فرق ہے۔ دولت مند وہ بھی تھے ہم بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے دل دولت کے ساتھ اللہ رب العزت میں اور محبت دین میں فانی تھے۔ ہمارے قلوب میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن اس حد تک کہ اگر تھوڑی بہت محبت ہو اور دین کی محبت زائل نہ ہو، شریعت نے اجازت دی ہے کہ جمع بھی کر لو اور خرچ کر لو۔ کچھ اچھا کھا پہن لو، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے..... بہر حال مطلب یہ ہے کہ جو آیت میں نے پڑھی تھی تو اس کے ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک نظر یہ تو یہ ہے کہ دنیا کا راستہ اور ہے اور ختم ہو جانے والا ہے اور ہمیں تو گزر جانا ہے۔ چاہے چوراہے میں پڑے گزرے، چاہے میلے میں پڑے گزرے، چاہے بھیک مانگ کے گزرے، بس آخرت میں پہنچ جائیں

گے، اس کا نام تو رہبانیت ہے اور سرے سے دنیا کی حیثیت ختم ہے، اگر اس مذہب پر دنیا چلتی ہے تو ویران ہوتی ہے اور جگہ جگہ ویرانی کے اثرات ہوتے، دنیا آباد نہ ہوتی۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے بس دنیا ہے۔ لہذا احلال و حرام کی تمیز نہ کرو، بس کھاؤ، اڑاؤ، عیش کرو اور مزے کرو۔ اس کا بھی شریعت اسلام نے رد کیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ: ”الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِکَ“ ① ”دنیا آخرت کی بھیتی ہے“

جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی آخرت میں پھل کما لو گے، اگر دولت کا بیج پاک مصرف میں ڈالا ہے تو وہاں پاک ثمرات اور پاک پھل نمایاں ہوں گے۔ ناپاک جگہ میں ڈالا ہے، بیج بھی ناپاک اور وہاں کانٹے دار درخت ملیں گے اور ”زقوم“ ملے گا جس کا قتل کرنا مشکل ہوگا، یوں کہ وہ عذاب کی صورت اختیار کرے گا۔ غرض دنیا کو نہ راستہ بتلایا کہ بھی! مسافر کی طرح گزر جاؤ نہ کماؤ نہ دھماؤ اور نہ ہی اصل قرار دیا بلکہ بھیتی قرار دیا جس میں ”بونا“ ضروری ہے۔

کاشتکار کا فریضہ..... ظاہر بات ہے کہ جب کاشتکار بوئے گا تو کچھ نہ کچھ محنت تو کرنا پڑے گی۔ خون پسینہ ایک رنگ بھی کرنا پڑے گا بیج بھی ڈالنا پڑے گا، پانی بھی دینا پڑے گا، اچھی خاصی محنت اٹھانا پڑے گی۔ تب جا کے وہ چھپے مبینے غلہ کمائے گا اور اس سے پھر پیسہ کمائے گا۔ غرض دنیا کو فرمایا یہ بھیتی ہے اور تم کاشتکار ہو۔ کاشتکار کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر پر پڑا رہ جائے، ورنہ پھر لوگ غلے لے آئیں گے تو وہ بیٹھ کر روئے گا اور کہے گا کاش! بیج ڈالتا تو میں بھی غلہ کما تا، اس وقت حسرت میں مبتلا ہوگا۔ لہذا حکم دیا کہ دنیا میں رہو اور کچھ کام کرو۔

مقام آخرت..... اور اس دنیا ہی سے اپنی آخرت پیدا کرو۔ اس لئے یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا یہ عالم ہے اور آخرت ساتویں آسمان پر کبھی ہوئی ہے۔ بلکہ آپ کی آخرت اسی دنیا میں سے نکلے گی، نکالتے رہو۔ انہی افعال میں سے نکلے جو ادا کر رہے ہو۔ نیت اچھی ہونی چاہئے، اتباع سنت ہونا چاہئے، اسی دنیا میں سے آخرت پیدا ہوگی۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: آدمی دسترخوان پر بیٹھے ”بِسْمِ اللّٰهِ“ سے شروع کرے اور ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اٰطَعْنِیْ هٰذَا وَرَزَقْنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنْیْ وَ لَا قُوَّةَ“ پر ختم کرے: ”غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ“ ② ”اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے“۔ تو کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے تو اس روٹی میں سے ہی آخرت نکلی۔ اگر روٹی نہ کھاتا اور سنت طریق پر حمد و ثناء سے ابتداء و انتہاء نہ کرتا، تو یہ مغفرت گناہ کا وعدہ کہاں سے ہوتا؟ تو روٹی میں سے آپ کی آخرت نکلی۔

① علامہ غزالی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم افف علیہ مع ایراد الغزالی لہ فی الاحیاء، وقال القاری: قلت معناه صحیح مقتبس من قوله تعالى ”من كان یؤد بحرث الآخرة نزد لہ فی حرثہ“ دیکھیے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۲۱۲۔ ② السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا فرغ من الطعام، ج: ۱ ص: ۳۵۹۔

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر کوئی شخص شفقت و محبت اور پیار سے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ ① دیکھا جائے تو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا تو ایک دنیوی فعل ہے۔ مگر نیت کی سچائی سے نیکیوں کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ نہ رکھتا یا اسے دین نہ جانتا تو بالوں کے برابر نیکیاں کہاں سے آتیں؟ تو یتیم کے سر میں سے آپ کی آخرت نکلی اور آپ کے ہاتھ میں سے آخرت نکلی۔ آپ یہ ہاتھ یتیم کے سر پر نہ رکھتے تو نیکیوں میں یہ اضافہ نہ ہوتا۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر کسی شخص نے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا اور ”زوج“ (جوڑا) بنا کے صدقہ کیا، یعنی پیسہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے، روپیہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو پئے کپڑا دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے: ”مَنْ أَتَقَى مِنْ كُلِّ شَيْءٍ دَوْجَيْنِ“ ② ”ہر چیز میں سے جس نے جوڑا جوڑا صدقہ دیا“ تو فرماتے ہیں جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔ تو دنیا میں دو چیزوں کا یعنی جوڑے کا صدقہ کیا، اس سے ہی تو آخرت بنی، تو آخرت آپ کے فعل سے نکلی، آخرت کہیں الگ تو نہیں رکھی ہوئی تھی۔ بہر حال دنیا آخرت کے کمانے کا ذریعہ ہے اور اس دنیا ہی میں سے آپ کی آخرت نکلے گی۔

تجارت میں غلطی آخرت آپ تجارت کر رہے ہیں، نیت صاف رکھیں۔ یہ تجارت آخرت کا ذریعہ بنے گی، چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ”التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ“ ③ ”ایک سچا تاجر جو امانت دار ہو اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا جنت میں ان کے ساتھ جائے گا“ کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اگر دیانت کے ساتھ تجارت نہ کرتے تو یہ فضیلت ان کو کیسے ملتی؟ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا: ”غَفَرَ اللَّهُ لِرَجُلٍ كَانَ قَبْلَكُمْ سَهْلًا إِذَا اشْتَرَى سَهْلًا وَإِذَا بَاعَ سَهْلًا“ ④ ”اللہ اس شخص پر مغفرت اور رحم کرے جو شفقت کے ساتھ خریدتا ہے اور شفقت کے ساتھ بیچتا ہے“، بیچنے میں اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے گا ہک کو نقصان نہ ہو۔ گا ہک خریدتا ہے تو اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے تاجر کو نقصان نہ پہنچے۔ دونوں کے دل میں نیک جذبہ ہے تو دونوں کے لئے دعا دی کہ: غَفَرَ اللَّهُ لِرَجُلٍ ”اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے بیچ رہا ہے اور اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے خرید رہا ہے“۔ اگر یہ تجارت نہ ہوتی تو یہ آخرت کا وعدہ آپ کے لئے کہاں سے پورا ہوتا۔؟ اسی میں سے تو آخرت نکلی ہے۔ یہ نہیں کہ آخرت کہیں عرش کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور دنیا یہاں ہے۔ اسی دنیا میں آخرت چھپی ہوئی ہے، نکال لینا آپ کا کام ہے جیسے اسی زمین کے اندر یہ پھل پھول

① مسند احمد، حدیث ابی امامۃ الباہلی، ج: ۳۵، ص: ۱۲۷، رقم: ۲۱۱۳۲۔

② المعجم الکبیر للطبرانی، باب الجیم، ابوذر غفاری، ج: ۲، ص: ۲۱۰۔

③ الجامع للترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، ج: ۱، ص: ۲۲۹۔

④ السنن للترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی استقرار البعیر، ج: ۵، ص: ۱۵۹۔

چھپے ہوئے ہیں، نکال لینا کا شکار کام ہے کہ شیخ ڈالتا رہے، پانی ڈالتا رہے پھل نکالتا رہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا کہ یہ تو زمین ہے اور یہ جو پھلوں کی دنیا ہے کہ یہ آسمان پر رکھی ہوئی ہے۔ وہاں سے پھل برسیں گے تو کبھی بھی اسے پھل نہیں ملیں گے، اسی زمین پر محنت کرنی پڑے گی۔ تو انسان دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ رد کر کے پس پشت ڈال دے بلکہ اس سے اپنی آخرت کا کام لے۔ ہر چیز سے کام لے۔ حیات سے بھی کام لے، موت سے بھی کام لے۔ موت میں مخفی آخرت چنانچہ جب انسان کا کوئی عزیز گزر جاتا ہے تو طبعی طور پر آدمی کو صدمہ پیش آتا ہے۔ لیکن دانش مند وہ ہے جو اس صدمے سے اپنے لئے اجر نکال لے، وہ یہ ہے کہ نہ تو جزع و فزع کرے نہ بین کر کے روئے نہ یہ کہ بالکل پتھر ہو جائے کہ اس کی آنکھ سے آنسو تک نہ نکلے، قلب کی سلامتی کے ساتھ جتنا طبعی غم ہے وہ ہو، اور عبرت پکڑے کہ جہاں آج یہ گیا ہے مجھے بھی کل کو جانا ہے۔ اس کی موت کو اپنی موت کی یادگاری کا ذریعہ بنائے تو اس کی موت دین کی ترقی کا ذریعہ بن گئی۔ اگر یہ میت نہ ہوتی تو اسے یہ اجر کیسے ملتا؟

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا، وہ واہلا کر رہی تھی۔ سر کے بال نوج رہی تھی کہ ہائے ہائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ فرمایا: ”بڑی بی! صبر کرو“۔ بڑی بی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس نے کہا:

”ہاں! تم نے یہ کہہ دیا کہ صبر کرو، تمہارے گھر میں یہ آفت آتی جب میں جانتی تم صبر کرتے، مجھے صبر کرانے کے لئے آئے ہو؟ میں نہیں صبر کر سکتی“۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اچھا تو جان!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے گئے۔ اگلے دن اس کو پتہ چلا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تب حاضر ہوئی اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ ہیں، آپ نے صبر کی تلقین فرمائی تھی۔ میں اب صبر کرتی ہوں“۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ”الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى“ ① ”جب صدمہ پیش آیا تھا، جب صبر کرتی تو اجر ملتا“۔ یوں تو دو چار برس کے بعد خود بخود ہی صبر آ جاتا ہے۔ کوئی ساری عمر آدمی تھوڑا ہی روتا رہتا ہے۔ تو وہ مجبوری کا صبر ہے اور صدمہ کے وقت اختیاری صبر ہوتا ہے۔ جو نفس کا ضبط کرنا ہے وہی اجر کا باعث ہے۔ مجبوری کی چیز اور بے اختیار چیز پر کوئی اجر نہیں ہوتا۔ جس چیز میں ارادہ و اختیار صرف کیا جائے اور طبیعت کے خلاف جدوجہد کی جائے اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔ غرض موت تک کو آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے زندگی کو بھی آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔

دوسرے کی نیکی ذریعہ ترقی علماء کرام لکھتے ہیں کہ کسی کی اچھائیاں دیکھو تو حرص کرو۔ برائیاں دیکھو تو حرص مت کرو۔ مثلاً آپ نے کسی کو دیکھا کہ نوافل بہت پڑھ رہا ہے اور دل میں حرص آئی اور دعاء کی کہ یا اللہ! مجھے بھی اتنے نفلوں کی توفیق دے۔ اور توفیق ہوگئی تو اس کے نوافل آپ کو نوافل پڑھوا دینے کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی نیکی بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور لوگوں کی موت بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔

① الصحيح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور، ج: ۵، ص: ۲۹۰

دوسرے کی برائی ذریعہ عبرت..... اور اگر برائیوں کو دیکھ کر آپ نے عبرت پکڑی اور ان سے بچ گئے تو لوگوں کے گناہ بھی ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ بن گئے۔ غرض دنیا کی ہر چیز میں عبرت، نصیحت و موعظت موجود ہے، انسان اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو مٹا کر ختم کر دے۔ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی ہر چیز سے عبرت پکڑے۔ ہر ہر چیز سے نصیحت حاصل کرے۔ ہر ہر چیز سے اپنی آخرت بنائے اور اپنی آخرت کو یاد کرے۔ یہ بھی ہوگا جب دنیا بجی ہوئی ہو۔ اس کو دیکھ دیکھ کر ہم عبرت پکڑیں۔

حضرات کا احترام..... اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔ وقت بھی تھوڑا تھا، اور کچھ زیادہ ہمت بھی نہیں تھی اور ضعف بھی کافی تھا اور کچھ کام بھی زیادہ ہے اور سفر کی آخری رات بھی ہے۔ اس واسطے ارادہ کیا جب اعلان ہو گیا تو کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اعلان کے احترام اور حضرات کے جمع ہونے کے احترام میں یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔

اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور ہمیں علم و عمل کی توفیق دے۔ ہماری دنیا بھی درست فرما دے اور آخرت بھی درست فرما دے اور ہمیں عدل و اعتدال پر قائم رکھے۔ افراط و تفریط اور مبالغوں سے ہمیں محفوظ رکھے، آمین!

دعاء

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاَجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةِ اَمِيْن

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ الْحَيٰوةِ وَخَيْرَ الْمَمَاتِ وَثِقَلْ مَوَازِيِنَنَا وَثَبِّثْ اَقْدَامَنَا

وَانصُرْنَا عَلٰى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ.

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا

اَللّٰهُمَّ اَنْصُرْنَا وَاغْفِرْ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ

وَجَنِّبْنَا بِالْقَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ.

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اِنَّا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِى الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

وَادْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّحِيْمِيْنَ.

(۶، شوال المکرم ۱۴۰۹ھ)

عالم اصغر

انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلماتی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں۔

آسمان ہاست در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہست کوہ ہائے بلند و صحرا ہست
گویا انسان اس کا مصداق ہے: میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز)

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَّاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. ﴿وَلِيَّ أَنْفُسِكُمْ أَقْلًا تُبْصِرُونَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ.

اقسام عالم اور ان کے حصص..... بزرگان محترم! انسان عالم صغیر ہے۔ عالم کبیر کے جملہ نمونے اور نقشے اس میں موجود ہیں، چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد اور عالم غائب عالم شاہد اجسام کا مجموعہ ہے جو آنکھوں سے مشاہد اور محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً دریا، پہاڑ، زمین، آسمان وغیرہ۔ انسان میں عالم شہادت بدن ہے۔ جس میں گوشت پوشت، ہڈی، چمڑہ وغیرہ اور دیگر اعضاء بدن وغیرہ۔ پھر جیسے اس دنیا میں عالم شہادت کے دو حصے ہیں۔ سفلیات (نچلے)، جیسے زمین اور اس کے سبزہ زار دریا، پہاڑ وغیرہ۔ علویات (اوپر کے) جیسے آسمان، چاند، سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں فوقانی حصہ جس میں قلب اور دماغ ہے، اس کے علویات ہیں۔ اور تحتانی حصہ جس میں مختلف حسی اعمال و حرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں، پیٹھ وغیرہ یہ اس کے سفلیات ہیں۔

عناصر اربعہ کی کارفرمائی میں کمال درجہ تشابہہ..... پھر جس طرح عالم انسانی کی بنیاد عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے مادوں پر ہے بعینہ انسان میں انہی چار مادوں کے اثرات حرارت، برودت، بیہست اور رطوبت کارفرما ہیں۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی تجنہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔ مٹی کی جملہ انواع..... مثلاً زمین ایک تو وہ خاک ہے۔ ایسے ہی انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے۔ پھر جس طرح زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول و عرض اور عمق (گہرائی) سب کچھ ہی ہے۔ ایسے ہی انسان کا بدن ہے۔ پھر جس طرح زمین کھودو تو تری نکلتا شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کاٹنے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے۔ سفید، سیاہ، سرخ، زرد۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے۔ مستور حصے جیسے زیر نعل، کنج ران سیاہ ہے۔ چہرہ پر سرخی رہتی ہے۔ ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے پوری نوع بشر پر نگاہ ڈالو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید، مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد اور عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے، جیسے تفریح گاہ اور کوئی گندا جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں، ایسے ہی انسان کا لطیف اور صاف ستھرا حصہ چہرہ اور ہاتھ ہے جسے عزت سے چومتے ہیں۔ اور گندا حصہ زیر نعل یا اعضاء نجاست ہیں۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات و کیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کی جملہ انواع..... پھر جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رود وڑ رہی ہے۔ بعینہ بدن انسانی میں حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اسی حرارت غریزی و طبعی پر انسانی زندگی قائم ہے پھر جیسے مٹی اور پتھر اور لوہے کے آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی انسانی ران یا ہاتھ کے آپس میں رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات یعنی سورج کا۔ یعنی سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں۔ ایسے ہی بدن انسانی میں حرارت اس کے علویات یعنی قلب اور دماغ کا فیض ہے۔ قلب ہی حرارت غریزی تیار کرتا ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجتو بدن جھڑنے لگے اور قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کی جملہ انواع..... پھر یہ پانی جیسے زمین کے گوشے گوشے میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی انسانی بدن میں رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے۔ پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں کوئی بڑے دریا ہیں، کوئی چھوٹے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بڑی اور چھوٹی رگیں گویا دریا ہیں۔ پھر جیسے زمین میں نہریں، ندی نالے، پانی کے ڈوگرے مثلاً تالاب ہیں، ایسے ہی انسانی بدن میں وہ رطوبات کا پانی رہتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں شیریں، نمکین اور شور مختلف قسم کے چشمے ہیں ایسے ہی انسانی بدن میں منہ سے آب شیریں اور آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے۔ پتے سے کڑوا اور معدہ سے ترش پانی چلتا ہے۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ سے یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں ہے کہیں کا جما ہوا ہے جیسے بحر نمک شمالی تو بلغم وغیرہ نمک چشمے ہیں۔ پھر جیسے کہیں

گند پانی ہوتا ہے۔ انسان میں پیشاب یا سنک گویا گندہ پانی ہے۔ جو گند صفائی سے بہتا ہے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے ہیں۔ اور کہیں گرم جہاں گندھک کا زور ہے۔ ایسے بدن انسانی میں ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری۔ زبان سرد پانی کا چشمہ اور پیشاب گرم پانی کا چشمہ۔ پھر دنیا میں مجمع البحرین ایک مقام ہے۔ جس کا ایک حصہ شیریں اور دوسرا تلخ و شور ہے۔ ایسے ہی انسان کے دماغ کی حس مشترک میں شیریں چشمہ قوت ذائقہ اور نمکین چشمہ قوت باصرہ موجود ہے۔ پھر جس طرح دنیا میں برسات ہوتی ہے ایسے ہی بدن انسانی میں پسینہ ہے۔

ہوا کی جملہ انواع..... پھر جس طرح عالم کا ہر خلا ہوا سے پر ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن کا ہر خلا ہوا سے بھرپور ہے۔ پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں سانس کے ذریعے جو ہوا اندر جاتی ہے وہ سرد ہے اور جو ہوا باہر نکلتی ہے وہ گرم ہے پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی۔ ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو خوشبودار ہوتی ہے اور خروج ریاہ ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین پر جس اور گھٹن ہونے سے انسان کا دل گھبراتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ ایسے ہی ریاہ بند ہونے کے وقت حالت ہوتی ہے۔ پھر جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا کھینچ لی جائے تو سارا عالم ختم ہو جائے ایسے ہی انسانی بدن میں سانس کھینچ لی جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔ غرض ہوا کی جملہ انواع انسان میں موجود ہیں۔

انواع جمادات..... جمادات میں ہڈیوں کا سلسلہ گویا پہاڑ ہیں۔ جن میں سے پہاڑوں کی طرح کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی۔ پھر جس طرح پہاڑوں پر مٹی جتنی ہے ایسے ہی اقلیم بدن پر گوشت چڑھا ہے۔ پھر پہاڑوں کے بعض خطے گرم ہیں، بعض سرد، ایسے ہی انسانی بدن کے مستور حصے گرم ہیں اور سطح بدن کے تمام نمایاں حصے سرد۔ پھر پہاڑوں کے مقامات مقدسہ کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں چہرہ مرہ کی ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے اور بعض حصوں کو دیکھنا شرعاً و عقلاً ننگ و عار سمجھا جاتا ہے۔ پھر زمین کے بعض حصوں کو دیکھنے کی قوت ہے۔ لیکن ایسا کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کے بعض حصوں کو دیکھنا (مثلاً پیٹھ وغیرہ) حماقت ہے۔ پھر جیسے پہاڑ پر نباتات اگتے ہیں، ایسے ہی انسان بدن پر بال اگتے ہیں۔ پھر جس طرح زمین پر کہیں گھٹا جنگل ہے، کہیں جھنڈ، ایسے ہی انسانی بدن کے چہرہ اور سر پر گھنے بال ہیں اور عام بشرہ بدن پر چھید ہیں۔ پھر جس طرح زمین پر بعض نباتات برابر بڑھتے اور نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں یکساں رہتا ہے۔ پھر بعض جگہ زمین کے جھاڑ جھنکار کے صاف کئے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی۔ ایسے بدن انسانی کے موئے بغل اور موئے زہار ہیں۔

پھر زمین کے بعض حصے قائم رکھنے سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور بعض حصوں کی تراش خراش سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں موئے ریش ہیں جن کے رکھنے سے انسانی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیز ان کی اصلاح اور موئے شوارب (موٹھوں کے بال) کی تراش سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انواع حیوانات..... پھر جس طرح زمین کے مختلف قسم کے حیوانات کی غذا زمین کی رطوبات ہیں۔ ایسے ہی انسانی جہاں میں سر میں جویں، پیٹ میں کینچوے، معدے میں ریسمانی کیڑے، بدن کے خون کو چوستے اور بڑھتے ہیں۔

پھر جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں مختلف صورتوں کے حشرات الارض ہیں۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں مختلف رنگوں کے جراثیم ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں۔ پھر جس طرح دنیا کے ہر خطہ کے جانور مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایسے ہی انسانی بدن کے ہر حصہ میں نئی نئی شکل و شکل کے جراثیم ہیں۔ پھر جس طرح زمین کی مخلوقات زمین میں پیدا ہو کر مرکز زمین میں ہی دفن ہو جاتی ہیں، ایسے ہی جراثیم بدن میں پیدا ہو کر مرتے اور بدن میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

آثار زلزلہ..... پھر جس طرح زلزلہ سے ساری زمین حرکت میں آتی ہے ایسے ہی بدن میں جھر جھری آنے سے پورا بدن اچانک متحرک ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح زلزلہ کا سبب آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی اندورنی گرمی، بھڑکا ہٹ یا پریشانی دل سے انسان کے پورے بدن میں جھر جھری آ جاتی ہے۔

پھر جس طرح اقلیم عالم میں عناصر کے غلبہ سے غیر معتدل آثار پیدا ہوتے ہیں مثلاً قحط سالی، آندھیاں، آگ برسناء، ایسے ہی اقلیم بدن پر غیر طبعی آثار مثلاً بخار، زکام، سرسام اور خارش وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔

عقل و حکمت کے آثار..... پھر جس طرح عقل و حکمت کی کمی اور شہوات عضلات کی زیادتی سے انسان، انسان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض دفعہ بحرانی مرض پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے بدن کو نوچنے لگتا ہے۔ پھر جس طرح کسی ملک پر بادشاہ کی حکومت ہوتی ہے اور وزراء جنود و عساکر (افواج) اس کے مددگار ہوتے ہیں، ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے۔ دماغ اور حواس خمسہ اس کے وزراء اور مشیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے اور ہاتھ پیر جنود و عساکر ہیں۔ پھر جس طرح علویات میں چاند اور سورج روشن ہیں۔ بعینہ اقلیم بدن میں سر میں دو آنکھیں منور ہیں پھر جس طرح ستاروں سے راستہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دماغ میں غور و فکر کے نتائج اور نظریے ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں۔

ستاروں کے آثار..... پھر جیسے ستارے مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں، ایسے ہی دماغی فکر غم و مسرت پیدا کرتی ہے۔ پھر جس طرح آسمان کے اوپر غیب میں جنت ہے۔ جس میں سوائے مسرت و اطمینان کے غم کا کہیں نشان نہیں۔ بعینہ انسان میں آثار فرحت و مسرت اور بشارت و طمانیت (خوشی و اطمینان) مثل جنت کے ہیں۔ جن میں مگن ہو کر نفس دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح غیب میں جہنم ہے۔ جہاں سوائے غم و درد کے کسی خوشی کا نشان نہیں۔ ایسے ہی انسان کے باطن میں آثار مصائب و غم اور تشویشات، مثل جہنم کے ہیں۔ پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے، جہاں حق سبحانہ و تعالیٰ کی تجلیات کا بلا واسطہ دور دورہ ہے ایسے ہی فوقانی اشیاء میں انسان کا لطیفہ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے۔ جس میں بلا واسطہ اسرار الہی متجلی اور منکشف ہوتے ہیں۔

ملائکہ و شیاطین..... پھر جس طرح آسمان پر فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں جن میں عصیان کا کہیں نشان نہیں۔ ایسے ہی دماغ میں حواس خمسہ ملائکہ کی طرح خدمات انجام دیتے ہیں۔ پھر جس طرح نبی عالم میں آسمان کے نیچے گمراہ شیاطین ہیں جو حکم الہی کے سامنے نہیں جھکتے، ایسے ہی انسانی دماغ کے نیچے نفس ظلمانی ہے، جو قلب کے اشاروں پر نہیں چلتا اور فانی لذات میں منہمک ہو کر سارے اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا ہے۔

عالم غیب سے تشابہہ..... دوسرا عالم، عالم غیب ہے جو جسمانیت سے پاک ہے اور صرف دل کی آنکھوں سے نظر آتا ہے، مثلاً ذات و صفات حق، ملائکہ، عالم اسرار غیب وغیرہ، انسان کا عالم غیب روح انسانی ہے۔ جس میں علم کے سرچشمے ہیں اور لطیفہ روح معنویات و روحانیات اور الہیات کا مرکز ہے۔ گویا اس روح میں کمالات باطن کے نمونے ہیں جو اس کو ودیعت کئے گئے ہیں۔ جس طرح ذات بابرکات مدبر و حکیم اپنی حکمت و قدرت سے سارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا توجہ ہٹالے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

اسی طرح روح انسانی بدن کی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اگر ذرا بھی اپنا رخ بدن سے پھیرے تو اقلیم تن گل سڑ جائے، پھر جس طرح وہ مختلف رنگ کے جہانوں کے لئے ایک مدبر ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح روح بھی انسانی بدن میں وحدہ لا شریک ہے۔ پھر جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود انسانوں سے اوجھل ہے اور ادراک سے قاصر ہے۔ ایسے ہی روح انسانی ہے۔ پھر جیسے وہ خالق اکبر عالم کے ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ ہونے کے باوجود کوئی اشارے سے نہیں بتلا سکتا کہ ذرا دھریا دھریا۔ ویسے ہی روح انسانی رگ رگ میں سمائے ہونے کے باوجود کوئی نہیں بتلا سکتا کہ کس کونے میں بیٹھی ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہ کو جو تعلق عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں۔ جو بیت اللہ سے ہے وہ عام جہان سے نہیں۔ چنانچہ اگر مقامات مقدسہ پر آنج آجائے تو سارا عالم زیر و زبر ہو جائے۔ ایسے ہی روح انسانی کا سب سے زیادہ تعلق قلب سے ہے۔ پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہ ملائکہ مقررین کو مامور فرماتے ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حکم الہی لے کر اترتے ہیں۔ اسی طرح روح انسانی کی صفت بھی رشد و ہدایت ہے۔ پھر جس طرح ہر ادراک اور حواس خمسہ اس کے ملائکہ ہیں، جن کی قوتیں دماغ میں پوشیدہ ہیں اور جن اعضاء کے ذریعے قوتیں نمایاں ہوتی ہیں، وہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ بمنزلہ انبیاء علیہم السلام کے ہیں۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی گونا گوں صفات و کمالات ہیں۔ کسی نہ کسی خاص غلبہ کے تحت ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے۔ ایسے ہی روح بھی کسی نہ کسی صفت سے ان کارکنوں پر متجلی ہوتی ہے اور ہر عضو آنکھ، کان، ناک اس کی اس قوت احساس و ادراک کا مظہر ہے۔ پھر حق تعالیٰ شانہ کی سب سے زیادہ جامع تجلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم و کمالات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ تجلی قلب پر ہے اور قلب مجمع العلوم ہے۔ حواس خمسہ میں ادراک و شعور کا فیض قلب ہی کا ہے۔

پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت و معرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و معرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ ایسے ہی ان اعضاء حواس کا علم قلب کی قوت علم سے مستفاد اور وابستہ ہے اور قلب بالذات مدرک ہے، چنانچہ آنکھ، کان، بند کر کے تنہا قلب تدبر و فکر کرتا ہے اور ساری کائنات کے نقشہ کو عالم خیال میں دیکھتا ہے اور حواس خمسہ کا محتاج نہیں۔

پھر جس طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے حاکم اور جملہ ادیان کے ناسخ ہیں۔ ایسے ہی قلب تمام اعضاء رئیسہ مروسہ پر حاکم اور ان کے علمی ذخیروں پر ناقد اور متصرف ہے کہ آنکھ نے صحیح دیکھا یا نہیں، کان نے صحیح سنایا یا نہیں اور قلب کے علوم پر اختیار نہیں۔ پھر جس طرح کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر اولاً اترے۔ اسی طرح روح کا فیضان بھی اولاً قلب پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حیات و زندگی بھی پہلے قلب پر اترتی ہے۔

پھر جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر عمل کے لئے جبر و اکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی روح انسانی اشیاء کا حسن و قبح دکھلا کر اعضاء بدن میں استعداد عمل کی قوت پیدا کر کے نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتی ہے اور عمل کے لئے نفس پر جبر و اکراہ نہیں کرتی۔ پھر جس طرح غذا کے اثرات بدن پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح روح بھی اپنی تربیت سے اس کے (خیر و شر کے) ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے۔

آخر میں بطور تبرک حضرت قاری صاحب (نور اللہ مرقدہ) کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ فرض مبداء ہو یا معاد، نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا و جزاء، حق تعالیٰ کے کمالات و صفات ہوں یا افعال، ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ اور ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی امونوج (نمونے) قائم ہیں۔

کارفر فرمائے آسمان جہاں

آسمان ہاست در ولایت جاں

کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

در رہ روح پست و بالا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے۔

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔ (ماخوذ از ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک)

افادات علم و حکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا
مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ!

فَاعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ. ﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ
وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ ①. صَدَقَ اللّٰهُ اَلْعَلِيُّ اَلْعَظِيمُ

قرآن حکیم اور انسانی نفسیات..... ظاہر بات ہے کہ آیت میں ظاہری پاکی و ناپاکی تو مراد نہیں ہے کہ جس
کے کپڑے پاک ہوں وہ تو طہین میں داخل ہو گیا اور جس کے کپڑے ناپاک ہوں وہ خیمین میں داخل ہو گیا۔ طہین
وہ خیمین بلحاظ عقائد و اعمال اور افکار کے مراد ہیں کہ طہین وہ ہیں جن کے عقائد بھی درست، اعمال بھی درست اور
جن کا فکر بھی درست اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ خیمین میں داخل ہے۔ اور اگر انبیاء علیہم السلام کی بھی اولاد ہو
اور وہ کفر میں مبتلا ہو وہ خیمین میں شامل ہو گئی، طہین میں شامل نہیں ہوگی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرما دیا گیا: ﴿اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ ② وہ آپ کے
اہل میں سے نہیں آپ کا اہل وہ ہے جو آپ کا مطہ ہو۔ جیسے کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
”مَنْ اطَاعَنِيْ فَهُوَ اِلَيَّ“ جو میری اطاعت کرے گا وہ میری آل اولاد میں داخل ہے، جو اطاعت نہیں کرے گا وہ
آل اولاد سے خارج ہے۔ یہاں پر نسبى اولاد مراد نہیں، روحانى اولاد مراد ہے جو میرے دین پر ہوا اور اس دین پر
چلے وہ میری اولاد ہے۔

① پارہ ۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۶۔ ② پارہ ۱۲، سورۃ ہود، الآیۃ: ۳۶۔

اور بعض روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا بھی ہے کہ: ”أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ“ ① ”میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں،،۔ اس سے بھی نبی باپ مراد نہیں۔ بلکہ نسبتی اور روحانی باپ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو میرا دین پہنچا اور وہ اس پر چلا تو میں اس کے حق میں باپ ہوں اور وہ میرے حق میں اولاد ہے اور جو اس سے نکل گیا نہ میں اس کے حق میں باپ ہوں اور نہ وہ میرے حق میں اولاد ہے۔ یہی معنی طیب و خبیث کے ہیں کہ جو اس فکر و عقیدے اور عمل سے خارج ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ جو اس میں داخل ہے وہ طہمین میں داخل ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جو طہمین میں داخل ہیں۔ وہ دین پسند ہیں۔ وہ طہبات ہی کو پسند کریں گے کہ ان میں بھی دین ہو۔ کوئی نیک صالح یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی فاحشہ آجائے یا بدکردار آجائے۔ بخلاف خبیثین کے جو خبث میں مبتلا ہیں انہیں عورتیں بھی وہی پسند ہوں گی جو خبث میں مبتلا ہوں۔ پاک صاف اور طاہرات ہوں تو ان کی طبیعت کبھی رجوع نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ دلوں کے اندر خبث بھرا ہوا ہے تو یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو قرآن نے اٹھایا ہے کہ نیک آدمی نیک چیزوں کی طرف توجہ کرے گا اور بد آدمی بد چیزوں کی طرف۔ وہ چیزیں عورتیں ہوں یا اشیاء ہوں جب دل میں بدی ہے تو بدی ہی پسند آگے گی۔ دل میں پاکی ہے تو پاکی ہی پسند آئے گی۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان کی طہائع ہی پاک پیدا کی گئیں ہیں بالطبع جب نبی علیہ السلام کی طبیعت چلے گی خیر کی طرف چلے گی۔ شر کی طرف کبھی نہیں جائے گی۔ اس لئے کہ بنیاد پاک ہے۔ اسی طرح سے اگر ان کے طفیل سے کسی کی بنیاد پاک ہے۔

یا ریاضت و مجاہدہ سے اپنی طبیعت پاک کر لی تو وہ پاک ہی چیزوں کو پسند کرے گا، ناپاک چیزوں کو کبھی نہیں پسند کرے گا۔ غذا بھی ہو، تو پاک غذا پسند کرے گا ناپاک نہیں، لباس ہو تو جائز لباس پسند کرے گا، ناجائز نہیں، ہر چیز میں یہ اصول چلے گا کیوں کہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔

یورپ کے ایک ریفرارمر نے لکھا ہے کہ قرآن کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے جس نے نفسیات سے بحث کی ہے اور کتابوں میں احکام دیئے گئے ہیں یہ ناجائز ہے یہ حلال ہے یہ حرام ہے اور قرآن کریم نے صرف حلال و حرام بیان نہیں کیا، حلال تک پہنچنے کا جو نفسیاتی طریقہ ہے ادھر بھی توجہ دلائی ہے، حرام تک پہنچنے کے جو نفسیاتی اصول ہیں ان کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات جیسے مثلاً ایک حدیث ہے جو قرآن کریم کی شرح ہے۔ اس میں فرمایا گیا صحابہ رضی اللہ عنہ کا مجمع تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”كَيْفَ بِكُمْ إِذَا فَسَقَ فِتْيَانُكُمْ وَطَفَعِي نِسَاءَكُمْ“ لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فاسق و فاجر بن جائیں گے اور عورتیں آزاد ہو

① السنن لابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب کراہیۃ استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، ج: ۱، ص: ۱۲، حدیث حسن

ہے دیکھئے صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۱، ص: ۸۶۔

جائیں گی اور تمہارے کہنے میں نہیں رہیں گی۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم! جمعین تو خیر القرون میں ہیں، ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔ حیران ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ ہو جائے گا؟ ”قَالَ نَعَمْ وَأَشَدُّ“ ”یہ بھی ہوگا اور اس سے زیادہ سخت بات ہوگی۔“ ”كَيْفَ بِكُمْ إِذَا لَمْ تَأْمُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ.“ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اچھی باتوں کی نصیحت چھوٹ جائے گی اور بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے گا۔ تو صحابہ میں حیرانی پیدا ہوئی کہ یہ کیسے ہوگا۔ وہ تو پاک زمانہ ہے، رات دن معروفات میں ہیں، ہدی کا تو ان کے ذہنوں میں تصور بھی نہیں آتا۔ تو حیران ہوئے اور عرض کیا: ”وَإِنَّ ذَلِكَ لَكَاثِبٌ يَارَسُولَ اللَّهِ؟“ ”یا رسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟“ ”قَالَ نَعَمْ وَأَشَدُّ.“ ”یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔“ ”كَيْفَ بِكُمْ إِذَا أَمَرْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَلَهَيْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوفِ.“ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب منکرات کی توہدایت کرنے بیٹھ جاؤ گے اور معروفات کے روکنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے، اب تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پہلے سے بھی زیادہ حقیر بڑھا اور عرض کیا: ”وَإِنَّ ذَلِكَ لَكَاثِبٌ يَارَسُولَ اللَّهِ؟“ ”یا رسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟“ ”قَالَ نَعَمْ وَأَشَدُّ.“ ”بھی ہوگا“ ”كَيْفَ بِكُمْ إِذَا أَرَأَيْتُمُ الْمَعْرُوفَ مُنْكَرًا وَالْمُنْكَرَ مَعْرُوفًا“ ① ”اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ اچھی چیزوں کو تم برا جاننے لگو گے یعنی فہم ہی الٹ جائے گا کہ اچھی چیزیں بری نظر پڑیں گی اور بری چیزیں دلوں کے اندر اچھائی بن جائیں گی۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا۔“

تو اس حدیث میں درجات بتلائے گئے ہیں کہ سب سے پہلے عمل سے ابتداء ہوتی ہے کہ عملی طور پر آدمی فسق و فجور اور تعدی و زیادتی کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ عمل خراب ہوتا ہے۔ نوجوان فاسق و فاجر ہو گئے، عورتیں سرکش اور آزاد بن گئیں۔ خاوند کی سنتی ہیں نہ باپ کی سنتی ہیں نہ اولاد کی سنتی ہیں، جوان کے جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ تو عملی خرابی ہے۔

عملی خرابی جب جڑ پکڑ جاتی ہے تو فصیحت کا کارخانہ رک جاتا ہے۔ فصیحت کرنے والے کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کہہ دیا تمہارا عمل نہیں ہے تم کس منہ سے فصیحت کر رہے ہو۔ تو فصیحت کا کیا منہ رہے گا۔ تو فصیحت رک جائے گی تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو گیا۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اچھی باتوں سے روکنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور بری باتوں کی ہدایت کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور چوتھا مقام فہم کے الٹ جانے کا ہے کہ جو اچھائی کی چیزیں ہیں، وہ بری بن جائیں اور جو بری چیزیں ہیں وہ اچھی نظر آنے لگیں۔

① مسند ابی یعلیٰ الموصلی، شہر بن حوشب عن ابی ہریرۃ، ج: ۱۳، ص: ۱۸۳۔ علامہ بیہقی نے اس حدیث کو ضعیف قرار

دیا ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ومنیع الفوائد، باب فی آیام الصبر و فیمین یتمسک ج: ۳، ص: ۳۱۴۔

یہاں آکر فہم کا الٹا پن ظاہر ہوتا ہے، غرض خرابی پہلے عمل سے شروع ہوتی ہے، پھر عقیدے پر پھر نصیحت پر، پھر عقل و فہم پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، انجام کار آدمی الٹا چلنے لگتا ہے قلب میں زلیخ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ نفسیاتی اصول ہے کہ عمل اول بگڑے گا فکر بعد میں بگڑے گی، عقیدہ اس کے بعد بگڑے گا اور پھر فہم الٹ جائے گا۔ تو فقط یہ نہیں فرمایا کہ برائی سے بچو۔ برائی سے بچنے کا نفسیاتی راستہ بھی بتلا دیا کہ عمل کی حفاظت کرو تاکہ فکر محفوظ رہے فکر کی حفاظت کرو تاکہ عقیدہ محفوظ رہے۔ عقیدے کی حفاظت کرو تاکہ فہم میں کجی نہ پیدا ہو۔ تو یہ ایک سلسلہ ظاہر فرمایا۔

تو یورپ کے ریفا رمر نے یہی کہا کہ دنیا کی ساری کتابوں میں احکام موجود ہیں، قرآن کریم میں احکام کے ساتھ نفسیات سے بحث کی گئی ہے۔ جو کسی کتاب میں نہیں کی گئی۔ فطرت کے راستے دکھائے گئے۔ اب جب قرآن کریم کی تعلیم ہی چھوٹ جائے تو احکام کیسے معلوم ہوں۔ احکام نہ معلوم ہوں تو عقائد کیسے درست رہیں۔ عقائد درست نہ ہوں تو فکر کیسے صحیح رہے اور جب فکر صحیح نہیں رہے گی۔ الٹی ہو جائے گی۔ تو دل ہی الٹ جائیں گے۔

اسی کو فرمایا گیا ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ الْآوَهُمْ مُمْشِرُ كُفُون﴾ ① ”بہت سے وہ لوگ ہیں جو مومن ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔“ شرک میں مبتلا ہیں یہی تو وہ مقام ہے۔ گائے علامت حیات ہے..... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ گائے ذبح کر کے اس میت سے ملاؤ، وہ زندہ ہوگا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہو۔ فرمایا ﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ ② ”مذاق مسخرہ ہم نہیں کیا کرتے۔ میں تو وحی الہی سے کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا اس کی شان کیا ہوگی؟ فرمایا: ”وہ نہ بوڑھی ہو نہ بن بیباکی بلکہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہو“۔ انہوں نے کہا رنگ کیا ہوگا؟ ﴿صَفَرَاءُ فَاغِقَ لَوْنُهَا تَسُرُّ النُّظُرِينَ﴾ ③ نہایت زرد خوش رنگ جو نگاہوں کو خوش کرتی ہو اور یہ کہ وہ نہ کسی کھیتی میں جڑی ہوئی ہو نہ کسی سخت میں لگی ہوئی ہو۔ یہ ساری شائیں ایک ہی گائے میں پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک صالح آدمی کی ملک تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے یتیم بچے تھے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بس یہی ایک گائے تھی۔ سارے بنی اسرائیلی جمع ہو کر وہاں پہنچے اور کہا کہ اس گائے کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا اس کو ذبح کر کے اس کھال بچھائے دیتا ہوں، اس میں سونا بھر دو، تو لاکھوں روپے کا سونا ان کو ملا اس کو ذبح کر کے اس کو میت سے ملایا گیا وہ زندہ ہوا اس نے قاتل کا پتہ دیا، غرض گائے علامت حیات ہے۔

سامری نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دریائے نیل میں فرعون غرق ہوئے۔ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام مع بنی اسرائیل کے پار ہو گئے، پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور پانی رک کر بارہ راستے بن گئے۔ اور بارہ قبیلے اس

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیہ: ۱۰۶، ② پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیہ: ۶۷، ③ پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیہ: ۶۹

سے گزرے جو ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے۔ فرعون جب نکلا تو ہامان نے کہا کہ آپ کے اقبال سے دریا میں راستے ہوئے ہیں۔ وہ جھجکتا تھا کہ میرا اقبال کیا۔ یہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ ہے۔

مگر وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دوسرا وزیر گھوڑی یعنی مادہ پر سوار تھا، وہ گھوڑی جو تھی آگے بڑھی۔ گھوڑا بھی لپک کے اس کے پیچھے پڑا، اور وہ دریا میں کود گئے، تو یہ سارے قبطی کو دے اور وہاں غرق ہو گئے اس کے بعد سامری نے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کے سم کے نیچے اگر خاک بھی ہوتی تو سبزہ اگ آتا تھا اس نے سمجھا کہ اس میں حیات کا مادہ ہے۔ اس نے چنگی اٹھا کے رکھ لی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے زیورات جمع کرو، سونے چاندی کے زیورات جمع کر کے اس کا پھڑا بنایا۔ اس میں وہ خاک پھونکی تو کوہ نے لگا اور اس میں آواز بھی نکلی۔ اس نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) خدا کو دیکھنے وہاں گئے۔ خدا تو معاذ اللہ یہاں آگیا۔ وہاں سے گو (گاؤ) کی پوجا شروع ہوئی۔

ہندوستان میں جو گاؤ پرستی کی وبا آئی ہے تو مورخین لکھتے ہیں کہ چند بنی اسرائیل جو مرتد ہو گئے تھے، بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں، تو جو حکمت حقہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے سنے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ اپنی چیزیں مل ملا کر لوگوں کو سمجھایا تو وہاں سے گوسالہ پرستی شروع ہو گئی۔ بہر حال اتنی بات معلوم ہوئی گائے جو ہے اسے حیات سے مناسبت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا دودھ نہیں ہوتا تو بچوں کو گائے کا دودھ پلاتے ہیں۔ اس کے اندر وہی مادہ ہے یعنی حیات آفرینی جو ماں کے دودھ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے خواب میں گائے وغیرہ دیکھنا انشاء اللہ حیات کی علامت ہے۔

تعبیر خواب میں حدیث فیہی کی ضرورت..... تعبیر خواب کا تعلق کچھ موسموں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ دیکھنے والے کی صفات سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کا بھی تعلق ہوتا ہے تو ممبر (تعبیر دینے والا) اگر صحیح ہے تو وہ قواعد کی رو سے تعبیر دے گا۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر ایک سے خواب مت کہو جو پہلے تعبیر دے دے گا وہی واقعہ ہو جائے گا۔ اسی لئے سمجھ دار اور خیر خواہ سے خواب کہو تا کہ وہ اچھی تعبیر دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ وہ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ ایک بہت بڑا دنبہ جو گائے کے برابر ہو ان کے مد مقابل آیا، تو مولانا نے اس کے سینک پکڑ لئے اب کبھی وہ ریلٹا ہے تو یہ پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی یہ ریلٹے ہیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی مقابلہ میں اس نے مولانا کے سینک مارا تو مولانا کی بائیں ران میں لگا اور ایک قطرہ خون کا نکلا۔ یہ خواب دیکھا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کو خواب کی تعبیریں دیا کرتے تھے، وہ بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ بھائی صاحب! میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول کے مطابق فرمایا۔ ”موت کو دہنے کی شکل (قیامت میں) دی جائے گی موت سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ کبھی تم اسے ہٹا دیتے ہو کبھی وہ تمہیں ہٹا دیتا ہے۔

جوسینگ بائیں ران پر لگا اور قطرہ خون کا نکلا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ عرب کا محاورہ ہے، کہ جدی رشتوں کو طعن سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ بطون کا اور پیٹ کا رشتہ ہے اور بنی اعمام جو چچا تائے کی اولاد ہے ان کو انخا ذ سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ران کی اولاد ہے، یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔ فرمایا کہ بائیں ران میں جوسینگ لگا تو ”ران“ سے میں یہ سمجھا کہ بنی اعمام میں کوئی حادثہ پیش آئے گا چوں کہ ایک قطرہ خون کا نکلا تو آپ کی چچا تائے کی اولاد میں چھوٹی عمر کا بچہ گزر جائے گا اور چونکہ عورت بائیں پسلی کی پیدائش ہے اور بائیں جانب خون لگا تو وہ لڑکی ہوگی اور چوں کہ ایک قطرہ خون ہے تو لڑکی چھوٹی عمر کی ہوگی۔ جب وہ تعبیر دی تو تھوڑی دیر میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں جو آپ کے چچا زاد بھائیوں میں بچی پیدا ہوئی تھی وہ گزر گئی۔ فرمایا تعبیر آگئی۔

تو تعبیر میں گویا احادیث کا بھی دخل ہوا۔ جیسا کہ حدیث شریف سے انہوں نے استنباط کیا۔ اس لئے تعبیر دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ اسی طرح تعبیر خواب میں اختلاف موسم کو بھی دخل ہے تو معبر پہچانے گا اور موسم کے لحاظ سے تعبیر دے گا۔ تعبیر خواب میں اعداد و شمار کا دخل..... اسی طرح اعداد و شمار کا بھی دخل ہے۔ حضرت نانو تو ی رحمۃ اللہ علیہ جب مرض وفات میں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام علماء کا حلقہ بہت پریشان تھے، مگر مولانا نے اطمینان دلایا کہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوگا، اب مطمئن تو ہو گئے مگر انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ علیہ۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انتقال نہیں ہوگا اور انتقال ہو گیا۔ فرمایا:

”میاں! کشف تو صحیح تھا۔ تعبیر میں غلطی ہوئی۔ فرمایا جب میں نے مراقبہ کیا تو لفظ ”مہدی“ میرے سامنے نمایاں ہوا اور مہدی کے جو اعداد و شمار ہیں وہ ساٹھ سے بھی اوپر پہنچتے ہیں اور مولانا کو جو مرض لاحق ہوا تو عمر انچاس سال کی تھی۔ تو میں نے کہا۔ ابھی عمر کافی باقی ہے۔ لیکن اس سے مراد لفظ مہدی نہیں تھا بلکہ مہدی کی ذات مراد تھی چنانچہ حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ کی عمر ۳۹ سال کی ہوگی۔ غرض ذات مراد تھی، نام مراد نہیں تھا۔ اس لئے تعبیر میں غلطی ہوئی ہے۔ کشف میں غلطی نہیں تھی۔“

اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کشف میں اعداد و شمار کو بھی دخل ہے۔ اس لئے معبر کو بہت سی چیزیں دیکھنی ہوتی ہیں، آیات و احادیث سے استدلال، موسمی اختلاف کو سامنے رکھنا، اعداد و شمار کا خیال رکھنا۔ بہر حال یہ ایک مستقل فن ہے جو معبر ہی جانتا ہے۔ اس لئے خواب ہمیشہ کسی ایسے آدمی سے ذکر کرنا چاہئے جس کو اس عالم شہادت سے بھی مناسبت ہو اور عالم مثال سے بھی ہو، تو وہ مطابقت اور تطبیق دے کر صحیح تعبیر دے سکتا ہے۔ روحانی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار..... حضور سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت عامہ ہونے کی بڑی دلیل تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: **أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي**۔ ① ”اللہ نے سب سے پہلے میری حقیقت پیدا فرمائی۔“

① حدیث کی تخریج کذا رکھی ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ ”نور“ سے مراد حسی نور تو نہیں ہو سکتا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے جیسے چاند اور سورج کا نور، اس حسی نور کی نور معنوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اپنے نور اور روشنی سے صورتیں اور شکلیں دکھاتا ہے اور نور علم سے اشیاء کی حقیقتیں اور ماتحتیں کھلتی ہیں، اس لئے علم کا نور آفتاب و ماہتاب کے نور سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اول میرے نور کو پیدا کیا۔ کہ وہ ”نور علمی“ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوند دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ”مجسم علم“ بنایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی شریعت کے ہر حکم کے نیچے حکمت ہے۔ ہر حکمت کے نیچے حقیقت ہے ہر حقیقت کے نیچے علت ہے جس پر حکم کا مدار ہے۔ اس طرح پوری شریعت علم سے لبریز ہے۔ حتیٰ کہ معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا۔ جہاں ہزاروں معجزات دیئے گئے جن کا اثر آسمانوں میں بھی ظاہر ہوا۔ زمین میں بھی ظاہر ہوا۔ حجر و شجر اور حیوانات میں بھی ظاہر ہوا۔ اسی لئے حیوانات نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دی۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزات کا اثر آسمانوں تک پہنچا، غرض یہ معجزات تو ایک طرف ہیں۔ لیکن سب سے بڑا معجزہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء کیا گیا یہ علمی اور کلامی معجزہ ہے جو قرآن کریم ہے، جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی جامعیت احکام کے لحاظ سے غرض ہر اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے۔ تو حقیقت میں علم گوند دیا گیا اور معجزہ علمی دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر تا پا علم ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ علم ہی سے دنیا چل رہی ہے۔ حق تعالیٰ کے علم و حکمت اور مشیت ہی پر یہ سارے کاروبار اور کارخانے چل رہے ہیں۔ اس لئے علم اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔ ویسے تو ساری صفات ان کی بلند ہیں مگر علم سب سے اونچی صفت ہے۔ اس واسطے کہ ہر صفت اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہے۔ مثلاً ارادہ ہے تو اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک مراد معلوم نہ ہو۔ قدرت ہے جب تک مقدور معلوم نہ ہو اس پر قدرت کیسے حاصل ہوگی؟ تو ارادہ و قدرت علم کا محتاج ہوا۔ فعل ہے جب تک علم نہ ہو وہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ لیکن علم اپنا کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔ نہ ارادے کا نہ قدرت کا۔ مثلاً آپ ریل میں جا رہے ہیں اور ایک بڑا دریا نظر پڑے۔ تو ارادہ کریں تب معلوم ہو کہ یہ دریا ہے۔ ارادہ نہ کریں تب معلوم نہ ہو یہ دریا ہے۔ وہ تو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے علم اپنا کام کرنے میں ارادے کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے قدرت کا محتاج نہیں کہ اس تالاب پر آپ کو قدرت ہو جائے۔ تو معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے۔ ورنہ معلوم نہ ہو۔ قدرت ہونہ ہو جب سامنے آئے گا تو علم ہو جائے گا۔

غرض ہر صفت علم کی محتاج ہے کہ وہ علم کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ علم کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ اس لئے ساری صفات اور سارے کمالات علم ہی کے تابع ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوند دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبوت اور ولایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ نے علمی اور عملی کمالات دیئے ہیں۔ اگر ایک بھی ولی دنیا میں نہ ہو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور ہیں۔ اگر ایک بھی صحابی رضی اللہ عنہ نہ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور تھے۔ فرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی کمالات کسی چیز کے محتاج نہیں۔ آپ کے اندر غناء ہے جبکہ ہر چیز علم کی محتاج ہے۔ جب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہٹلانے سے پتہ چلے گا۔ فرض ساری دنیا محتاج ہوئی، حتیٰ کہ نبوتیں بھی محتاج ہوئیں۔

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جو ہے وہ ذاتی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے تابع ہیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان ہے، تو آپ کے فیضان سے پچھلوں میں تو نبوتیں پیدا ہوئیں اور اگلوں میں ولادتیں پیدا ہوئیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی محتاج اور اولیاء بھی محتاج۔ یہی وجہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا۔ اور اس میں انبیاء علیہم السلام نے تقریریں کیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اللہ نے ”صفی اللہ“ بنایا اور مجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ مجھے اولاد دی تو دنیا اولاد سے بھردی۔ یہ میرے فضائل ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے اللہ نے کلام کیا۔ مجھے مکلم (بات کرنے والا) بنایا، کلام کی توفیق دی اور طور پر مجھ سے بات چیت ہوئی، مجھے اور میرے ماننے والوں کو بحر قلزم میں نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ غرض انہوں نے یہ اپنے فضائل بیان کئے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ملک دیا کہ کسی کو دیا ملک نہیں ملا۔ ہواؤں پر مجھے قدرت دی جانوروں پر مجھے قدرت دی، سب میری رعایا میں داخل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ مجھے اللہ نے ”روح اللہ“ بنایا مجھے بلا باپ کے قدرت سے پیدا فرمایا۔ جب یہ سب بیان کر چکے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل بیان فرمائے کہ مجھے ”رحمۃ للعالمین“ بنایا، مجھے ”شفیع المذنبین“ بنایا۔ مجھے ”خاتم النبیین“ بنایا۔ میری نبوت کو اصلی بنایا اور نبوتیں تابع کیں، تو سب نے کہا کہ یہی وجہ ہے اور بنیاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء علیہم السلام پر افضل ہیں۔ غرض پہلی رحمت تو یہی ہے کہ دنیا میں ہر کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی وساطت سے پیدا کیا گیا، دنیا میں جو کچھ ہے وہ کمال ہی سے چل رہا ہے، نقصان اور عیب سے دنیا نہیں چل رہی اور کمالات سارے علم کے تابع ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے ازل سے لے کر اب تک روشنی پھیلی۔ تو پہلی رحمت تو یہی ہوئی۔

مادی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار..... دوسرے یہ کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث نے روایت نقل کی ہے کہ: ﴿لَوْلَاكَ يَا مُحَمَّدُ لَمَا تَخَلَّقْتُ آدَمَ﴾ ① اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم)

① علامہ محبوتی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال الصغاني موضوع، والقول لكن معناه صحيح وان لم يكن

و سلم) اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گویا پیدائش اور وجود درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوا۔ تو وجود اور زندگی کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تو جب وجود سب سے بڑی نعمت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ غرض مادی اعتبار سے دیکھا جائے تو وجود کی دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں بی۔ روحانی نعمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کمالات علی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں پیدا ہوئے۔ تو مادی لحاظ سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ روحانی طور پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔

عالم آخرت میں رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار..... پھر یہ کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیا جائے گا۔ تمام امتوں کے صلحاء کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے۔ میدان محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے اور زمین پر ساری مخلوق اس طرح سے ہوگی کہ نہ جھک سکتے ہیں، نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں۔ اور آفتاب کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ لوگ پسینے میں غرق ہوں گے۔ اور اس طرح چالیس برس کا عرصہ گزر جائے گا۔ اس وقت لوگوں کے دلوں میں آئے گا کہ کسی سے شفاعت کراؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ:

”اللہ نے آپ کو ہم سب کے لئے باپ بنایا۔ باپ کی شفقت والفت معلوم و متعین ہے۔ آپ علیہ السلام ہماری سفارش کریں کہ اس مصیبت سے نجات ملے۔“

وہ فرمائیں گے: ”لَسْتُ لَهَا۔“ ”میں اس کا اہل نہیں ہوں“ میں نے ایک غلطی کی تھی۔ گو وہ معصیت تو نہیں کی تھی مگر ایک لغزش تھی، جس درخت کی ممانعت کی گئی تھی وہ کھالیا تھا۔ اور معصیت نہیں تھی کہ معصیت حکم کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ شیطان نے اس میں تاویل سکھائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کو دوامی زندگی ملتی ہے۔ تو یہ ممانعت جو تھی وقتی تھی۔ آپ میں اس وقت تک اتنی استعداد نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے استعداد پیدا ہوگئی، اب کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔

تو تاویل کے راستے سے کھایا اور تاویل کے راستے سے کوئی کام کرنا معصیت نہیں ہوتا، خطاء فکری اور خطاء اجتہادی ہوتی ہے اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ مجتہد اگر صواب کرے تو دوہرا اجر ملتا ہے، خطا پر ایک اجر ملتا ہے۔ تو معصیت پر اجر تو ہوا ہی مل سکتا ہے؟ اس لئے معصیت تو نہیں تھی۔ خطاء فکری و اجتہادی تھی۔ وہ مجھ سے سرزد ہوگئی۔ تو اسے پیش کریں گے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے، کہ میں اللہ سے جا کر تمہاری سفارش کروں۔ میں اس کا اہل نہیں، تم حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ پھر لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے وہ بھی عذر کر دیں گے کہ:

”لَسْتُ لَهَا:“ ”میں اس کا اہل نہیں“۔ میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کو بلایا لیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ ① ”جب یہ کفر میں مبتلا ہے تو تمہاری اولاد نہیں رہا“۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ جاہلوں کی سی باتیں مت کرو، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسی وقت استغفار کیا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ مجھ سے یہ خطا سرزد ہوئی تھی۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں سفارشی بن کر جاؤں اگر مجھے کہا تم نے تو غلطی کی تھی تمہاری شفاعت کا کیا منہ ہے، تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

وہ بھی عذر کر دیں گے کہ ”لَسْتُ لَهَا“ ”میرے سے فلاں لغزش ہو گئی تھی“۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے میں نے ایک قطبی کو پھنسا مارا تھا۔ اس کی گردن اڑ گئی حالانکہ وہ خطا عدا نہیں کی تھی کہ اسے قتل کیا ہو مگر نبی کا ہاتھ اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑ گئی۔ اس لئے میرا منہ نہیں ہے کہ میں جا کر سفارش کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے قتل کیا تھا۔ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ مگر جب لوگ ان کے پاس آئیں گے تو وہ فرمائیں گے۔ ”لَسْتُ لَهَا“ ”میں اس قابل نہیں ہوں“۔ میری قوم نے مجھے خدا اور اس کا بیٹا کہا۔ اگر یہ فرما دیا گیا کہ اچھا آپ وہی ہیں جنہیں ہماری مسند پر خدا بنا کر بٹھایا گیا تھا؟ کیا وہ آپ ہی ہیں جنہیں خدا کا بیٹا کہا گیا تھا؟ حالانکہ اللہ بیٹے اور باپ سے بری ہے۔

تو میرا منہ اس قابل نہیں کہ میں سامنے ہوں۔ اس لئے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ ”أَنَا لَهَا أَنَا لَهَا“ ”میں اس کا اہل ہوں“ میں سفارش کروں گا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام محمود پر فائز کئے جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سات دن رات کی لمبی مدت تک میں سجدے میں پڑا رہوں گا اور اللہ کی وہ حمد و ثناء بیان کروں گا کہ عالم میں کسی نے نہیں کی ہوگی اور اب میرے دل میں بھی نہیں ہے۔ اسی وقت القاء کی جائے گی۔ مگر اس قدر غنا کا دن ہوگا کہ سات دن آپ سجدے میں رہیں گے اور کچھ نہیں کہا جائے گا۔ سات دن کے بعد اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ:

”يَا مُحَمَّدُ! اذْفَعْ رَأْسَكَ سَلِّ تَغْطِ وَاشْفَعْ تُشْفَعُ“ ② ”سر اٹھاؤ۔ سوال کرو ہم عطا کریں گے۔ شفاعت کرو تو ہم قبول کریں گے“۔ غرض پورے عالم میں صلحاء کے لئے خواہ وہ کسی بھی امت کے ہوں آپ شفاعت فرمائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم اب حساب شروع کرتے ہیں اور جس کا جو ٹھکانہ ہوگا۔ وہ وہاں پہنچ جائے

① پارہ ۱۲، سورۃ ہود، الآیہ: ۴۶، ② الصحيح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: لما خلقت بیدی،

گا۔ غرض یہ شفاعت کبریٰ کا مقام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا۔ اس دن آخرت میں سب اولین و آخرین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آپ کی سیادت پورے عالم پر ظاہر ہوگی۔ اس وقت جو منکر کفار ہوں گے وہ حسرت میں پڑیں گے کہ کیوں نہ ہم ایمان لائے۔ تو یہ تیسری ”رحمت عامہ“ ہے جو پورے عالم پر متوجہ ہوگی۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی آثار..... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا میں ہوں گا جو جہنم کا دروازہ کھٹکناؤں گا اور کہوں گا کہ دروازہ کھولو۔ پھر اسی طرح ابد تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت پہنچی ہوئی ہے۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ازلی آثار..... اور ازل سے رحمت یہ ہے کہ جب ”عہد اُنسٹ“ کیا گیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا ”اُنسٹ برِ بَہِکْم“ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ساری مخلوق کو آدم علیہ السلام کی کمرے سے نکالا اور جمع کیا اور فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب ایک دوسرے کا منہ تیکنے لگے کہ کیا جواب دیں۔ اس لئے کہ آدم کی کمرے سے نکلے ہوئے اس وقت کوئی عقل و شعور نہیں تھا اور صفت ربو بیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو حیرانی پیدا ہو گئی تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جواب دیا کہ۔ ”بَلٰی“ ”کیوں نہیں، بیشک آپ ہمارے رب ہیں“۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب دیتے ہی تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان پر جاری ہو گیا، ”بَلٰی بَلٰی“ بے شک آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اس کے بعد ساری مخلوق نے زبان سے کہا ”بَلٰی“ آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں اور تمہارے باپ کو گواہ کرتا ہوں کہ تم نے میری ربو بیت کا اقرار کر لیا اس آسمان و زمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے میری ربو بیت کا اقرار کر لیا۔ اور اس ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے اقرار کیا۔ جب تم دنیا میں پہنچو تو اس اقرار کو یاد رکھنا اور میرے رب ہونے کو ماننا اور میری تقدیر پر راضی رہنا۔ غرض اس وقت سب نے بلی کا لفظ اختیار کیا اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اختیار کیا۔

تو رحمتہ للعالمین ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے جواب دینے کے قابل جب ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سکھلایا۔ تو حق تعالیٰ نے تو تعلیم کے ذریعے سے ربو بیت کا اقرار کر لیا۔ اس لئے رحمت عامہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے؟ غرض ازل میں بھی رحمت، دنیا میں تشریف لائے تب رحمت، برزخ میں پہنچیں گے تب رحمت۔ شب معراج میں پہنچے تب رحمت، قیامت کے دن شفاعت کبریٰ ہوگی تب رحمت اور اَوَّلُ مَنْ يَلْذُقُ بِأَبِ الْجَنَّةِ“ ① ”کہ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکنائیں گے“۔ تب رحمت، غرض اول سے لے کر آخر تک رحمت ہی رحمت ثابت ہے۔

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم..... اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ

رحمۃ للعالمین“ ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے لئے بھی رحمت، عالم جنات کے لئے بھی رحمت، عالم حیوانات کے لئے بھی رحمت، عالم بشر کے لئے بھی رحمت، غرض جتنے عالم اللہ نے بنائے ہیں سب کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں۔ جب وجود ہی ہر چیز کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ہوا تو ہر چیز مرہون منت اور مرہون احسان ہے، اس واسطے آپ کی رحمتہ للعالمین ازل سے چلی اور اب تک چلتی رہے گی۔ قیامت پر ختم نہیں ہوگی بلکہ جنتوں میں بھی چلے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَقِیْلُ وَاَرْقِیْ۔^① ”مخلات کرتا جا اور جنت کے درجات طے کرتا جا“۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی لے کر تشریف لائے۔ تو مدارج کی ترقی قرآن کریم کے ذریعے ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے دنیا کو پہنچا۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ قرآن کریم کی جتنی آیات ہیں، جنت کے اتنے ہی درجات ہیں۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جو آیتیں ہیں یہی بحیثہ جنت میں درجات کی صورت میں منکشف ہو جائیں گی۔ یہاں یہ آیتیں علمی شکل میں ہیں، وہاں جا کر باغ و بہار کی شکل اختیار کریں گی۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ اور تو میں تو جنت میں داخل کی جائیں گی اور مسلم حفاظ کے سینوں میں خود جنت آئی ہوئی ہے۔ جو یہ قرآن کریم ہے۔ اس کی آیات ہی جنت بنیں گی۔

تو یہ سب رحمۃ للعالمین ہی کی شان کا ظہور ہے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت قلوب سے لے کر قلوب تک (ڈھانچہ) ازل سے لے کر اب تک، دنیا سے لے کر برزخ تک پھیلی ہوئی ہے، اسی لئے رحمۃ للعالمین کہا گیا، رحمۃ للعالمین نہیں کہا گیا۔ اس میں تمام عالم داخل ہیں۔

اللہ نے سب سے بڑا ہدیہ جو مخلوق کو دیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود ہے جو عطا کیا گیا۔ اور اسی لئے فرمایا کہ جب کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئے یا کوئی غم طاری ہو تو وہ میری وفات کو یاد کرے، کہ اس سے بڑا صدمہ عالم کے لئے نہیں ہے۔

حقیقت تو تسل..... تو تسل کا ایک تو مطلب یہ ہے جو دنیا میں ہوتا ہے کہ جو شفاعت کے طور پر کسی کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ حاکم پر اس کا اثر ہے۔ حاکم اس کی بات کو مان لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔ یہ شرک میں بھی داخل ہے۔ حق تعالیٰ پر کس کا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ خود موثر بالذات ہیں ان پر کون موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وسیلہ کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا۔ یہاں تو تو تسل کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رحمت سے آپ نے ان لوگوں کو نوازا ہے، اس میں مجھے بھی حصہ عطا فرما دیجئے کہ میں بھی اس رحمت سے نوازا جاؤں۔ ویسے کے یہاں یہ معنی ہیں تو یہ معنی کہ وہ وسیلہ والا حق تعالیٰ پر اثر رکھتا ہے، اس کے دربار میں تو سب بندے ہیں اور سب محتاج ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جو سب سے زیادہ مقدس طبقہ اور حق تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں۔

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن، ج: ۱۰، ص: ۱۵۶۔

لیکن قیامت کے دن صورت یہ ہوگی کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس طرح تھر تھرائے ہوئے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ تورات کہاں ہے؟ وہ عرض کریں گے میں نے تو موسیٰ علیہ السلام کو پہنچا دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جائے گا کہ آپ کو تورات پہنچی؟ وہ عرض کریں گے، جی ہاں پہنچی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے۔ میں نے امت کو پہنچا دی۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب طلب کیا جائے گا تو کیفیت یہ ہوگی کہ اس طرح تھر تھرائے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ تھر تھرا کا پتہ ہے۔ یہی صورتحال اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوگی۔

اسی طرح سے قرآن کریم کے بارے میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ قرآن کریم کہاں ہے؟ عرض کریں گے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پہنچا دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلب کئے جائیں گے اور پوچھا جائے گا آپ تک قرآن کریم پہنچا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرض کریں گے، جی ہاں پہنچا۔ فرمایا جائے گا، آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے، میں نے امت کو پہنچا دیا۔ فرمایا جائے گا کہ اب بیٹھ کر سناؤ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرش کے نیچے منبر بچھایا جائے گا۔ سارے اولین و آخرین کے مجمع میں، آپ پورا قرآن کریم تلاوت فرمائیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اندر ایک تو لفظ ہیں، لفظوں کے نیچے ان کے معانی ہیں۔ معانی کے نیچے ان کے حقائق ہیں۔ حقائق کے نیچے اسرار و مصالح اور حکمتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں مجسم کر کے نمایاں کی جائیں گی اور قرآن کریم ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک باغ و بہار کھڑا ہوا ہے۔ ہزاروں رنگ کے پھول اس میں کھلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں خوشبوؤں سے معطر ہے۔ تو لوگ کہیں گے یہ قرآن تو آج تک ہم نے سنا ہی نہیں، یہ تو عجیب و غریب قرآن ہے۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ شانہ، موجود حضرات انبیاء علیہم السلام موجود، اور ملائکہ علیہم السلام موجود تو روحانیت کی کیا انتہا ہوگی؟ پڑھنے والے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو روحانیت کا کیا مقام ہوگا؟ غرض جو ساری چیزیں علمی طور پر قلوب میں تھیں مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ تو ایک عظیم باغ و بہار کی صورت میں قرآن نمایاں ہوگا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہ بھی کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے آج تک سنا ہی نہیں تھا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت انبیاء علیہم السلام کی شان بھی یہ ہوگی کہ وہ مصیبت کی وجہ سے تھر تھرائے ہوئے ہونگے تو پھر میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ اس واسطے تو سل کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ صاحب وسیلہ کا اثر اللہ تعالیٰ پر پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی حکومتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تو صرف، تو سل کے یہ معنی ہونگے کہ جس رحمت و برکت سے آپ نے ان بزرگوں کو نوازا ہے، اس میں ہم غریبوں کو بھی شامل فرمالیجے، کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے نہ یہ معنی کہ ہم اثر ڈالتے ہیں اور حق تعالیٰ ہماری سفارش سے مجبور ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ

جابر ہیں مجبور نہیں ہیں۔ قاہر ہیں مقہور نہیں ہیں۔

مقہور و مجبور تو بندے ہیں۔ اس لئے تو سل کے یہ معنی کہ اللہ پر اثر ہو یہ تو شرک ہے اور ایک یہ کہ اس تو سل کی نعمت میں ہمیں داخل فرما لیجئے، یہ دعا اور استدعاء ہے یہ عبدیت اور بندگی میں داخل ہے۔ اس تو سل میں کوئی حرج نہیں ہے اس کی شریعت نے اجازت دی ہے تو سل کے اس معنی کے لحاظ سے آپ یہاں بیٹھ کر دعائیں مانگیں، خواہ کسی قبر پر جا کر مانگیں وہ جائز ہے یہاں بھی جائز ہے، قبر پر بھی جائز ہے۔ قبر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ حق تعالیٰ سے مانگے کہ جس نعمت سے آپ نے انہیں نوازا ہے اس نعمت سے مجھے بھی نواز دیجئے۔ اس تو سل کی اجازت دی گئی ہے۔

میلا دا النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟..... عید میلا النبی پر جلوس اور مجلس وغیرہ یہ سارے مظاہرات ہیں جیسے دنیا میں نمائش مظاہرے ہوتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی مزاج کے مطابق ہوتیں، تو سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کرتے، تابعین رحمہم اللہ کرتے، آئمہ مجتہدین کرتے۔ لیکن کسی سے منقول نہیں بلکہ چند صدیوں کے بعد یہ مظاہرے شروع ہوئے۔ ان مظاہروں میں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ بھائی! کر لیا۔ لیکن یہ جو نمائش صورتیں ہیں اور غلو ہے یہ اسلامی مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسری اقوام سے لیا گیا ہے جیسے ہندوؤں میں جلوس نکلتے ہیں۔ ان کے جو مقتدی ہیں ان کی صورتیں بنانا کراؤنوں پر اور ہاتھیوں پر رکھتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔ اسلام تو حقائق لے کر آیا ہے، صورتوں اور شکلوں کی نمائش لے کر نہیں آیا۔ اپنے اندر حقیقت پیدا کرو۔ نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام کا موضوع تو یہ ہے کہ جو خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں ان میں بھی زیادہ مت الجھو۔ اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں اگر صورتوں کے عشق و محبت بتلا ہوا تو حسن خاتمہ کے اندر فرق پڑ جائے گا۔ اس لئے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کا وقت ہے اور آپ صورتوں میں الجھے ہوئے ہیں تو صورتیں حقیقت سے روکیں گی۔ اس واسطے اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو۔ حقائق کا طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔

اکمال دین کا طریق..... سوال اول..... ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ ① یہ آیت قرآن میں اپنی جگہ سب سے آخر میں چاہتی ہے، ورنہ اس کی موجودہ جگہ قرآن کے غیر مرتب ہونے پر دال ہوگی؟

جواب الیوم سے خاص یوم نزول آیت مراد نہیں، بلکہ مطلقاً دور حاضر مراد ہے اور وہ عام ہے، وقت نزول کو بھی اور نزول آیت کے ماقبل و مابعد کے زمانے کو بھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ ”آج بڑا نازک زمانہ ہے“ یا ”آج لوگوں کو بھلا کام کرنا دشوار ہو گیا ہے“۔ ”یا آج کا دن تو وہ ہے کہ بھیڑیوں نے بھی انسانوں سے پناہ مانگی ہے“۔ ظاہر ہے کہ اس سے یوم تکلم کی تاریخ مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ دور مراد ہوتا ہے جس سے مستکرم اور

مخاطب گزر رہے ہوتے ہیں۔ پس یہاں بھی ”الیوم“ سے مراد وہ دور حاضر ہے جس سے مخاطبین قرآن گزر رہے تھے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری حصہ نہ کہ خاص یوم نزول آیت۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اس صورت میں اگر اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی کچھ آیتیں اتریں تو وہ اکمال دین کے منافی ثابت نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی دائرہ اکمال سے خارج ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یوم نزول آیت سے پہلا اور پچھلا سارا دین ”اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ“ میں داخل رہے گا۔ گویہ آیت درمیان میں آجائے اور سب سے اخیر میں نہ رہے۔

تفسیر اکمال دین رہا یہ کہ اس آیت کے نزول کا وقت کلیۃً آخر میں، بلکہ یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیوں نہ رکھا گیا کہ ظاہر طور پر بھی اس آیت سے پورے دین کی تکمیل کا اعلان ہو جاتا اور ”الیوم“ کے معنی مطلقاً دور حاضر کے نہ لینے پڑتے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے فقط اکمال دین کی کوئی علمی یا اعتقادی خبر ہی دینی مقصود نہ تھی۔ بلکہ اکمال دین کا پورا پورا اشتہار بھی مقصود تھا اور اس کے لئے یوم نزول سے بڑھ کر دوسرا کوئی وقت موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ یہ یوم عرفہ تھا جس میں حج کے لئے اطراف سے لوگ جمع ہوئے تھے، پھر اوپر سے یوم جمعہ بھی تھا۔ جو خود یوم جامع ہے اور اس پر مزید یہ کہ حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن تھا جس میں ایک لاکھ سے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم کے عدد کی اکثریت حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے شریک حج ہوئی۔

پس اس یوم جامع میں تمام جمع شدہ مسلمانوں کے روبرو ہیبت اجتماعی کے ساتھ عین وقت اجتماع میں ذات جامع پر یہ آیت اتار دی گئی، تاکہ بیک دم تمام مسلمین اولین اکمال دین کی اطلاع بھی پالیں اور اس کے نزول کا مشاہدہ کر کے ان کے دلوں میں یہ چیز اتر جائے کہ اب جبکہ یہ دین کامل ہو چکا ہے، تو اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی نیا نبی و دین آنے والا ہے اور نہ آئے ہوئے دین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ ہونے والی ہے۔ پس یہ اکمال دین کی اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ اس کی تشہیر و دعایت اور نزول آیت کا مشاہدہ کرا کر اور ”عَلَسَىٰ ذُوْاۤیۤ اَیۡمٰنٍ“ مراد (واضح ثبوت) اسے نازل فرما کر یہ خبر شائع بھی کرنی تھی کہ اب نجات کا انحصار اسی دین میں ہے اور بس۔ ﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ①

اکمال دین کے بارے میں ازالہ تشکیک اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی دعویٰ (اکمال دین) عین یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے آخر میں نازل کیا جاتا، تو قطع نظر اس کے بروقت اعلان عام نہ ہو سکے گا ایک مفسدہ یہ بھی محتمل تھا کہ اگر اس دعویٰ کے اعلان میں کسی کو شبہ پیش آتا اور اس کی وہ شرح سامنے نہ آتی جو نزول آیت کے ۹۰ دن بعد تک ہوتی رہی، تو اس شبہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی اور ہو سکتا تھا کہ خود غرض تکمیل دین کے بارے میں شبہات ڈال کر دین کے اتمام و کمال کو مشتبہ بنا

دیتے اور بعد میں آنے والے تیس دجال جو یہ نص حدیث ادعاء نبوت کے ساتھ آنے والے تھے اپنا مطلب یہ کہہ کر نکال لیتے کہ دین کے آخری اور کامل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں کوئی نبی نہ آ سکے یا اس دین کے بارے میں کوئی بیان اور شرح بھی نازل نہ ہو سکے۔ لیکن جب کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹۰ دن اس دنیا میں قیام فرمایا اور اکمال دین کی حقیقت بعد کے کلمات سے اور زیادہ واضح فرمادی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کا آخری اور مکمل ہونا شرح صدر کے ساتھ سمجھ گئے اور گویا اس کی گنجائش دے دی گئی کہ اگر کسی کو اس اکمال میں شبہ یا شک ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابھی دنیا میں موجود ہیں اور ان پر وحی بھی آرہی ہے۔ وہ اس شبہ کو رفع کر سکتا ہے۔ اس چیز نے دعوائے اکمال کو ہر قسم کے احتمالی شک و شبہ سے بھی پاک کر دیا۔ ورنہ جیسے حدیث قرطاس یوم وفات نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، اور اس کے بارہ میں بعد کے بیان سے لوگ تشنہ رہ گئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی ہو گیا جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روافض نے اسے ملعبہ اور ایجاد فتنہ کا حیلہ بنالیا۔ محض اس لئے کہ قرب وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اس کا کوئی بیان یا کوئی شرح سامنے نہ آ سکی جو عوام کی زبان بندی کر سکے۔

ایسے ہی اگر یہ آیت بھی جس میں اسلام کی تکمیل اور مدارجات ہونے کا بنیادی دعویٰ تھا۔ عین وفات کے دن آخری ساعتوں میں نازل ہوتی اور بعد کی شرح سامنے نہ آتی تو ممکن تھا کہ اکمال دین کے بارہ میں احتمالات اور تشکیک پیدا کر کے عوام کو فتنے میں مبتلا کیا جاتا اور دجالین وقت اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ جبکہ نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد تک حضور کو دنیا میں رکھا گیا۔ وحی اترتی رہی اور اس مقصد کی شرح حد تکمیل کو پہنچتی رہی۔ تو اس قسم کے احتمالات اور شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

بہر حال آیت کا نزول تو حجت الوداع کے موقع پر رکھا گیا تاکہ ایک وقت میں ”ایک مکان میں مسلمانوں کے تمام خواص و عوام کے جمع شدہ مجمع میں اکمال دین کا اعلان ہو جائے کہ اس اجتماع کے بعد حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر ایسا اجتماع ہونے والا نہ تھا۔ پھر بعد نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ عرصہ دنیا میں قائم رکھ کر متعلقہ شکوک و شبہات کے تمام احتمالات کو قطع کرنا منظور تھا، کہ عین یوم وفات میں نزول ہونے سے ایسے محتمل شبہات قطع نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر ”الایوم“ سے یوم خاص نہیں بلکہ دور حاضر مراد لیا گیا تاکہ بعد کی اترنے والی بھی ساری آیتیں اس دائرہ اکمال میں داخل رہیں اور دین پورے کا پورا اپنے اجزاء سمیت کامل پکارا جائے، اندریں صورت قرآن کی ترتیب میں خواہ وہ نزول کی ترتیب ہو یا تدوین کی ترتیب ہو، کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

خلق و کسب..... سوال دوم..... ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ ① آیت سے بندہ کے جبر اور اس کے مجرم نہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کفر خدا کی طرف سے ہے۔ جواب۔ اس آیت سے بندہ مجبور محض

ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہ ختم اور مہر زدگی اگرچہ خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق و ایجاد سے عمل میں آئی ہے۔ مگر اس کا یہ خلق مرتب ہوا ہے بندہ کے کسب پر یعنی بندہ نے کفریہ حرکات کرتے کرتے اپنی استعداد قبول حق فنا کر لی، تو خدا کا آخری فعل اس پر بصورت ختم مرتب ہوا۔ پس بندہ اس فناء استعداد کا سبب ہے اور خدا خالق ہے، پھر نہ صرف اس آخری فعل پر بلکہ ابتداء سے لے کر انتہا تک یہ کسب و خلق جمع چلے آ رہے ہیں۔ جب بھی بندہ کسی ایمانی یا کفری حرکت کا اکتساب کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے فعل کو وجود دے دیتے ہیں یعنی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ارادہ کرتا ہے تو اسکے ارادے کو وجود دیدیتے ہیں، ارادے کے بعد وہ فعل کرتا ہے تو اس کے فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا بندہ جیسے اپنے افعال میں آزاد ہے، ایسے ہی اس کے افعال قلب و قالب کے ظہور اور وجود پر بھی حق تعالیٰ نے کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ ورنہ اگر بندہ کے کسب پر اللہ کا خلق و ایجاد اور وجود بخشی مرتب نہ ہو تو بندہ مجبور محض ٹھہر جائے اور وہ کچھ کر ہی نہ سکے۔

اور اسی طرح اس کے اندر جو خلقی جوہر اور مادے رکھے گئے تھے وہ نمایاں نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ بخل بھی ہے اور خلاف عدل ایک ظلم بھی ہے کہ ایک شے میں خدا تعالیٰ اچھے برے مادے تو رکھ دے مگر انہیں نمایاں ہونے کا موقع نہ دے۔ حالاں کہ اس کی بارگاہ بخل اور ظلم سے پاک اور بری ہے۔ پس بندہ کی مجبوری اس میں تو نکل سکتی ہے کہ وہ کسی فعل کا قصد کرے اور وہ فعل نمایاں نہ ہو، نہ اس میں کہ وہ جب بھی کوئی فعل کرنا چاہے تو اس کے ظاہری و باطنی قوی پر کوئی پابندی عائد نہ ہو، بلکہ قدرت ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار ہے کہ ادھر اس نے عزم فعل کیا اور ادھر اچانک وہ فعل اس سے نمایاں ہو گیا۔ یعنی بندہ کے کسب اور خدا کے خلق میں کوئی فاصلہ یا وقفہ درمیان میں حائل نہیں ہوتا، ادھر کسب عبد ہوا ادھر معاً خلق ظاہر ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے بجلی کی روشنی میں سوچ اور قلم کی نسبت ہے کہ جیسے ہی سوچ بھلا یا ویسے ہی معاً آن کی آن میں قلم روشن ہو گیا۔

پس حرکت سوچ کسب عبد کی مثال ہے اور قلم روشن روشنی خلق الہی کی مثال ہے۔ یعنی جیسے سوچ بھلانے والے کا روشنی بنانے یا پاور ہاؤس سے اس قلم میں لا کر جلوہ گر کرنے میں کوئی ادنیٰ دخل نہیں۔ ایسے کسب افعال کرنے والے بندے کو ظہور افعال اور وجود نتائج میں کوئی دخل نہیں۔ اس کا کام صرف کسب ارادہ و فعل یعنی اکتسابی حرکت کرنا ہے، اس ارادے کی تخلیق و ایجاد اور اس فعل کو وجود دینا خود بندے کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔

پس ایک بد عمل نے ظالمانہ اور کافرانہ حرکات کا کسب شروع کیا تو خدا نے ان حرکات کو وجود بخشا شروع فرمایا اور جب وہ اکتساب کفر کرتے کرتے اس حد پر آ گیا کہ اس کی قبول حق کی صلاحیت و استعداد ہی فنا ہو گئی۔ تو خدا نے اس فنا اور بطلان استعداد کو بھی وجود دے دیا اور پیدا کر دیا۔ پس اسی فناء استعداد کے فعل و ایجاد کا نام ختم ہے کہ خدا نے اس پر مہر لگا دی کہ اب اس میں ایمان داخل نہ ہوگا۔

پس ایمان کے دروازے بندے نے خود اپنے اوپر اپنے کسب سے بند کئے۔ خدا تو اس کی حرکات کو وجود بخشا

رہا نہ کہ خدا اس پر ایمان کے دروازے بند فرماتا رہا اور ظاہر ہے کہ جرم اور معصیت کسب شرور ہے نہ کہ خلق شرور کیوں کہ خلق کے معنی صرف وجود بخشے اور عطاء وجود کے ہیں اور عطاء وجود کسی حالت میں بھی جرم یا برائیاں نہیں ہو سکتا، ہاں خود شے وجود یافتہ کبھی اپنی ذات سے بری ہوگی کبھی اچھی۔ مگر اسے وجود دینا کسی حال میں بھی برائہ ہوگا کیوں کہ عطاء وجود احسان ہی احسان ہے، کہ وجود جیسی نعمت کسی شے کو بخشی جائے، اور عدل ہی عدل ہے کہ ہر شے کو اپنے چھپے ہوئے خلقی جوہر دکھلانے کا موقع دیا گیا ہے اور اس کی خاصیتوں کے ظہور پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پس مجرم اگر ٹھہرتا ہے تو یہ کسب شرور کرنے والا بندہ ٹھہرتا ہے نہ کہ اس کسب کو وجود بخشے والا خدا۔ حاصل یہ کہ اس بندہ کا کفر بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے مگر تخلیقاً نہ کہ اکتساباً اور مجرم کا سب ہوتا ہے نہ کہ خالق اور معطی وجود۔

قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ..... سوال سوم..... قرآن مجید حمد اور تسمیہ (بسم اللہ) سے شروع کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کلام باری نہیں لوگ اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں مگر چوں کہ اس تاویل کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس وجہ سے مخالف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا اور نہ دل کو طمانینت حاصل ہوتی ہے۔

جواب..... تقریر اعتراض کو واضح نہیں کیا گیا کہ اس کے مطابق جواب دیا جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معترض خود بھی اپنے اعتراض کو سمجھتے ہوئے نہیں ہیں۔ بظاہر تقریر شبہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بھلا کوئی خود ہی اپنے کلام کو اپنے نام سے شروع کیا کرتا ہے یا اپنے نام سے خود ہی برکت حاصل کیا کرتا ہے یا مدد چاہا کرتا ہے؟ یعنی یہ اندازہ کلام عرف عام کے خلاف ہے۔

اول تو شبہ یوں بے اصل ہے کہ عرف ہر جگہ کا ہر قوم کا الگ ہوتا ہے، اگر ایک جگہ ایک دستور نہ ہو تو دوسری جگہ ممکن ہے کہ وہ ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن کا عرف ہو کہ اپنے نام سے کلام کا آغاز کیا جائے۔

پھر یہ کہ شروع میں بسا اوقات متکلم اپنا نام ذکر کرتا ہے تاکہ بعد کے کلام کا تعارف اور نسبت مخاطبوں پر واضح ہو جائے جیسے اکثر خطوط اپنے نام سے شروع کئے جاتے ہیں، تاکہ باؤل وبلہ مخاطب سمجھ لے کہ یہ فلاں کا مضمون ہے۔ اس الجھن میں نہ رہے کہ لکھنے والا یا کہنے والا کون ہے؟

اس لئے آغاز کلام بہ تسمیہ الہی اس اصول پر قابل اعتراض نہ ہوا۔ مزید غور کیا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی عظیم یا مہم کام کا کسی بڑے نام یا بڑی نسبت یا بڑی صفت سے شروع کرنا عقلاً مستحسن ہی نہیں، بلکہ مطلوب سمجھا گیا ہے اور ایک فطری امر ہے چنانچہ اس پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ آپ اسے مستحسن اور معقول جانتے ہوں گے کہ بندے اپنے کلام کو خدا کے نام اور خدا کی ثناء و صفت سے شروع کریں جس سے اس امر کا فطری اور معقول ہونا واضح ہے۔

اور ظاہر ہے کہ فطرت اللہ کی ہے جس پر بندوں کو مقلد کر لیا گیا ہے۔ پس بندوں میں ہر فطرت خود اللہ ہی سے آتی ہے اس لئے اصل میں یہ ڈھنگ کہ آغاز کلام کسی بڑے نام یا بڑی نسبت و صفت سے ہو، اولاً خدا کے کلام کا ہونا چاہئے، بندے تو محض اس کی نقل اتاریں گے کیوں کہ نہ خود اصل ہیں نہ ان کا وجود ہی اصلی ہے۔ نہ ان کی ذات و صفات اور افعال

ہی اصل ہیں۔ اصل ہر چیز کی اللہ ہے۔ اسی کی ذات و صفات و افعال اصل ہیں۔ اس کے سوا ہر چیز مجاز اور اس کا ظل محض ہے۔ اس لئے آغاز کلام کا یہ ڈھنگ اگر مستحسن ہے اور بلاشبہ ہے تو اولاً یہ ڈھنگ کلام الہی ہی میں مستعمل ہونا چاہئے بندوں میں یہ ڈھنگ محض ظنی اور مجازی طور پر خدا سے آئے گا وہ ناقل محض ہوں گے نہ کہ اصل۔

پس ادھر تو یہ اصول معقول کہ کلام کا آغاز کسی بڑے نام یا بڑی صفت و توصیف سے ہونا چاہئے اور ادھر یہ مسلم کہ نہ خدا سے کوئی بڑا، نہ خدا کے نام سے کسی کا نام بڑا۔ نہ اس کے صفات و افعال سے کسی کے افعال و صفات بڑے اور نہ ہی اس کی توصیف و تعریف سے کوئی ثناء و صفت بڑی۔

اس لئے کلام الہی میں اس امر مستحسن کے استعمال کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہو سکتی کہ خدا اپنے کلام کو اپنی ہی صفات اور اپنے ہی نام اور اپنی ہی توصیف سے شروع فرمائے، بلکہ اگر آپ غور کریں تو بندے بھی اپنے کلام کو خدا کے نام اور ثناء و صفت سے اسی لئے شروع کرتے ہیں کہ اس کے نام سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اور کلام کا بڑے ہی کے نام سے شروع کیا جانا فطری اور عقلی ہے۔ اس صورت میں بندوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے کلام کو بھی اور اپنے کام کو بھی اسی کے نام سے شروع کریں۔ چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ ۔

”كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَمْ يَبْدَأْ بِاسْمِ اللَّهِ تَعَالَى فَهُوَ أَقْطَعُ“ ①..... ”جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے“۔

پس بڑے نام سے آغاز کلام عقلی بھی ہوا شرعی بھی ہوا اور عرفی بھی ہوا۔ اس لئے آغاز کلام خداوندی بنام خداوندی اسی فطرت کے ماتحت ہے کہ امر مہم کو بڑے نام اور بڑی ثناء سے شروع کیا جانا ہی فطرت ہے اور اس کے نام سے بڑا نہ کسی کا نام ہے اور نہ اس کی شان سے بڑھ کر کسی کی شان ہے۔ تو پھر آغاز کلام میں خواہ خود اس کا کلام ہو یا اس کے بندوں کا ہو اس کے نام کے سوا اور کس کا نام لیا جائے؟

فرق اتنا ہوگا کہ بندے اپنے کلام میں خدا کا نام لے کر برکت حاصل کریں گے اور خدا اپنے کلام میں اپنا نام لے کر برکت ظاہر فرمائے گا۔ وہاں حصول برکت کا سوال یوں نہیں، کہ وہ خود سرچشمہ خیر و برکت ہے اور یہاں اظہار برکت کا یوں سوال نہیں کہ بندے اپنی ذات میں کوئی خیر و برکت نہیں رکھتے جسے ظاہر کریں۔ اس لئے ہم بسم اللہ کہیں گے تو مقصد برکت و مدد کا حاصل کرنا ہوگا اور خدا بسم اللہ فرمائے گا تو مقصد برکت و مدد کا اظہار اور پھیلانا ہوگا۔ اس لئے تو ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم کو محض تعلیم پر محمول نہیں کرتے، بلکہ عملاً اس فطرت پر محمول کرتے ہیں کہ آغاز کلام کسی پر عظمت نام یا لفظ سے کیا جانا ہی عقل سلیم اور طبع مستقیم کی خواہش ہے اور یہی عین فطرت ہے۔

﴿فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ ②

چونکہ سوال میں اعتراض کی کوئی تقریر اور بنا ظاہر نہیں کی گئی اس لئے یہ اجمالی تحقیق عرض کر دی گئی، اعتراض کا کوئی موجب پہلو سامنے آتا تو اس پر کچھ اور عرض کیا جاتا۔

سوال چہارم..... ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ ① خدا کی مکانیت اور اس کے احتیاج الی الکان کو بتاتا ہے اور یہ جسم و حدوث کا خاصہ ہے، لوگ اس کو تشابہات میں سے کہتے ہیں۔ ﴿وَيَقُولُونَ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ مُرَادِهِ﴾ عقیدت مند دل تو اس کو مان لے گا مگر عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ متکلم ہی اس کے مطلب کو جانتا ہے کہ ایسی صورت میں مخاطب ہی اس کا بے کار ہوگا اور ترجمہ بھی اس کا صاف ہے، یہ ضروری مسائل ہیں جن کے حل و انشراح کی جناب کو تکلیف دیتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

تعیین مراد میں احوال متکلم کا دخل..... جواب: ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اس کی حیثیت عرفی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ پس کلام کا مقصد سمجھنے کے لئے محض متکلم کے الفاظ ہی سامنے نہیں رکھے جاتے، بلکہ اس کے احوال و اوصاف اور شؤن کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، فرعون نے بھی اَنَا الرَّبُّ کہا اور منصور رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اَنَا الْحَقُّ کہا۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔

لیکن ایک کو اس دعویٰ کے سبب آپ ملعون قرار دیتے ہیں اور ایک کو اس دعویٰ کی بناء پر مقبول بتاتے ہیں۔ یہ فرق دعویٰ و کلام کے فرق سے نہیں جب کہ وہ دونوں کا ایک ہے بلکہ احوال کے فرق سے ہے۔ فرعون کے مجموعی احوال کفر و جحود اور اللہ و رسول علیہ السلام (موسیٰ) کی تکذیب و تردید کے ہیں۔ اس لئے اس کا اَنَا الرَّبُّ کہنا بمقابلہ خدا اپنا استقلال و وجود ثابت کرنا ہے یعنی خدا کا کفار (انکار) اور اپنا اثبات (ثابت کرنا) ہے، گویا فرعون کے مترادف احوال سے تو اس کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں از خود ہوں کسی اور کا محتاج نہیں، میں اپنے اندر بھی خود ہوں اور اپنے سے باہر بھی میں ہی میں ہوں۔ نہ میرے اندر ہی کسی اور کا وجود ہے اور نہ میرے سے باہر ہی ہے اور منصور کے مطیعانہ احوال سے، جن کا حاصل خدا اور رسول کی تصدیق و محبت ہے، ان کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں فانی محض اور بے ثبات ہوں، باہر تو باہر خود اپنے اندر بھی میرا اپنا کچھ نہیں، وجود ہے تو اس کا ہے اور بقاء ہے تو اس کی ہے۔ گویا میں اندر بھی خود نہیں ہوں وہ ہے۔ تو فرعون کے انا سے اثبات باطل اور نفی حق نکلتی ہے اور منصور کے انا سے اثبات حق اور نفی باطل نکلتی ہے۔ مگر دونوں کے کلاموں کے معنی کا یہ عظیم فرق، الفاظ اور دعویٰ کے فرق سے نہیں بلکہ صرف احوال کے فرق سے ہے۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کے کلاموں کا مطلب لیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم و کافر کے افعال بالخصوص معاشی افعال یکساں اور بالکل ایک ہوتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، وہ بھی رہن سہن کے وہی سامان فراہم کرتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ مگر ایک کے تمام افعال مقبول اور موجب زیادت اجرا اور ایک کے تمام افعال مردود اور موجب زیادت و زور۔ فرق اگر ہے تو صرف احوال کا ہے۔

پس کسی کے افعال ہوں یا اقوال ان کا مطلب ان کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی لیا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی، جس کے عام احوال نیکی و تقویٰ کے ہوں، اگر اتفاقاً کوئی غلطی بھی کر گزرے تو اس کی بھی تاویل حسن کرتے ہیں اور ایک بد آدمی جس پر بدی اور فجور کا غلبہ ہو اتفاقاً کوئی نیک حرکت بھی کرے تو اسے بھی خود غرضی اور بدی پر محمول کرتے ہیں۔ بناوہی نکتی ہے کہ کسی کے کام اور کلام کا مطلب اس کے احوال و شؤون اور اوصاف کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ از خود ہے یعنی کسی کے بنائے سے وہ نہیں ہوا، بلکہ خود سے ہے، وجود صرف اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس لئے کہیں بھی کوئی ہو، وہ اسی کے دائرہ میں ہوگا۔ باہر نہیں ہوگا اور اس لئے لاحالہ اس کا وجود لامحدود بھی ہوگا۔ اگر محدود ہو، جس کی کوئی حد ہو تو حد سے باہر دوسروں کا وجود ہوگا۔ تو وجود صرف خدا کا نہ رہا اور معطی وجود صرف وہ نہ رہا، دوسرے بھی بن سکیں گے اور اس سے خالقوں کا تعدد نکلے گا۔

اس لئے اگر وجود اصلی صرف اس کا ہوگا تو اسے لامحدود بھی ماننا پڑے گا اور ہر شے کو اس کے وجود سے موجود اور اس کے احاطہ وجود میں تسلیم کرنا پڑے گا، پھر اس سے دوسروں کا وجود اس شان سے نہ ہوگا کہ اس کے وجود کے نکلے کر کر کے دوسروں کو بانٹے جائیں۔ ورنہ نکلے ہونے کے بعد اس میں حد بندیاں ہو جائیں گی اور وہ لامحدودیت باقی نہ رہے گی جو اس کی خودی کے لئے لازم تھی۔ بلکہ دوسرے جب اس سے وجود پائیں گے تو بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی سے جہان والے روشنی پاتے ہیں کہ خود سورج کی روشنی کے نکلے نہیں ہوتے اور ہر چیز اس سے روشنی حاصل کرتی ہے، یعنی اس کی روشنی کے صرف پرتوؤں ہی سے منور ہو جاتی ہے۔ خود اس کا نور اسی کی ذات میں قائم رہتا ہے۔

پس خدا از خود ہی ہے کسی کے بنائے نہیں بنا ہے۔ اس کا وجود اصلی ہے، کسی کا بخشا ہوا نہیں ہے اور وجود اصلی جب سب پر محیط ہے تو وہ ہر زمان و مکان میں ہے یعنی لامحدود ہے اس سے موجودات وجود پاتے ہیں۔ تو خود اس کے وجود کے نکلے نہیں ہوتے، جو اس کے جسم اور جسمانیت سے بری ہونے کی علامت ہے۔ کیوں کہ وجود خود لطیف ترین شے ہے، جو خود آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔

پس خدا کا از خود ہونا، محیط الکل ہونا اور جسم نہ ہونا اس کی اصلی شان اور صفت ہے۔ اگر ”اِسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ“ کا کلام سامنے آئے گا تو اسی سابقہ قاعدے سے، اس کلام کا مطلب اس کے الفاظ محض سے نہیں، بلکہ ساری شانوں کو سامنے رکھ کر ہی لیا جائے گا اور شان اس کی یہ ہے کہ نہ وہ محدود ہے نہ جسم (جسم والا) ہے نہ کسی کے احاطہ میں ہے نہ کسی کی گرفت میں ہے، بلکہ سب اس کے احاطہ میں اور اس کی گرفت میں ہیں۔ تو ”اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اِسْتَوٰی“ ① سے آخراں کی جسمانیت کیسے ثابت ہو جائے گی اور اس کا حدوث کیسے مفہوم؟ ہاں! جب ہوگا کہ اس پاک متکلم کے کلام کے صرف یہی الفاظ سامنے رکھ کر اور اس کی ساری ثابت شدہ شان

صفات سے قطع نظر کر کے ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ کے معنی لئے جاویں۔ لیکن اگر الفاظ کے ساتھ احوال بھی ملائے جاویں جو عرض کردہ قاعدہ کے مطابق ضروری ہیں تو ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ کا جسمانییت اور حدوث سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔

عرش رحمت خاصہ کا مظهر و فہ ہے..... بلکہ غور کیا جائے، تو عرش سے اگر ثابت ہوتی ہے تو اللہ کی صرف ایک ہی صفت یعنی صفت رحمت کا تعلق خاص ثابت ہوتا ہے نہ کہ ذات کا اور وہ بھی مظهر و فہ کا کیوں کہ ”اللَّهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ نہیں فرمایا گیا، بلکہ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى جس کا حاصل یہ ہے کہ عرش پر اللہ کی صفت رحمت پھیلی ہوئی ہے اور وہاں اس کی اسی خاص شان کا ظہور اور تجلی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عرش محل تدبیر ہے اور تخت شاہی ہے۔ جس سے سلطنت الہی کے کاروبار چلتے ہیں اور جہانوں کی تدبیر کی جاتی ہے۔

پس بتلانا یہ ہے کہ ساری سلطنت رحمانیہ ہے، رحم و کرم اور رافت و ترحم پر مبنی ہے۔ غضب پر یا کورے قانونی داؤ بیچ پر مبنی نہیں ہے اور بالفاظ دیگر کائنات کی ہر چیز ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے حسی طور پر نمایاں اس طرح فرمایا ہے کہ عرش کو تو ساری کائنات پر محیط بنا دیا، کہ اس سے باہر کوئی جہان میں نہیں اور عرش پر صفت رحمت کو محیط کر دیا، تو گویا رحمت سارے جہانوں پر محیط نکلی۔ جس سے واضح ہو گیا کہ ہماری سلطنت قہر و سیاست پر مبنی نہیں، بلکہ رحمت و کرم پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بندے رات دن اور ہمہ وقت کفر و معصیت بھی کرتے ہیں مگر رزق اور باران رحمت بند نہیں ہوتا۔ گو کسی خاص وقت جبکہ اقوام کا ظلم و ستم انتہاء کو پہنچ جائے، تو بطور تنبیہ سزا بھی دلائی جاتی ہے۔ سواں کا غضب بھی رحم و شفقت ہی ہوتا ہے۔

بہر حال کلمہ عرش پر استواء کے معنی جسمانی تمکن کے نہ ہوئے جو شُشُونِ الْهَيْمَةِ کا مقتضی ہے اور وہ استواء معنوی بھی ذات کا نہ ہوا، بلکہ صفت رحمت کا ہوا۔ تو اس سے خدا کی جسمانییت یا محدودیت یا حدوث کا کیا تعلق کہ یہ شبہات آیت پر وارد کئے جائیں۔

کیفیت استواء غیر معلوم ہے..... ہاں! اس شان رحمت کے عرش پر چھائے ہونے کی کیفیت لا معلوم ہے کہ اس کا کیا انداز ہے اور کیا نوعیت ہے اور کیفیت ہی کی لا علمی کی بناء پر ”اللَّهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهِ بِذَلِكَ“ کہا جاتا ہے، نہ یہ کہ ”اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ“ کا مفہوم نامعلوم ہے، ”اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ“ صفت رحمت کا ہے اور یہ استواء محیط الكل ہے۔ کیوں کہ جسمانییت میں عرش تمام اجسام پر محیط ہے، تو صفت رحمت محیط الكل ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس انداز سے جیسے ہماری روح ہمارے بدن کو محیط ہوتی ہے اور بدن کا کوئی ایک جز بھی روح کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کیفیت کا پتہ نہیں جس کیفیت سے روح بدن پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے اس ساری کائنات بدن کو گھیر رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم روح کے احاطہ کو نہیں جانتے یا اس کو یقینی نہیں سمجھتے ہیں۔ روح کے تعلق اور احاطہ کو یقینی جان کر اگر لاعلمی ظاہر کرتے تو اس کی کیفیت اور نوعیت

احاطہ سے، نہ کہ اصل تعلق کے علم سے۔

پس ہم یقیناً جانتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ شانِ رحمت عرش پر اور بواسطہ عرش ساری کائنات اجسام اور ارواح پر محیط ہے۔ مگر ہم اس احاطہ کی کیفیت اور نوعیت کو نہیں جانتے۔ اللہ اعلم کہہ کر بحوالہ خدا کر دیتے ہیں۔

پس جتنا ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے ہم سے اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور جتنا نہیں جانتے اتنا سپرد خدا کر دینے ہی کے مکلف بنادئے گئے ہیں۔ یہ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم اس نوعیت کی بھی کھود کرید کر کے اصلیت کا سراغ لگائیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پس خدا کی بھی یہ شانِ رحمت ہے کہ بقدر استطاعت تو ہمیں تکلیف دی اور بغیر استطاعت ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

”فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ“

پس منظر..... جناب محترم و مکرم زید! سلام مسنون، نیاز مقرون، مکرمت نامہ موصولہ ۴ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ باعث شرف ہوا۔ آپ کے سلسلہ تالیفات میں ”داستانِ عمل“ اور ”اخلاق و آداب“ جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافے سے بے حد مسرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نُوذِ عَلٰی نُورِ اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کر کے ان پر اضافہ و تشریح کا ایما فرمایا ہے۔ جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دامِ مجددہ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپ کا ہی ایما کیا کم تھا کہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ تو اسے ضعیف کندھوں پر لا دے پھر نے کی ناقابلِ برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تقیل کروں۔ پھر بھی جو تاخیر ہوئی وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنؤ کا سفر پیش آ گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوری دارالعلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ سر پر آ گیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو علی گڑھ کا سپردِ پیش ہو گیا۔

اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعدِ عشاء جو کچھ بن پڑا بطور تقیل ارشادِ دستور ذیل قلمبند کیوں اور بلا نظر ثانی ہی ارسال ہیں۔ مناسب ہو کہ جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دامِ مجددہ ان پر ایک اصلاحی نظر فرمائیں۔

یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے ان تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں۔ اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

علم کی غایتِ عمل ہے۔ اس کا جو ہر تقویٰ ہے۔ اس کا زیورِ ادب ہے شعراء کا ادب لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شتہ کلّامی اور بلاغتِ بیانی کے ہیں۔ حفظ اشعار، حفظ لغات اور حفظ اسماء و اصطلاحات اس ادب کو پونجی ہے۔ شاعری یا مرصعِ نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کی صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعیِ جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے۔ معنویت یا

واقعت براہ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگزاری اور خیال آفرینی کا نظر ہوتی ہے۔ اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعت جمع ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لفظی دنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض وغایت اکثر و بیشتر داد و خواہی اور زربلی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین و آفریں اور مدح سرائیوں پر مدوحوں کی داد و دہش اس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ایک پرلے درجے کا بے ادب اور علم سے بے بہرہ حتیٰ کہ فاسق و فاجر بھی اپنی طبعی ذہانت و ذکاوت اور موزوں طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس حال میں کہ اس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہ ہو۔ جہلاء عرب بلند پایہ شاعر، پرگو، برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پتلے تھے۔ اس وقت کی دنیا میں ان کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کے لئے عجم (گوٹکا) کا لقب تجویز کیا تھا۔ مگر بایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی، حتیٰ کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی ان کے زمانے کا نام تک زمانہ جاہلیت ہوا کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔

تاہا ادب و تقویٰ چہ رسد

اس ادب کے ہزار ہا ادیب امراء و سلاطین کے درباروں میں نظر آتے تھے جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے۔ زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت ان کی گزربس ہوتی تھی۔ آج کی دنیا میں جب کہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے، شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے، تو قومی اسٹیجوں اور عوامی نشر گاہوں سے اسی ادب کے بار بردار سینکڑوں ادیب، مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیوں کہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں، زیور علم کا تو سوال کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فریبی یا اپنی خواہش داد اور مخاطب کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے ﴿يَسُرُّكُمْ بِأَفْوَهِهِمْ وَتَأْتِيهِمْ فُلُوقُهُمْ وَاتَّخَذُوهُمْ فَيَقُونَ﴾ ① ”وہ تمہیں اپنے مونہوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں“۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب اور اس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے الگ اور دور رکھا اور فرمادیا کہ یہ شاعری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقت المحقق تک رہنمائی تھی۔ عارف و کامل شعراء جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ، سعدی رحمۃ اللہ علیہ، عطار رحمۃ اللہ علیہ اور سلف و خلف کے دوسرے شعرو کا بردلوں میں اگر با عظمت ہیں تو شاعری کی بدولت نہیں، بلکہ معرفت کی بدولت، یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمال باطن کے۔ اس لئے اس قسم کا اکابر سے مذکورہ بالا

نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

عوام کا ادب..... عوام الناس کے عرف میں ادب کے معنی احترام و تعظیم کے ہیں۔ مگر انہی کے مروجہ اقوال و افعال اور بندھی جڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ ان ہی رسوم تعظیم کے ساتھ جب کوئی ان سے پیش آتا ہے تو وہ اسے بادب اور مہذب کہتے ہیں۔ ورنہ بے ادب اور گستاخ کہہ کر دشمنین (غضب ناک) ہو جاتے ہیں۔

برادر یوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا منڈی گود میں ڈال دینا یا اصطلاحی الفاظ میں تعظیلات و تسلیمات اور اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا یا ہاتھ جوڑ کر سر و قد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا ان کے یہاں ادب اور ان الفاظ و ہیئت کومن و عن ادا کر دینے والا متادب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے کتنے ہی مناقشات اور مصیباتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو، جو اپنے وقت پر کافی جوش و خروش سے ابھرتے ہوں۔ اور محبت کی بجائے عداوت کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں، جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اسے متادب ہی کہا جائیگا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل دنیا سازی اور ظاہر داری ہے۔ جس کے نیچے حقیقت و معنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی روح خود غرضی نفس اور رضا جوئی غیر تو نہیں ہوتی، بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھر کم ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

مخاطب کی حقیقی عظمت و توقیر کا اکثر و بیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اسکی برائیوں سے بھر پور ہوتا ہے۔ اس رسی شائستگی اور ظاہر داری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ﴾ ① ”یہ لوگ دنیا کی زندگی کی صرف ظاہر داریوں کو جانتے ہیں اور انجام و عاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں۔“

تکلیس ادب..... مدعیان علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں۔ بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین دین و دنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال و ہیئت اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے بارے میں انہیں صراحۃً لفظوں میں کوئی حکم مل جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا

یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جا رہی ہو۔ لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیان علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کئے ہیں۔ مگر اس کی حقیقی کیفیات سے ان کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پروا رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہوا و ہوس کا غلبہ ہے۔

نیز جذبات نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی ان کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیات جھلکنی ناگزیر ہیں جو ان کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں۔ وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ و حسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں جذبات نفس اور جبلتی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شعری رسوم کی پابندی ان ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرح محض رسمی اور نمائشی ہو کر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے۔ فرق اتنا ہو گا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ عوام اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابل تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دنیا دار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ مدعیان علم بھی بلا خشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے، چنانچہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہل علم قلبی عقیدت و انقیاد جذبہ عشق و گرویدگی اور حقیقی نیاز مندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب و احترام اور رسمی آداب و تعظیلات سے گریز نہیں کرتے۔ مگر ان کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر و غرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں۔ جس سے کبھی تو ان کی زبان قال پر فعلی شنی اور اپنے علم و ادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں۔ گویا وہ خدا اور رسول پر اور ان کے نام لیواؤں پر احسان جتا رہے ہیں کہ وہ ان کا کتنا ادب کرتے ہیں اور کبھی وہ ان ہی مخاطبوں کے بارے میں جن کے ادب کے وہ زبان اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب و لہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔

پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور باطن بے ادبی، کیوں کہ بظاہر تو وہ اتباع رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگ بے ادبی شامل ہو جانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداء بن جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انہیں اتباع نہیں بتلایا تھا بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی۔ ویسے ہی ان کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگرچہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔

بہر حال اس رنگ تعلی و کبر اور عجب و ریا کے ڈھنگ کی رسوم شریعی کی پابندی حقیقی ادب و تعظیم نہیں۔ بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب و تقویٰ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ مگر وہ تقویٰ کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔ پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلمیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے جس سے ہزار ہا بے بصیر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہل علم کے لئے فرمایا ہے:

”فَسَادَ كَثِيرٌ عَالِمٌ مُتَهَنِّكٌ وَ أَكْثَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَسَبِّحٌ هُمَا فِتْنَةٌ لِّى الْعَالَمِينَ كَثِيرَةٌ لِّمَنْ بِهِمَا فِى دِينِهِ يَتَمَسَّكُ.“ ”دنیا میں وہ عالم فسادِ عظیم ہے جو پردہ دردی کرے اور بے ادب ہو اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادت کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا) یہ دونوں کے دونوں دنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اس شخص کے لئے جو دین میں ان سے رہبری حاصل کرے اور حجت پکڑے۔“ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ”اِخْذِرُوا مِنَ النَّاسِ صَنَفَيْنِ عَالِمٌ قَدْ فُتِنَهُ هَوَاهُ وَ صَاحِبٌ دُنْيَا قَدْ اَغْمَتَهُ دُنْيَاهُ.“ ”دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اس عالم سے جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہو اور ایک اس دنیا دار سے جسے دنیا نے اندھا کر دیا ہو۔“ ظاہر ہے کہ اس ادب کو اس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے کیوں کہ اس ادب میں صورت تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقویٰ باطن نادر رہتا ہے۔ کیوں کہ تقویٰ باطن کے ساتھ دعویٰ، شہنی، کبر نفس، غرور اور علم پر گھمنہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فنائیت، مجویت، کمال تو واضح، اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت و توقیر کے جذبات نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگ ادب سے خالی ہے اور ذوق ادب سے مبرا، یعنی صورت ادب ہے، ادب نہیں، حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوق ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

کمال ادب..... لیکن اگر ادب کی شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں موجود ہو اور یہ صورت ادب، بے روح ڈھانچہ نہ ہو، بلکہ با کیف رسم ہو تو یہ حقیقی ادب کہلائے گا اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متادب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر و احکام ہی کو پیش نظر رکھے گا۔ بلکہ اس کے منشاء اور اشارہ، خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی ذاتی عظمت و برگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس سے اس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گزر کر حقائق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئت بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا، بلکہ دل و دماغ اور نفس و روح سے بھی ادب و توقیر کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز اس مقام کے لحاظ سے اس پر ادب و عظمت کے وہ دقیق و دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیان علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آ سکتے۔ بلکہ اس صاحب معرفت پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو وہ باغ دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وہ اگر بدن کا ادب مانگے تو یہ روح سے بھی ادب کرے گا۔ وہ افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کر دے گا، یعنی ظاہر و باطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمال ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو ہم اہل تدین اور عالموں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔

پس عالموں اور دین داروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفاظی یا نقاشی یا لفظ و ہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز

مندى، باطنى اور فديویت روح و طبيعت کے ساتھ شرعى آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندى احکام کے ساتھ احکام کی آخرى اور قدرتی حدود کو جو ذوق سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں۔ ہمہ وقت زیر نظر رکھنا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اس میں ادعاء ہو، نہ گھمنڈ، نہ شیخی، نہ اتر اہٹ، نہ اپنی توقیر ہو، نہ دوسروں کی تحقیر، نہ روایت ہو، نہ حکایت، بلکہ محویت و گرویدگی ہو اور فنائے نفس کے ساتھ رضائے حق کے جذبات کام کر رہے ہوں۔

پس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حسن و جمال زیور سے آراستہ ہو کر ڈگنا ٹکنا ہو جاتا ہے اسی طرح علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب ان احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور انتہائی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرنا ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق و تکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت و اشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر نطوہ نصوص کے تعبیری حکم کو فتویٰ کہا جائے گا تو اس اقتضائی، دلالتی اور اشارتی حکم کو تقویٰ کہا جائے گا۔ پس صحیح معنی میں ایک متادب اسی وقت ادب داں بنتا ہے، جبکہ عملی طور پر اسکے سامنے ادب کے یہ تمام ظاہری و باطنی اور فتویٰ و تقویٰ احکام اور حدود موجود ہوں اور دل کی آمادگی اور امتگ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوق حدود بھی اس پر منکشف ہو جائیں۔

زیور علم..... یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فانی الادب ہو جائے۔ یہی وہ ادب ہے جس کو علم کا زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اس کا ادب اس میں شامل نہ ہو اور وہ احتیاطی اور تقویٰ حدود زیر عمل نہ ہوں جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال و جمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور جوہر ہے۔ اس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینہ پیکر ہے جس کی طرف رغبت و شوق کی نگاہیں نہیں اٹھ سکتیں۔ اس سے بہ سہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور ان کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا۔ پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے۔

ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود و نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارات میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان پر مسترأ عملدرآمد کی مشق سے جبکہ ذوق اور نیاز مندى اور فديویت کا ملکہ راسخ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ادب کی سی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارات سے گزر کر ان کی دلالت و اشارات میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ادب اسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ جن سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سر تا پا ادب بن جاتا ہے اور پھر اس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے

سامنے نہیں ہو یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں، بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی حدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیادیں استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیوں کہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات (احکام) کا ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک حصہ منہیات (نواہی) کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کے لئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہو جانے ہی سے اصل مامور و منہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام ”آداب شرعیہ“ ہے۔ اس لئے یہی آداب درحقیقت امر و نہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جب تک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا۔ اصل احکام پر آئینہ نہ آئے گی اور جوں ہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے۔ وہیں اصل مقاصد احکام کا قلعہ سمار ہو جائے گا۔

حدود و ادب..... البتہ یہ حدود آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارت ہی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدان صحیح سے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ذوقی بمعنی اختراعی نہیں بلکہ بواسطہ ذوق ہو۔ ان ہی نصوص کتاب و سنت کی دلالت و اشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے، جو ایک طرف تو فطرۃ سلامتی و صحت لئے ہوئے ہو اور دوسری طرف شرعی اتباع، پیروی و سنت اور محبت نبوی اور عشق خداوندی نے اسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کر دیا ہو۔ جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔

پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہوئے ہیں مگر شریعت میں سے ان کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃ تشریفی ذوق سے مناسبت و قرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدرتا نادانوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور ان کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق افتیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعے اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب و دواعی زنا سے بھی رک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہ چاہے ممنوع نہ ہوں، مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آ کر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے ناعمر عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، اس کی خوشبو پر ناک رکھنا، اس کی طرف چل کر جانا، اس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترک زنا کے آداب کہلائیں گی اور اگر فعل زنا کبیر گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب و دواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے، ان میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے، ورنہ فی نفسہ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ

اس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہو جائے گا جو اس شخص کو ناعلم عورت کے تصور سے بھی بچالے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس ناعلم کے جمال کی طرف فکر و دھیان دوڑانا بھی جائز نہیں، بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن زنا سے پاک رہے۔

اور جبکہ باطن کا عمل فکر و تصور ہے تو باطن کا زنا دراصل اجنبیہ کا دھیان اور خیال زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحۃً اسے زنا کے تصور و دھیان سے روکنے کا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوالِ قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوق احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے جب کہ ظواہر اعمال کی مشق و تکرار سے اس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اسے گناہ ہی سے نہیں خیال گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل (خیال) سے بھی باز آ جائے عمل یا شریعت یا شریعت کی حدود سے بے متعلق نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسی سلسلہ عمل کا ایک باطنی کنارہ تصور کیا جائے گا۔

اور جب کہ اسی باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اشقی ہے تو اسے اس شرعی ممنوع کی اساس و بنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آداب شرعیہ کہیں باہر سے لاکر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے۔ بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقع پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ تحفظ دین کا طبعی نظام..... اسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اس سے بچنے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دیئے، جو شراب خوری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے۔ تاکہ ان کے سامنے نہ رہے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترک شراب) کو محفوظ اور محکم کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خوری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اس کے تخیل پر بھی لاجول پڑے گا۔ حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نظر نہیں آتا، لیکن جب وہ اصل ممنوع اور معصیت کبیرہ تک پہنچا دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اس لئے اس ذوقی حکم (ترک تخیل) کو بھی راہ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ انتظام شریعت کی لائنوں پر اسے احتیاطی حکم کہا جائے گا۔ جس کے لئے فتویٰ کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تقویٰ کا کلمہ استعمال کریں گے۔ سطح پرست نگاہوں میں تقویٰ کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیالی نظر آئیں نیز دور بین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظ دین کا ایک طبعی اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو محارم شریعت اتنا ہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں، تاکہ غیر محتاط چرواہے ان ڈول بندیوں سے تنگی باہری باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ پس عقلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے روکنے کا طریقہ

اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے یہ دقیق حدود عمل بھی جو بظاہر کتاب و سنت کے الفاظ میں صراحتہ نظر نہ آئیں معانی کتاب و سنت کا جز بن کر مامورات و منہیات کا ہی جز کہلائیں گی۔

ذوق ادب کا نتیجہ..... فقہاء و مجتہدین رحمہ اللہ علیہم نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نور اجتہاد سے کھول دیا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے۔ حالانکہ ان سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کر ان کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا و شراب کے جزئیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعل مباشرت اس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تحیل سے زنا کر لیا۔

پس اگر نصوص کتاب و سنت میں لفظوں میں اس خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ممانعت زنا کی ان ہی کھلی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیر کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوق ادب اور ذوق تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کر دیا ہے۔ گویا یہ اسی ممانعت زنا کا ایک انتہائی مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے۔ جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مصرنگاہوں نے اسے پالیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگیں شربت پیتے ہوئے (جو بلاشبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی کیوں کہ اس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی اور اگر اس پر قضاء ظاہر شریعت کی رو سے شراب خوری کا حکم نہیں لگایا جائے گا تو دیانتاً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے اس کے باطن کو ضرور شراب خور کہا جائے گا۔

مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات..... ہاں پھر جیسے افعال زنا و شراب پر حد شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی، ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا، قضاء نہ سہی تو دیا نہ ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دی جائیں تو انفسی (ذاتی) ہی سہی یعنی فعل زنا و شراب پر اگر سنگساری اور ذہنی کی حد جاری ہوتی، تو اس ذہنی زنا کا رکی اور شراب خوری پر انفسی بیماریاں، آفات غم و الم و تشویش و پراگندگی، فتنے اور پریشانیاں باطن پر بھوم کر آئیں گی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت و کدورت کے بادل امنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے۔

”نیست بیماری چو بیماری دل“

پس یہ تشریحی رنگ کی سزائیں نہ ہوں گی تو تکنیکی رنگ کی ہوں گی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو

باطنی وسائل سے دی جائیں گی کیوں کہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکرو خیال) سے عمل میں آئے تھے۔ وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے، من اللہ ہی ہیں۔ بہر حال ظاہر و باطن میں سے جس سے بھی شراب خوری و زنا کاری کا صدور ہوگا اور ان میں سے کسی پر بھی آدمی مواخذہ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔ ﴿وَإِنْ تُبْذُوا مَافِي أَنْفُسِكُمْ أَوْتُخَفُّوهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ① اور جو باتیں انفس میں ہیں ان کو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کرو گے یا دل میں پوشیدہ رکھو گے، حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے، پھر بجز کفر و شرک کے جس کے لئے بخشا ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔“ حاصل یہ نکلا کہ: قانون الہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور جسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب و ارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس ظاہری شریعت کی رو سے تو شراب و زنا کبیرہ گناہ تھے اور ان کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود و تعزیرات جاری ہوتی تھیں۔ لیکن حاکم حقیقی حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت و جلال اور ظاہر و باطن میں اس کے حاضر و ناظر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا و شراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبر الکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہوگی۔

وسائل عبادت پر اجر و ثواب آداب کے سلسلہ میں دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں، یہی صورت ماموریت کی بھی ہے کہ ان میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے، مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے۔ لیکن اس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دوائی میں جماعت ہے جو موجب پابندی نماز اور باعث ترقی اجر و قرب ہے تو وہ سنت موکدہ قرار دی گئی، پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی ٹوہ اور اجابت مؤذن (یعنی کلمات اذان سننا اور مؤذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے انہیں دہرنا مستحب قرار دیا گیا) جس سے شرکت جماعت کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارت اور ضروریات سے فراغت ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت مؤذن اور حاضری مسجد کی توفیق ہو تو اس کی بھی ترغیب و تائید کی گئی۔

غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت و وسیلہ ہے اجابت مؤذن کا اور اجابت مؤذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اتمام جماعت کا اور یہ اتمام جماعت وسیلہ ہے پابندی صلوٰۃ کا جو اصل مقصود ہے، اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔

طہارت کو نصف ایمان اور مزمل معاصی قرار دیا گیا اور اجابت مؤذن کے اختتام پر قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا، حاضری مسجد کے اقدام پر قدم قدم پر ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹا دیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا۔

حاضری مسجد اور انتظارِ صلوٰۃ کو حکم میں صلوٰۃ کے رکھا گیا، شرکتِ جماعت پر ستائیس درجہ اجر و ثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا اور اصل نماز کو نور اور دستاویزِ ایمان کہہ کر اسے فحش و منکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام امور چونکہ اس کی تحصیل و تکمیل کے وسائل اور حدود ہیں، اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو نماز قائم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی اور آدمی کو اس کی پابندی نصیب نہ ہوگی۔

تارکِ آداب تارکِ شریعت ہے..... پس ادب کا حاصل یہ نکلا کہ وہ سلسلہ مامورات میں تو محافظِ فرائض ہے اور سلسلہ منہیات میں مدافعِ محرمات ہے، فرائض کے آداب امتثالی حدود کہلائیں گے اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔

محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجالانے سے فرائض میں جماؤ میسر آئے گا، فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی۔ اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تجلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے اور محرمات کے آداب تجلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جلی عیوب و نقائص زائل ہوتے ہیں۔

اور اس طرح آداب کی ترکیاتی نوع تو نفس کو جامعیتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اس پر قلعی کر کے اسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات۔ گویا تارکِ آداب درحقیقت تارکِ فرائض و محرمات اور بالفاظِ دیگر تارکِ شریعت ہے، اس لئے کتاب و سنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہر باب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے۔ جن میں بعض آداب قرآن و حدیث کی عبارت میں صراحتاً موجود ہیں اور بعض ان کی دلالت و اشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہاء ملت اور حکمائے امت کی مدد کے ہر کس و ناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اسی لئے بطور مثال ہم نے تجلیاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب کی توجہ رہے اور یہ بغیر فقہائے امت کا دامن سنبھالے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔

فقہاء کا مقام معرفت..... الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جوایا سرے سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کی الفاظ کی آڑ لے کر کم از کم اپنے باطن کو اس کی باطنی قید و بند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو مشرک فی النبوة وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے ان کی علمی کاوشوں اور توفیقی ریاضتوں کی بے قدری کریں۔ لیکن حقیقت شناس بصر جو ان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ

کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان فقہانے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے۔ بلکہ احکام کے ظاہری و باطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کر دینے پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری و باطنی مراتب احکام اور ان کی ان آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ جو بظاہر نظر شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر ان کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف باء کے بتیس حروف میں ہزار ہا کلمات و عبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف باء سے گزر جانے والا مصرع ہی ان حروف کی ترکیب و تحلیل سے مختلف معانی نمایاں کر دیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ایسے ہی یہ معانی شریعہ کے مبصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے ان میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔

پس یہ فقہاء امت کسی ناقص طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آ جانے پر محض دوا بتلا دینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض پہچان کر نسخہ نویسی کر دینے تک محدود نہیں رہ جاتے۔ بلکہ امت کے امراض کے ساتھ ان کے اسباب و علل اور پھر آثار و نتائج سے باخبر رہ کر ہر شرعی دوا کی خاصیت اور اس کے درجہ تاثیر کو بھی جانتے ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزء کی تشخیص اور دوا و مرض کے اجزاء میں تطبیق دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ جس سے ان کا مطلب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا اور آج تک دنیا اپنے مختلف امراض کا علاج ان ہی کے اصول و قواعد پر کرتی آرہی ہے تاکہ دوست دشمن کوئی بھی ان کی ان قابل قدر مساعی سے مستغنی بن کر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بنانا نہیں کہ تجویز احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی ان کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ راہنمائی فی العلم مجوز احکام نہیں بلکہ مظہر احکام ہیں۔ اختراع احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے ان کا اتباع ان کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے، اس لئے آداب شریعہ کے سلسلے میں کتاب و سنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع قیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرے بھی پیش نظر رکھے جائیں گے، ورنہ ظواہر نصوص کو لے کر باطن نصوص کو ترک کر دیا جاتا اور فقہاء کی مساعی سے فائدہ نہ اٹھانا نہ صرف حرمان (مردمی) ہی ہے بلکہ خسران (نقصان) بھی ہے۔

ذوقی آداب..... پھر ان چاروں شرعی جہتوں کے آداب سے متادب بن کر اور گویا۔ ذوق ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں، جو دوسروں کے لئے خواہ حجت نہ ہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قائل سے نہیں بلکہ خود اس

کے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جھکتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی سر ادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اس کے آگے بھی ادب سے گردن جھکا دیتا ہے۔ اگر کوئی مکان اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے۔ جیسے بیت اللہ و بیت الرسول یا آثار و مشاہد اہل اللہ۔

اگر کوئی شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لگ جائے تو وہ ان کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا اور رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث و دینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے بطوع و رغبت جھک جاتا ہے، گو ظواہر شریعت میں ان آداب کے الفاظ دستیاب نہ ہوں۔

ہجرت کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت خانہ کے نچلے حصہ میں فروکش ہوئے، بالائی منزل پر وہ اور ان کے اہل و عیال فروکش تھے۔ تمام رات حضرت ابو ایوب مکان کے ایک ایسے کونے میں سکر کر بیٹھے رہتے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سیدھ میں بیچہ نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ انہیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوق ادب نے اس طرز عمل پر انہیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔^① تو یہ ذوق ادب ہی مانع تعیل ہوا۔ جو ہزار تعیلوں سے بڑھ کر تعیل و طاعت تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زیارت مدینہ کے موقع پر گیارہ دن مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے، مگر بول و براز نہ کیا محض اس جذبہ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مرقد صحابہ رضی اللہ عنہ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو امام دارالہجرت ہیں ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے عرصہ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جو تہ پہن کر کبھی نہیں گھومے، کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اس مقام پاک پر پڑھ جائیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض جوش ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوش زن تھا ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے مکہ

① الصصحیح للبخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان بن فلان، ج: ۹، ص: ۲۰۲۔

معظمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا کہ یہی رنگ غلاف کعبہ کا ہے، میں اسے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا، مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو روڑ کی سے پانچ میل پایادہ ننگے پیر سفر فرماتے۔ ظاہر ہے کہ شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں، مگر متبعین ادا امر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے جو ان کی ذات کی حد تک انہیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔ اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ..... حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو روضہ اقدس کی گیلری کا جھڑاؤن (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس و خاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اس کی سلائی آنکھوں میں پھرتے رہے، ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں ذوقی جذبات ادب تھے۔ آداب شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے، اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ تقلید و اتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بن جانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں کیوں کہ یہ ان اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اس لئے واجب الاحترام اور لائق صداق ہی نہیں بلکہ درجہ حال میں قابل اتباع و پیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اٹھے تھے اور جن آداب کی دعوت شریعت اسلام نے پیش کی خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا ان کی دلالت و اشارات میں مخفی ہوں یا اہل اللہ کے پاک ذوق و وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ ان کی اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری، تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ و بیان کے مقررہ کلمات ادا کر دیتا یا سر جھکا دیتا ہوں۔ بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزائے ترکیبی فکر و نظر کے ساتھ نصوص کے بعید محتملات کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عمل درآمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال و تصور و ریاضت نفس مجاہدہ عمل، تادیب جوارح، تزکیہ باطن و تصفیہ قلب اور لہجہ اللہ ترک شہوات و لذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا، صلحانے لیا، صدیقین نے اسے اپنایا اور اسی کے ذریعہ سے اپنے دین و دیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

سرچشمہ ادب..... اس مقام ادب پر پہنچ کر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے، نہ تزئین الفاظ و فقرات، نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے ہیں، نہ سلاست بیانی کے، نہ مروجہ رسوم ہیئت و بدن باقی رہتی ہیں، نہ بناوٹی تعظیم و توقیر بلکہ سادگی و بے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت و ادب اور حقیقی اظہارِ رضا ر باقی رہ جاتا ہے جس میں زینت کی بجائے خلوص آرائش کی بجائے فنایت و محویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر بھرپور کلام و بیان کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت و رطہ حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گنگ بنا دیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عشق کے لئے زبان کی

ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہار ہے اور وہاں اعلانِ ادب کی ضرورت نہیں، کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب اور سرچشمہ ادب ہے۔۔

عشق را خود صد زبان دیگر است

پاری گو گر چہ تازی خوشتر است

ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

بوئے او دلبر چو پراں می شود

رسمی علم و ادب کو حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تجل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے علاماتِ قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجل اور زینت حاصل کرنے لگیں۔ اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم و ادب بھی محض رونقِ محفل کا آلہ بن کر رہ جائے، نہ رونقِ باطن بنے اور نہ باطنِ نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔

پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسومِ شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قائم رکھا جاتا ہے، رسومِ شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں۔ مگر حقائقِ شرعیہ کلیہً گم ہو جاتی ہیں، اسلئے الفاظ و رسومِ ادب کا یہ بے روح نقشہ، ایک مردار لاشہ کی طرح ہو جاتا ہے جس کا کوئی نفع نہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دل کا ادب ہے، اور نہ ان کے شایانِ شان ہے اور نہ اسے جو ہر عمل کہا جاسکتا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جاسکے جو ہر عمل اور روحِ تقویٰ وہی ادب ہے جو ان رسمیات سے بالارہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی روح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ، عامیانہ، رسمیانہ، متکبرانہ اور منافقانہ رسومِ آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آداب و اخلاق اور منکسرانہ حدود و رسوم پر لگا دے تاکہ انسان میں فناءِ نفس اور رضاءِ حق کے جذبات ابھر جائیں اور نفسِ انسانی صحیح معنوں میں شائستہ اور ربانی بن جائے۔ جس سے اسے مطلوبہ سعادت حاصل ہو جائے اور شقاوت سے بچ کر حقیقی نجات سے ہمکنار ہو جائے۔

نماز پورے اسلام کی میزان

نماز میں عبادت کا پہلو..... شرعاً عبادت کے معنی غایت تدلل یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ نماز میں دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک بیئات جو اعضاء بدن اور جو راح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء سے فاتحہ سورت تک پھر تسبیحات سے لے کر التحیات تشہد تک اپنی عبودیت، غلامی، اور فداویت یا اللہ کی عظمت اور برتری اور لامحدود بزرگی کے سوا کسی اور چیز کا بیان نہیں ہوتا۔ اور بیئات کے لحاظ سے نیاز مندانه سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملائیت اعتراف ہے جو عبادت کا اصل مقصود یعنی خدا کے آگے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی ہے۔

نماز تمام کائنات کو جامع ہے..... ارشاد ربانی ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ عَالِمٌ صَلَوٰتُہٗ وَتَسْبِيحُہٗ﴾ ① یعنی ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض تصانیف میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی بیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے۔ تاکہ اس کی نماز، اس کی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے، مثلاً درختوں کی نماز قیام ہے، ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ چوپایوں کی نماز رکوع ہے، وہ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں، جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ پھر حشرات الارض یعنی ریٹکنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑوں مکوڑوں مثلاً سانپ، بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑے کی نماز بصورت سجدہ ہے، ان کی خلقی بیئت سجدہ نما بنائی گئی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں۔ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے سر بسجود اور سرنگوں رہتے ہیں، پہاڑوں کی نماز تشہد ہے۔

گویا ہر وقت زمین پر دوڑا نوچے بیٹھے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں۔ پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے ہیں۔ جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے، پرندوں کے انتقالات ہی عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر سیاروں اور آسمانوں کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر آ جاتے ہیں۔ جیسے ایک نمازی رکعت پڑھ کر پھر عود کرتا ہے۔ پھر

زمین کی نماز تکوینی جود اور سکون ہے۔ گویا ساکت اور صامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہے جو انتہائی تذلل اور خشوع ہے۔ پھر جنت و نار کی نماز سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں ہمارے مکان کو پر کر دے پھر ملائکہ کی نماز اصطفا یعنی صف بندی ہے کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یاد الہی میں مصروف رہتے ہیں۔

پھر یہی سب ہیئتیں جو ان جمادات و نباتات و حیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں۔ بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں، مثلاً کسی قوم کی نماز محض قیام، کسی قوم کی نماز نیم قیام کہ گھنٹوں کے بل ڈنڈوٹ کھیلنا، کسی قوم کی نماز محض رکوع، کسی قوم کی نماز اوندھالیت جانا، (یعنی سجدہ) اور کسی قوم کی نماز مجموعہ صلوٰۃ اقوام ہے۔ بیہات میں درختوں کا سا قیام، چوپایوں کا سارکوع، فرشتوں کی سی صف بندی، آسمانوں اور سیاروں کی سی گردش اور پہاڑوں کا سا قعود ہے، اذکار میں ہر مخلوق کی تسبیح اور ذکر ان کی خلقت اور استعداد کے مطابق جدا جدا ہے، جس کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ ① یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح ہر قوم کو اس کے مناسب ہی اذکار تلقین کئے گئے کسی قوم کو تعویذ کا حکم تھا، کسی پر سوال و دعا کا غلبہ۔ چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل کر دیا گیا۔ اس لئے مسلم کی نماز تمام اقوام کی جامع کر دی گئی، جو فطرت الہی نے اقوام عالم میں مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔

اوقات کی جامعیت..... اوقات نماز بھی جامع ہیں یعنی جو وقت فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے۔ ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لیا، ظہر کا وقت سہل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلاب آفتاب کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے خاتمہ بالغیر کر دیا، پھر نفل نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیت کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار و اطاعت کی بجائے صرف ان مقررہ واجب و نفل اوقات میں نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ نماز میں روزہ، اعتکاف، حج اور زکوٰۃ کی حقیقت موجود ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے، صبح صادق سے کھانے پینے اور عورتوں سے متفرق ہونے سے بچنا، یہ چیزیں نماز میں بھی منور ہیں۔ بلکہ نماز میں ان کے علاوہ سلام، کلام، عورتوں کو چھو دینا، ہنسنا، بولنا، چلنا، پھرنا اور عام، نفل و حرکت سب ہی منور ہے۔ اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف صوم میں ضروریات بسر پر پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے اور کھانے پینے کی اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور مفید صلوٰۃ ہیں۔ بلکہ مسجد میں ٹہلنے اور نفل و حرکت کی بھی اجازت نہیں اس لئے نماز کا اعتکاف زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نگلی۔ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔

نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط وصحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہو سکتی پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں، بعینہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے تعظیم ارفع یدین کر کے نماز شروع کرتے ہیں، پھر جس طرح طواف اذکار و ادعیہ سے بھر پور ہے، نماز میں ہم قسم اذکار (تلاوت، درود شریف، تسبیحات وغیرہ) موجود ہیں۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تاحید عرفات یا ذیقہ میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں رہ کر ذرا الہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں پھر جس طرح حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے، بعینہ نماز کے ذریعے شیطان کے شر کو معنوی ہتھیار کے ذریعے دفع کیا جاتا ہے، پھر جس طرح حج میں طواف وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے۔ بعینہ نماز میں سلام و دعاء کر کے دربار الہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بعینہ یا بمثلہ موجود ہے، زکوٰۃ کی حقیقت تزکیہ نفس ہے، یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا، نماز میں بھی تزکیہ نفس اور تزکیہ روح ہے کہ نفس ماسوی اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل ذکرہ کا ہو رہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت اس طرح نماز میں موجود ہے اور زکوٰۃ کی صورت یوں ہے کہ نماز کے لئے مسجد، چٹائی اور حوض پر فی سبیل اللہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے، جس طرح زکوٰۃ میں بھی فی سبیل اللہ مصارف لازم ہیں۔

نماز سے انانیت نفس کا ازالہ..... نماز سے انانیت اور کبر نفس کا ازالہ ہوتا ہے جو ہزار ہا بدخلقیوں اور بد اعمالیوں کی اساس ہے کیوں کہ کبر نفس جب تک باقی رہ سکتا ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو، اور نماز سے حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجاتی ہے اور جب کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر و غرور پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

نماز میں فن تصوف کا موضوع..... فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے یعنی نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوں، اور نماز میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں، نفس اور رب، نماز جب نفس کی تحقیر و تذلیل کرتی ہے تو وہ مر جاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی عظمت مطلقہ نماز سامنے کر دیتی ہے۔ تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں، اور وہ اپنے فضائل سے نوازتا ہے، اس سے واضح ہو گیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لئے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

روحانی اور اخلاقی مقامات..... نماز چونکہ تزکیہ نفس کر دیتی ہے، اس کے بعد نفسانی احوال و مقامات پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ ہو جاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے، لیکن بلا واسطہ بھی نماز میں تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہو جاتے ہیں، آدمی بلند پایہ ہو جاتا ہے۔ شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے، صبر کو لو تو آدمی نماز میں ہر ایک لذت سے صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزے سے زیادہ مکمل ہے، اخلاص کو لو تو نماز کی روح ہی ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ ① ہے جس کی حقیقت ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے۔

تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس سامنے ہے وہاں تواضع کی کیا حقیقت ہے، ”رَضًا بِالْقَضَاءِ“ کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا اور اس سے صبر کر لیتا ہے۔ شجاعت کو لو تو اس میں سخت ترین مقابلہ اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نزاع کا خاتمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اِضْطَفٰی

اجماعی مسلک..... اما بعد! برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ مشہور و معروف اور جمہور علماء کا اجماعی مسئلہ ہے۔ علماء دیوبند حسب عقیدہ اہل سنت والجماعت برزخ میں انبیاء کرام کی حیات کے اس تفصیل سے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی اپنی پاک قبروں میں حیات جسمانی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اور ان کے اجسام کے ساتھ ان کی ارواح مبارکہ کا ویسا ہی تعلق قائم ہے جیسا کہ دنیوی زندگی میں قائم تھا۔ وہ عبادت میں مشغول ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ قبور مبارکہ پر حاضر ہونے والوں کا صلوة و سلام بھی سنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

علماء دیوبند نے یہ عقیدہ کتاب و سنت سے پایا ہے اور اس بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بھی متواتر ہی رہا ہے۔ حتیٰ کہ بریلوی حلقوں سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ برزخ میں حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے منکر ہیں اور اس افتراء سے علماء حرمین شریفین کو ان کی طرف سے بدظن بنا کر اور دھوکہ دے کر ان کے خلاف فتویٰ بھی حاصل کر لیا گیا، لیکن جب علماء حرمین پر اس دھوکہ دہی کی حقیقت کھلی اور انہوں نے اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں از خود ایک مفصل استفتاء مرتب کر کے علماء دیوبند سے جواب مانگا جس میں حیات انبیاء کا سوال بھی شامل تھا۔

تو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مفصل جوابی فتویٰ بنام ”اَلْمُفْتٰی عَلٰی اَلْمُفْتٰی“ مرتب فرما کر علماء حرمین کے پاس ارسال فرمایا۔ جس میں مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بھی علماء دیوبند کا نقطہ نظر غیر مشتبہ اور واضح الفاظ میں تحریر فرمایا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور برزخ میں ان کی یہ حیات، حیات دنیوی ہے۔ نیز اسی ذیل میں اس نقطہ نظر کو مزید واضح اور مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے رسالہ ”آب حیات“ کا بھی حوالہ دیا جو اس موضوع پر ایک مستقل اور پُر از حقائق و معارف کتاب ہے جس کا مقصد اس مسئلہ کی ایک مستحکم تائید کے علاوہ یہ بھی تھا کہ علماء دیوبند کا یہ عقیدہ (حیات انبیاء) انہیں ان کے اسلاف سے بطور توارث کے ملا ہے۔ کوئی انفرادی رائے یا وقتی اور

ہنگامی فتویٰ نہیں ہے جو حوادث کے پیش آنے سے اتفاقاً سامنے آ گیا ہو۔

مفاہمت کی بنیاد..... پھر اس مسئلہ اور اس کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ کے حوالہ کی تائید میں اس وقت کے تمام اکابر علماء دیوبند کے توثیقی دستخط بھی اس میں ثبت کرائے۔ جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ مسئلہ حیات انبیاء کے بارے میں یہ مذکورہ عقیدہ صرف ان کے سلف ہی کا نہیں بلکہ خلف بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سلف قائل تھے اور اسی طرح یہ مسئلہ (اثبات حیات انبیاء) بطرز مذکور سلف سے لے کر خلف تک یکسانی کے ساتھ مسلمہ اور متفق علیہ رہا ہے اور تمام علماء دیوبند کا یہ اجماعی مسلک ہے جس سے کوئی فرد منحرف نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض علماء دیوبند یا متقدمین میں سے بعض حضرات کی عبارتیں اس بارے میں کچھ مبہم یا مبہوم ہوں۔ سو اگر اس سلسلہ میں ان کی کچھ صاف اور واضح عبارتیں بھی پائی جاتی ہوں تو ان کے مبہمات یا مجملات کو واضح عبارتوں کے تابع کر کے مبہمات کی تفسیر کی جاسکتی ہے، لیکن اگر صرف مجملات ہی ہوں جن سے مسئلہ کے دونوں پہلو نکل سکتے ہوں یا واضح ہوں مگر مخالف پہلو صاف اور نمایاں ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، تو پھر اپنے مفہوم کو سامنے رکھ کر مخالف پہلو اختیار کرنے والوں پر ایسی نکیر کی گنجائش نہ ہوگی۔ جو مخالف پہلو کے ناممکن ہونے کی صورت میں کی جاسکتی تھی۔ کیوں کہ اس صورت میں یہ تفصیلاتی یا کیفیاتی اختلاف ایک علمی اور نظری اختلاف ہوگا جسے مسلکی اختلافات سے تعبیر نہیں کیا جاسکے گا۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں ایسے اختلاف کی گنجائش ہے جو علماء میں ہر وقت ہو سکتا ہے۔

البتہ عوام سے ایسے اختلافات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ صرف نفس مسئلہ اور اس کی قدر مشترک کے مکلف ٹھہرائے جاتے ہیں جو مسلک کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لئے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں زیر نظر مصالحت اور مفاہمت باہمی کی بنیاد تفصیل مسئلہ کے اختلافی پہلوؤں سے الگ رہ کر نفس مسئلہ کی قدر مشترک پر رکھی گئی جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوگی جیسا کہ آئندہ مفاہمت کی عبارت کے متن سے واضح ہوگا۔

اجتماعی نقصان..... بخت و اتفاق سے وقت کے بعض فضلاء دیوبند نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں کچھ اس قسم کا اختلاف فرمایا جس کا مبنی متقدمین کی ایسی ہی عبارتیں یا نصوص کے بدلولات کی اسی قسم کی تعبیرات ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش کلیۃً مسلوب نہیں سمجھی جاسکتی، جس کا ظہور تین چار سال سے ہوا۔ یہ اختلاف رائے مضر، لیکن سوئے اتفاق سے یہ اختلاف اسٹیج پر آ گیا اور اس میں رد و قدح کی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور آخر کار اس مسئلہ کی بحث علماء سے گذر کر عوام میں ان کے رنگ سے پھیل گئی جس سے قدرۃً اس اختلاف نے نزاع و جدال کی باہمی صورت اختیار کر لی۔ گروپ بندی شروع ہوگئی اور یہ بحث آخر کار ایک جماعتی فتنہ کی صورت میں آگئی جس سے مسئلہ تو ایک طرف رہ گیا اور فساد آگے آ گیا، اور خود جماعت دیوبند میں تفریق و تفرق اور تخریب کے آثار نمایاں ہونے لگے، جانہین سے رسالے لکھے گئے، اخباری

بجائیں چھڑ گئیں، جس سے جماعت کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ گیا۔

مساعی طیبہ..... یہ صورت حال دیکھ کر اور اخبارات و رسائل سے ان مناقشات کی خبریں معلوم کر کے دل زخمی ہوتا رہا، اور جوں جوں یہ فتنہ بڑھتا گیا وہیں دلوں کا غم بھی ترقی کرتا گیا۔ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح فتنہ نزاع و جدال کی یہ صورت ختم ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ کو احقر کو پاکستان حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور اسی ماہ میں بزمانہ قیام لاہور، جناب محترم مولانا غلام اللہ خان صاحب اور محترم مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری احقر سے ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے، دوران ملاقات احقر نے اس نزاع و جدال کا شکوہ کرتے ہوئے اس صورت حال کے مضراثرات کی طرف توجہ دلائی، اور عرض کیا کہ یہ صورت بہرِ نفع ختم ہونی چاہئے جبکہ یہ مسئلہ کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اسٹیج پر لایا جائے، اور اس کی وجہ سے تفریق و تفرق و تخریب کے ان مضراثرات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مسئلہ یا تو اسٹیج پر آئے ہی نہیں یا اگر اتفاقاً آجائے تو اس کا عنوان نزاعی نہ رہے۔

اس پر ان دونوں بزرگوں نے نہایت مخلصانہ اور دراندازانہ لہجہ میں کہا کہ ہم خود بھی اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور دلی تمکلی محسوس کرتے ہیں، کاش آپ (احقر) ہی درمیان میں پڑ کر اس نزاع کو ختم کرادیں۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے سوا یہ قصہ کسی دوسرے کے بس کا ہے بھی نہیں۔ اس بارہ میں آپ کی اب تک کی تحریرات نہایت معقول انداز سے سامنے آئی ہیں جن کو دونوں فریقوں نے احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے، اب بھی اس بارے میں آپ کی مساعی احترام و قبول کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

احقر کو ان مخلصانہ جملوں سے نزاع کے ختم ہونے کی کافی توقع پیدا ہو گئی اور ارادہ کر لیا گیا کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر کوئی مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے۔ چنانچہ جواب میں یہی عرض کیا گیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب دامِ مجددہ، شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان سے مل کر اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کر دوں گا۔

کراچی پہنچ کر احقر نے اس سلسلے میں مولانا غلام اللہ خان صاحب سے مراسلت شروع کی تاکہ معاملہ کے ابتدائی مبادی طے ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں مفاہمت کے معنی خلافِ دیانت رائے تبدیل کر دینے یا مسئلہ کو کم و بیش کر کے کسی اجتماعی نقطہ پر آ جانے کے تو ہوں ہی نہیں سکتے۔ اس لئے طریق مفاہمت اور فریقین کے لئے نقطہ اجتماع ذہن میں یہ آیا کہ اولاً یہ مسئلہ عوام میں لایا ہی نہ جائے اور اگر بیان مسئلہ کی نوبت آئے تو اس کا قدر مشترک پیش کر کے اس کی تفصیلات اور اختلافی خصوصیات پر زور نہ دیا جائے بلکہ عوام کو ان کی گہری خصوصیات میں پڑنے سے روکا جائے تو کم از کم عوام میں سے یہ نزاعی صورتیں ختم ہو جائیں گی، جو مضرت ثابت ہو رہی ہیں، پھر اگر علماء کی حد تک تفصیلات میں کچھ اختلاف باقی بھی رہ جائے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو تو گروپ بندی کے مضراثرات ختم ہو جائیں گے جو فتنہ کی اصل بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے احقر نے اپنی محدود معلومات کی حد تک اس مسئلہ کے قدر مشترک کا ایک عنوان تجویز کر کے مولانا ممدوح کو لکھا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں تاکہ دوسرے حضرات کی رائے بھی حاصل کی جاسکے۔

اس عریضہ کا جواب مجھے ملتان پہنچ کر مدرسہ خیر المدارس میں ملا۔ جس میں مولانا غلام اللہ خان صاحب نے احقر کے عنوان کو رد کئے بغیر خود بھی ایک عنوان لکھ کر بھیجا۔ اس موقع پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مولانا محمد علی صاحب جالندھری اور دوسرے معتمد علماء جمع تھے، جن کے سامنے احقر نے اپنا منصوبہ اور یہ دونوں عنوان علیحدہ علیحدہ رکھ کر گفتگو کی۔ طے یہ پایا کہ قیام ملتان کی قلیل مدت اس مسئلہ کے لئے کافی نہیں ہے اور بعض ضروری افراد بھی یہاں موجود نہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو جہلم کے قیام میں رکھی جائے اور وہاں ایک مستقل دن اس کام کے لئے فارغ رکھا جائے اور ساتھ ہی احقر نے ملتان ہی سے اپنی تقریروں میں اس منصوبے کے لئے فضا ہوا کرنی شروع کر دی۔

ملتان، جہلم، سرگودھا اور راولپنڈی میں خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں اصلاحی عنوانات اختیار کئے گئے۔ احقر نے اس سلسلے میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری سے جہلم تشریف لے چلنے کے لئے عرض کیا۔ جس کو ان حضرات نے بہ خوش دلی منظور فرمایا، مقررہ تاریخ پر یہ سب حضرات جہلم میں جمع ہو گئے اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قدر مشترک زیر غور آیا، طے یہ پایا کہ قدر مشترک کم از کم اتنی تفصیل ضرور لئے ہوئے ہونا چاہئے، جس سے مسئلہ کے تمام بنیادی گوشوں پر روشنی پڑ سکے اور عوام بطور عقیدہ کے اسے سمجھ سکیں۔

چنانچہ گفتگو کے بعد ایک جامع تعبیر احقر نے قلمبندی اور ارادہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ان حضرات ممدوحین کی موجودگی میں دوسری جانب کے ذمہ دار حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا قاضی نور محمد صاحب، مولانا قاضی شمس الدین اور مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو جمع کر کے اس منصوبہ اور مجوزہ عنوان پر گفتگو کی جائے۔

قدر مشترک چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ء یوم جمعہ دونوں جانب کے یہ سب بزرگ احقر کی قیام گاہ (مدرسہ حنفیہ عثمانیہ) میں جمع ہو گئے، اس مجلس میں احقر نے اس معاملہ کی اوّل سے آخر تک ساری روداد بیان کر کے مسئلہ کا وہ منہج قدر مشترک دونوں جانب کے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے رکھا۔ گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور ختم مجلس تک الحمد للہ یہی ماحول قائم رہا، نہ اس میں ہارجیت کے جذبات تھے نہ غلبہ و مغلوبیت کے تصورات تھے بلکہ مسئلہ کو سلجھانے اور نمٹانے کے جذبات نمایاں تھے اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں نے احقر کی پیش کردہ قدر مشترک کے عنوان کو قبول کر لیا۔ اور اس قدر مشترک تحریری یادداشت پر جو احقر نے اپنے دستخط سے پیش کی، فریقین نے دستخط فرمائے اس یادداشت کا متن بلفظ حسب ذیل ہے:

”عامہ مسلمین کو فتنہ نزاع و جدال سے بچانے کے لیے مناسب ہوگا کہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں۔ یہ (عنوان) مسئلہ کا قدر مشترک ہوگا،

خطبات مجسم الاسلام — مسئلہ حیات النبیؐ سے متعلق

ضرورت پڑنے پر اسی کو عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، تفصیلات پر زور نہ دیا جائے، عبارت حسب ذیل ہے:

وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام سننے میں ہے۔“

احقر: محمد طیب

دارد حال راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

(مولانا قاضی) نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ

لاشی (مولانا) غلام اللہ خان..... (مولانا) محمد علی جالندھری

اس مختصر عبارت کی کافی تفصیل چوں کہ قاضی شمس الدین صاحب (برادر مولانا قاضی نور محمد صاحب اپنے مکتوب میں لکھ کر مولانا محمد علی جالندھری صاحب کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس لئے یہ عبارت بالا ان کی مسلمہ ہے، بناء پر اس عبارت پر ان کے دستخط کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عبارت بالا کو ان کا مسلمہ سمجھا جائے۔

حق گوئی اور انصاف پسندی..... چوں کہ اس موقع پر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری بیچہ علالت راولپنڈی تشریف نہ لا سکے اس لئے احقر کے عرض کرنے پر ابوہریرہؓ پیش کرنے پر حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ صاحب نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر دستخط کر کے بندہ کو عنایت فرمائی جس کا متن بلقلم حسب ذیل ہے:

”ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں۔ اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس تحریر کی حد تک ان پر برأت کا اعلان کر دیں گے، نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریر نہ کرائیں گے اور اگر اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے۔“ نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ لاشی غلام اللہ خان (۲۲ جون ۱۹۶۲ء) اس تحریر پر ہر دو دستخط کنندہ بزرگوں کی حق پسندی اور حق گوئی ظاہر ہے۔ باوجود یہ کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ان بزرگوں کے قوی ترین تعلقات اور مخلصانہ روابط ہیں مگر اس بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں بے لوثی نمایاں ہے۔

سکوت مصلحت..... تاہم سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں۔ صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود و سلام کے حضور کے سچ مبارک تک پہنچنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل

نہیں۔ ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے اس لئے انہیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا بلکہ منوول سمجھا جائے گا۔ گو ان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور، اس ناچیز اور ہر دو دستخط کنندہ بزرگان ممدوحین بالا کے نزدیک قابل تسلیم نہیں لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے جبکہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے۔ ان پر زبان طعن و ملامت کھولنا یا تشبیح کرنا کسی طرح قرین انصاف و صواب نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنّت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں، اس لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر سکوت اختیار کر لیا جانا ہی قریب مصلحت اور جاہلین کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے محترم صدر سید صاحب ممدوح سے بھی پوری توقع ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ مسئلہ حیات کی ان تفصیلات میں جمہور اہل السنّت والجماعت کے مسلک کا احترام قائم رکھنے کے لئے اپنے کسی خصوصی مفہوم کو (خواہ وہ ان کی دانست میں مفہوم اہل السنّت والجماعت ہی ہو مگر جمہور علماء کے نزدیک وہ ان کا خصوصی مفہوم شمار کیا جا رہا ہے اور خواہ وہ کتنی بھی دیانت پر مبنی ہو) ضروری الاشاعت نہ سمجھتے ہوئے سکوت کو کلام پر ترجیح دیں گے یہ مسئلہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی عقائد کا نہیں ہے کہ اس میں سکوت روا نہ رکھا جائے۔

فروعی اختلاف کی حیثیت..... اس طرح عام مسلمانوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ مسائل اور ان میں علماء کے جزوی (معمولی) اختلافات کو مناقشات اور جدال و نزاع (لڑائی جھگڑے) کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اس قسم کے اختلافات امت کے لئے آسانوں کا ذریعہ بنائے گئے ہیں نہ کہ نزاعات اور مناقشات کا۔ اس لئے عملاً و اعتقاداً جمہور سلف و خلف کا دامن تھام کر دوسری جانبوں سے مصالحت اختیار کریں اور لڑنے اور لڑانے کی خواہش نہ کریں۔

آج امت کے بہت سے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جو ان کی ہیئت اجتماعی کی متقاضی ہیں اور یہ ہیئت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اسے اس قسم کے فروعی اختلافات میں بصورت گروہ بندی ضائع نہ کیا جائے۔ خوشی کی لہر..... آخر میں دونوں جانب کے بزرگوں اور بالخصوص فریقین کے نامبروہ اکابر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو پوری توجہ اور التفات خاطر اور سب قبول کے ساتھ سنا اور ملت کو بہت سے مفاسد اور مہالک سے بچالیا۔

”فَحْزَاهُمْ اللَّهُ عَنِّي وَعَنْ جَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ خَيْرَ الْجَزَاءِ“

اس نئی اصلاحی صورت کا سب سے زیادہ شاندار مظاہرہ راولپنڈی کے اس عظیم الشان جلسہ عام میں ہوا جو احقر کی تقریر کے سلسلے میں مدرسہ حنفیہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک بڑے میدان میں زیر صدرات حضرت مولانا خیر محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان، منعقد کیا گیا تھا۔

احقر کو منظوم سپاس نامہ دینے سے جلسہ کا آغاز ہوا اور احقر کی تقریر شروع ہوئی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ تقریر کے آخر میں احقر نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس نزاع کے ختم ہونے کی بشارت تفصیل سے سنائی

جس سے عوام میں خوشی کی اک بے پناہ لہر دوڑ گئی اور ان ہزار ہا انسانوں کے جھوم نے بے تحاشا تبریک و تہنیت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے جس سے فضا گونج اٹھی۔

اعتراف شخصیت..... ختم تقریر پر ایک جانب سے مولانا غلام اللہ خان صاحب نے اور دوسری جانب سے مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے اپنی تقریروں سے اس بیان کی توثیق کی اور نہایت فراخ دلانہ اور مخلصانہ لب و لہجہ سے فرمایا، کہ ہم نے مہتمم دارالعلوم کے درمیان میں پڑ جانے سے اس مسئلہ کی نزاعی صورت حال کو ختم کر دیا ہے اور جو چیز ہمیں ناممکن نظر آ رہی تھی وہ اس شخصیت (احقر نا کارہ) کے درمیان میں آ جانے سے نہ صرف ممکن ہی بن گئی بلکہ واقعہ ہو کر سامنے آ گئی۔ اور ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مہم کو مہتمم دارالعلوم ہی کی شخصیت انجام دے سکتی تھی جس میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے علمی و مذہبی مرکز کی سربراہی کی نسبت موجود ہے جو ہم سب کا مرکز قلوب ہے اور دوسری طرف بانی دارالعلوم دیوبند حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی وہ قاسمی نسبت موجود ہے جو پوری قاسمی برادری کو اس پر متحد کئے ہوئے ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے سوا دوسرے سے یہ مہم انجام نہیں پاسکتی تھی۔

جذبات مسرت..... بہر حال ہم نے اس نزاع کو ختم کر دیا ہے اور ہم اس بارے میں عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو تقریروں کے بعد ہزاروں آدمیوں کا عظیم اجتماع جذبات مسرت سے ابل پڑا اور اس نے ”مہتمم دارالعلوم زندہ باد“ ”دارالعلوم دیوبند زندہ باد“ اور ”علماء دیوبند زندہ باد“ کے فلک شکاف نعرے لگانے شروع کئے۔ کئی منٹ تک فضا نعروں سے گونجتی رہی اور مجمع میں جذبات مسرت کی ایک عجیب حرکت تھی، جس سے مجمع متموج دریا کی طرح متحرک نظر آ رہا تھا اور نعروں میں تقریریں بند ہو گئیں۔ بالآخر جلسہ شاندار کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جو تحریک احقر کے قلم سے کراچی سے شروع ہوئی تھی وہ ملتان، سرگودھا اور جہلم میں اپنے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی راولپنڈی میں حداثہ تک پہنچ گئی۔ خدائے برتر تو انا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چار سال کی مکدر فضا صاف ہوئی اور اس کے المناک آثار رو بہ زوال نظر آنے لگے۔ (”وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَاٰخِرًا۔“)

حق تعالیٰ اس یگانگت کو پائیدار اور برقرار رکھے اور مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ دین ملت کے اہم کاموں کو جزئیات فرعیہ کے مقابلے میں اہم سمجھتے ہوئے اپنی جماعتی قوتوں کو ان پر لگائیں۔

احقر: محمد طیب غفرلہ

(۱۹۶۲/۶/۲۳ء) مولانا مدنی قدس سرہ

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم
آہ! صدا! ہر اکل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے، آج مولانا مدنی قدس سرہ کہہ رہے ہیں مولانا
سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دار دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور

وابستگان کو غم و اندوہ میں ترپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقام کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیاء کی سب سے بڑی جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر، جمعیت علماء ہند کے صدر، جماعت دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعت دیوبند کی صد سالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی، دینی، روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۸۵۷ء ہی پر انتہا ہو گئی۔ اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہو گیا۔

کمال جامعیت..... حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے۔ جامع ہستیاں دیر سے بنی ہیں اور اٹھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم و ثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ، علم و بصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی۔ آپ نے آج کے لادینی مادی دور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص و عوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اسلامی علوم و معارف اور ایشیائی فنون و آداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری و باطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے۔ جو اس مرکز علم و فن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی، آپ اپنے اساتذہ و شیوخ کے ابتداء ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر و شیوخ انہیں اطمینان و اعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اس لئے آپ مختلف ماہر فن اساتذہ و شیوخ کی علمی و عملی یادگار تھے۔ قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، ادب و خطابت، منطق و فلسفہ کی مہارت و حذاقت آپ کے قول و فعل سے نمایاں رہتی تھی۔ آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔ باطنی سلسلوں میں پارسائی، پاکیزگی، نفس، تقویٰ و طہارت، ضبط اوقات، تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی و قومی مشاغل کے ان کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک اہل متنع مشغلہ تھا۔

حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ ”ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہو“ آپ کی ذات گرمی میں عملی صورت سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔

ایک حسین امتزاج..... مادی دنیا سامان راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اس کی راہنما اور مربی نہ بنے۔

حضرت مدوح کی ذات ان دونوں سائنسوں کا ایک معتدل امتزاج تھی، آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلو توں میں نمایاں نظر آتے رہتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درس حدیث و قرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے۔ ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ ان کی توجہ کی جامعیت کو پرانگندہ نہیں کر سکتا تھا۔

دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی، انہوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور انہوں سے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع ان کے کام کا نصب العین تھا۔ اسی لئے آپ نے درس و تدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کے میدان کو بھی سر کر لیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کر دکھلایا۔ اس جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا یا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندو بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا۔ اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا، ان کے قلوب بھی حضرت مدوح کی عزت و عظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہر و باطن کے معترف رہے۔ شیخ العرب واجم..... حضرت مدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب و عجم میں پھیلا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پا کر حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس قرآن و حدیث اور تدریس علوم فنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمہ علوم نبوت میں بیٹھ کر علوم نبوت کی خدمت کی، جس سے عرب و عجم کے لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے، آخر کار عمر کے آخری حصہ میں ۳۳ برس کامل دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر فائز رہ کر مشرق و مغرب کے لوگوں کو علوم کے آب حیات سے سیراب فرمایا۔

سیاسی نقطہ نظر..... ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے، جنہوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ آپ اس سلسلہ میں حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی، سیاسی فلسفہ و حکمت کے امین اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے، جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور آخر کار جانشین شیخ الہند ہی کے لقب میں یاد کئے جانے لگے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں راہنما ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کی کمالیت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی ہر

محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیا اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیاء کا قصر آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔

چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیاء بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ پھر اس ترقی آزادی کی وہ روح جو ان کی روح میں پیوست تھی، صرف سطحی آزادی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط و اقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی، لاندہیت، دہریت، الحاد، بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستان کو اجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے کبھی نہیں مٹ سکتی اور اس فاسد مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تندرستی اور اس کا اصل سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ انہیں یقیناً یہ احساس تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی۔ لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزوی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہر حال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی تھی اور اس کی روح اخلاقی، اسی لئے جہاں آزادی کی جنگ ان کے دست و بازو کا اثر تھی، وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرت الہیہ کی عطاء فرمودہ حدود و قیود کے دائروں میں انہیں محدود و مقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی ان کے عمل کا ایک مستقل محاذ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق و مغرب کے مزاج الگ الگ ہیں، لیکن فوجی اقتدار کے غلبہ نے مشرق کے مزاج کو فاسد کر دیا ہے، اگر یہ بیماری رفع ہوگئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بزرگوں کی ظاہر و باطنی رہنمائی میں کام کیا اور علم و تحقیق کا ایک نیا باب کھولا۔

اس طاقت و رنصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلا دیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہر حال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیاء و مشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ ان میں خاطر خواہ ابھر آیا۔ آج مغرب کی طاقتیں اگر کل یہ نہیں ٹوٹیں، تو ان کو توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والا ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال حضرت شیخ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی، ایشیاء کی آزادی اور آخر کار اخلاق و انسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں ان کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جو ہری قدریں کبھی نہیں ابھر سکتیں۔

مرکب نصب العین..... اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے تو دوسری طرف جمعیت علماء ہند کے صدر بھی تھے۔ اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم ان کی

سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب و سنت کی ترویج میں بھی اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشین بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح و تربیت اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم قانت بنانا ان کا نصب العین تھا۔

کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ و خانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی، لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑ رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا جس کی سطح سیاسی اور مابین اخلاقی تھی۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کی بابت رائے قائم کی وہ رائے صحیح اور واقعی رائے ثابت ہوئی۔

مینارہ نور..... بہر حال حضرت شیخ اس دور الحاد و بے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے اور اگر بقول امیر امان اللہ خان سابق بادشاہ افغانستان ”شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس نور کی ضیاء اور چمک تھے“

یہ نور ان سے منتشر ہو کر ان کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کار فرما ہوتی تھیں۔ منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تریہ کہ اس جوش و جلال کے باوجود نہ ان کی محبوبیت میں فرق آتا تھا نہ مطلوبیت میں۔ کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے تھے جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور ۲ بجے کے قریب روح پر فتوح اس جسد خاکی کو چھوڑ کر رہ گئے عالم جاوداں ہو گئی۔ ”رَحْمَةُ اللَّهِ رَحْمَةً وَاسِعَةً“

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی۔ بعد مردن چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی۔ روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا، لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آ سکتی۔ جو یقیناً مقبولیت عند اللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشارت و طمانیت کی کھلی علامت تھی۔ جو مقبولیت زندگی میں تھی وہی موت کے بعد بھی ہے، مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آنا فانا ہوا پر دوڑ گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہندو بیرون ہند سے تعزیتی فون، تار، اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کہ دارالعلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے اہل پڑا۔ ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہو گیا، لوگ جس شخصیت کے ارد گرد پروانہ دار جمع رہتے تھے اب اس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وابستگان حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں

اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقتاً مرتے ہی نہیں، صدیاں گزر جانے پر بھی دلوں میں ان کی روح دوڑتی رہتی ہے اور ان کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے۔ جس کی بناءً ان کا پیکر یا چہ نہیں ہوتا جو مٹ جانا ہے، بلکہ ان کی معنویت ہوتی ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں، اس لئے موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مر کر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

معنوی معیت..... آج حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں جبکہ ان کا مشن موجود، ان کا نمونہ عمل موجود، ان کا علم موجود، ان کی مجاہدانہ کارنامے موجود اور ان کی محبوبیت موجود۔ اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبت عظیمہ ہے۔ وہیں ان کی معنوی معیت وجہ سکون و قرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے، ان کی معنویت موجود، اس سے استفادہ اور اس کا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار و تسلی ہوگا۔ اور ایصالِ ثواب کے ذریعے حضرت مرحوم کے لئے وجہ سرور و انبساط ہوگا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اور ان کے حق میں سکون و راحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گزر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اس کو دعاء و ایصالِ ثواب میں یاد رکھتا ہے، اس لئے غم غلط کرنے اور حضرت اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غم محض یا غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہو سکتا بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمر بستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہ، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب و درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل، اجر جزیل اور ذوق تعمیل عطاء فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئیں کہ ان سطروں میں ان کے مناقب کب آ سکتے تھے، بلکہ محض غم اور دل کو ہلکا کرنے اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے ذکر اور یاد سے ”اَذْكُرُوا مَعَايِینَ مَوْتَانَاکُمْ“ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرت مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روانہ نہ رکھا جائے گا۔ (وَهُوَ الْبَاقِی مِنْ کُلِّ شَیْءٍ)

انٹرویو

قتدیل راہنمائی..... انسانی عظمت کی تعریف اور تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کوئی دولت مند آدمی کو بڑا مانتا ہے، کسی کے نزدیک سیاست دان اور ارباب اقتدار بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کوئی بڑی بڑی علمی ڈگریاں اور فنی ڈپلومے حاصل کرنے والوں کو بڑا سمجھتا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عظمت کی کسوٹیاں (معیار) بناتا ہے، لیکن بڑائی کا جو معیار مولانا قاری محمد طیب کو دیکھ کر دستیاب ہوتا ہے وہ اتنا جامع اور واضح ہے کہ اس کے بعد عظمت کا مفہوم تشریح طلب نہیں رہتا اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ خدائے ذوالجلال سے جو شخص جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔ کیوں کہ اس کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو سب سے بڑی لاثانی اور لافانی ہے۔

قاری محمد طیب عشق الہی کی تصویر اور خلق خدا کی ہدایت کے لئے راہنمائی کا نور ہیں۔ وہ علم و عمل کا جیتا جاگتا پیکر ہیں۔ دینی علوم پر ان کی نظر عالمانہ ہی نہیں محرمانہ بھی ہے۔ انہیں قدرت نے قرآن فہمی کی غیر معمولی استعداد بخشی ہے۔ علم حدیث میں ان کے ادراک کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ تاریخ کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح آگاہ ہیں، زمانے اور زندگی کا ہر اتار چڑھاؤ جانتے ہیں اور قدیم و جدید کا ہر تیور پہچانتے ہیں۔ خطابت ان کی لونڈی ہے، لاکھوں کے مجمع میں بولتے ہیں تو پورا مجمع خاموش ہو کر یوں گوش برآواز ہو جاتا ہے جیسے دور دور تک کوئی تنفس موجود نہ ہو۔ کوئی سا موضوع ہو وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے بے تکان تقریر کرتے ہیں اور فکر و نظر کے دریچے کھولتے چلے جاتے ہیں۔

یہی محاسن ہیں جن کی بدولت وہ محض دارالعلوم دیوبند ہی کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے قتدیل راہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

- 1..... اسلام پاکستان کی تقدیر ہے۔
- 2..... پاکستان اسلام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔
- 3..... اسلام ہی زندگی کا وہ واحد اور کامل دستور ہے جو پورے اعتماد سے ہمارے مادی اور روحانی تقاضے پورے کرتا ہے۔

جب تک اسلام نافذ نہیں ہوگا ہم زبوں حال رہیں گے
نفاذ اسلام کا مرحلہ ترتیب..... یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے خیالات کا اظہار بڑی مدت سے سب ہی

مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ اسلام کس طرح اور کس مرحلہ وار ترتیب سے نافذ ہو؟ یہ آج کے دور کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ خوش قسمتی سے قاری محمد طیب گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے تو خیال گزرا کہ تذکرہ بالا سوال پر ان کے علم و نظر سے استفادہ کیا جائے۔

یہ خواہش ہمیں کشاں کشاں قاری صاحب تک لئے گئی۔ وہ ملتان روڈ کے ایک مکان پر تشریف فرما تھے۔ آس پاس بہت سے عقیدت مند بیٹھے تھے۔ میں نے قاری صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تو بڑی شفقت اور بے تکلفی سے میرے سوالوں کا جواب مرحمت فرمانے لگے۔ اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں فرمایا: ”فی زمانہ اسلام کے نفاذ کا دار و مدار اردو باتوں پر ہے۔ (۱) اجتماعی سطح پر حکومت وقت قدم اٹھائے، مروجہ قوانین کا جائزہ لے اور وہ تمام قوانین یک قلم منسوخ کر دے جو قرآن و سنت کے منافی یا ان سے متعارض ہوں، مزید برآں ایسے قوانین بنائے جائیں جن کا مقصد کلی طور پر دین کا نفاذ اور اس پر عملدار آمد ہو۔ (۲) انفرادی سطح پر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی جلوہ گاہ بنائیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام الہی پر دل کی گہرائیوں سے کار بند ہوں۔ رہن، سہن، شادی، بیاہ، خوشی، غمی، خرید و فروخت، لین دین، غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہی احکام کی پابندی کریں، جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور ان چیزوں سے باز رہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے۔“

علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت ان دونوں امور کی تشریح کرتے ہوئے قاری صاحب نے بتایا کہ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، اس لئے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ دینی علوم کو اس قدر عام اور سہل الحصول بنا دیا جائے کہ کوئی بھی دین سے نا آشنا نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص عالم فاضل ہی بنے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ دینی فرائض کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو بھرپور معلومات ہونی چاہئیں، اگر کوئی کسی معاملے کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو وہ اہل علم سے رجوع کرے اور درپیش معاملے میں رہنمائی حاصل کرے۔

قرآن کریم کے سترہویں پارے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ﴿فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ ① ”اگر تم نہیں جانتے تو اہل دانش سے دریافت کرو۔“

اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ لگن پیدا کی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھیں، جب دلوں میں یہ لگن پیدا ہو جائے گی تو وہ یقیناً عالمان دین سے رجوع کریں گے۔ جب وہ دینی تقاضوں سے آگاہی حاصل کر لیں گے تو اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس طرح ماحول اور معاشرے میں خود بخود اصلاح کے رجحانات پیدا ہوں گے اور یہی رجحانات فلاحی برگ و بار لائیں گے۔ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہی تھا۔ وہ جس چیز کے بارے میں لاعلم ہوتے تھے اس کا ایک

① پارہ: ۷، سورۃ الانبیاء، الآیہ: ۷۔

ایک پہلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرتے تھے اور پھر اسے حرز جان (عزیز سمجھنا) بنا لیتے تھے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ: یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ماحول ٹھیک نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں ہوگا اور ماحول اسی صورت میں سنور سکتا ہے جبکہ پوری قوت اور مکمل فرض شناسی سے کام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ماحول بہتر بنانے کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور دین پر عمل پیرا ہونے کا کام اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کرے۔

کسی محلے میں اگر ایک گھر عملاً اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن جائے تو وہ گھر چراغ راہ ہو جاتا ہے جس کی کرنیں پڑوس کے گھروں کو بھی منور کرنے لگتی ہیں۔ سعادت اور فلاح کے دیئے اس طرح دھیرے دھیرے جلتے ہیں۔ جب ایک گھر میں اسلامی تعلیمات کی برکتیں جلوہ گر ہوں گی تو دوسرے گھر انے اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے یوں گلی گلی، محلے محلے، قریہ قریہ اور شہر در شہر دین کا اجالا پھیلتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ پورا ماحول اور معاشرہ دینی رنگ میں ڈھل کر بقعہ نور بن جائے گا۔

نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری..... قاری صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر چیز کی ذمہ داری حکومت وقت کے کندھوں پر ڈال دینا درست نہیں۔ نجی گھریلو، اور خاندانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا انقلاب لانا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے جس میں کوئی خلل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر فرد اپنی ذات اور خاندان میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ اٹل کر لے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے یا اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ لہذا اسلام کے عملی نفاذ کی پہلی اور بنیادی ذمہ داری فرد پر ہے۔

قاری صاحب نے کہا کہ آج کل ایک افسوسناک حالت یہ ہے کہ:

ہر یکے نا صحیح برائے دیگر

لوگ خود تو نیک عمل کرتے نہیں البتہ دوسروں کو نصیحت کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں، نیک عمل سے گریز مگر نیکی کی زبانی تبلیغ کا رے خیر ہے۔ کیوں کہ قول مؤثر نہیں ہوتا، اصل اور مؤثر قوت عمل ہے، صرف عمل۔ لہذا ہر شخص پر لازم ہے کہ پہلے وہ اسلامی معاشرت، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا علم حاصل کرے اور پھر اس کا عملی نمونہ بن جائے۔ اکل حلال کو اپنی زندگی کے لئے لازم جانے اور حرام کی کمائی سے دور بھاگے۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائے گی اور جب مسلمان اچھی طرح دینی رنگ میں ڈھل جائیں گے تو پھر حکومت کا کام معمولی رہ جائے گا۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت ہی سے ہر مطالبہ کرنا سراسر غیر ضروری ہے۔ حکومت تو صرف اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کا اقدام یا اہتمام کر سکتی ہے۔ اولین ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو دینی معاشرت کا سچا نمونہ بنالیں۔

نفاذ اسلام میں حکومت کا کردار جہاں تک اجتماعی سطح پر حکومت کے کردار کا تعلق ہے۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف قرآن اور سنت کو ٹھہرایا جائے، عوام قانون پر چلتے ہیں۔ لہذا ایسا کوئی قانون نہ تو برقرار رہنا چاہئے اور نہ ہی آئندہ بننا چاہئے جو منکرات پر مبنی ہو یا قرآن و سنت کے احکام کی نفی کرتا ہو۔

ثانیاً حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس کے ابتدائی مدارج میں دینی عقائد، اخلاق اور معاملات کی کما حقہ تعلیم دی جائے۔ پرائمری اور ہائی اسکولوں میں طلباء کو وہ دعائیں اور ان کا مفہوم یاد کرایا جائے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ اگر ہر بچہ کو ایک ایک دعاء چار چار روز میں بھی یاد کرائی جائے تو چھ مہینے میں وہ ساری دعائیں اچھی طرح یاد کر لے گا۔ ان دعاؤں کی پہلی اور لازمی برکت یہ ہوگی کہ عملی توحید کا رنگ قائم ہو جائے گا اور ہماری نئی پود کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ شروع ہی سے راسخ ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ چیز اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطہ نظر اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ: اسلام، انسان کی بنیادی ضرورتوں کا مکمل حل پیش کرتا ہے، شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”البدر“ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: زندگی بسر کرنے کے لئے تین چیزیں لازماً درکار ہیں۔

1 کسرہ بھیمبر۔ روٹی کا ٹکڑا۔ 2 قطعہ ثوب۔ بدن ڈھانپنے کا کپڑا۔ 3 قطعہ ارض۔ رہنے کے لئے زمین کا ٹکڑا۔ اسلام کسی فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضروریات سے محروم نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو رزق رسانی کے سلسلے میں اسلامی نظام کا حال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کمر پر غلے کی بوری لا کر ضرورت مندوں کے جھوپڑوں تک پہنچایا کرتے تھے، جہاں تک کامل مساوات کا تعلق ہے تو وہ ایک غیر فطری چیز ہے۔ اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے۔ وہ کسی کا حد سے زیادہ امیر یا حد سے زیادہ غریب ہونا پسند نہیں کرتا، اس سلسلے میں اسلام کی غرض و غایت یہ ہے کہ جو لوگ دولت کے اعتبار سے بہت بلندی پر ہیں انھیں کچھ نیچے اتارا جائے اور جو مفلوک الحال انتہائی پستیوں میں ہیں انھیں کچھ اوپر اٹھایا جائے اس طرح توازن اور اعتدال کی فضاء قائم کی جائے۔

اتحادِ مسلم مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ”مسلمانوں کے تمام فرقوں میں گہرا اتحاد بے حد ضروری ہے۔ ضمنی اختلافات کے باعث مسلمانوں کا آپس میں کوئی رنجش رکھنا سخت افسوسناک اور بے جواز چیز ہے۔ کیوں کہ ہمارا دین ہمیں جڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کٹنے اور بچھڑنے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں وحدت کے اسباب بے پناہ ہیں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں مقابلہ و مجادلہ نہ کرو۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر فرقہ مثبت اور معروف پہلو پر اکٹھا ہو جائے اور ملت اسلامیہ کے مشترکہ مشن میں تعاون کرے۔ جہاں تک تمام فرقوں کے اپنے اپنے جداگانہ

لیکن ضمنی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ ان پر اپنی اپنی حدود میں عمل پیرا رہ کر بھی مضبوط دینی وحدت بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ منفی انداز فکر ترک کر کے تکفیر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخ دلی اور وسعت قلبی کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ سرداران قریش کی نگریم کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیا کرتے تھے، جب ہمارے آقائے نامدار کا یہ سلوک کفار کے ساتھ تھا تو ہمارا اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ محتاج وضاحت نہیں۔“

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کے حالیہ اقدامات کے بارے میں استفسار پر قاری صاحب نے کہا کہ: جو شخص یا جو حکومت اسلام کے عملی نفاذ کا اہتمام کرے گی وہ ہر حال میں قابل نگریم قرار پائے گی۔ اکابر دیوبند کا مشن..... مزید فرمایا کہ: دین کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے“ مزید فرمایا کہ اکابر دیوبند کا مسلک اور مشن یہی تھا، جس کے لئے وہ مدت العمر کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی جانیں اس مشن کی خاطر کھپا دیں۔“

ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر..... ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں قاری صاحب نے بتایا کہ دینی غلبے اور اسلامی حمیت کے لحاظ سے وہ روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آواز میں یکسانیت اور خود اعتمادی کا لہجہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ سابق بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی صاف صاف یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئیں کہ ہم مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔ بات مزید آگے بڑھی تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اہل پاکستان کی ترقی اور فلاح کے لئے دعا گو ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں سے ان کی محبت قدرتی ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ مسلمانان ہند پورے عالم اسلام کے لئے دردمندی کے جذبات رکھتے ہیں اور پاکستان عالم اسلام کا ایک اہم ملک ہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ایک دوسرے کے رشتہ دار شروع ہی سے موجود ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں کی خوشحالی کی دعاء مانگتے رہتے ہیں، پھر پاکستان کے لئے ان کی خیر اندیشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نہایت قریبی ہمسائے ہیں اور دو آزاد اور خود مختار ہمسایہ ممالک کو جس انداز اور اخلاق سے رہنا چاہئے۔ اس کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات تازہ اور بیدار رکھیں۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور قیام پاکستان..... شاید بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قاری صاحب اپنے عظیم مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انداز فکر کی پیروی میں قیام پاکستان کے حامی تھے۔ ماضی کی کچھ باتیں چھیڑیں، تو راقم نے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام کے

سیاسی افکار کا تذکرہ کیا اور قاری صاحب سے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ اپنی دینی وجاہت اور جہاد حریت کے باعث ہمارے ماضی کی رونق ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں قیام پاکستان کے خلاف تھیں۔ آخر کیوں؟

اس پر قاری صاحب نے فرمایا کہ: فکری اور نظری اختلاف کسی بھی معاملے پر ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔ تاہم جب پاکستان بن گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب پاکستان کو مضبوط بنایا جائے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اس کی ساخت بناوٹ اور موقع محل پر مختلف آراء ہو سکتی ہیں لیکن جب مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر اس کی تقدیس کا خیال ہر دم لازم ہے۔ پھر مسجد کے بنانے یا نہ بنانے پر بحث نہیں کی جاسکتی یہی حال قیام پاکستان کا ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب چونکہ پاکستان قائم ہو گیا ہے لہذا اس سلسلے میں میری رائے کا اختلاف بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب خدا تعالیٰ پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنائے۔

مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان..... مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ بٹوارے کے بعد پاکستان کے لئے کیا جذبات رکھتے تھے؟ اس سلسلے میں قاری صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی معرفت پیغام ملا کہ مولانا ابوالکلام مجھے یاد فرما رہے ہیں۔ میں دہلی پہنچا اور سیدھا ان کے دفتر گیا۔ مولانا اپنے روایتی اخلاق کے مطابق نہایت تپاک سے پیش آئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیوں یاد فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اب پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھے اور لائق لوگ پاکستان چلے جائیں اور اس نوزائیدہ مملکت کا نظام سنبھال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

اتنا فرمانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں بخوشی آپ کو بھجوانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ اس بارے میں آپ کو بلا جھجک اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ طور پر پاکستانی ہائی کمشنر سے ملاقاتیں کی جائیں۔

قاری صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم کی یہ باتیں سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور ان سے کہا کہ یہ قطعی غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ اس پر مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں ڈوب گئے میں نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی نے حکومت کو ہمارے بارے میں جان بوجھ کر کیا نادرستی میں غلط اطلاع دی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چندہ جمع کرنے والے سفیر چندہ کے سلسلہ میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اور اسی ضمن میں انہوں نے ہائی کمشنر سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔ سی آئی ڈی والوں نے اس بات کو زیب داستان کے لئے بڑھایا اور یہ افسانہ بنا ڈالا کہ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ جب یہ حقیقت مولانا کے علم میں آئی تو وہ بہت متاسف ہوئے اور انٹیلی جنس کے

عملے پر بڑا ملال ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ یہی سی آئی ڈی کے جھوٹے لوگ تھے۔ جو ہمارے بارے میں بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

خدا حافظ..... قاری صاحب باتوں باتوں میں فکر و نظر اور علم و خبر کی پھول لٹا رہے تھے، خاصا وقت بیت چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی پھیلتی چلی جا رہی تھی راقم نے اجازت چاہی تو انہوں نے شفقت و مرحمت کے ایک نادر لمس کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور گراں قدر دعائیں دے کر خدا حافظ کہا اور میں یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ قاری صاحب ۸۶ برس کے لیل و نہار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ایسی عظیم اور فیض رساں شخصیتوں کو تادیر زندہ اور باعث برکت بنائے رکھے۔ (۲۰ مین)

از: شاعر شیریں مقال

جناب انور صابری (مرحوم)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب ”قدس اللہ سرہ العزیز“

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخش علوم نو ہے
تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کر دیا ہے
خدا کے فضل و کرم سے دین کا مقام محمود مل گیا ہے
ترے فکر میں قرن اول کی عظمتوں کا نشان ملے گا
مری نظر میں نئے زمانے کا فخر مصر و حجاز تو ہے
رشید کے باغ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے
فریضہ حج کے بعد اپنے وطن میں باعز و شان آیا
جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگ اعزاز دیں بڑھایا
حوادثِ دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
تری جبین پر جمین قاسم کی دل نواز و حسین صو ہے
”حکیم الامت“ نے ایک نظر میں حکیم الاسلام کر دیا ہے
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا
کیا جسے مشکف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے
ملا دوام بہار جس کو گل ریاضِ رسول تو ہے
لئے ہوئے دل میں معرفت کا تخیل نو جوان آیا
رہے گا تا عمر تیرے سر پہ خدا کی رحمت کا خاص سایہ
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پاسکیں گے

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۹

ایک احادیث پر عمل اعراب اور تخریج تحقیق کے ساتھ [۲۰] ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت تازگی بخشتا ہے

مترجم: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم حیدریہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا ساجد محمود صاحب
مختص فی احادیث مابعد فاروقیہ کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
مختص فی احادیث مابعد فاروقیہ کراچی

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل مابعد دارالعلوم کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عتایی صاحب مظلہ

بیت السلام
پبلشر: کراچی، پاکستان





قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق..... بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید..... اکتوبر 2011ء
- تعداد..... 1100
- ناشر..... بیت السلام



بیت السلام
پبلشرز، کراچی، پاکستان

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی - فون: 021-32711878

موبائل: 0321-3817119 ای میل: baitussalam_pk@yahoo.com

خطبات حکیم الاسلام — فہرست

27	 نماز ہے توکل دین ہے	11	 اساسی عبادات
27	 نماز تعلق مع اللہ کی مظہر اتم ہے	11	 بنیادی عبادات
28	 قیام نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے	11	 منشاء عبادات
28	 سلطنت اسلامی کا مقصود	12	 منشاء جلال و جمال
29	 نمازی یا نماز کے ثمرات	12	 جلال و جمال کے آثار و لوازم
30	 رمضان اور اس کے مقاصد و برکات	13	 نماز شان کبریائی کا مظہر
30	 اصلاح طینت	14	 حج، ذاتی محبوبیت کا مظہر
30	 سعادت کی بنیاد	14	 حسن تعبیر
31	 تخلیہ و تحلیہ	15	 عجز و عشق کے مظاہر
32	 نظام سعادت	15	 زکوٰۃ و روزہ کی حیثیت
33	 ایمان و امانت	15	 موانع نماز اور ان کا تدارک
34	 حیا داری اور خشکاری	16	 نماز کی تمہید
34	 خلاصہ کلام	17	 موانع حج اور ان کا تدارک
35	 بد و تقویٰ سے انقلاب باطن	18	 حکمت استغفار
36	 نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی	18	 خطاب حج
36	 عباداتی سال کا آغاز و اختتام	19	 حکمت احرام
37	 ماہ رمضان نیکیوں کا مرکز اتصال	19	 عاشقانہ بول
38	 بندہ و خدا میں ربط باطنی	19	 حکمت طواف
38	 کامل ترین ملاپ	20	 حکمت وقوف و عرفات
38	 اعتراف قبولیت	20	 فدیہ جان
39	 بشری عروج کا نقطہ کمال	20	 مقدمہ حج
39	 روزہ اور ماہِ روزہ کا اثر	21	 زکوٰۃ و روزہ ”عبادت الخیرہ“ ہیں
40	 صیام و قیام کا باہمی تناسب	23	 نماز و حج میں باہم نسبت تضاد
40	 ہلالِ عید	23	 علمی حج
41	 تتمہ رمضان	25	 آئینہ حج اور آئینہ نمازی
41	 عبادت کا ہمہ گیر نقطہ آغاز	25	 اہمیت نماز
42	 ماہ رمضان کے اعداد کا اثر	26	 کائنات کا انتہائی مقصد
			 عبادت کا فرد کامل

60		43	باطنی دولت		رمضان اور اشہرج کا باہمی ارتباط
60		44	دولتِ معرفت کا تقوق		عاشقی، درویشی اور سرشاری
63		45	اسلام میں عید کا تصور		صورت و قاری کی بھی ممانعت
63		45	اجتماعیتِ عامہ!		خانہ بدوشی
64		46	حکمتِ دوگانہ		فدیہ جان
64		46	حکمتِ فطرانہ و قربانی		ایام حج میں یاد رمضان
64		47	روحِ عید		حکمتِ عید قربان
65		47	عظیم اجتماعیت		شانِ جلال و جمال کا شکریہ
65		48	عوالم گیر اجتماعیت		اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے
65		49	خوش قسمت قوم		اجتماعی دین
66		49	عید کا اصل اصول		عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت
66		49	سال بھر کے لئے نورانی اثرات		ماہ و سال کا توازن
67		51	اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ		فصلیتِ تقویٰ
67		51	حقیقتِ رمضان		احوالِ واقعی
67		51	فردِ مسلم کا درجہ امت		طریقِ سلف اور وصیتِ تقویٰ
68		52	محبت و معیت		نتائجِ تقویٰ
68		52	حقیقتِ ہر فی		تقویٰ، امنِ عالم کا ضامن ہے
68		53	تائید و تکرارِ چینی		تقویٰ کے بغیر قیام امن ناممکن ہے
69		53	اقلیم بدن کا بادشاہ		باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے
69		54	قلب اصل ہے یا دماغ؟		تقویٰ محاسبہ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے
69		55	مدارِ اعمالِ قلب ہے		تقویٰ میں احتیاط کا پہلو
70		56	مدارِ حیاتِ قلب ہے		درجاتِ تقویٰ
71		56	دماغِ قلب کے تابع ہے		حصولِ تقویٰ
71		56	مدرکِ حقیقی قلب ہے		جاہل مقامِ تقویٰ سے نا آشنا ہے
72		58	مرکزِ اصلاحِ قلب ہے		قدرِ تقویٰ بقدرِ عظمت
73		58	اقتائے قلب		تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ
73		59	ایمان کا مور و اول قلب ہے		فقر و غنا میں تقویٰ کی ضرورت
74		59	محلِ اسلام		تقسیمِ دولت احوالِ قلوب کے مطابق ہے

94	حقیت ایمانیہ	75	حقائق شریعت اور عجائبات کائنات کا باہمی تعلق
95	آثار ایمانیہ	75	منزل مقصود اور اس کائنات کی حقیقت
95	مقام صدیقیت	76	انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد
95	غلبہ محبت	76	معرفت الہی
96	آثار محبت	78	متاع مشترک
96	سونے کا سنون طریق اور قوت ارادی	78	شہ کا مصاحب
96	ابتدا بالتمین	80	نسبت کی عظمت
98	معیار عقل	81	مرکز سعادت
98	راستے کا رنج و راحت اور منزل مقصود	82	فاتحہ الکلام
98	مدارِ نجات	84	تحصیل حاصل
99	محبت کی تلخیاں	84	محروم القسمت کا حال
99	غلبہ ادب	84	مرکز سعادت
100	استغراق محبت	86	جائے بزرگان بجائے بزرگان!
101	ظرف محبت	87	الہامی درس گاہ
101	دعویٰ محبت کا ثبوت	87	الہامی اہتمام
101	بڑوں کی بڑی بات	88	الہامی طلباء
102	محبت آمیز عمل	88	الہامی سنگ بنیاد
102	دوام معیت نبوی کی بشارت	89	حقائق و کیفیات کا فرق
102	محبت و خواہش کا ککراؤ!	89	نسبتوں کا چمن
103	ضد و معصیت اور تقاضائے محبت	89	زیادۃ فی العلم
103	تعلیم جدید	91	علم کی دھن
104	بچے اپنا خوشی	91	علم و عمل کی سند
104	تعمیر معنوی کی علامت	91	علم و خشیت
104	اقسام علم	92	راہنمائی کی تیاری کا زمانہ
105	علم دین کے ساتھ علم دنیا کی ضرورت	92	خلوص و محبت کا شکر یہ
106	نظام محکم کی شہادت	92	اقتیاز دار العلوم
106	مستفدین کی بنیاد پر متاخرین کی تعمیر	93	ایک بڑی کمی
106	دونوں علوم کا حقیقی نقطہ	93	مہمانوں کا شکر یہ

123	تاسیس دارالعلوم کا امتیاز	107	رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی قدر و قیمت
124	طلباء کرام کا امتیاز	107	رئیس الاحرار کا غایت تاثر
124	حصول علم کا امتیاز	107	انقلاب ۱۳۷۲ء کے اولین ہیرو
124	دارالعلوم کے انتظام و انصرام کا امتیاز	108	عدالت شرعیہ کا قیام
125	مدرسین کرام کا امتیاز	108	دارالعلوم میں صنعت و حرفت کے شعبہ کا مقصد
125	روح دارالعلوم	109	دارالعلوم کے ذریعے ”ہندو مسلم“ کا پر داز
126	آزادی ہند کا خاموش راہنما	110	دارالعلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر
126	آزادی کی خوشی کی تکمیل	110	تنظیم ملت کا نیا خاکہ
127	آزادی کا ہیرو	110	قیام دارالعلوم کا بنیادی محرک
127	شاملی کے میدان کی طغانی	111	اصول آزادی کی اثنی شخصیت
129	سیاسی حکومت کے ازالہ کی واحد تدبیر	111	اکابر دہلی و آزاد ہند
129	جہاد شاملی کے زرخ کی تبدیل	112	شیریں شر کے حصول پر تہریک
129	آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ	112	اکابر ملت اور جہاد آزادی
130	خاموش راہنمائی کے آٹھ اصول	113	شیخ الحدیث دارالعلوم کی پیشین گوئی
	جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ	114	آزادی ہند کی جدوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے
131	سرکاری امداد کا بدل	115	کی
131	تالیف خواص	116	ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات
131	اتحاد مشرب	116	ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل
131	ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد	117	ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات
132	روحانیت و اخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل	117	نئے ہندوستان میں وحدت جماعت کی ضرورت
132	سرکاری امداد سے احتراز کی حکمت	119	پس منظر
134	سرمایہ داری پر ضرب کاری	119	حدیث پاکستان
134	تنظیم مدارس آزادی کی شہت ازل	119	پاکستان جانے کے مقاصد
135	جمعیت علماء کا پس منظر	119	دنیا کا عمومی دینی انحطاط
135	ملت کا وقار بازیافت کرنے کے اصول	121	اصلاح کی ذمہ داری
136	عوامی قوت کا پر داز	122	پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے
136	عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ	122	فتنوں کا سد باب
137	یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتوی		اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات

150	137	بڑی امید افزاء خوبی
150	137	اعلان استغناء
151	138	دیانت عمل کی تاثیر
151	138	قدر دار العلوم
152	139	حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصرف
153	139	قیس عثمانی
154	139	جذبات تشکر
155	140	امارت شرعیہ
155	140	روزِ مسرت
156	141	اسلام کی بنیاد
157	141	عقائد
158	141	عبادات
158	142	اخلاقیات
158	142	معاملات
160	143	اجتماعیات
162	143	مشکلمین اسلام کی خدمات
162	143	ائمہ اجتہاد کی خدمات
162	144	اختلاف مشرب
163	144	فقہائے اسلام اور ان کا تادب
	145	امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ
163	145	امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
165	147	امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
165	147	احسانِ عظیم
165	147	مرفاء اسلام کی خدمات
166	147	امراء اسلام کی خدمات
167	147	خلفاء اسلام کی خدمات
169	148	خلفاء کیلئے طریق عمل
169	148	معاظینِ حقون نبوت کی تعظیم ضروری ہے

183	فرق مراتب	169	مسلم و حربی کے درمیان سودی معاملہ
183	احسانات کاغم	170	دارالحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا
183	سلامتی فطرت	170	سود پر دلچسپ مباحثہ
185	ضمیر کی سچائی	171	حکم شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے
185	دینی مقبولیت	171	مداودین حجت ہے
186	اعتماد کا کار	172	مراتب عصمت
186	انفرادی اعتماد	172	منشاء گناہ
187	رکمی توحید و بکاء	173	شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش
187	میت کی راحت رسانی	173	تلبیس ابلیس
188	ایصال ثواب کی آسانی	174	خطا اجتہادی اور عصمت
189	محاسن مرحوم	174	لغزش اور گناہ کا فرق
190	مرحوم کی یادگار	174	عصمت اطفال
190	جامع مذہب	176	عصمت انبیاء علیہم السلام
190	جامع مذہب	176	عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کا فرق
191	طبقاتی اجتماعیت	177	باعث تعجب ایمان
192	دارالعلوم کی شان اجتماعیت	177	جبری عصمت
192	وفاق البد ارس	177	حفاظت اولیاء کرام
192	افادات علم و حکمت	178	حضرت ثعلی رحمۃ اللہ علیہ کا عبرتناک واقعہ
194	حسن نیت سے حرام حلال نہیں بنتا	178	حفاظت اولیاء کا طریق
194	عمل مشروع میں ہی حسن نیت کا اعتبار ہے	179	وجوہ عصمت
195	عمل صالح کی دو بنیادیں	180	اولیاء اللہ سے صدور گناہ خلاف تقویٰ نہیں
196	شرک و بدعت کی بنیاد	181	مقام عصمت اور شیطان
197	قوم کے اخلاق کا تحفظ	181	حفاظت اولیاء اور شیطان
197	ظلمت اخلاق	181	حاصل کلام اور درجات عصمت
197	قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے	182	بندہ حکم پر انکشاف اسرار ہوتا ہے
198	حرام میں شفاء نہیں	182	مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی ہے یا جہنمی؟
200	متبادل صورت	182	اسلم ترین مذہب
200	مطالعہ کا علم لائق اعتماد نہیں	183	نس بندی

219	استثنائی حکم	200	حکومت سے کام لینے کا طریقہ	219
	منظم فساد سے روٹی کی بچت	201	حکام اور اہل دین کے درمیان خلج دور کرنے کے لئے	
219	تقسیم دولت میں عدم توازن	201	تجویز	219
220	سرمایہ دار کا طریق واردات	202	تعمیری انداز میں اصلاح	220
221	کثرت اولاد پر انعام	202	ورثہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم	221
221	استثنائی اجازت	202	دارالعلوم کی ترقی	221
	اشرویو	204		
	دارالعلوم کا مستقبل	204		
	تجدید دین کا مظہر اتم	205		
	ظرافت آمیز شکوہ	206		
	امام دعوت و عزیمت	207		
	تین بڑے کام	207		
	روح دارالعلوم	208		
	اصلاح معاشرہ اور خلافت اسلامیہ	209		
	افغانستان سے رابطہ	209		
	ترکوں سے رابطہ	210		
	انگریزی دور میں محکمہ قضاء کا قیام	210		
	تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ	211		
	حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید	212		
	علوم کا عروج	213		
	کچھ اپنی زندگی کے بارے میں	213		
	پیدائش کا پس منظر	213		
	حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی بسم اللہ	214		
	نازبرداری	215		
	مسلمانوں کے تنزل کے اسباب	215		
	مذہبی نقطہ نظر سے اسباب تنزل	216		
	نقطہ نظر کا اختلاف	217		
	برسر اقدار طبقہ کی اصلاح کا طریقہ	218		

اساسی عبادات

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَلَّافَةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ۔“

بنیادی عبادات..... بزرگان محترم! اسلام میں بنیادی طور پر عبادتیں، دو ہی ہیں۔ جن پر پورے اسلام کی
عمارت کھڑی ہوئی ہے، ایک نماز، دوسرے حج۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی لامحدود صفات کمال کو اگر اصول طور پر
سمیٹا جائے تو دو ہی نوعوں میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک صفات جمال اور دوسرے صفات جلال۔

منشاء عبادات..... صفات جمال مہر و لطف کی صفات ہیں جیسے رحمت و رأفت، عفو و کرم، حلم و صبر، خلاق و رزاقی،
گہداشت و حفاظت، راہنمائی و ہدایت، ستاری و مغفرت، جود و عطاء، انعام و احسان، نصرت و اعانت وغیرہ اور
صفات جلال تہری صفتیں ہیں جیسے قہر و غضب، جبر و تشدد، مواخذہ و انتقام، غلبہ و استیلاء، عزت و جبروت، مالکیت و
ملکیت، حکومت حاکمیت، سلب و منع وغیرہ۔ قرآن حکیم نے حق تعالیٰ کی ان دونوں شانوں کی طرف جن کے نیچے یہ
دونوں آئی ہوئیں ہیں، ان جامع اور معجزانہ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے ﴿تَبٰرَكَ اَسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ
وَ الْاِکْرَامِ﴾ ① جلال کے نیچے تہری صفتیں آ جاتی ہیں اور اکرام کے نیچے مہری صفات رہتی ہیں۔ ایک جگہ
صراحت کے ساتھ ان دونوں شانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ﴿نَبِّئْ عِبَادِيَ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ﴾ ② وَأَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ③

ایک جگہ فرمایا ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطُّوْلِ﴾ ④ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ⑤
ایک جگہ صفات جمال کے افعال بیان فرمائے گئے کہ ﴿لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الرحمن، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۵۰، ۴۹۔

③ پارہ: ۲۳، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۳۔

جَمِيعًا ﴿١﴾ اور اسی کے آگے صفات جلال کے افعال کا تذکرہ فرمایا گیا کہ ﴿وَأَسْلِمُوْا لَهُ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ ﴿٢﴾ اسی طرح ایک موقع پر صفات مہر کے تحت امیدیں باندھتے رہنے کا حکم دیا اور مایوسی ختم فرمادی کہ ﴿اِنَّهٗ لَا يَنْبَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ ﴿٣﴾ ”بلاشبہ کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔“ اور صفات قہر کے تحت بے خوف ہو جانے سے روکا گیا کہ ﴿فَلَا يَنْمُنْ مَّكَرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ﴿٤﴾ ”اور (آدمی) مطمئن نہ ہو بیٹھے اللہ کی مخفی تدبیر سے۔“

منشاء جلال و جمال..... ایک جگہ صفات جلال اور صفات جمال دونوں کے منشاء پر مطلع فرمایا گیا کہ صفات قہر کے ظہور کا منشاء جرائم ہیں اور صفات مہر کے نزول کا منشاء ایمان ہے۔ ﴿فَاَنْتَقِمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اٰجَرُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ﴿٥﴾ ایک جگہ اولاً شان رحمت کے تحت افعال خیر پر انعام کا ذکر فرمایا گیا اور آگے اسی کے ساتھ شان غضب کے تحت شر پر سزا و انتقام کا ذکر کیا گیا ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا﴾

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبِّتْ وَجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ﴿٦﴾ بہر حال صفات کمالات کی یہی دو بنیادی نوعیں ہیں جن کے نیچے تمام صفات ربانی آئی ہوئی ہیں۔ جلال و جمال اور مہر و قہر، صفات جمال کا سرچشمہ رحمت ہے۔ اور صفات جلال کا سرمنشاء غضب ہے۔ اسی لئے اس کی ذات بابرکات رحمن بھی ہے اور غضبان بھی۔ رحمت کی شان سے کرم فرماتا ہے۔ اور غضب کی شان سے تنبیہ و مواخذہ۔ ظاہر ہے کہ بندوں کو دونوں ہی کی ضرورت ہے کیونکہ مخلوق خیر و شر کے دو مادوں سے مرکب ہے، بندہ کی خیر رحمت خداوندی کو جذب کرتی ہے اور اس کا شر غضب الہی کو اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں نوعوں کے جمع ہونے بغیر ربوبیت اور پال پرورش کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ ماں ایک طرف بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اسے گھور کر طمانچے بھی مارتی ہے کیونکہ نرم اور گرم دونوں کے جمع کرنے سے ہی تربیت ہوتی ہے۔ ﴿بَلْ يَدَّاهُ مَبْسُوْطَتَانِ يَنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ ﴿٧﴾ ”(اس کے دونوں ہاتھ، مہر کے بھی اور قہر کے بھی) کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے صرف فرمائے۔“

جلال و جمال کے آثار و لوازم..... یہ دونوں شانیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اس لئے ان کے آثار و لوازم اور تقاضوں میں بھی یہی تقابل اور تضاد کی شان پائی جاتی ہے صفات جمال یعنی مہر و لطف کا قدرتی اثر انس و محبت اور گرویدگی و شفیقتگی ہے کہ بندہ رام ہو جائے، جھک جائے اور الفت میں سرشار ہو جائے، مجو ہو مٹا ہوا ہو، نہ اپنا ارادہ ہو نہ خواہش، نہ اپنی خبر نہ اپنے نام لگے ہوؤں کی پروا، سوختہ جانی ہو اور سوختہ روانی۔ ربودگی میں نہ اپنا باہر کا ہوش ہو اور نہ اندر کا جوش۔ مطمع نظر اور مقصد دل ہمہ وقت محبوب ہو اور اس کی ادائیں، اس کی طرف دوڑنا اور

① پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیہ: ۵۳۔ ② پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیہ: ۵۳۔ ③ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیہ: ۸۷۔

④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۹۹۔ ⑤ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیہ: ۳۷۔

⑥ پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیہ: ۸۹، ۹۰۔ ⑦ پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیہ: ۶۳۔

اسی کی طرف بھاگنا، سوتے جاگتے اس کا دھیان اور اس کے تصور میں محویت و سرشاری ہو۔ کہ صفات جمال کا یہی قدرتی تقاضا ہے اور صفات جلال یعنی قہر و غضب کا قدرتی اثر رعب و ہیبت، فکر و مغلوبیت، سرنگونی اور سرافگنی ہے کہ بندہ خوفزدہ اور لرزاں و ترساں رہے، گردن جھکی ہوئی ہو، ناک نیچی ہو اور دربار شاہی (مسجد) میں حاضر ہو تو نگاہ اعضاء کا ادب پیش نظر ہو، زبان خاموش ہو، چال میں سکون و مسکنت ہو، چہرے سے خوف و خشیت نمایاں ہو، ادب سے دایاں قدم پہلے ہو اور بایاں پیچھے، قیام دست بستہ ہو، ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، نشست ہو تو دوزانو ہو، کھڑا ہونا اور چلنا ہو تو سکون و تواضع سے ہو، نہ دوڑنا، نہ بھاگنا، لپکنا، نہ تھرکنا، سکینت و متانت میں ہمہ وقت غرق اور جوش کے ساتھ ہوش میں ہو، ہر آن محو و مستغرق، غرض ہر نقل و حرکت اور ہیبت و وضع میں ادب و خاکساری، ذلت و انکساری اور عجز و نیاز مندی رچی ہوئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ صفات قہر جلال چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے سامنے خوف و خشیت اور مرعوبیت کے ساتھ نیاز مندانہ حاضر ہوں جن کے رویں روئیں سے بندگی و مسکنت غلامی و جگہی اور تمام ضوابط حکومت کی عاقلانہ پابندی چسکتی ہو اور صفات مہر و جمال چاہتی ہیں کہ خدا کے بندے اس کے سامنے انس و محبت، فنایت و محویت اور استغراق و استہلاک کے ساتھ حاضر ہوں، جن کی ہر ایک نقل و حرکت سے ربودگی، خودگزاری از خود رفتگی، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا، عاشقانہ انداز سے نمایاں ہو، پہلی صورت مہذب اور باادب محکوم کی ہے۔ دوسری صورت ایک از خود رفتہ اور از خود گزشتہ عاشق کی ہے یعنی ایک شان کے نیچے آدمی عاشق فنا پسند ہوتا ہے۔ ایک کے نیچے عاقل فکر مند اس لئے اللہ کی ان دونوں صفات (جلال و جمال) کے تقاضوں سے انسان پر دو ہی قسم کی عبادتیں فرض ہوئیں۔ صفات جلال کے تحت اظہار عجز و نیاز اور مظاہرہ ذلت و مسکنت کی عبادت رکھی گئی جس کی صورت نماز ہے۔ اور صفات جمال کے تحت اظہار عشق و محبت اور مظاہرہ محویت و فنایت کی عبادت فرض ہوئی جس کی صورت حج ہے۔

نماز شان کبریائی کا مظہر..... چنانچہ نماز کے ایک ایک عمل سے اپنی ہی فدویت و عبدیت، لجاہت و سماجت اور مرعوبیت و ہیبت زدگی نمایاں کی جاتی ہے جس میں فکر و عقل کے ساتھ ادب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ ابتداء نماز ہی سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بیزار ہونا اور اس کے ساتھ اپنے حاکم مطلق اور بادشاہ عالمین کی بڑائی کا اعلان کرنا ہے جس کا نام تکبیر تحریمہ ہے۔ پھر چاکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا جس کا نام قیام ہے۔ پھر ذلیلوں کی طرح سر کو جھکا دینا جس کا نام رکوع ہے پھر انتہائی پستی کے ساتھ ہاتھ، ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا جس کا نام سجدہ ہے۔

پھر انتہاء ادب و تعظیم کے ساتھ اس کی یکتائی کی شہادت دینا جس کا نام تہجد ہے۔ پھر انتہائی بے بسی اور محتاجی کے ساتھ اسے پکارنا جس کا نام استغاثہ و فریاد ہے۔ پھر کمال ضعف و بے زوری اور انتہائی خوشامد کے ساتھ بھیک مانگنا جس کا نام دعا ہے پھر انتہائی تعلق و نیاز مندی کے ساتھ اس کے نابیوں اور خلفاء (انبیاء و اولیاء) تک پر

صلوٰۃ و سلام بھیجنا جس کا نام درود اور صلوٰۃ و سلام ہے۔ پھر انتہائی عقیدت و نیاز سے حاضرین دربار (شرکاء جماعت اور ملائکہ) کو دو طرفہ سلام دے کر رخصت ہونا، جس کا نام تحلیل و تسلیم ہے وغیرہ وغیرہ، وہ عاجز اندہ اور محکومانہ افعال ہیں جو بلحاظ حقیقت اللہ کی صفت حکومت و مالکیت اور حاکمیت و بادشاہت کا طبعی تقاضا ہیں۔ پس نماز اس کی شان کبریائی۔ اور شان جلال و حکمرانی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ میں خوف و خشیت کی تخم ریزی کرتی ہے جس سے وہ قانون الہی کی نافرمانی اور فواحش و منکرات سے بچ کر مقرب بارگاہ بن جاتا ہے۔

حج، ذاتی محبوبیت کا مظہر..... ادھر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک سنت و واجب سے عاشقی، محبت و انس اور محبوب پر مر مٹنے کا والہانہ اور شیدایانہ انداز سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حج میں مشغول انسان کی عاشقانہ کیفیات اور از خود رفتگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تن من و دھن کی کچھ پروا نہیں رہتی نہ کپڑوں کی خبر، نہ آرائش و زیبائش کی پروا نہ وضو و لباس نہ قطع و برید کی بو پاس بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، لبیں پھیلی ہوئیں۔ رواں چکنا ہوا، ننگے سر، ننگے پاؤں، کپڑے گرد آلود، بدن پر میل کچیل کی نمود، در محبوب پر سربہ سجود، گھر سے بے گھر، تارک مال و زر نہ کھانے کی پروا، نہ پینے کی خبر، دل پر لذت نکاح کا اثر نہ تن پر آزار دولت و زر، نہ صفائی و ستھرائی سے سردکار، نہ عطر و خوشبو کا روادار، نہ غسل کا دھیان نہ نظافت کا وہم و گمان، آثار و محبت سے وارفتہ، گریہ و لبکا سے سوختہ۔ رکی و قار سے دل گرفتہ، خانہ محبوب کے تصور میں از خود رفتہ، حضور ہی ہو تو حاضر حاضر کہہ کر چلانا۔ غیبت ہو تو دم بخود ہو جانا اور محبوب سامنے آئے تو لپکنا، خانہ محبوب کے ارد گرد چکر لگانا، درود یوار کو چھونا، پردہ ہائے دیوار سے لپٹنا اور رونا کہیں شوق میں لپکنا، کہیں خوف سے تھمنا، کہیں ذوق سے دوڑنا کہیں رعب جمال سے رکنا، خدام محبوب نمایاں ہوں تو نعرہ مستانہ کے ساتھ سر جھکا دینا اور دشمنان محبوب کا تصور آئے تو اکڑنا اور سینہ تان لینا، تجلی محبوب نمایاں ہو تو سرنگوں ہو جانا اور دشمن محبوب (شیطان) کا مقام سامنے آ جائے تو کنکر پتھر لے کر لپکنا اور مازنا، ہر لذت ہر زینت اور ہر رسمی صورت سے بیزار رہنا، کسی ایک جگہ قرار نہ پکڑنا، کوچہ ہائے محبوب کے درد کی خاک چھاننا، کبھی مکہ تو کبھی منی، کبھی عرفات، کبھی مزدلفہ نہ چال میں سکوں، نہ انداز میں قرار کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ اپنے کو مٹا دینے کا جذبہ اور تن من و دھن کو خاک میں ملا دینے کا داعیہ اور آخر فدائیت و جاں سپاری کی انتہا پر اپنے نفس کو بھی باذن محبوب فدیہ حیوان دے کر فدا کر دینا ذرا بھی کوتاہی ہو تو مال و زر دے کر خوشامد سے تلافی کرنا، وسیلہ محبوب کا دھیان آئے جس کی بدولت رسائی ممکن ہو تو سوجان سے وہاں حاضر ہونا، سلام کرنا، لجانا اور شوق و ذوق سے عرض و معروض کر کے وسیلہ لینا وغیرہ وہ عاشقانہ افعال ہیں جو عشق و محبت کے جذبہ میں فطرتاً عاشق سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفات جمال اور ذاتی محبوبیت کا متقضا ہیں۔

حسن تعبیر..... ان میں سے ترک آسائش و آرائش اور ترک لذت و زیبائش کے مجموعہ کا نام احرام ہے خانہ محبوب کے ارد گرد گھومنے کا نام طواف ہے۔ تصور اعداء کے موقعہ پر سینہ تان کر اکڑنے کا نام رمل ہے۔ ذوق و شوق میں

دوڑنے کا نام سہی ہے کوچہ ہائے محبوب کے دروں کی خاک چھاننے کے نام سیاحت حج ہے۔ خاک صحن پر ٹھہر کر گریہ و بکاء کرنے اور شوق وصال کے اظہار کا نام وقوف ہے۔ شیطان پر پتھر برسارنے کا نام رمی ہے۔ اور فدیہ حیوان کے ذریعہ خود فدا ہو جانے کا نام نحر ہے ان میں سے کسی بھی عاشقانہ فعل میں فروگزاشت کا نام جنایت ہے۔ اور اس کے تدارک و تلافی کا نام صدقہ و کفارہ ہے۔ اور پھر افعال کے مجموعہ کا نام مناسک ہے۔ اور پھر وسیلہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار (مدینہ) میں حاضر ہو کر زیارت کرنے اور صلوٰۃ و سلام کے بعد ہزار خوشامد سے وسیلہ لینے کا نام زیارت و توسل ہے۔

عجز و عشق کے مظاہر..... بہر حال پہلا مظاہرہ عجز و نیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئی ہیں۔ جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دونوں (جلال و جمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کے ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔ اس لئے اصولاً اسلام میں یہ دو ہی عبادتیں اصل ٹھہرتی ہیں کہ بلحاظ حقیقت ان کے سوا کوئی دوسری صورت عبادت کی ہے بھی نہیں، کہ عبادت کی متقاضی صفات کی نوعیں ہی یہ دو ہیں دو سے زائد نہیں۔

زکوٰۃ و روزہ کی حیثیت..... رہ گئی زکوٰۃ اور روزہ کہ عبادت انہیں بھی کہا گیا، بلکہ نماز و حج کی طرح مابانی اسلام میں شمار کرایا گیا ہے، سوا بلاشبہ وہ عبادت ہیں اور اسلام کی اساسی ہی عبادت ہیں لیکن پھر بھی ان کے اور نماز و حج کے عبادات ہونے کی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے غور کیا جائے تو زکوٰۃ اور روزہ خود اپنی ذات سے نہ عبادت ہے نہ اپنی ذات سے براہ راست مطلوب ہیں بلکہ نماز و حج کی خاطر مطلوب اور انہی کی بدولت عبادت بنی ہیں زکوٰۃ تو نماز کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت بنتی ہے اور روزہ حج کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت ہوتا ہے بالفاظ دیگر زکوٰۃ نماز کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور روزہ حج کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور وسیلہ چونکہ حکم میں مقصد ہی کے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں بھی نماز و حج کی وجہ سے عبادت بنادی گئیں خود اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔

مواعظ نماز اور ان کا تدارک..... وجہ یہ ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت میں اگر کوئی چیز خارج اور سد راہ ہے تو وہ سامان عیش اور وسائل عشرت ہیں جن کی لذتوں میں پڑ کر انسان میں نماز سے غفلت اور سستی و کسل پیدا ہوتا ہے اور آدمی جماعت سے ہی نہیں بلکہ نماز ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ نفس کی توجہ ایک آن میں دو طرف نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ نفس کے مرغوبات جب نفس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے تو مرغوب روحانی کی طرف کیسے متوجہ ہو سکے گا؟ اس لئے اکثر و بیشتر امراء ہی نماز سے غافل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ارد گرد جب اسباب عیش و نشاط اور لذات نفس کا ہجوم رہتا ہے تو انکے نفس کو طبعاً مسجد کی طرف دوڑنے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ نماز کی طرف رخ کریں،

البتہ غرباء، قلیل العیش اور محروم الوسائل ہوتے ہیں اس لئے عموماً وہ تعیش سے فارغ رہتے ہیں تو ان کا فارغ نفس بھی بے تکلف نماز کی طرف دوڑ سکتا ہے۔

امراء، نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے اس لئے شریعت نے مال و زر اور وسائل عیش و عشرت میں (جن میں لگ کر آدمی نماز اور مسجد سے غافل ہوتا ہے) توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور انہیں کم کرنے اور دلوں سے ان کی محبت و شغف نکال دینے کے لئے زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھی تاکہ مال دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے اور لٹانے کے علاقے سے انسانی نفس میں سے زر پرستی اور اس سے پیدا شدہ تعیش پسندی کے غیر معتدل جذبات نکل جائیں اور مال لٹانے کی سالانہ عبادت، پھر روز مرہ کے صدقات کی خوبیاں سے خود نفس کو بھی راہ خدا اور راہ عبادت میں لٹا دینے کے جذبات پیدا ہو جائیں۔

پھر چونکہ وسائل عیش کا تعلق صرف نقد و زر ہی سے نہیں بلکہ زمینی پیداوار اور پالتو جانور، سوار یوں کے حیوانات، زرتار، لہاسوں، زریں برتنوں حتیٰ کہ ہر تجارتی سامان سے ہے اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کا دائرہ بھی صرف نقد و سونا، چاندی اور دولت زریں ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام وسائل عیش میں اپنی اپنی شرائط و حدود کے ساتھ زکوٰۃ رکھی، چانچہ پالتو جانور، گھوڑے، اونٹ، گائے بھینس، بکری وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی۔ کھیتوں کی پیداوار وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی جس کا نام عشر ہے معدنیات اور کانوں میں زکوٰۃ رکھی دھنہ اور ہاتھ آجانے والے خزانہ میں بھی زکوٰۃ رکھی جس کا نام خمس ہے، پھر ہر ایک مال تجارت پر زکوٰۃ رکھی خواہ وہ مٹی ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے زر و مال بڑھنے اور اس کے بڑھنے سے وسائل عیش اور سامان راحت بڑھنے کا قدرتی تعلق ہے اور وہی تعلق نفس کو عیش پرستی میں مبتلا کر کے عبادت سے غافل اور بے تعلق بنا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ جب رکاوٹ کے اسباب ہٹ جاتے ہیں تو شے وجود پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جب راہ عبادت کا خارج یعنی زر و مال اور وسائل عیش و عشرت کو بہ صورت زکوٰۃ و صدقات راہ خدا میں فنا کر دینے کی عادت پڑ گئی اور دل میں ان کی رغبت میں شدت اور ہوس قائم نہ رہی تو نماز سے رکاوٹ ڈالنے والے اسباب ختم ہو گئے، اس لئے نماز آسان ہو گئی پس زکوٰۃ و صدقات درحقیقت نماز کو بروئے کار لانے کے لئے فرض کی گئی ہے، اس لیے وہ وسائل نماز میں سے ہوئی جو آدمی کو کھینچ تان کر نماز تک پہنچا دیتی ہیں اس لئے عبادت کی لائن میں نماز اصل ہوئی اور زکوٰۃ اس کے تابع ہو کر عبادت بنی جب کہ وسیلہ مقصود حکم میں مقصود ہی کے ہوتا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ زکوٰۃ مبادی نماز میں ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ: **وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ**۔ اس انداز کی بکثرت آیتیں اس کی شاہد عدل ہیں۔

نماز کی تمہید..... یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال و زر نہ ہو اور وہ خود ہی نان شبینہ کا محتاج ہو تو اس پر زکوٰۃ کی فرضیت ہی نہیں حالانکہ نماز بدستور فرض رہتی ہے کیونکہ علاوہ تکلیف بالا ایطاق کے یہاں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں

کیونکہ زکوٰۃ نماز کے مواعین رفع کرنے کے لئے رکھی تھی، جب یہاں مواعین صلوٰۃ ہی نہیں تو رفع مواعین (زکوٰۃ) کی حاجت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اس قسم کے غریب مسکین انسان عام حالات میں نماز سے بھی بیگانہ نہیں ہوتے کیونکہ جب وسائل عیش ہی مفقود ہیں جو عبادت اور بالخصوص نماز میں حارج ہوتے تھے تو ایک بے زر اور بے پر آدمی طبعی طور پر خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور نماز میں کمی ست نہیں ہوتا اسی لئے مسلم کو عام حالات میں زہد و قناعت کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ وہ جس قدر قلیل العیش ہوگا، اسی قدر طاعت و عبادت کی طرف رخ کئے ہوئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی اسے زکوٰۃ سے بیگانہ بنانے کے ہوئے، اگر زکوٰۃ بذاتہ مقصود ہوتی تو بجائے زہد و قناعت کے تمول اور نکاحا ثمال کی ترغیب دی جاتی بہر حال دولت ہو تو اس پر اندرون حدود زکوٰۃ و صدقات کے احکام عائد ہو کر اسے قلیل العیش بنادیتے ہیں اور نہ ہو تو اس پر احکام زکوٰۃ و صدقات اس لیے لاگو نہیں ہوتے وہ پہلے ہی قلیل العیش ہے۔ اس لئے ان دونوں ہی صورتوں میں آدمی اپنے مقصد تخلیق (عبادت) کی طرف توجہ کئے ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ دولت و مال چونکہ راہ عبادت میں حارج ہوتا ہے اور اس کے نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں کارخانہ عبادت میں خلل نہیں پڑتا۔

اس لئے زہد و قناعت اور مال کو لٹانے یا گھٹانے کی ترغیبیں دی گئیں جس سے زکوٰۃ کا وسیلہ عبادت اور بالخصوص وسیلہ نماز ہونا نمایاں ہے۔ اور ثابت ہو جاتا کہ حقیقی عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہی ہے جس کے بغیر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہو سکتا اور زکوٰۃ اس کا وسیلہ اور اسے بروئے کار لانے کی ایک تمہید ہے خود اصل نہیں۔

مواعین حج اور ان کا تذکرہ ادھر حج کی عاشقانہ عبادت چونکہ مظاہر محبت ہے اور محبت میں سب سے پہلی چیز ماسوا اور غیر محبوب کا ترک ہے ورنہ اگر عاشق غیر محبوب کی طرف مائل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کی طرف اس کا میلان یا سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو کمزور ہے تو اسے عاشق ہی کیوں کہیں گے۔

پس ایک حج کرنے والے عاشق خداوندی کا پہلا قدم خدا کے ماسوی کو ترک کر دینا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ماسوی اللہ مرغوبات نفس ہی ہو سکتے ہیں۔ جن میں بڑا مرغوب جس سے انسان کا دل انکا ہوا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور عورت سے لذت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے سارے جھگڑے انہیں چند مرغوبات نفس کے لئے آدمی سر لیتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک دل میں ان چیزوں سے شغف اور کمال رغبت باقی رہے گا۔ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ شانہ) کا شغف و عشق اس دل میں کہاں سے جگہ پاسکے گا؟ اس لئے اس محبت و عشق کی عبادت یعنی حج کے ابتدائی مراحل میں ایک عاشق خداوندی کے لئے سب سے پہلے کھانے پینے اور بیوی کی لذت اٹھانے کے شغف اور غیر معمولی لگاؤ سے الگ رہنا قدرتا ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ عشق الہی کا مظاہر جسے حج کہتے ہیں شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے شریعت نے حج کے مہینوں سے قبل مصلیٰ ہی رمضان کا مہینہ رکھا تا کہ تیس دن تک نفس کے ان اولین مرغوبات کھانا پینا اور لذت جماع کی غیر معمولی

خواہش کو روزہ کے ذریعے کم سے کم کر دیا جائے۔ پس مہینہ کے تیس دنوں میں دن بھر تو یہ لذتیں روزہ کے ذریعہ بالکل ہی چھڑادی جاتی ہیں اور بھوک پیاس سے کمزوری لاحق ہو جانے سے رمضان کی راتوں میں بھی آدمی ان لذتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا ادھر راتوں میں تراویح اور تلاوت قرآن پاک کا شغل مقرر کر دیا گیا جس سے ان لذات کے لئے کچھ وقت بھی پورا نہیں ملتا کہ آدمی کا دل ان میں پھنسے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک ان لذتوں سے بیگانہ رکھ کر رمضان میں یہ بنیادی لذتیں چھڑادی جاتی ہیں تاکہ ان مرغوبات نفس کی خواہش ابھری ہوئی نہ رہے بلکہ ان کی محبت و رغبت کا دھیان دب جائے اور آدمی ان سے بیگانہ ہو کر محبت حق کے مظاہرہ کے قابل ہو جائے۔

حکمت اعتکاف..... لیکن اس کے بعد بھی گھربار کی محبت بدستور باقی رہتی تھی مکان کی آسائش اور گھریلو سامان کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ حالانکہ یہ بھی وہی ماسوی اللہ ہے جو محبت الہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے ہی درجہ میں سہی، اس لئے رمضان کے بیس دن گزرنے کے بعد عشرہ آخر میں اعتکاف کی سنت کے ذریعہ گھر بھی چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی گھریلو زندگی چھوڑ کر خانہ خدا میں پہنچے اور رات دن وہیں بسر کرے اور اس طرح کھانے پینے اور لذت جماع سے بیگانگی کے بعد وہ گھریلو سامان سے بھی دستبردار ہو جائے اور اس طرح نفس کے اور دوسرے محبوبات بھی ترک کرنے کی اس میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔

خطاب حج..... پس! ماہ رمضان میں ان بنیادی لذات کے ترک کر دینے کی مشق سے جب آدمی کا دل محبوب حقیقی کی طرف بڑھ گیا اور اس کی طرف دوڑنے کی اس میں قریبی استعداد پیدا ہو گئی تو رمضان ختم ہوتے ہی اشہر حج (حج کے مہینے) شروع ہو جاتے ہیں اور افعال حج کے آغاز کا وقت آ جاتا ہے کہ آدمی دیار محبوب کی طرف دوڑ پڑے گویا اس عاشق خداوندی کی طرف کھانے پینے بیوی بچوں اور گھربار سے دل ہٹا لیا تھا۔ شرعی خطاب متوجہ ہوتا ہے کہ اس عشق کی راہ میں کھانا پینا بیوی اور گھر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے، اب وطن بھی ترک کر دو اور دیار محبوب کی طرف کوچ کرو کہ وطن بھی ایک بڑا بت ہے جو راہ خدا میں حارج ہوتا ہے۔

حکمت احرام..... پھر یہ عاشق خداوندی جب وطن چھوڑ کر جنگلوں بیابانوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا دیار محبوب میں داخل ہو گیا تو حرم الہی کی میقات آتے ہی محبوب حقیقی کا حکم یہ ملا کہ یہ کھانے پینے زن و فرزند گھربار اور وطن و ملک کا چھوڑ دینا بھی اس راہ عشق میں کافی نہیں بلکہ لباس زینت بھی ترک کرو سلے ہوئے کپڑے بھی چھوڑو کہ اس لذت کا شغل بھی محبوب حقیقی کے وصال میں حارج اور عشق کی غیرت کے خلاف ہے۔ صرف تن ڈھاکنے کی حد تک احرام کی کفنی پر قناعت کرو، ایک چادر بدن کا نصف بالا ڈھاکنے کے لئے اور ایک چادر بدن کا نصف زیریں۔ چھپانے کے لئے ہونہ سر پر ٹوپی اور عمامہ ہو جو سر کو ڈھانپ دے نہ پیر میں کوئی گھیرا جوتا جو پورا ڈھانپ لے تاکہ جیسے رمضان میں اس عشق الہی کا باطن گرویدہ محبت ہو چکا تھا، اب اس کا اظہار

بھی آمار عشق سے ہو جائے اور اس عاشق الہی کو عشق میں تن من دھن کی کوئی خبر نہ رہے۔

عاشقانہ بول..... لیکن اس ظاہر و باطن کے درمیان کی ایک چیز ابھی باقی تھی جو ابھی تک آمار عشق سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور وہ زبان ہے جو کسی حد تک ظاہر ہے اور کسی حد تک باطن یعنی ظاہر و باطن کے درمیان ایک برزخ ہے جو باطن کی تو ترجمان ہے اور ظاہر کی نگہبان ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اسے بھی اس عشق سے حصہ ملے اور ظاہر ہے کہ زبان کا حصہ قول اور بول ہی کی شکل کا ہو سکتا تھا اس لیے اسے عاشقانہ بول دیا گیا کہ وہ قدم قدم پر خود اپنی ترجمانی کی بجائے محبوب حقیقی کی محبت کی ترجمانی کرے اس لئے احرام باندھتے ہی زبان کو لبیک لبیک کے کلمہ سے ذکر محبوب کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ زبان کے ذریعے نفس اور خواہشات نفس کی ترجمانی نہ ہو بلکہ حضوری حق کے جذبات کی ترجمانی ہو اور اس قہنجی کی طرح چلنے والی زبان کے تقاضے آزاد نہ رہیں کہ وہ جتنا چاہے اور جو چاہے بولتی رہے اس لئے عاشق کے ان ایام عشق میں ہر تغیر اور ہر موڑ پر لبیک کا نعرہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نیچائی اور اونچائی ہر پہاڑ ہر غار ہر قافلہ ہر جماعت کی مڈ بھیڑ پر یہی عاشقانہ و الہانہ نعرہ زبان پر چھایا ہوا رہے کہ لبیک اللہم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک پس اس طرح کی آزاد لذت بھی اس عاشق حق سے ترک کرادی گئی اور یہ عاشق اپنی زبان اپنے دل اور اپنے تمام تر اعضاء و جوارح سے صرف اپنے محبوب حقیقی ہی میں مشغول و منہمک ہو گیا۔

حکمت طواف..... اب جب کہ خانہ محبوب تک رسائی ہو گئی۔ آدمی مکہ محترمہ اور حرم محترم میں پہنچ گیا اور خانہ خدا کے سامنے آ گیا جس میں جمالات حق تجلی ریز ہیں تو پھر شرعی خطاب متوجہ ہوا کہ تم نے اب تک محبوبات نفس گھربار و مسائل عیش اور اسباب راحت و عیش کی خاطر بہت چکر لگائے تھے اب یہ چال اور چکر ان سب چیزوں سے ختم کر کے خانہ محبوب کے لیے مختص کردو اور عشق کی وارفتگیوں میں غرق ہو کر محبوب کے گھر کے ارد گرد پروانوں کی طرح چکر لگاؤ ایک دو پھیروں سے نہیں بلکہ سات پھیرے پھر و جو فن حساب کی رو سے عدد زائد ہے اور کبھی گھٹنے والا نہیں پھر طواف بھی ایک دو بار نہیں بلکہ ان پاک ایام اور مکہ کے قیام کی اعلیٰ ترین عبادت ہی یہ چکر لگانا اور خانہ محبوب کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہنا ہے جس کا نام طواف ہے۔

حکمت وقوف عرفات..... پھر مکہ کے مقدس شہر کا قیام گو وطن کا قیام نہیں مگر بہر حال شہر کا قیام ضرور ہے۔ اس میں وطن کی عمارتیں نہ سہی بلکہ الہی کی ہی سہی جو شہری زندگی کی ساری راحتیں لذتیں اور زینتیں لئے ہوئے ہیں اور عاشق کی شان غیرت کے یہی خلاف تھا کہ عاشق کا دل عمارتوں اور سامان عیش و تمدن میں کسی بھی درجہ میں انکار ہے اس لئے اصل حج کے لئے جو حقیقی طور پر شان عشق کا مظاہرہ تھا ایام حج میں حکم یہ ملا کہ مکہ کی شہری آبادی بھی ترک کرو اور عرفات کے ریکستان میں ننگے سر ننگے پاؤں کفنی پہنے ہوئے پہنچو کہ اصل حج یہی ہے کہ ایک چٹیل میدان میں گھر بار بیوی بچے سامان تمدن اور وسائل عیش کی متقاضی ہوتی ہے بلکہ ایک کپڑے کا مسافر خانہ یعنی خیمہ ہو اور تم ہو۔ تاکہ اعلیٰ ترین ترک لذات کا مقام حاصل ہو جائے جو ایک عاشق کے لئے سزاوار و اجابت عشق کے لئے درکار ہے۔

فدیہ جان..... ہاں مگر پھر بھی سب تروک کے بعد عاشق کا نفس ابھی عاشق کے پاس ہی تھا جس کی رو سے وہ اپنے کو ”اَنَا“ اور ”میں“ کہہ سکتا تھا۔ دارِ انحالیکہ کمالِ عشق کے لئے یہ بھی ایک چیلنج ہے کہ عاشق اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر بمقابلہ محبوب اس کا تصور بھی دل میں قائم رکھے۔ بلکہ اس کا آخری فریضہ یہ ہے کہ راہِ محبوب میں اپنے نفس کو بھی ایثار کر دے اور اس ظاہری ہستی سے بھی سبکدوش ہو جائے تو خطابِ شرعی متوجہ ہوا کہ عرفات سے لوٹ کر منی پہنچا اور اس کے قطعہ جاں سپاری میں پہنچ کر جیسے مخر کہتے ہیں ٹار ہونے کے لئے اپنی جان بھی پیش کر دو، یعنی اسے بھی ترک کرنے کا عزم باندھ لو، اب یہ محبوب حقیقی کا لطف و کرم ہے کہ اس سچے عاشق کی طرف سے جس نے اپنی ساری زندگی کی تمام لذات اور آخر کار خود زندگی ہی کو پیش کر دیا، قبول فرما کر اس کی جان کے بدلے قربانی کے جانور کی جان بطور فدیہ قبول فرمائے اور اس کے بعد پھر گھر لوٹ جانے اور تروک و وسائلِ عیش سے لذت اندوز ہونے کی اجازت عطا فرمائے۔ اس لئے منی میں قربانی کا حکم ہوا کہ جان کا فدیہ جان سے دیدو۔ یہ خود تمہارا اپنے نفس کا فدا ہونا ہی سمجھا جائے گا پس محبوب کے لئے آخر میں جان بھی پیش کر دی جاتی ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے۔

مقدمہ حج..... بہر حال اس سے واضح ہے کہ حج تروک کا مجموعہ ہے، ترکِ لذت، ترکِ زینت، ترکِ راحت خانہ ترک لباس ترک وطن ترک جاہ۔ اور ترک مال وغیرہ جس کی ابتداء کھانے پینے اور عورت اور گھر کے ترک کرنے سے ہوتی ہے، یہی دینی زندگی کی لذات کا اعظم ترین حصہ ہے بلکہ دوسری لذات کا سرچشمہ ہے، جسے اشہر حج سے قبل کے سینے (رمضان) میں حج کی خاطر چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے تروک کی استعداد پیدا ہو جائے، اگر کھانے پینے اور بیوی سے کنارہ کشی کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو اگلے کسی ترک پر بھی آدمی مستعد اور آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے روزہ کی عبادت درحقیقت حج کا مقدمہ ثابت ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی عبادت نماز کا مقدمہ ثابت ہوئی تھی جس سے پوری طرح کھل جاتا ہے کہ اسلام میں اصل عبادتیں دو ہی ہیں نماز اور حج۔ ایک صفاتِ جلال کا تقاضا ہے اور ایک صفاتِ جمال کا اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے وسائل اور مبادی میں سے ہیں۔ جنہیں ان دو کی وجہ سے عبادت بنا دیا گیا ہے۔ خود بذاتہ عبادت کے بارہ میں اصل نہیں ہیں۔

زکوٰۃ و روزہ ”عبادتِ لغیرہ“ ہیں..... یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز اور حج میں وسائلِ دولت یا وسائلِ لذت کے خارج ہونے کا امکان نہ ہو وہاں نماز اور حج تو ہو گا مگر زکوٰۃ و روزہ کی عبادت نہ ہوگی جیسے ملائکہ کو نماز بھی دی گئی ہے وہ ہرقت رکوع و سجود اور قیام میں ہیں اور حج بھی دیا گیا ہے۔ کہ وہ روزانہ ساتویں آسمان پر ”بیت المعمور“ کا حج اور طواف کرتے ہیں بلکہ ہر آسمان میں بیت المعمور کی سیدھ میں ایک ایک قبلہ ہے جس کا اس آسمان کے باشندے طواف کرتے ہیں مگر ملائکہ میں چونکہ نہ مال و دولت کا قصہ ہے نہ شہوت و زینت اور غضب کا کہ وہ نماز اور حج سے روکیں اس لئے انہیں نہ زکوٰۃ کا پابند کیا گیا نہ روزہ کا کہ وہ خود ہی پاک ہیں، پھر مال دلوا کر اور روزہ رکھوا کر انہیں پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس سے صاف نمایاں ہے زکوٰۃ اور روزہ درحقیقت نماز اور حج ہی کے لئے رکھا گیا

ہے اور یہ ان کے مبادی میں سے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ نفس کو پاک اور صالح بنا کر نماز اور حج کے لئے مستعد بنایا جائے پاکی اور صفائی پہلے سے حاصل ہے وہاں نماز اور حج تو قائم رہے زکوٰۃ اور روزہ درمیان میں سے نکال لیا گیا، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نماز اور حج تو صفات الہیہ کا تقاضا ہیں۔ ایک صفات جلال کا اور ایک صفات جمال کا لیکن زکوٰۃ اور روزہ صفات نفس کا تقاضا ہیں کہ جب تک زکوٰۃ اور روزہ کے ذریعے انسانی نفس کو پاک نہ کیا جائے وہ نماز اور حج کے قابل نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ حقیقی معنی میں عبادت وہی ہوتی ہے جس کا تقاضا معبود کی صفات کریں نہ کہ وہ جن کا تقاضا خود عابد کی صفات کریں، گو معبود ہی کے لئے کریں، اس لئے نماز اور حج تو بذاتہ یا خود عبادت ثابت ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزہ بذاتہ عبادت نہیں بلکہ ان دو اصلی عبادتوں کا وسیلہ بن کر بغیر عبادت ثابت ہوئیں اور یہی مقصود تھا اس بیان کا۔

نماز و حج میں باہم نسبت تضاد..... اب ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں مزید غور کیا جائے تو جیسے ان میں بلحاظ منشاء کے فرق ہے کہ ایک جلالی صفات سے پیدا شدہ ہے اور ایک جمالی صفات سے ایک میں گرمی ہے اور ایک میں نرمی ویسے ہی ان کے آثار و لوازم میں بھی کافی فرق بلکہ تضاد کی نسبت ہے، جو چیزیں نماز میں مستحسن اور ضروری ہیں وہ حج میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ ممنوع اور قبیح ہیں، اور جو باتیں حج میں مطلوب اور ضروری ہیں وہ نماز میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔

نماز چونکہ احکم الحاکمین کے شاہی دربار کی حاضری ہے اس لئے اس میں تو آداب شاہی کی رعایت کی گئی ہے بیچ وقت وضو جو غسل کے قائم مقام ہے لباس کی صفائی اور ستھرائی اور اس پر خوشبو یا کا استعمال، وقار اور متانت کے ساتھ مساجد کی حاضری کی بھاگتے دوڑتے نہ آویں بلکہ متین چال سے چل کر پہنچیں، سنجیدگی سے نشست و برخاست ہو، بے ڈھنگا پن نہ ہو، سکوت و خاموشی یا ذکر خفی کے ساتھ بیٹھنا ہو، شور و شغب یا آواز کی بلندی نہ ہو، بخلاف حج کے کہ وہ محبوب کے در پر عشاق کی حاضری ہے اس لئے وہاں عشق و محبت کی وارفتگی، سوز و گداز افروختن و سوسن و جامہ گزیدن اور بیتابی و تڑپ کے ساتھ وجدی حرکتیں مطلوب ہیں تاکہ عقل و مصلحت بینی کی باتیں یا اپنی آرائش و زیبائش اور زیب و زینت جس سے عاشق کو اپنی دھن میں مئے رہنے کے سبب کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس لئے اگر نماز میں صفائی ستھرائی اصل تھی تو یہاں بے زیب و زینت رہنا اصل ہے کہ ”الْحَجُّ الْمَعْجُ وَالنَّحْجُ“ ① وہاں لباس عمدگی کی مطلوب تھی تو یہاں سرے سے سلاہو لباس ہی ممنوع ہے، وہاں لباس کی زینت مطلوب تھی تو یہاں ترک زینت مطلوب ہے وہاں خوشبو لگانا مستحسن تھا یہاں احرام کے بعد خوشبو حرام ہے، وہاں نمازوں اور بالخصوص جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لئے بدن کی معتدل زینت ضروری تھی جو حجامت سے حاصل ہوتی

① السنن للترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی فضل التلبیۃ والنحر، ص: ۷۲۹، رقم: ۸۲۷.

ہے۔ یہاں محرم کے لئے سرے سے بدن کی آرائش، اصلاح خط اور حجامت ہی ناجائز ہے، وہاں سکوت اور سرفخا ضروری تھا یہاں لبیک لبیک کا شور ہے وہاں سکون اعضاء و جوارح ضروری تھا کہ ایک جگہ جم کر کھڑے رہیں یا فکر میں مستغرق رہیں اور بیٹھیں تو گردن جھکا کر سکون سے بیٹھے رہیں۔ یہاں نقل و حرکت بلکہ بھاگ دوڑ ضروری ہے۔ کہیں صفامردہ پر دوڑنا کہیں طواف میں چکر کاٹنا، وہاں تواضع سے گردن جھکانا ضروری تھی اور یہاں سعی سے پہلے کے طواف میں گردن تاننا اور اکڑا کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا و اجبات میں سے ہے، وہاں نمازوں کا اکثر حصہ جیسے سنتیں اور نفلیں گھر میں پڑھنا مستحب تھا، یہاں سرے سے گھر چھوڑ دیا محبوب میں آنا ضروری ہے کہ حج فرض ہو یا نقل گھر بیٹھ کر ہو، ہی نہیں سکتا۔

وہاں خون گرانے سے بچنا ضروری تھا اور یہاں اہراق دم یعنی منی میں خون بہانا ہی اصل عبادت ہے، وہاں شیطانی دوسوں کا مقابلہ ناپسند بلکہ دفع الوقتی اور ادھر سے خیال ہٹا دینا ہی دوسرے کا علاج ہے۔ یہاں خود شیطان کے مواقع محل کے بھی مد مقابل آکر اسے نکلروں سے سنگسار کرنا ضروری ہے، غرض وہاں افعال ہی افعال ہیں اور یہاں تروک ہی تروک۔

وہاں بقا و شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضا ہے اور یہاں فنا و لحویت کی شان وہاں بقا و شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضہ ہے اور یہاں فنا و لحویت کی شان لازمی ہے جو عشق کا مقتضا ہے غرض ان دونوں عبادتوں کے لوازم و آثار میں تضاد کی نسبت ہے، جیسا کہ عقل اور عشق کے تقاضوں میں تضاد کی نسبت ہے، بادشاہ کے دربار میں عقل و ہوش کے ساتھ آنا پڑتا ہے، اور محبوب کے در پر عقل و شعور سے بالا ہو کر محویت و ربودگی کے ساتھ حاضر ہونا ہوتا ہے غرض یہ واضح ہو گیا کہ ادھر حق تعالیٰ کی صفات کمال کی دو شانیں تھیں، صفات جلال اور صفات جمال اور ادھر ہر بندہ میں بھی دو ہی جوہر رکھے گئے تھے۔ ایک عقل اور ایک عشق یعنی اگر اللہ کی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حاکم بھی ہو اور محبوب بھی۔ تو بندہ کے ان دو جوہروں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا محکوم بھی ہو اور عاشق بھی۔

ان دونوں تقاضوں سے یہ دونوں عبادتیں مقرر ہوئیں، ایک نماز جس میں حاکم حقیقی کے سامنے اپنی حکومت و فدویت اور نیاز مندی و عبدیت پیش کی جاتی ہے، اور ایک حج جس میں محبوب حقیقی کے سامنے اپنی محویت اور ربودگی اور جاں نثاری اور جاں سپاری پیش کی جاتی ہے، اس لئے دونوں عبادتیں اسلام کا بنیادی موضوع ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لئے جن میں اسلام سمجھانے کے لئے تحریری مواد فراہم کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ اولاً عبادات اور خصوصاً نماز و حج کے لئے سب سے پہلے مواد فراہم کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں عبادتیں اسی کی مستحق بھی ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں۔ چنانچہ نماز پر بھی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن میں نماز کے مسائل نماز کے افعال، نماز کی روح، نماز کے اسرار، نماز کے مصالح، نماز کی غرض و غایت، نماز کے ثمرات و نتائج وغیرہ جمع کئے گئے ہیں اور ایسی کتابوں کا ایک بڑا عدد تاریخ کے اوراق میں دستیاب ہوتا ہے۔

اسی طرح مناسک حج پر بھی کتابوں کا ایک ذخیرہ ملے گا جو اس اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مرتب ہوا ہے۔ فضائل حج، مسائل حج، دلائل حج، اسرار حج، آمار حج، شعائر حج، مقامات حج، تاریخ حج، جغرافیہ حج، طریق حج وغیرہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دونوں موضوع اسی کے مستحق بھی تھے کہ ان پر سفینے مرتب ہوں اور ان کے حقائق محض سینوں کی امانت نہ بنے رہیں جب کہ یہی دو عبادتیں اسلام کی اساس اور حقیقی عبادتیں تھیں جن سے دوسری عبادتوں نے جنم لیا، پھر اس میں بھی خصوصیت سے حج کی عبادت چونکہ نقل و حرکت اور سیروسیاحت کی عبادت تھی جس میں ایک حاجی کو اپنی نظر و فکر کی مستعدی کی حد تک مختلف رنگ کے تجربات بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے حج سے متعلقہ تصانیف میں سفر ناموں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اہل علم حجاج نے بوقت سفر حج قلمبند کیا اور اپنے تجربات سے مابعد کے حجاج کو مستفید ہونے کا موقع بخشا تا کہ ان کے تجربات سے بعد کے لوگ مختلف معلوماتی فوائد بھی حاصل کریں اور پچھلوں کے تجربات اگلوں کے لئے راہ حج میں مدد اور آسانوں کا ذریعہ ثابت ہوں۔

علمی حج..... خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے بھائی مگر بزرگ بھائی دوست اور مخلص دوست متدین اور متقی عالم مولانا محمود حسن صاحب گویا وی دام مجددہ فاضل دیوبند نے بھی اپنے سفر حج میں اپنے علمی حج کو علمی حج بنانے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے سفر حج کے کوائف و تجربات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سفرنامہ کی صورت میں مرتب فرمایا نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ شرعی اور فنی طور بھی حج کے مختلف پہلوؤں کو اپنے علم و عمل اور تجربہ کی روشنی میں جمع فرمایا ہے، جس کے عنوانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں حج کے تمام مآلہ و مآغلینہ سے بحث کرتے ہوئے مسائل، فضائل، دلائل، شمائل، شعائر آثار، و قائل حوادث و ضروریات وغیرہ کا ایک معتد بہ اور بڑا ذخیرہ جمع فرمادیا ہے جو ان کے علم و عمل اور اخلاص و ایثار کا شاہکار ہے اس لئے یہ سفرنامہ تاریخ، تحقیق، فقہ، کلام، روایت اور درایت ہر پہلو سے حج کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے حج کو ”آئینہ“ بنا کر طالبوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور خصوصیت سے یہ مصنف مدوح کا خاص احسان ہے کہ انہوں نے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات سے بھی دنیا کو فائدہ پہنچانے کی سعی فرمائی ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللَّهُ عَنَّا وَعَنْ جَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔

آئینہ حج اور آئینہ نمازی..... محترم مصنف کی خواہش تھی کہ میں اس رسالہ ”آئینہ حج“ پر بطور مقدمہ چند سطریں لکھ کر پیش کروں میرے لئے سب سے بڑی مشکل وقت نکالنے کی تھی، پھر اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسے اہم اسلامی موضوع پر قلم چلانے کی تھی اور اوپر سے کتاب اپنی جامعیت اور مکمل تفصیلات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے بھی مقدمہ تمہید سے بے نیاز بھی تھی جب کہ اس میں جن کا پہلو خود ہی موجود ہے اس لئے تفصیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی پھر بھی یہ چند سطریں کسی نہ کسی طرح سفر و حضر میں تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر پوری کیوں اور محض ”آئینہ حج“ پیش کر دینے کے لئے پیش کر دی گئیں تاکہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر لوگ خود ہی اس کا اور اپنا اندازہ لگا سکیں۔ ورنہ جہاں تک حج کے

پہلوؤں کا تعلق ہے یہ ”آئینہ“ سارے حج کا خود ہی آئینہ دار ہے، جس کے جوہروں میں حج کے سارے ہی پہلو جلوہ گر ہیں، نہ اس میں کسی کی بیشی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی، نہ تمہید کی، نہ مقدمہ کی، پس یہ مقدمہ آئینہ حج میں خود اپنے کو دیکھنے کے لئے بطور آئینہ کے پیش کیا جا رہا ہے نہ کہ حج کو دیکھنے کے لئے۔ کہ حج نمائی کا آئینہ بنانا۔

مصنف محترم جیسے عالم و فاضل کا کام تھا جنہوں نے آئینہ حقیقتاً بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ میرا کام صرف آئینہ نمائی تھا جو برے بھلے انداز سے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنف ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور سفر نامہ کی اس علمی سعی کو مشکور فرمائے۔ (آمین)

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يَبْنِئُهُ تَعِیْمُ الصَّالِحَاتِ.

پس منظر..... جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر امیر جامعہ اور منتظمین جلسہ کے اصرار پر حضرت مہتمم صاحب (رحمۃ اللہ) نے ایک نہایت ہی مختصر مگر نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا جو اس درجہ موثر و مقبول ہوا کہ اساتذہ کرام جامعہ ملیہ اور دیگر حضرات نے حضرت موصوف سے اس کے قلمبند کرنے کی فرمائش کی۔ تاکہ اشاعت کے ذریعہ اس کو غائبین تک بھی پہنچایا جائے اور وہ بھی اس سے اسی طرح مستفیض و معظوظ ہوں جس طرح حاضرین نے فیض حاصل کیا۔ چونکہ وہاں مصروفیت زیادہ رہی اور قیام گاہ پر زائرین اور ملاقاتیوں کا برابر ہجوم رہا۔ اس لئے اس خطبہ کو قلمبند کرنے کا موقع نہ ملا۔

دیوبند مراجعت فرمانے کے بعد احقر کے اصرار پر باوجود انتہائی عدم ایم الفرحتی کے حضرت موصوف نے یہ خطبہ قلمبند فرما کر مرحمت فرمایا ہے کہ اگرچہ تقریر کا بعد از وقت بعینہ تحریر میں آجانا تو عادتاً ناممکن ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چونکہ یہ تحریر حضرت موصوف کے قلم سے ہو کر شائع ہو رہی ہے اس لئے ایک حد تک اصل تقریر کی غمازی کر سکے گی۔

(احقر: مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

اہمیت نماز

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِبَشِيرٍ وَنَذِيرٍ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِينًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. ﴿وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَبُوا مَعَهُ الرَّاكِبِينَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ.

کائنات کا انتہائی مقصد..... بزرگان محترم! مجھے اس وقت کوئی تقریر کرنا منظور نہیں ہے اور نہ اس کا پروگرام ہی ہے، مجھے امر کیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات سے مسجد کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں دعا کراؤں یہ ظاہر ہے کہ دعا کرانے کی چیز نہیں ہے۔ کرنے کی چیز ہے۔ آپ بھی خود ہی دعا کریں گے اور یہ بھی دعا کرنے میں آپ کے ساتھ شامل ہوگا۔ اس لئے دعا کرانے کے لئے بھی میں نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ مقصد دعا سے پہلے دعا کے نقاط پر توجہ دلانا ہے کہ کن پہلوؤں پر دعا کریں گے۔ اور حق تعالیٰ سے کن مقاصد کا سوال کریں گے۔ کیونکہ اس وقت مطلقاً دعا مقصود نہیں ہے بلکہ دعا خاص مقصود ہے۔ سو اس دعا کے نقاط اور پہلوؤں پر اس طرح سے غور کیجئے کہ اس ساری کائنات کا پھل اور آخری مقصد انسان ہے جس کے لئے زمین و آسمان کا یہ سارا خیمہ تانا گیا ہے۔ اگر انسان کی تخلیق منظور نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق بھی عمل میں نہ آتی۔ پس ساری کائنات انسان کی خاطر بنائی گئی ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ** ② ”ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے۔“ ارشاد بانی ہے: **﴿خُلِقَ لَكُمْ مَالِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾** ③ ”اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہیں۔“ ایک جگہ فرماتے ہیں: **﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً**

① پارہ ۱: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۳.

② شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵.

③ پارہ ۱: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۹.

فَاَخْرِجْ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَاسْعَوْا لَكُمْ الْفُلُوكَ لَتَجْعَزَىٰ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَعَوْا لَكُمْ الْاَنْهَارَ
وَسَعَوْا لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَعَوْا لَكُمْ الْاَيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاتَّكُم مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ﴿١﴾
”اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی کو اتارا اور اس سے پھل لگائے
تمہارے رزق کے لئے اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ اس کے حکم سے وہ دریا میں چلیں اور دریا تمہارے
کام میں لگائے اور آفتاب ماہتاب تمہارے کام میں جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے کام میں لگادیا اور وہ
سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے اس سے مانگا۔ (خواہ دعا تو لی سے یا دعا عملی یعنی اختیار و اسباب سے)“

پس زمین و آسمان، رات دن کا لوٹ پھیر، شجر و حجر اور بحر و بر کا کارخانہ سب کچھ انسان ہی کے لئے تیار کیا
گیا ہے جس سے واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا انتہائی مقصد انسان ہے۔ پھر یہ انسان کس لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ
کائنات کے لئے نہیں۔ ورنہ وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جائے گا اور یہ خلاف نقل و عقل اور خلاف مشاہدہ ہے
جیسا کہ واضح ہوا۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ ہے کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بلکہ خالق کائنات کے لئے ہے یعنی
اس کی عبادت کے لئے۔ اس کے سامنے جھکنے اور گڑ گڑانے اور اس کے آگے سرعہ عبودیت خم کرنے کے لئے پس
انسان کا مقصد تخلیق عبادت نکلا اور اب منطقی اصول پر نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے
لئے تو ساری کائنات کی یہ تنظیم و تخلیق صرف عبادت کے لئے عمل میں آئی ہے۔

عبادت کا فرد کامل عبادت پر اگر آپ غور کریں گے تو اس کا فرد کامل نماز ہے۔ گویا ساری دنیا نماز کے لئے
بنائی گئی ہے کہ یہی عبادت کا فرد کامل اور مظہر اتم ہے بلکہ میں ترقی کر کے یہ عرض کروں گا کہ سلسلہ عبادت میں
عبادت صرف نماز ہی ہے اور کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کے معنی غایت تذلل اور انتہائی ذلت اختیار
کرنے کے ہیں جو انتہائی عزت والے کے سامنے اختیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے نماز کے سوا
کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں نکلتی۔ مثلاً روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں کیونکہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور تمام
لذات نفسانیہ سے مستغنی ہو جانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنا اور عدم احتیاج ذلت نہیں۔ کیونکہ غنا تو خود خالق کی
شان ہے تو خالق کی شان اختیار کرنا عیاذ باللہ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یا صدقہ و زکوٰۃ دینا عطا ہے اور عطا تو خود اللہ کی
صفت ہے اور معاذ اللہ ذلت کیسے ہو سکتی ہے؟ یا حج بولنا خدا کی شان ہے تو اسے عبادت اور غایت تذلل کیسے کہ دیں
گے۔ اسی طرح اور تمام اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ بذاتہ ذلت نہیں کہ انہیں عبادت کہا جائے پھر بھی جو انہیں
عبادت کہا جاتا ہے محض اتشال امر خداوندی کی وجہ سے نہ کہ بالذات۔ ہاں نماز بالذات عبادت ہے، کیونکہ اس کی
ہیئت کذائی قیام، قعود، رکوع اور آخر کار سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیکنا انتہائی ذلت اور عبودیت کا اظہار ہے،
اس کے اذکار مشتمل ہیں یا اظہار فذویت نفس پر یا اعلان عزت رب پر۔ اور یہ خود شان تذلل ہے۔ غرض نماز کی

ہیت اور حقیقت سب مظہر ہے شون تذلل اور احوال عبودیت پر۔

حاصل یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق عبودیت یعنی نماز کے واسطے ہوئی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے نماز ہی کا ساری کائنات کو پابند ظاہر فرمایا ہے نہ کہ زکوٰۃ و حج اور صوم و صدقہ کا۔ فرمایا: ﴿كُلُّ قَلْبٍ لَّدَیْ عَلِیْمٍ صَلَوٰتُہٗ وَ تَسْبِیْحُہٗ﴾ ① ”ہر چیز نے (خلق اور کونی ہدایت سے) اپنی نماز اور تسبیح (یعنی پست نماز اور اذکار نماز) کو جان لیا ہے۔“ جس سے واضح ہے کہ ساری کائنات نمازی ہے، بھلا پھر انسان کو تو کیوں نہ نمازی بنایا جاتا۔ فرق اتنا ہے کہ اور مخلوق غیر عاقل ہے تو اس میں نماز کا داعیہ جلی اور کونی طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انسان ذی عقل و ہوش ہے۔ تو اس کی نماز اختیاری ہے، جس کے لئے ہدایت و رہنمائی اور وعظ و پند کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس اگر انسان نمازی نہ ہو تو گویا اس نے اپنے مقصد تخلیق کو فوت اور ضائع کر دیا۔ اس لئے فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں تمام رعایائے اسلام کے نام فرمان جاری فرمایا تھا کہ:

نماز ہے تو کل دین ہے..... إِنَّ اَہْمَ اُمُورِکُمْ فِیْ ذِیْبِکُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَیْہَا حَفِظَ دِیْنَہٗ وَ مَنْ ضَیْعَہَا فَہُوَ لِمَا سِوَاہَا اَضَیْعَ ② ترجمہ: میرے نزدیک تمہارے دین میں سب سے زیادہ اہم چیز نماز ہے، جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسرے دینے کاموں کو اس سے بھی زیادہ ضائع کرے گا۔ اس سے واضح ہے کہ دین کے دوسرے کاموں کی بقاء بھی درحقیقت نماز ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے، اسی سے عظمت حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔ غرض نماز ہے تو کل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں، اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہان ہے ورنہ حرمان و خسران ہے۔ بس اسی مقصد نماز کی تکمیل کے لئے یہ تنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نماز اپنے مشروع طریق سے اسی مقدس جگہ میں ادا کی جائے۔

نماز تعلق مع اللہ کی مظہر اتم ہے..... اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو جامعہ نے اپنے پروگراموں میں رسوم ادا کی ہیں اور اب حقیقت ادا کی ہے وہ سب چیزیں نمائشی تھیں۔ حقیقت اگر ہے تو صرف یہ، جیسے اس وقت انجام دے رہے ہیں کہ اس سے مقصد زندگی تکمیل پا رہا ہے۔ نماز مظہر اتم ہے تعلق مع اللہ کی۔ اگر نماز اور تعلق مع اللہ قائم ہے تب تو یہ ساری رسمیں جو ہم نے ادا کی ہیں بارود اور زندہ کہی جائیں گی، ورنہ یہ سب چیزیں جو رسم کی شکل سے ادا کی گئی ہیں ایک بے جان لاش ثابت ہوں گی۔ اور لاش کا انجام یہ ہے کہ وہ چند ہی دن بعد گلے، سڑے، پھولے اور پھٹے اور اس کی بدبو سے دماغ متعفن ہوں اور احساسات گندے ہو جائیں۔

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۱.

② المصنف لعبد الرزاق، ج: ۱، ص: ۵۲۶، رقم: ۲۰۳۸۔ مشکوٰۃ المصابیح کتاب الصلوٰۃ، الفصل الاول، ج: ۱،

ص: ۱۲۹، رقم: ۵۸۵.

نیز یہ تعلق مع اللہ ہے جو ان رسوم کی شکلوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ بلا تعلق مع اللہ اور بلا واسطہ اوامر الہیہ کے یہ رسمیں بھونڈی اور بد شکل متصور ہوں گی پس اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر اور نمازی بن کر در حقیقت ہم اس کا تہیہ کر رہے ہیں کہ اپنی رسوم کی صورتوں کی بھی اصلاح کریں اور اس میں حقیقت و روح بھی پیدا کریں۔ تاکہ ہمارا ہر عمل پائیدار اور عواقب کے لحاظ سے نتیجہ خیز ہو۔ اور بے جان لاش کی طرح ضائع اور بے جز درخت کی طرح بے ثمر نہ رہے۔ قیام نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے..... اس لئے ہمیں دعا اس کی کرنی ہے کہ اے اللہ ہمیں نماز کی توفیق دے اور نماز کے لئے ہمارے اس مکان مقدس یعنی مسجد کی تکمیل کرادے اور اس مسجد کو بنانے والوں، اس کی تعمیر کرنے والوں، اس میں امداد دینے والوں، اور اس کے منتظموں کا یہ عمل قبول فرما۔ ہمیں اللہ سے یہ مانگنا ہے کہ وہ اس نماز کے ذریعے ہمارے ہاتھوں جامعہ میں ایسی فضا پیدا کر دے کہ جس میں نیکیاں پھلیں پھولیں اور بدیاں اپنی موت مر جائیں۔ آج کا دور وہ ہے کہ نیک کر کے شرماتا اور منہ چمپاتا پھرتا ہے کہ جیسے گویا اس نے کوئی بڑا بھاری جرم کیا ہے اور مجرم بدکاریاں کر کے فخر سے سراونچا کرتا ہے کہ گویا اس نے دنیا کا کوئی محترم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں اللہ سے واسطہ پیدا کر کے اور نماز کو قائم کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ نیکی کر کے نیک سر ابھارے اور مجرم اور بدکار خلاف شریعت امور کر کے منہ چمپاتا رہے اور اپنی برائی کو محسوس کرے۔

آج کے دور میں ایمان سے کورے آدمی کا لقب ہے دانا، عالی ظرف اور بہادر، اور ایماندار کا لقب ہے احق بے وقوف مجنون اور دیوانہ۔ حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ ”يُقَالُ لِلرَّجُلِ مَا عَقَلَهُ وَمَا ظَفَرَهُ وَمَا بَدَلَهُ وَلَيْسَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْإِيمَانِ“ ① ”آدمی کے لئے کہا جائے گا کہ کس قدر دانا ہے کس قدر عالی ظرف ہے اور کیسا بہادر ہے۔ دراصل ایک اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا نشان نہ ہوگا۔“ اور دوسری روایات میں فرمایا گیا ہے کہ امین کو خائن کہا جائے گا اور خائن کو امین علم والے کی اتنی بھی عزت نہ رہے گی جتنی کہ ایک مردار گدھے کی لاش کی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں آج مشاہدہ میں آرہی ہیں۔ اہل تقویٰ کا نام مذہبی دیوانے، احق ملانے وغیرہ ہیں اور اہل فجور کے القاب اعقل، اطراف اور اجلا ہیں تو ہمیں تعلق مع اللہ والوں کی کثرت کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے صحیح لقب سے یاد کیا جائے اور اسی کے مرتبہ کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے۔ پس دعا میں ایک نقطہ یہ بھی ہمیں لانا ہے کہ اے اللہ ہمیں اہل تقویٰ میں سے اور نمازی کر کے ہمیں اہل سعادت کر اور اہل سعادت کی عزت و توقیر اور شوکت دنیا میں قائم فرما۔ ہماری مادی شوکت اگر ہمیں حاصل ہو اور جس کا ہم فوجی انداز میں مظاہرہ کر کے گویا اس کی تحصیل کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اس کا ثمرہ اور آخری غایت بھی نماز ہی ہے یعنی خدا سے تعلق۔

سلطنت اسلامی کا مقصود..... حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿الَّذِينَ إِن مَّكُنْهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب رفع الامانة والايمان. ج: ۱، ص: ۳۴.

وَاتَّوُوا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿١﴾ پس ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا دنیوی عروج اور جہنمیں فی الارض یعنی سلطنت و امارت اس لئے نہیں کہ ایک، پیسٹری کی فکر میں مستغرق ہوں۔ کوٹھی، بنگلوں کی تعمیر ان کا منہ بنائے نظر ہو اور انڈیا کھس ان کا آخری مطلب ہو۔ بلکہ ان کا عروج اس لئے ہوگا کہ وہ خدا کی چوکت پر چھکیں اور اس کی مخلوق کو جھکا دیں۔ دنیا میں معروف اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برائی سے دنیا کو پاک کریں صدقہ و خیرات سے غریبوں کی غربت مٹا دیں سالکوں اور محتاجوں کے دلوں کو تھامیں۔ اخوۃ ہمدردی سے عالم کو بھر دیں۔ تفوق اور علو و فساد کا قلع قمع کریں۔

نمازی یا نماز کے ثمرات پس محض اس کی دعا کرنی ہے کہ خداوند! ہمیں عروج دے تاکہ ہم تیرے اس مقدس مکان میں جمع ہو کر تیری یاد کریں اور اس بھولی ہوئی اور غافل دنیا کو تیرے بارے میں ہوشیار بنادیں۔ پس یہ کام ہم اس مسجد مقدس میں جماعتی حیثیت سے انجام دینے کی توفیق اللہ سے مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی دعا میں نمازی، مکان نماز کی تکمیل کی توفیق، نماز کے شوکت کے وسائل قائم کر نیکی توفیق، نماز کے لئے مادی شوکت فراہم کر نیکی توفیق اور نماز کے ذریعے اپنی صورت و سیرت اور ہیئت و حقیقت کے پاکیزہ اور مطلوب انداز پر لانے کی توفیق مانگنا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ نمازی یا نماز کے ثمرات ہیں یا نماز کے مبادی اور وسائل ہیں۔ ہم صرف نماز ہی دنیا میں چاہتے ہیں اور نماز ہی کے لئے ہر کام بھی چاہتے ہیں۔

اگر حقیقتاً ہمیں یہ زندگی میسر ہو جائے تو اسی زندگی کا نام قرآن کی زبان میں حیات طیبہ ہے۔ اسی کا نام اسوہ حسنہ اور پاک سیرت ہے جس کے لئے اسلام آیا اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

پس دعا کے یہی چند نقاط تھے جن پر توجہ دلانے کے لئے میں کھڑا ہوا تھا، مجھے کوئی تقریر یا نماز کے موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کرنا منظور نہیں تھا۔ نہ اس کا وقت ہے اور نہ کوئی پروگرام اس لئے اب آپ سب حضرات ہاتھ اٹھائیں اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں ان مطلوبہ نقاط پر مخلصانہ دعا فرمائیں۔

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَوَسَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشَيْمَرًا وَنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهِ وَبِسِرَاجٍ مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيْمًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ اِنَّا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ).

اصلاحِ طینت..... بزرگانِ محترم! ایک اعلیٰ ترین باغ کا بہار آفریں نشوونما، اس کی دلکش اور نظرا فرور سرسبزی شادابی، تازگی اور بار آوری اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کی زمین کو خود روگھاس پھونس اور خس و خاشاک سے پاک نہ کر دیا جائے، اسی طرح ایک پاکیزہ برتن پر قلعی سے اس وقت تک چمک نہیں آئیگی جب تک اس کے جگری رنگ کو دور نہ کر دیا جائے اور اس پر چھائی ہوئی کدو رتوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے ہو بہو اسی طرح ایک قیمتی کپڑے پر کوئی نظر فریب رنگ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک کہ میل کچیل اور آرائے ہوئے دھبوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے۔ اصول یہ نکلا کہ کوئی شی بھی تہذیب و تمدن اور اصلاحِ عمل کے ذریعہ اعلیٰ جوہروں سے اس وقت تک شائستہ اور آراستہ نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے اندر سے ابھرنے والی خرابیوں کے مادوں کو سنت سے مغلوب اور مضحل کر کے اس کی طینت کو صاف نہ کر دیا جائے۔

سعادت کی بنیاد..... ٹھیک اسی فطری اصول کے مطابق اس کائنات کے اشرفِ اصول اور افضل ترین رکن انسان کو بھی دیکھو کہ اسے بھی سعادت و شرافت، بزرگی اور برتری اور ظاہر و باطن کے فضل و کمال سے اس وقت تک آراستہ نہیں کیا جاسکتا، جب تک کہ اس کے اندرونی شرف و فساد اور جبلی عیبوں اور اخلاقی خرابیوں کے ناپاک مادوں سے اسے صاف نہ کر لیا جائے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق اور نیکو کارانہ افعال کے مادے اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتے جب تک اس کے ظاہر و باطن کو رنگ خودی اور رنگ ہوا و ہوس سے پاک نہ بنا لیا جائے اور اس کے دل کی

زمین میں ایمان و ہدایت کا شجرہ طیبہ اس وقت تک نشوونما اور شرمیں پاسکتا جب تک کہ اس میں سے خود رو و ساوس واوہام ہوائے نفس اور فانی لذتوں کی ہولناکیاں کھرچ کر باہر نہ پھینک دی جائیں۔

تخلیہ و تحلیہ اس صورت میں قدرتی طور پر انسانی تہذیب و تربیت کے دو عمل قرار پائے جاتے ہیں، افعال اور تروک یعنی کچھ کرنے کی چیزیں جو اس سے کرائی جائیں گویا اس کے نفس میں بھری جائیں اور کچھ بچنے کے چیزیں جو اس سے چھڑائی جائیں گویا اس کے نفس میں سے نکالی جائیں کرنے کی چیزوں سے اس کا نفس خیر و خوبی سے آراستہ ہوگا اور بچنے کی چیزوں سے اس کا نفس شر اور شیطنت سے پاک ہوگا۔ اسی طرح تربیت انسانی دو عملوں کا مجموعہ بنتی ہے ایک تخلیہ اور ایک تحلیہ (یعنی خالی کرنا اور بھرنا) تخلیہ کے ذریعے اس رذائلِ نفس سے پاک کیا جاتا ہے اور تحلیہ کے ذریعے اس کو فضائل سے آراستہ کیا جاتا ہے جب تک کہ دونوں مثبت اور منفی عمل اس میں جاری نہ کئے جائیں نہ ان کی تہذیب مکمل ہو سکتی ہے اور نہ وہ سعادت و رشد کے نور سے روشن ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت خداوندی جو انسان کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے، دو ہی اجزاء سے مرکب ہو کر نازل ہوئی ہے، ایک امر، اور ایک نہی یعنی ایک حصہ اس میں مامورات کا ہے جن کے کرینکا امر کیا گیا ہے تاکہ نفس کو اس کی سعادت طمأنینہ اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا اسے پابند کیا گیا ہے، تاکہ نفس کی شقاوت دور ہو۔ پس مامورات کو از قسم افعال سمجھو اور منہیات کو از قسم تروک، یہی مامورات نیکیاں ہیں جن کا نوع اور اصل نام شریعت کی زبان میں معروف ہے اور یہی منہیات بدیاں ہیں۔ جن کا نوعی اور اصول نام اصطلاح شرع میں منکر ہے اور یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغی اصطلاح بنتی ہے۔ جسے سب پہنچاتے ہیں۔

اور قرآن نے جا بجا اس کی تاکید کی ہیں، کہیں اس کا امر کیا ہے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ ① ”اچھی باتوں کا حکم کرو اور برائیوں کو روکو اور کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔“ کہیں امت کی خیریت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دائر کر دی ہے۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② ”ان تمام امتوں میں تم بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔“ کہیں رفعت و برتری اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے فرمایا گیا کہ ﴿السَّبِيءُ الْأَمْسِيُّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوزًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ③ ”نبی امی کہ جس کی بات وہ تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔“

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمن، الآیہ: ۱۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیہ: ۱۱۰۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۵۷۔

نظام سعادت..... شریعت کے یہ تمام مامورات یا معروفات جس کا شاریک افعال میں ہے، اصلاح شریعت میں ان کے افعال کا نام بر ہے اور وہ تمام منہیات یا منکرات جو اقسام ترک ہیں ان سے بچنے کا اصطلاحی نام تقویٰ ہے اس لئے گویا پوری شریعت کا خلاصہ برو تقویٰ نکل آتا ہے جس پر انسانی سعادت کا نظام قائم ہے۔

اگر افعال بر یا امور خیر کو معطل کر دیا جائے تو حصول خیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کو شرعی زبان میں اثم کہتے ہیں اور یہ اثم یا گناہ ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور اگر تقویٰ کو معطل کر دیا جائے تو دفع شر کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جس کا اصطلاحی نام ”عُدْوَان“ ہے (یعنی حدود سے تجاوز اور زیادتی) اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان حدود سے تجاوز کرنا ہی تمام فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کی جڑ ہے۔ پس کوئی انسان محض بر سے یا نیک کاموں سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس میں تقویٰ کے ترک نہ ہوں اور کوئی فرد بشر محض ترک تقویٰ سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں بر (نیکی) کے افعال اور ثائیرات نہ ہوں۔

اب چونکہ برو تقویٰ نیکی اختیار کرنے اور برائیوں سے بچنے کے اس مثبت و منفی عمل کے مجموعی نظم ہی سے دین اور تہذیب و تمدن کا نظام استوار ہوتا ہے، اس لئے شریعت اسلام نے ان دونوں میں باہمی تعاون کی اور انکی اضداد یعنی اثم و عدوان سے عدم تعاون کی دعوت دی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ ساری بنیادی تفصیلات بلکہ پوری شریعت کے امور نبی کے نظام کو ان دو جامع اور معجزانہ جملوں میں ادا کر دیا ہے جن سے ان انواع کے یہ اصطلاحی نام بھی متعین ہو جاتے ہیں۔ ﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ ① ”تعاون کرو نیکی اور تقویٰ پر اور گناہوں اور سرکشی پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والے ہیں۔“

لیکن یہ ظاہر ہے کہ برو تقویٰ کے یہ افعال و ترک محض ان کے نظم (الفاظ) کی جوہری خوبی اور برتری سے انسانوں میں قائم نہیں ہو سکتے، جب تک کہ خود انسانوں میں بھی برو تقویٰ کو قبول کرنے اور ان سے اثر پذیر ہونے کا مادہ اور صلاحیت نہ ہو۔ اور اس میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی نہ ہوں جو اس برو تقویٰ کے جذب کرنے پر جھکی ہوئی ہوں اور اسے برداشت کریں جس سے نفس انسانی پر برو تقویٰ کا رنگ چڑھ سکے، ورنہ اگر اندرونی قابلیت کے بغیر ہی برو تقویٰ کا خطاب صحیح ہوتا یا محض برو تقویٰ کے شرعی نظام کو خوبی اور برتری ہی نفوس میں اسے جا گزیر کر دیا کرتی تو حیوانات آخر اس تکلیف شرعی سے الگ کیوں رکھے جاتے؟ ان کو برو تقویٰ کا مکلف نہ بنائے جانے کی اس کے سوا وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان میں بار اور متقی نیک اور پرہیزگار بننے کی یا برو تقویٰ قبول کرنے کی کوئی استعداد اور کوئی قوت موجود نہیں اس لئے محض برو تقویٰ کے شرعی نظام کا اعلیٰ اور منضبط ہونا ان کے لئے کارآمد نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکل آتا قدرتی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو برو تقویٰ کا مکلف ٹھہرایا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں بھی برو تقویٰ کے نظام کو

قبول کر لینے کی قوتیں بھی ہوں جن پر یہ نظام ہر تقویٰ اپنا عمل کرے اور انسان باروقتی۔ نیکو کار اور پرہیز گار بنے، اسی طرح انسان میں اثم و عدوان کے مادے بھی ہونے ضروری ہیں جن سے وہ اثم و عدوان کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہوتا ہو اور شریعت اسے ان قبیح حرکات سے روکے، ورنہ اس میں ان گناہ کاریوں کے مادے ہی نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی اثم و عدوان کا مرتکب نہ ہو سکتا اور ایسی صورت میں اسے اثم و عدوان سے باز رہنے کا حکم دیا جانا بالکل ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کسی جنگلی جانور شیر اور بھیڑیے کے کہا جائے کہ خیر دار گناہ مت کرنا اور اثم و عدوان کا مرتکب نہ ہونا۔ ظاہر ہے کہ جیسے یہ حکم غیر حکیمانہ ہے ایسی ہی اثم و عدوان کے مادے کے بغیر انسان کو یہ حکم دیا جانا لغو اور لالچی ہوتا ہے، جس سے اللہ کی شریعت بری ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں میں اثم و عدوان کے مادے بھی ہوں اور وہ ان قبیح حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہو بلکہ ہوتا ہو اور پھر اسے روکا جائے جس سے وہ اپنے اختیار سے خود کرے، تاکہ یہ رکنا شریعت کے لئے حکیمانہ فعل ثابت ہو اور رکنے والے کے لئے امر حسن باعث اجر و کمال بنے۔

ایمان و امانت اس اصول کے بعد سمجھئے کہ انسان میں جو قوت افعال برکات کا حامل کرتی ہے بلکہ افعال برکات کا مصدر ہے جس سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں ان کا نام شریعت کی اصطلاح میں امانت ہے اور جو قوت تقویٰ کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اس سے متقیانہ ترک کا ظہور ہوتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں حیاء ہے۔ پس امانت امر حسن اور اچھے کام کی رغبت کے مادے کا نام ہے اور حیاء امر قبیح سے انقباض کے مادہ کا نام ہے۔

پس ایمان اور اس کے سارے عملی شعبے عبادۃ، اطاعت، تفویض وغیرہ درحقیقت امانت کے کندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ اگر امانت نہ ہو یعنی دل میں ان امور حسنہ کی رغبت و قبول کا مادہ ہی نہ ہو تو آدمی نہ ایمان قبول کر سکتا ہے نہ عمل صالح نہ دین دیانت۔

پس امانت کی وہی نوعیت ہے جو رنگریزوں پھٹکری کی ہوتی ہے کہ وہ ہر رنگ کے لئے زمین ہے اگر رنگ کو پھٹکری نہ دی جائے تو کوئی رنگ بھی نہ کپڑے پر چڑھ سکتا ہے نہ کھل سکتا ہے۔ یا جیسا کہ عطاروں میں تل کے تیل کو ہوتی ہے کہ ہر خوشبو کے لئے یہ سادہ تیل زمین ہے جو گلاب، جمبیلی اور کیوڑہ ہر خوشبو کو قبول کر لیتی ہے، اور مختلف عطر بن جاتے ہیں۔ اگر یہ زمین (تل کا تیل) نہ ہو تو کوئی عطر تیار نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح امانت زمین ہے، ایمان اور ایمانیات کے لئے جس پر ایمان کا رنگ چڑھ جاتا ہے یا ایمان اور ایمانیات کی خوشبو میں جم جاتی ہیں، اگر قلب میں یہ امانت کا مادہ نہ ہو تو نہ ایمان ہو نہ ایمانیات، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ..... ”اس میں ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو“۔

پس ایمان و ایمانیات کو امر حسن اور مرغوب سمجھوانے والی طاعت اور پھر اسے جذب کرنے والی قوت یہ امانت ہی کی قوت ہے۔ امانت کی ضد بددیانتی اور خیانت ہے جس کے معنی ہیں امور خیر کی رغبت نہ کرنا انہیں مستحسن نہ سمجھنا اور قبول نہ کرنا اور نتیجہ کے طور پر لہو و لہب اور خرافات میں مبتلا رہنا اور زندگی کو برباد کر دینا۔ اس خیانت کی قوت کو جو

امور خیر کو بالا بالا دفع کر دیتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں فتنہ کہتے ہیں جو درحقیقت امانت کی ضد ہے۔ پس امانت، ایمان اور عمل صالح کو جذب کرتی ہے اور فتنہ اسے دفع کرتا ہے۔ فتنہ کا حاصل بدیانتی، اور خیانت ہے اور خیانت امر خیر میں ہوتی ہے۔ امر شر کو دفع کرنے کا نام خیانت نہیں۔ ایمان کے نظام صالح اور حسن معاشرت میں رخنہ اندازہ اور اس کے نظام میں افراتفری پھیلانا ہی خیانت ہے جسے فتنہ کہتے ہیں۔ پس برہمن کی قوت کا مادہ امانت ہے اور ہر نیکی کو دفع کرنے کے اور توڑنے درہم برہم کرنے کے مادہ کا نام فتنہ ہے اور دونوں مادے انسان میں موجود ہیں۔ شریعت مادہ امانت کو اجاگر کرنے اور مادہ فتنہ کے استیصال کے لئے آئی ہے۔

جہاد و قتال انسانوں کے گلے کاٹنے کے لئے نہیں رکھا گیا بلکہ دفع فتنہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ تاکہ کوئی فتنہ زدہ قوم نظام صالح کو برباد نہ کر پائے۔ یہ جدابات ہے کہ اس کی بربادی اور رخنہ اندازی انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے تو وہ فتنوں کو مٹانے والی طاقت بالا خزان ہی کی گردنوں پر مسلط ہوتی ہے ورنہ اصل مقصود دفع فتنہ ہے قتل انسان نہیں۔ چنانچہ یہی فتنہ زدہ انسان اگر فتنہ سے ہٹ کر امانت پر آ جائیں تو قتل فوراً بند ہو جاتا ہے۔ بہر حال امانت امور حسنہ کے امتحان کی قوت ہے اور فتنہ امور حسنہ کے استہجان و تخریب کی قوت ہے۔

حیاداری اور فحش کاری..... ترک تقویٰ کو بروئے کار لانے والی قوت جو انسان کے باطن میں رکھی گئی ہے حیاء ہے جس سے انسان امر قبیح کے ارتکاب سے سبکڑتا اور منقبض ہوتا ہے جس سے قبح متروک ہو جاتے ہیں اگر حیاء کا مادہ نہ ہو تو امور قبیحہ سے رکنے بچنے کی صورت نہ ہو۔ پس منکرات کو برا ثابت کرنے والی اور بچانے والی طاقت حیاء ہے حیاء کی عدم موجودگی میں نہ آدمی قبیح کو قبیح کہتا ہے اور نہ اس سے رک سکتا ہے اس لئے فرمایا گیا اِذَا فَاتَكَ الْحَيَاءُ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ① ”جب تجھ سے حیاء جاتی رہے تو جو تیرا جی چاہے کر“۔ اسی لئے حدیث میں الْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ ② (حیاء کل کی کل خیر ہی خیر ہے) فرمایا گیا اور اسی لئے حیاء کو ایمان کا عظیم ترین شعبہ قرار دیا گیا ہے کہ خلاف ایمان حرکات سے بچاؤ اس قوت کے بغیر میسر آنا ممکن نہ تھا۔

حیاء کی ضد فحش ہے جو ہر امر قبیح پر بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کو بروئے کار لاتی ہے اور حیاء دارانہ امور کا نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے، زنا کار، شراب خوری، جوئے بازی، نقب زنی، کذب بیانی اور بدگوئی وغیرہ سارے قبح پر آمادگی اور ان کا ارتکاب اسی قوت فحش سے ہوتا ہے۔ پس حیاء منکرات سے دور کرتی ہے اور فحش منکرات کے قریب لاتا ہے۔ پس منکرات شرعیہ کا مصدر اور سرچشمہ فحش ہے اور ان سے بچاؤ کا سرچشمہ اور مصدر حیاء ہے۔

خلاصہ کلام..... خلاصہ یہ نکلا کہ امور خیر یعنی معروفات کی رغبت و تعمیل کا سرچشمہ امانت ہے اور ان کی خلاف ورزی اور ذہنی برہم کا سرچشمہ فتنہ ہے اور تمام امور شرعی یعنی منکرات سے بچاؤ کا سرچشمہ حیاء ہے اور ان کے

① الصحيح للبخاری کتاب الادب، باب اذالم تستحي فاصنع ما شئت ج: ۱۹، ص: ۷۹۔

② الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان و افضلها، ج: ۱، ص: ۱۲۳۔

ارتکاب اور سیہ کاری کا سرچشمہ فحش ہے۔ پس امانت و فتنہ حیاء و فحش کی یہی چار قوتیں ہیں جس سے معروف منکر اور بد و تقویٰ کا تعلق ہے۔ اول دو طاقتوں کا تعلق افعال برکے کرنے اور آچھوڑنے سے ہے اور آخر کی دو قوتوں کا تعلق متروکات تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے۔ اس لئے شریعت الہی کا کام جو بنی آدم کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ افعال برکاء امر کر کے امانت کی طاقت کو مضبوط بنائے اور اس کی ضد فتنہ کا استیصال کرے اور متروک تقویٰ سے نبی کر کے حیاء کی طاقت کو مستحکم بنائے اور اس کی ضد فحش کا استیصال کر کے کہ یہی عین عدل و احسان ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ① ”اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا اور روکتا ہے برے کاموں اور منکر سے اور نصیحت کرتا ہے تم کو شاید کہ یاد کرو۔“

بد و تقویٰ سے انقلاب باطن..... پس یہ امر بالمعروف یا امر بالمعروف براہ راست قوت امانت پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے آدمی امین بنتا ہے اور امین بن کر ایماندار ہوتا ہے ایماندار ہو کر مامون ہوتا ہے جس سے خیر کے عناصر ابھر جاتے ہیں اور فتنے دب جاتے ہیں اور نبی عن المنکر یا ہدایت و تقویٰ براہ راست قوت حیاء پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے آدمی باحیاء بنتا ہے اور حیاء دار بن کر برائیوں اور منکرات سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے شر کے عناصر دب جاتے ہیں اور ایمان داری کے موانع دور ہو کر ایمان اور عمل صالح کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

الحاصل بد و تقویٰ کے عمل سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تاکہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بد و تقویٰ اور لائحہ انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پشت کرتا ہے اور اصلاح کے اسی مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔ الحاصل بد و تقویٰ کے عملی سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تاکہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بد و تقویٰ اور لائحہ افعال و متروک انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پشت کرتا ہے اور اصلاح کے اس مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

اب افعال و متروک یا بد و تقویٰ (احکام اور امتناعی احکام نیکو کاری اور پرہیز گاری) کے اصولی نقشہ کے عملی پہلو پر نظر ڈالو۔ تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں ایمان باللہ۔ اخلاص باللہ۔ ذکر اللہ تذکر یا یا م اللہ، تلاوت کلام اللہ، تعظیم شعائر اللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور حضور مع اللہ یا (نماز و دعا اور مجاہدہ و مراقبہ وغیرہ) اور تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، احسان اللہ، اطعام لوجہ اللہ، اخوة فی اللہ اور اح لدین اللہ یعنی عام خیر خواہی بنی

نوع انسان عدل و انصاف و فاعہد اور ایقائے عہد وغیرہ سب کے سب امور بر کے اجزاء ہیں جن کے کرنے سے انسانی نفس سر بلند مقبول اور محبوب خدا و خلق بنتا ہے عند اللہ اس کی وجاہت قائم ہوتی ہے، اور عند الناس اس کی بالادستی اور برتری مسلم ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا و آخرت کے بلند مناصب و مقامات کا حق دار ہو کر برابر و اختیار کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن بر (نیکو کاری) کا یہ سارا لمبا چوڑا سلسلہ اس وقت تک کارگر اور موثر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ نفس انسانی میں سے نفسانیت اور اس کے رذائل کا خاتمہ نہ ہو جو اس امور بر کے حق میں سم قاتل اور قوی مانع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی انسان کو ان سر بلند یوں پر نہیں پہنچنے دیتے مثلاً جب تک انسانی نفس سے باہر کے رذائل جیسے حرص و ہوا، ہوس رانی اور بدستی سے کھانے پینے کی لذتوں میں غرقابی جنسی خواہشات اور نفسانی عیش میں ہمہ وقت سرگردانی کے جراثیم خارج نہ کئے جائیں یا جاہ کے رذائل جیسے ہوس اقتدار، نمائشی و قار کی ہمہ وقت بھوک، جذبات انانیت و خودی اور ہوس ریاست و امارت زائل نہ ہو گئے۔

نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی..... خلاصہ یہ نکلا کہ ایک طرف زن، زر، زمین کی جاہ پسندانہ بد مستیوں اور دوسری طرف نفس و ہوائے نفس کی جاہ پسندانہ خودی، خود بینی اور خود آرائیوں کا سودا انسان کے سر سے نہ نکالا جائے یا کم از کم ان کے ترک کا خوگر نہ بنایا جائے اس وقت تک انسان پر اعمال برکارنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اگر بحکف چڑھ بھی گیا، تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتا اور اگر اتفاقاً کچھ جم بھی گیا تو پختہ نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی شوب میں اڑ جائیگا۔

بہر حال نفس میں روحانیت اور ملکیت کی خیر اس وقت تک جاگزیں نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں سے نفسانیت کا یہ جلی شرکھرج کر باہر نہ پھینک دیا جائے، بالفاظ دیگر افعال بر کی قلعی سے اس وقت تک نفس پر چمک دمک نہیں آ سکتی جب تک کہ تروک تقویٰ سے اس کارنگ خودی اور رنگ انانیت اتارا نہ جائے اور اس تک قلب کے آئینہ میں انوار الہیہ منعکس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس صیقل کر کے شفاف نہ کر لیا جائے۔

دل را اگر تو صاف کنی چو آئینہ در د لے جمال دوست بہ بنی چو آئینہ

عباداتی سال کا آغاز و اختتام..... اس لئے شریعت نے اپنے آغاز کار سے لے کر انجام کار تک افعال و تروک اور (ثبت اور منفی احکام) کا رشتہ ملا جلا رکھا ہے۔ اور افعال بر کو تروک تقویٰ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہونے دیا چنانچہ شریعت کا آغاز نزول قرآن سے ہوتا ہے اور نزول قرآن ماہ رمضان سے ہے۔ اس لئے ماہ رمضان گویا شریعت اور اس کی عبادتوں کا سن آغاز سے بالکل اسی طرح جیسے اداروں و کارخانوں اور تعلیم گاہوں وغیرہ میں سال کا آغاز کسی خاص مہینہ سے مقرر کر لیا جاتا ہے، اور اسی ماہ سے اس کے کاروبار کا آغاز سمجھتے ہیں اور اسی رجسٹر دفتر اور بھی کھاتے شروع کرتے ہیں مثلاً اسلامی اداروں میں حسابی سال عموماً محرم سے شروع کر کے ذی الحجہ پر ختم کیا جاتا ہے تعلیم گاہوں میں تعلیمی سال عموماً شوال سے شروع کر کے رمضان میں ختم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اداروں میں دفتر

سال جنوری سے شروع کر کے دسمبر پر ختم کیا جاتا ہے، ایسے ہی اسلامی شریعت کا دینی اور عباداتی سال ماہ رمضان سے شروع ہو کر شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نزول قرآن جو اساس شریعت ہے، ماہ رمضان میں ہوا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ ① ”رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ اس میں قرآن اترتا ہے۔“

اسی لئے رمضان گویا عباداتی سال کا نقطہ آغاز نکلا جس سے انسان کا ایمانی نشوونما متعلق ہے۔ اور شعبان نقطہ اختتام ثابت ہوا۔ جو اس ایمانی شباب کے بلوغ کی حد ہے۔ اس لئے نبص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے میں عمروں کے اختتام کا اعلان عالم غیب میں ہو جاتا ہے۔ جو درحقیقت اعمال کے انقطاع کا اعلان ہے کہ عمل کا تعلق عمر سے ہی ہے، بلکہ عمر دی ہی گئی ہے عمل کے لئے اس لئے جس آن یہ زندگی ختم ہوگی، اسی آن انسان کا عمل، رزق اور کسب وغیرہ سب منقطع ہو جائے گا۔ یوں بھی ہر سال پچھلے رزق کا حساب ختم کر کے نئے سال کے لئے روزی رزق اس کا ماہ میں تعین کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ پس شعبان اعلان اختتام طاعات و انقطاع اعمال کا مہینہ نکلا جسے عباداتی ال کا نقطہ اختتام کہنا چاہئے۔ جس طرح کہ رمضان اس کا نقطہ افتتاح و آغاز تھا۔

ماہ رمضان نیکیوں کا مرکز اتصال..... اب رمضان کو لیجئے تو اس میں افعال بر اور تروک تقویٰ کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح گوندھ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہلال رمضان نظر آتے ہیں اول شب ہی سے اس ماہ کا افتتاح دو چیزوں سے کیا گیا ہے جو اعمال بر کی جان ہیں یعنی تلاوت قرآن اور نماز تراویح، یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسانی نفس کو قرب خداوندی اور لذت وصال کی دولت میسر آتی ہے۔ نماز تراویح سے تواضع و قرب ہوتا ہے۔ کیونکہ نبص قرآن و تصریح حدیث مجددہ ہی کمال قرب کا ذریعہ ہے جو افعال صلوٰۃ کا اصلی مقصود ہے۔

ارشاد قرآنی ہے ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ ② ”سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔“ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ”إِنَّ أَقْرَبَ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ“ ③ ”بے شک بندہ اپنے رب سے قریب تر اس وقت ہوتا ہے کہ وہ سجدے میں ہو۔“ اور قرب بمعنی اتصال ہی نہیں بلکہ بمعنی الصاق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تصریح ہے کہ بحالت سجدہ انسان کا سر اللہ کے قدموں پر گرتا ہے۔ پس اقربیت یعنی کمال قرب و بقا تو نماز سے ملا اور پھر اس کمال قرب کی بھی تکمیل اور باثمرہ ہو جانا روزانہ کے چالیس سجدوں سے ہو جائے گا۔ کیوں کہ بیس رکعت میں چالیس سجدے ہوتے ہیں اور چالیس کے عدد کو تکمیل شے میں خاص دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام ۱۰۸۵: ۲۰ نے کا وقت آیا تو چالیس دن کا چلہ کرا کر مناسبتہ مع الغیب کی تکمیل و تقویہ کرائی گئی۔ اور نبص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلب سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے یعنی قلب کی ایک خاص علمی تکمیل کے لئے چالیس دن کا مخلصانہ عمل تجویز فرمایا گیا جس سے حضرات صوفیاء کرام نے چلہ کشی کا اصول اخذ کیا۔ غرض چالیس کے عدد

① پارہ ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵۔ ② پارہ ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۹۔

③ الصحيح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقول فی الرکوع والسجود، ج: ۳، ص: ۱۰۲۹۔

کو تکمیل حال و خیال میں خاص دخل ہے۔ اس لئے رمضان کی ترویج میں روزانہ چالیس سجدے پیارے کرائے گئے۔
 بندہ و خدا میں ربط باطنی..... پھر اس کمال قرب کو بے شمر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ کمال وصال کی سبیل تلاوت قرآن سے کی گئی کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کو اللہ کے باطن کی چیز فرمایا گیا ہے۔
 ارشاد ہے 'تَبَرَّكَ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّهُ كَلَامُ اللَّهِ وَخَرَجَ مِنْهُ' ① "قرآن سے برکت حاصل کرو، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ اس سے واضح ہوا کہ قرآن اللہ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے جو تلاوت کے ذریعے ہمارے اندر پہنچ جاتی ہے یعنی اس کے باطن سے چلتی ہے اور ہمارے باطن میں پہنچ جاتی ہے، جس سے اللہ اور اس کے بندے کے درمیان باطنی ربط پیدا ہوتا ہے۔
 کامل ترین ملاپ..... ادھر ایک دوسری حدیث میں تلاوت قرآن کو محادثہ مع اللہ یعنی اللہ سے باتیں کرنا بتلایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بات کر کے متکلم اور مخاطب اپنا اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں، جسے علمی قرب کی انتہائی منزل کہنا چاہئے۔

پس! تلاوت کے ذریعے ہمارے اور اس کے باطن کا ریل میل کچھ اس شان سے ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ توافقی اور تواصل کی دوسری صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ جسمانی میل میلاپ اور وصل صرف اطراف بدن کے مل جانے کی حد تک ہوتا ہے ایک جسم دوسرے جسم میں سما نہیں سکتا، گویا جسمانی وصال بھی محض سطحی ہوتا ہے۔ اور اس میں لذت بھی اگر ہوتی ہے تو سطحی اور عارضی، لیکن روحانی ملاپ ہے کہ جسمانی میل ملاپ تو بجائے کود ہے، روحانی میل ملاپ تو بجائے خود ہے، روحانی میل ملاپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس وصل و وصال اور میل ملاپ کو بھی اگر دیکھا جائے تو وہ بھی وسیلہ ہی ہے۔ اصل مقصد قبول ہے نہ کہ وصول۔ اگر وصول ہو اور قبول نہ ہو تو وہ وصول بے کار ہے۔ بادشاہ کے یہاں وصول تو شاگرد پیشہ اور کم مرتبہ ملازمین کو بھی ہو جاتا ہے مگر قبول نہیں ہوتا و زیر اعظم اور امراء شاہی اگر واصل ہوتے ہیں تو یہ محض وصول ہی نہیں بلکہ ان کا قبول بھی ہوتا ہے۔

اعتراف قبولیت..... سو اس تلاوت ترویج میں جبکہ فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے اور ہر رکعت میں ضروری ہے۔ خواہ بلا واسطہ ہو یا بواسطہ امام، اور اس کی ایک آیت پر ادھر سے قبولیت کا بروقت اعتراف و اعلان کیا بھی جاتا ہے۔ بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ کہتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں حَمْدُہٗنِیْ عَبْدُہٗ (میرے بندے نے میری تعریف کی) وہ کہتا ہے اَلْبُرْحَمٰنِ الرَّحِیْمِ تو فرتے ہیں اَنْتَہِیْ عَبْدُہٗ (میرے بندے نے میری ثناء و صفت بیان کی)۔ جب یہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمَ الدِّیْنِ تو فوراً فرماتے ہیں مَجْدُہٗنِیْ عَبْدُہٗ (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) جب یہ کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو فرماتے ہیں ہٰذَا بَیِّنٰی وَبَیِّنٌ عَبْدُہٗ (یہ میرا اور بندہ کے درمیان کا معاملہ ہے) جب وہ سوال کرتا ہے اور اِهْدِنَا سے آخر تک پڑھ جاتا ہے تو

فوراً فرماتے ہیں۔ وَلَعَبْدِي مَسْأَلٌ (میرے بندہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے) تو یہ بروقت اقرار و اعتراف اور بندہ کو اپنا کہہ کر اس کی بات کو سراہنا ہی قبول ہے جس کے لئے وصول کی تمنا کرتے ہیں۔ ①

بشری عروج کا نقطہ کمال پس تراویح و تلاوت میں ابتدائی مرتبہ قرب اتصال کا ہے جو نماز سے حاصل ہوتا ہے پھر قرب سے وصول و وصال کا ہے جو تلاوت سے حاصل ہوتا ہے اور پھر وصول سے قبول و رضا کا ہے جو تلاوت خاص کے مکالمہ سے حاصل ہوتا ہے غرض تراویح و تلاوت سے حضرت حق کی ہم نشینی، معانقہ اور مکالمہ، تراخی طرفین کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس سے آگے بسوی عروج و کمال کا کوئی اور مقام نہیں۔ لیکن نظر اس پر کیجئے کہ جہاں رمضان کی راتوں میں نماز و تلاوت سے وصول و قبول کی لذتیں دی جاتی ہیں۔ وہیں اس مبارک مہینہ کے دنوں میں نفس کی ہوسنا کیوں اور نفسانی لذات کو بھی قوت سے ترک کرایا جاتا ہے۔ کھانا پینا بھی ترک، مقاربت نسواں بھی بند حتیٰ کہ ان چیزوں سے خالی لذت لینا بھی ناپسندیدہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ شب کی غیر معمولی لذت وصول و قبول، جو افعال بر میں سے فعل تراویح و تلاوت سے ملتی تھی بغیر ان تقوائی تروک کے میسر آنی ناممکن تھی۔

پس رمضان کے مہینہ میں دن بھر روزہ کے ذریعہ جو مجموعہ تروک ہے نفس کو مانجھا اور صاف کیا جاتا ہے اور شب کو اس صاف شدہ ظرف پر تلاوت و تراویح سے جو مجموعہ افعال بر ہے قلعی کی جاتی ہے جس سے وہ چمک اٹھتا ہے اور اس میں قرب و اتصال اور قبول و وصال کی اس چمک و دک سے انوار خداوندی منعکس ہونے لگتے ہیں گویا نفس انسان۔ میں نفس رحمان نظر آنے لگتا ہے۔ پس ماہ رمضان جیسے برکات مہینہ ہے ویسے ہی تقویٰ کا بھی مہینہ ہے۔ اور جیسے اس میں اثم سے بچاؤ میسر آتا ہے ویسے ہی اس میں عدوان سے بچاؤ کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ اور ماہ روزہ کا ثمر اس لئے قرآن حکیم نے جب رمضان کے روزوں کا ذکر کیا تو اس کا سب سے بڑا ثمرہ تقویٰ بتلایا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ ② ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پہلوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ“۔ اور جب خود ماہ رمضان کا ذکر کیا جس میں دنوں کے ساتھ راتیں بھی شامل ہیں تو نزول قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا سب سے بڑا ثمرہ نور ہدایت، نور دلائل اور نور معرفت ظاہر فرمایا جو درحقیقت انسانی نفس کی چمک و دک اور قلعی کا سب سے اعلیٰ سامان ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ﴾ ③ ”مہینہ رمضان کا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کے کھلے دلائل کا مجموعہ اور قوت تمیزی کا علم ہے“۔ گویا روزہ کا ثمرہ تقویٰ اور ماہ کا ثمرہ بر نکلا اور اس طرح قرآن کریم سے ماہ رمضان برو تقویٰ کا مہینہ ثابت ہوا جس سے اثم و عدوان کا خاطر خواہ دفعیہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ

① الصحيح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ج: ۲، ص: ۳۵۲۔

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۳۔ ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵۔

اٹھ وعدوان کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ نفس کا دانہ پانی بند ہو جاتا ہے۔ اور شیاطن قید کر دیئے جاتے ہیں جو اٹھ وعدوان پر ابھارتے تھے۔ ایک دانا دشمن کی حیثیت سے اور ایک نادان دشمن کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ دونوں دشمنوں کے اسیر ہو جانے پر اٹھ وعدوان کا دفعیہ قدرتی تھا۔

صیام و قیام کا باہمی تناسب..... اس لئے روزہ تلاوت تراویح یعنی صیام و قیام کا تناسب اور ایک سے دوسرے کا رابطہ بھی واضح ہو گیا کہ ایک تخلیہ کا مقام ہے یعنی روزہ جو انسان کو روز اکل نفس سے پاک کرتا ہے اور ایک تحلیہ کا مقام ہے یعنی قرآن اور تراویح جو نفس انسانی کو چمک دار اور نورانی بناتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صیام و قرآن کی شفاعت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بطور قرین و عدیل کے ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ مضمون حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن صیام و قرآن دونوں مل کر بندہ کے شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ خداوندی! ہم نے دن بھر اس بندہ کو کھانے پینے اور شہوانی لذتوں سے محروم رکھا تو اس کے حق میں ہماری شفاعت کو قبول فرما، قرآن کہے گا۔ خداوند! میں نے اس بندہ کو راتوں میں نیند اور آرام سے محروم رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی شفاعت کا انجام سوائے قبولیت شفاعت کے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن کلام الہی اور صفت خداوندی ہے۔ تو اس کی شفاعت ایک صفت الہی کی شفاعت ذات سے ہے، جو ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی اپنی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ تو کون ہے کہ اس شفاعت کو رد کر سکے؟ اور وہ خود کیسے رد فرمائے گے۔

چوں خدا از خود سوال و کد کند پس دعائے خوشن چوں رو کند

ادھر روزہ کو تمام عبادات میں حق تعالیٰ نے اپنی چیز فرمایا ہے۔ اور یہ کہ میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا اور ظاہر ہے کہ اپنی چیز کو آنا کہہ کر کون بے ابرو کیا کرتا ہے کہ اسے رد کرے۔ اس لئے صیام و قرآن کی شفاعتیں رد ہونی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ شریعت نے اپنے عباداتی سال کا افتتاح افعال و ترکوں سے کیا ہے جو تربیت انسانی کے دروازہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دونوں میں ترک کو اصل رکھا اور افعال اس کے ضمن میں رکھے، اور راتوں میں افعال کو اصل قرار دیا اور ترک اس کے ضمن میں بقدر ضرورت آجاتے ہیں جو بوقت تلاوت و صلوٰۃ قائم رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اس کی راتیں روشنی میں دونوں سے کم نہیں ہیں بلکہ لَيْلُهَا وَ نَهَارُهَا سَوَاءٌ کی مصداق ہیں۔

ہلالِ عید..... جب رمضان کے یہ معدودے چند ایام اس شان سے پورے ہو جاتے ہیں کہ اس کے دن ترکوں میں مصروف اور اس کی راتیں افعال میں مشغول تو ہلالِ عید تکمیل عبادت کا مسرت بخش پیغام لے کر فضاء آسمان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا منجاب اللہ آسمان سے اطلاع دیجاتی ہے کہ اے بندگان الہی! تم نے وہ فرض پورا کر دیا جو ہلالِ رمضان نے تمہارے ذمہ عائد کیا تھا۔ تم نے اپنے دنوں کو نفسانی لذتوں (طعام و شراب اور مقاربت) سے بے نیاز رکھ کر خداوندی قرب و وصال کی لذتوں کو ترجیح دی اور اپنی راتوں کو لہو الحمدیث اور قصہ کہانیوں میں گنوانے

کی بجائے خیر الحدیث اور احسن انقصص کے کہنے اور سننے میں مشغول رکھا اس لئے تمہیں ہلال عید کے نورانی حروف کے ذریعے مبارک باد دی جاتی ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور منزل تک پہنچ گئے اس پر بندوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے قدردان اور مشکور پروردگار کا جان و مال سے شکریہ ادا کریں چنانچہ عید کی صبح ہوتے ہی اولاً صدقہ فطر ادا کر کے مال سے اور پھر دو گنا عید ادا کر کے جان و مال سے اپنے محسن رب اور نعم پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے تیس دن کی یہ حقیر اور ناچیز قربانی قبول فرمائی اور دوران قربانی میں تو خصوصی طور پر لذت قرب و وصال سے نوازا۔ اور بعد تکمیل ہلالی حروف سے اپنی خوشنودی کا اعلان عام فرمایا۔

تمتہ رمضان پس عید درحقیقت رمضان کے افعال و ترک کا ایک عملی شکریہ ہے جو بندوں کی جانب سے جناب خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شکریہ پر حسب وعدہ الہی ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① (اگر تم شکر گزار ہو گے تو تمہاری نعمت میں اضافہ کروں گا) بسلسلہ اضافہ نعمت شش عید یعنی شوال کے ۶ روزوں کا مزید اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں رمضان تو نہیں تمتہ رمضان کہا جائے گا۔ کیونکہ رمضان کی مدت ایک ماہ کی مدت جو ایک منضبط اور معتدل مدت ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔

سال سے کم اور ہفتہ سے زیادہ ایک درمیانی مدت ہے۔ اس میں اگر ایک دن کا بھی اضافہ ہو جاتا تو دوسرا ماہ لگ جانے سے رمضان کی مدت دو ماہ ہی کہلاتی۔ اور روزے ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کے کہلائے جاتے جو یقیناً طبائع پر بھی شاق گذرتے، مدت بھی معتدل نہ رہتی اور اس میں کسر بڑھ جانے سے مدت کا انضباط بھی فوت ہو جاتا۔ اس لئے روزہ کا ایک ماہ پورا کرنا اور درمیان میں ایک دن خوشی اور کھانے پینے کا دے کر بطور تمتہ رمضان ۶ روزے اور دیئے اور وہ بھی غایت رحمت سے اختیاری دیئے گئے جن میں کوئی جبر و اکراہ نہیں تاکہ بندوں پر بھاری بھی نہ ہو اور خدا کی طرف سے اس شکر گذاری پر حسب قانون الہی زیادت نعمت کا وعدہ بھی پورا ہو جائے۔ گویا اس طرح اس عباداتی سال کا افتتاح ۳۶ روزوں اور ۳۰ دن کی تراویح سے کر دیا گیا۔ یعنی ۳۶ ترک ۳۰ افعال سے انسانی عبادت کا سال شروع ہوتا ہے۔

عبادت کا ہمہ گیر نقطہ آغاز غور کرو تو رمضان میں عبادت کا یہ جمع شدہ ذخیرہ رمضان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ سال بھر تک یہی ذخیرہ توفیق و برکات کا کام دیتا ہے اگر یہ ذخیرہ اس ماہ میں جمع نہ ہوتا تو پورا سال عبادت سے بیگانگی اور برکات باطن سے محرومی میں بسر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصولاً ہر شے کے نقطہ آغاز ہی میں اس کا انجام اور وسط پنہاں ہوتا ہے۔ وہ نقطہ پھیل کر وسط سے گذرتا ہوا انجام تک جا پہنچتا ہے یعنی آخر تک اسی کا نقطہ فیض کام کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہر کلمہ اور کلام کا نقطہ آغاز حروف مقطعات (حروف تہجی) ہیں اس لئے ہر کلمہ و کلام اور لمبی سے لمبی عبارات میں فیض ان ہی حروف ہجا کا ہوتا ہے درخت کی ہر شاخ اور پھول پتی کا نقطہ آغاز اس کا تخم ہے تو

وہی تختی مادہ پھیل پھیل کر پھول پیتاں اور برگ و بار بنتا رہتا ہے۔ وہ نہ ہو تو نہ شاخ ہونہ برگ و بار، گویا سارے برگ و بار درحقیقت اس تخم کا فیض ہوتی ہیں۔

اعداد کا نقطہ آغاز واحد ہے وہی (ایک) مکرر نہ کر رہو کہ دو اور تین اور سو الاکھ بنتا رہتا ہے، وہ نہ ہو تو دو نہ ہوں نہ سو اور نہ لاکھ گویا رب ہا رب اور کرب در کرب فیض صرف ایک ہی کا ہوتے ہیں۔ خود بذاتہ کچھ نہیں، اس اصول پر سمجھو کہ عباداتی سال کا نقطہ آغاز رمضان المبارک اور اس کے افعال و ترک ہیں۔ (جیسا کہ ابھی واضح ہوا) یہی ایک حصہ افعال و ترک کا ذخیرہ درحقیقت سال بھر کی عبادت کا نقطہ آغاز ہے اس لئے یہی مادہ عبادت پورے سال کی عبادت کا مادہ ہے جو رنگ بدل بدل کر مختلف طاعات میں ظہور کرتا رہے گا۔ گویا سال بھر کی مختلف الانواع عبادتیں اور بروقتی کے مختلف مظاہر اس ماہ کے صبر و استقامت کا فیض ہوتے ہیں، یہ نہ ہو تو سال بھر کی توفیق و برکت درجہ صفر میں رہ جائے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

ماہ رمضان کے اعداد کا اثر..... شاید اس لئے اس ماہ مبارک کے افعال و ترک کے اعداد کچھ ایسی مناسب سے رکھے گئے ہیں کہ برکت ہی نہیں عدد ذابھی پورے سال پر پھیل سکیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک اکائی دوسرے مہینوں کی دہائیوں کے برابر ثابت ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ آخر رمضان میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے۔ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَطْلَقْتُكُمْ شَهْرَ عَظِيمٍ شَهْرَ مُبَارَكٍ شَهْرَ فِيهِ لَيْلَةُ خَيْرٍ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللَّهُ صِيَامَهُ وَ قِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا مِنْ تَقَرُّبٍ فِيهِ خُصْلَةٌ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَذَى فَرِيضَةٍ فِيمَا سِوَاهُ وَمَنْ أَذَى فَرِيضَةٍ فِيهِ كَانَ كَمَنْ أَذَى سَبْعِينَ فَرِيضَةً سِوَاهُ“ ① ”اے لوگو! تم پر سایہ گستر ہوا ہے ایک عظمت والا مہینہ ایک برکت والا مہینہ، وہ مہینہ جس میں ایک رات، ہزار رات سے بہتر ہے اللہ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں اور قیام لیل (تراویح) نفل رکھی ہے جس نے اس مہینے میں کوئی بھی بھلائی کی بابت کی تو وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے سو ماہ رمضان کے (بقیہ سال میں) کوئی فریضہ ادا کیا۔ اور جس نے اس ماہ میں فریضہ ادا کیا مثلاً (روزے رکھے) تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں (بقیہ سال) میں ستر فریضے ادا کئے۔“

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس ماہ کی نفل بقیہ سال کے فرض کے برابر ہے اور اس کا فرض بقیہ سال میں ستر فرائض کی برابر ہے۔ گویا بلحاظ برکت ہی نہیں بلکہ بلحاظ اجرا و عدد بھی اس مہینہ کی طاعت کی ایک اکائی دوسرے مہینوں کی طاعت کی دہائیوں کے برابر ہے۔ ماہ رمضان کے دنوں کو دیکھئے تو ان میں ۳۰ روزے رکھے گئے ہیں اور شریعت کی بخششیں بے کراں نے ایک نیکی کو دس نیکی کے برابر شمار کیا ہے۔ ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مِثَالِهَا﴾ ② اس اصول پر یہ ۳۰ روزے ۳۰۰ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر عید کے بعد شش عید جو بطور تہ و توالع رمضان کے ساتھ لاحق کئے گئے ہیں (گو بوجہ تسہیل و رحمت انہیں اختیار رکھا گیا اور جزو رمضان نہیں بنایا گیا) اصول مذکورہ

① شعب الایمان للبيهقي، فضائل شهر رمضان، ج: ۸، ص: ۱۲۰. ② پارہ: ۸، سورة الانعام، الآية: ۱۶۰.

پر ۶۰ ہو جاتے ہیں تو رمضان کے اصل اور ملحقہ روزوں کا مجموعہ بھی وہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے اوپر ۳۶۰ دنوں کے مساوی ہیں اور رمضان کے یہ اصل اور توابع روزے پورے کر دینے والا سال کے تمام روزے رکھنے والا بن کر صائم الدہر بن جاتا ہے۔ اسی مضمون کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ ذیل میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کو حضرت انصاریؒ روایت فرما رہے ہیں ”مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اتَّبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ“ ① ”جس نے رمضان کے روزے پورے رکھے۔ پھر شوال میں ۶ روزے ان کے ساتھ اور ملا لئے تو تو یہ عمر بھر روزے رکھنے کی مانند ہے“ (رواہ مسلم)۔ ② حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے ”الْبَصُلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتَنِبْتَ الْكِبَائِرَ“ ③ ”پانچ نمازیں جمعے سے جمعہ رمضان سے رمضان تک درمیانی دنوں کے گناہوں کا کفارہ یہ رمضان ہی ادا کر دیتا ہے جبکہ کبیرہ گناہوں بچتا رہے۔“

اس سے واضح ہو گیا کہ رمضان ہی کی اطاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔ اور یہی فیض منتشر ہو کر سال بھر کے دنوں راتوں کی عبادت اور توفیق کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ نہ صرف برکت یا اثر بلکہ عدا بھی رمضان سال عبادت کا نقطہ آغاز اور ختم توفیق تھا۔ اس لئے مادہ توفیق و طاعت سال بھر کی عبادت کے برگ و بار کی آبیاری کرتا ہے اور پورے سال پر چھایا ہوا رہتا ہے۔

رمضان اور اشہر حج کا باہمی ارتباط..... یہی وجہ ہے کہ رمضان کے ایام نے جن ترک (ترک طعام ترک شرب اور ترک خواہشات) کا پر داؤڈالا وہ رمضان ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان ترک سے دوسرے اور ترک نشوونما پاتے ہیں اور تقویٰ کے آگے کی منزلیں سامنے چلی جاتی ہیں، جو اگر رمضان میں نہیں ہوتیں مگر رمضان ہی کے ترک کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ماہ رمضان میں طلب حق نے محبت حق کی خاطر اپنے نفس کی عظیم آرزوؤں یعنی کھانے پینے اور لذت نفسانی کی چیز کو ترک کر کے ترک ہوائے نفس کی استعداد پیدا کر لی تو ترک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کھانے پینے اور قرب و وصال کی لذتوں کے سوا اور بھی بہت سی لذات ہیں جن کی خواہش نفس میں ہمدوقت موجزن رہتی ہے یہ تو صرف باہ کے سلسلہ کی لذتیں تھیں۔ جنہیں رمضان نے ایک دم چھڑا کر فی الجملہ صبر کر لینے کی قوت انسان میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن ان سے زیادہ سخت اور ہولناک جاہ کے سلسلہ کی لذتیں ہیں۔ جو انسان کو مغرور و متکبر بنا کر مشاہدہ حق ہی سے نہیں جاہ حق سے بھی بھڑکا دیتی ہیں۔ اور قرب و وصال کے درجات میں سدا رہا

① الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستۃ ایام من شوال... ج: ۶ ص: ۲۶.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستۃ ایام من شوال ج: ۶ ص: ۲۶.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الطہارۃ، باب الصلوٰات الخمس والجمعة الی الجمعة... ج: ۲ ص: ۲۳.

ہو جاتی ہیں کبھی مکان اور بلڈنگ سے اپنے کو باوقار کہلانے کی کوشش کرتا ہے کبھی اپنے قبیلے اور دوست احباب کے اجتماع اور جھگڑوں سے اپنے لئے شیخی اور فکر کا سامان بہم پہنچاتا ہے کبھی اپنی متانت اور سنجیدگی و بامعنی خاموشی کی نمائش سے اپنے سے وقار کی نمائش کرتا ہے کبھی اپنی زینت و آرائش اور خوبصورتیوں پر گھمنڈ کر کے اپنے خیال میں بدقسمت ہو جاتا ہے اور پھر ان ہی جاہ پسندانہ اندازوں سے دوسروں پر ظلم و تعدی وغیرہ کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں جن سے دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے اور دنیا امن و سکھ سے محروم ہو جاتی ہے۔

غرض جاہ پسندی اور دوسروں پر بڑا بننے اور عوام میں امتیازی شان نمایاں کرنے کے مختلف ڈھنگ ہیں اور مختلف راستے ہیں جس سے گزر کر ایک مغرور انسان قرب الہی اور وصال حق سے محروم ہو جاتا ہے اس لئے ان کا ترک ان ترکوں سے بھی زیادہ ضروری ہے جن کی رمضان نے مشق کرائی تھی۔

اس لئے جو نبی ان باہی اور شہوانی لذات کے افراط سے نجات پا جانے کی استعداد پیدا کر کے رمضان رخصت ہو جاتا ہے ویسے ہی حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہی، جو حج کا پیغام دیتے ہیں جس طرح ہلال رمضان نے اعلان کیا تھا کہ اگر دربار الہی میں حاضر ہو کر قرب و وصال شاہی منظور ہے تو شہوانی لذات سے پاک و صاف ہو کر اور انہیں ترک کر کے دربار شاہی (مساجد) میں تراویح و تلاوت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اسی طرح ہلال شوال اعلان کرتا ہے کہ محل سرائے شاہی (حرم کعبہ) یعنی سید المساجد میں حاضری اور خلوت محبوب مطلوب ہے تو ان جاہ پسندیوں کو ترک کر کے عاشقانہ وار فکری پیدا کرو اور خدا کے گھر کی طرف پروانہ وار بروہو مگر ع

شرط اول قدم آن ست کہ مجنون باشی

یہ سامان وقار چھوڑ دو، اسباب جاہ ترک کرو۔ وسائل غرور و گھمنڈ کو خیر باد کہو اور دیوانہ وار محبوب حقیقی کی طرف چلو، سب سے پہلے گھر بار اور وطن ترک کرو اور اپنا گھر چھوڑ کر محبوب کے گھر کی طرف کوچ کرو اپنا شہر چھوڑ کر خدا کے بلد امین کی طرف بروہو عزیز و اقرباء کی موانست مانع وصال الہی ہے تو اسے بھی چھوڑ دو مسافرت اور غربت اختیار کرو جتنے اور قبیلے کی طاقتوں پر بھروسہ تھا تو اسے بھی خیر باد کہو کمپرسی اور بے کسی کی شان سے گھر سے نکل کھڑے ہو۔ پھر نکلو تو دیوانوں کی طرح عاشقوں کی طرح نکلو۔

عاشقی، درویشی اور سرشاری..... سب سے پہلا سامان وقار لباس اور اس کا فیشن ہے اس ترک کر کے احرام باندھو اور ایک لنگی کندھے پر اور ایک لنگی گھٹنوں میں یعنی شاہانہ رئیسانہ اور معنمانہ ٹھاٹھ چھوڑ کر فقیروں کا بھیس بھرو اور مسکینوں کی سی وضع بناؤ کپڑوں کی بوکا بھی دھیان نہ رہے۔ کہ خوشبو کی فکر ہو۔ عاشق کو ان نمائشی چیزوں سے کیا واسطہ اگر وہ عشق سے مغلوب ہے۔ بدن کی صفائی ستھرائی کے دھیان کو ترک کرو الچ و لچ و لٹچ ج تو نام ہی ہے میلے کچیلے رہنے یعنی صفائی ستھرائی کے خیال کو غیر سمجھ کر ان سے بے نیاز ہو جانے کا بدن کے بناؤ سنگار کی فکریں چھوڑو نہ غسل کی پرواہ نہ حجامت کی خبر نہ خط کی اصلاح نہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے کی فکر حتیٰ کہ میلے بدن میں جوئیں بھی

پڑ جائیں تو انہیں بھی مت چھیڑو کہ تم محبوب کے عاشق بن کر چلے ہو تمہیں جانداروں کے قتل و غارت سے کیا سروکار؟ چہرہ غبار آلود پیر گرد آلود نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتہ نہ کندھوں پر عباء و قباء نہ بال سنوارے ہوئے نہ مانگ نہ پٹی نہ ان میں تیل پھر بولنے میں نہ آواز نہ بنانے کی فکر نہ الفاظ کے سنوارنے کی فکر نہ کلمات کی سجاوٹ، نہ عبادت کی زینت، بلکہ سرے سے ہی فضول کلام ترک کر دو، ورد زبان ہو لبیک کبھی پست آواز سے ہو تو کبھی بلند آواز سے کبھی آہستہ سے اور کبھی شور کے ساتھ یعنی آوازیں بھی عاشقانہ۔

مگر دیوانگی پیدا کرو۔ قافلے میں ہو تو لبیک لبیک کا شور ہو۔ زمین کی اونچ نیچ آجائے تو چلا پڑتا کہ آواز کا وقار جس کی بناوٹ اور سجاوٹ کی فکر تھی مٹ کر رہ جائے غرض نہ بات اپنی نہ کلام اپنا۔ بات ہو تو محبوب کی اور کلام ہو تو شوق محبوب اور ذوق عشق کا، یعنی زبان اور گلا صرف اسی کے لئے وقف ہو۔ محبوب کا گھر آجائے تو آواز شوق بلند کرو، شوق و ذوق میں کبھی خانہ محبوب کے پتھروں کو چومو، کبھی پردہ دیوار کو تھام کر روؤ اور چیخو، کبھی اس گھر کے ارد گرد پرانوں کی طرح گھومو، نثار ہو، کبھی یاد میں غرق ہو کر سرنگوں ہو اور کبھی بھکاری بن کر بانگ سے سرفراز ہو، کبھی فریاد اور کبھی یاد کرو، کبھی قرب کا شکر یہ کبھی بعد کا شکوہ، پیر چکر میں ہوں اور زبان عشق کی حرکت میں، پھر ان چکروں میں چال بھی ایک انداز کی نہ ہو جس سے چال کی خوشنمائی کا وقار آگے آئے، اگر چند پھیروں میں سیدھے چلو تو چند پھیروں میں اکڑ کر مونڈھے ہلا ہلا کر سینہ تان کر چلو۔ یعنی کبھی در محبوب کے مسکین بن جاؤ۔ اور کبھی محبوب کے سپاہی ہو جاؤ، صورت و سیرت ہی نہیں مرضی بھی تمہاری کوئی اپنی نہ ہو۔ ایک مرضی محبوب ہو اور تم ہو، مرضی حق ہو اور اس کی پیروی تاکہ اندرون میں کوئی شنی وغرور نہ رہ جائے اور نہ بیرون پر کوئی اتراہٹ اور ناز و انداز کی نمود آئے۔

صورت و وقار کی بھی ممانعت..... پھر یہ کفنی کا لباس بھی ان پھیروں میں کبھی ایک ہیئت و رنگ پر نہ ہو کہ صورت و وقار پیدا ہو جائے اگر پہلے تین پھیروں میں وہ بر جائے خود نہ ہو۔ تو چار پھیروں میں اسے دائیں کندھے کے اوپر کو لیا جائے۔ تاکہ اس کفنی کے اوڑھنے اور پہننے میں بھی کوئی اتفاقی پہن اور سجاوٹ پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی عاشقی کے شایاں نہیں یعنی اگر غیر اختیاری پہن بھی سجاوٹ بن جائے تو وہ بھی یکسر مٹ کر رہ جائے۔ پھر ان گھومنے کے پھیروں میں گود پوانگی تھی مگر چال ڈھال اور رفتار معمول کی مطابق تھی اس لئے اس کو بھی ختم کرو۔ صفاء مروہ پہنچو تو چال کہیں آہستہ ہو تو کہیں دوڑ بھاگ بھی ہوتا کہ چال کا انداز بھی ایک انداز پر باقی نہ رہے جیسا کہ طواف میں ہیئت بدن کا اپنا انداز مٹا دیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح اس عاشق حق کے لباس، بدن، زینت، چال ڈھال، سیرت و صورت، کلام، آواز، رفتار، گفتار وغیرہ میں کوئی شاہدہ نمائشی و وقار و متانت کا باقی نہ رہ جائے۔

خانہ بدوشی..... پھر اگر چہ تم نے وطن اور وطن داروں کا انس چھوڑ دیا، بلدائین میں پہنچ گئے، مگر بلدائین بھی تو بہر حال آبادی ہے جس میں اپنا نہیں تو اس شہر والوں کا سامان زینت، لذت بخش، انکی آوازیں انس افزائے مسح و گوش اور ان کی ملاقاتیں، انس افزائے دید و دل تو ہوتی ہیں جو وصال یار میں حائل ہو سکتی ہیں۔

اس لئے مکہ کی آبادی بھی ترک کر دے وہ پھر وطن اقامت اور محل موانست ہے جنگل بیاباں میں بسر کرو جہاں نہ گھر ہو نہ در، نہ تمدن، نہ عمارت نہ سامان معاش، نہ اسباب رفاہیت، عرفات کے ریگستان میں جلتی دوپہر میں دھوپ کے سمندر میں گزارو، کسی کپڑے، خیمہ سے اگر دھوپ سے بچاؤ ہو جائے تو فہماور نہ سایہ کی لذت بھی ترک کر دو، تپش کو ترجیح دو اور خشکی کی راحت بھی چھوڑ دو، مسکن اور جائے سکون کی فکر میں مت رہو۔ ویرانہ نشین اور صحرا نور ہو جاؤ۔ خانہ بدوشوں کی طرح یہ دن منی میں گزارو تو رات مزدلفہ میں بسر ہو۔ نہ وہاں پورا دن، نہ یہاں پوری رات، پھر مزدلفہ کی رات بھی اس فکر کے ساتھ گزارو۔ کہ صبح ہی یہاں سے کوچ ہے، مزدلفہ بھی طلوع آفتاب سے پہلے چھوڑ دو، گویا عرفات کے دن کی طرح یہاں کی رات بھی بے فکری سے نہ گزارے کہ عاشق کو چین اور لطف اندوزیوں سے کیا واسطہ؟ پھر مزدلفہ کی آدھی تہائی رات میں خدمت محبوب پیش نظر رہے، علاوہ طاعت و عبادت کے اس میدان کی کنکریاں بھی چنوتا کہ اس میگزین سے دشمن الہی اور خود عشاق کے پشتیں دشمن شیطان رجیم کو سنگسار کر سکو جو راہ محبوب میں حائل اور ناصح نادان بن کر سامنے آتا ہے۔ مزدلفہ سے منی میں آؤ تو گویا وہاں دو تین شب قیام ہو، مگر اس کو بھی سفر در انجمن کا مصداق رکھو، ایک جگہ چین سے بسر نہ کرو۔ کبھی یہاں سے پھر در محبوب پر جاؤ۔ خانہ محبوب کے گرد پروانہ وار گھومو، واپس ہو تو روزانہ اس شیطان سے لڑائی مول لو جو راہ جاں سپاری میں حائل ہوتا ہے تاکہ صلح جوئی سے بیٹھے رہنے کا سکون وقار بھی ختم ہو جائے، اور وہ بھی ربی جمار سے تاکہ سپاہیانہ وقار کا غور بھی مٹ جائے اور نیا دیکھ لے تیر و تفتنگ چلانے والا سپاہی آج چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے پر اتر آیا ہے۔

فدیہ جان..... تو اب وقت آ گیا کہ سر سے اس نفس ہی کو راہ محبوب میں نثار کر دو اور خود اسی کے گلے پر چھری چلا دو، اگر سب کچھ کھو کر جان باقی رہ گئی تھی تو اس سے بھی دریغ نہ کرو، یہ الگ بات ہے کہ محبوب حقیقی محض اپنی شفقت بے پایاں سے ذبیحہ جان کا فدیہ ذبیحہ حیوان سے قبول فرمائے، ورنہ اس راہ میں یہ جان جان آفریں کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتی اور وہ جب کہ اسی کو بخشی ہوئی ہو تو سودا بہت ہی ارزاں ہو جاتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہر حال شکر محبوب کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق منخر میں پہنچ کر اپنا فدیہ ایک جان کی قربانی سے دید و کہ یہ آخری ترک ہے تروک میں سے جس کے ذریعے وصال محبوب کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ بہر حال شہر رمضان نے اگر باہمی لذات ترک کرائی تھیں تو اشہر حج نے جاہی لذات کے ترک کا پروگرام پیش کیا، جو ترک وطن، ترک مسکن اور ترک لباس، ترک زینت، ترک راحت، ترک فیشن، ترک نمائش، ترک وقار، ترک جاہ، ترک افتخار ترک نشاط اور ترک مال سے شروع ہو کر ترک جان پر ختم ہو جاتا ہے۔

ایام حج میں یاد رمضان..... مگر ساتھ ہی ساتھ باہ کی ان لذات کے ترک سے بھی چشم پوشی نہیں کہ جو رمضان نے سکھائی تھیں، بلکہ اشہر حج میں خاص تروک کے ساتھ رمضان کے تروک کو بروئے کار لانے کے لئے گویا

نصف ماہ رمضان کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ یعنی چھ روزے شوال کے اور نو روزے عشرہ ذی الحجہ کے اشہر حج میں رکھ کر پندرہ روزوں کا پروگرام اشہر حج میں رکھ دیا گیا ہے، تاکہ ان مہینوں میں بھی آدی رمضان کو فراموش نہ کر سکے، حتیٰ کہ بعض روایات میں عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کو رمضان کے دنوں پر فوقیت اور فضیلت دی گئی ہے۔ دونوں کی لذتوں کا سلسلہ منقطع کرایا جاتا ہے۔ تب آدی خانہ محبوب کی حاضر باشی اور مشاہدہ حق کے قابل بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رمضان ابتدائی تروک کا مہینہ ہے۔ اور اشہر حج ان تروک کی تکمیل و انتہا کے مہینے ہیں۔

حکمت عید قربان ہاں پھر جس طرح رمضان کے تروک و افعال کی تکمیل پر یکم شوال کو دو گانہ شکر ادا کیا گیا تھا اور مالی شکریہ میں صدقہ فطر سے عیال محبوب (غرباء و احباب) کی خدمت کی گئی تھی، اسی طرح یہاں بھی حج کے تروک و افعال کی تکمیل پر جونوں ذوالحجہ تک ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کو اسی انداز سے بجان و دل دو گانہ شکر ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صدقہ انصیہ (قربانی) سے غرباء و احباب کی خدمت کی جاتی ہے تاکہ مالی شکریہ بھی ادا ہو جائے۔ شان جلال و جمال کا شکریہ پس عیدین کے تہوار اسلام میں رنگ رلیاں منانے کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ رنگ رلیوں کو مٹانے اور اس قسم کے تمام مادی اور نفسانی لذتوں اور خواہشوں کو ختم کر کے روحانی قرب و وصال کے شکریہ کے طور پر قائم کئے گئے ہیں، فرق اتنا ہے کہ رمضان کے تروک کے ساتھ افعال برکے سلسلہ میں نماز (تراویح) کا فعل رکھ لیا گیا جو حق تعالیٰ کے جلال و عظمت کے سامنے اظہار نیاز و عبودیت کے لئے ہے تاکہ اس کی علی الاطلاق آقائی اور حکمرانی کے ساتھ اپنی علی الاطلاق ذلت و نیاز مندی اور محکومیت کا ثبوت پیش کیا جائے اور اشہر حج کے تروک کے ساتھ افعال برکے سلسلہ میں مناسک حج رکھے گئے جو حق تعالیٰ کے جمال و محبوبیت کے سامنے اپنی شیفگی اور گرویدگی اور اپنے عشق و محبت کے جذبات پیش کرنے کے لئے ہیں تاکہ اس کی علی الاطلاق جمال و خوبی کے سامنے اپنا علی الاطلاق عشق و محبت پیش کر دیا جائے۔

دوسرے رخ سے دیکھئے تو ترک کے سلسلہ میں محکوم اور غلام کو بسلسلہ حاضری ملازمت نفس کی مرغوبات اور خواہشات ترک کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ کھانے کمانے اور اڑانے کے کام کا نہیں رہتا۔ ورنہ اسے خدمت کا وقت کیسے ملتا اور عاشق و محب کو محض خواہشات نفس ہی نہیں سرے سے نفس ہی کو توجہ دینا پڑتا ہے، نفس کی شخصیت اور تشخص ہی کو عشق میں گم کر دینا پڑتا ہے اسکی حیثیت عرفی اور طبعی، غرور و قار تو دور کی چیز ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نماز تو شاہی خدمات بجالانے کے لئے سرکاری طور پر حاضری دربار شاہی ہے جس کے لئے وقت اور عیش کی قربانی کافی ہے مگر شاہی آداب بجالانے کے ساتھ اور حج عاشقی کے جوش میں حرم سرانے شاہی میں شخصی حاضری ہے جس کے لئے جان و مال دونوں کی قربانی ضروری ہے۔ مگر آداب عشق کے ساتھ جس کا حاصل خود گزاری اور خود فراموشی ہے۔

نماز میں سکون و متانت مطلوب ہے کہ دربار اور دفتر معبودیت میں حاضر ہوتی ہے اور حج سے اسی سکون

ومتانت کو مٹایا جاتا ہے کہ عاشقانہ رنگ سے درمحبوب کی حاضری ہے، پس تلاوت و تراویح رمضان کے لئے تو باہی ترک رکھے گئے جن کا تعلق عیش سے تھا سکون و متانت سے نہ تھا، اور اس کے لئے وقت کی قربانی کافی تھی، لیکن حرم سرائے میں پہنچ کر قرب و وصال کے لئے جا ہی ترک بھی ضروری ہو گئے جن کا تعلق جاہ و باہ، عیش و وقار، متانت و ہیبت سب ہی سے تھا، تاکہ عاشقی کی مسکنت اور خود گزاری پیدا ہو جائے تو اس کے لئے محض وقت کی قربانی کافی نہ تھی جب تک کہ عین نفس کی قربانی نہ کر دی جائے۔

پس عید الفطر سے شونِ جلال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو غلام بننا میسر آ گیا اور عید الاضحیٰ سے شونِ جمال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو عاشق ہونا میسر آ گیا۔ اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے..... اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ علی الاطلاق مالک الملک اور آقا و حاکم ہیں ایسے ہی وہ علی الاطلاق محبوب و مطلوب اور جمیل و مرغوب بھی ہیں اور اس لئے جہاں ایک بندہ کو ان کے شاہی دربار (مساجد) میں حکمران اور نیاز مند بن کر حاضر ہونا ضروری ہے وہیں اس کے لئے ان کے شاہی حرم (مسجد حرام) میں عاشق و گرویدہ بن کر بھی پہنچنا ضروری ہے، یعنی اس کی بندگی تام و کامل نہیں ہوگی اگر ان میں سے ایک نوع بھی بندگی کی رہ جائے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام میں حج نہ ہوتا اسلام ناقص رہ جاتا کہ شونِ جمال کے تقاضے منعقد رہ جاتے پس جہاں اسلام کی تکمیل و تنمیم نماز اور حج کے بغیر ممکن نہ تھی، وہیں مسلمان کی تکمیل بھی بغیر ادائیگی نماز و حج کے ممکن نہ تھی۔

اس لئے اسلام کی دو ہی بنیادی عبادتیں اصل نکلتی ہیں، نماز اور حج، ایک جلالی عبادت ہے اور ایک جمالی، بقیہ دو عبادتیں زکوٰۃ و صوم یہ خود اصل نہیں ہیں بلکہ ان دونوں اصلی عبادتوں کے تابع اور ان کے مقدمہ و تمہید کے طور پر ہیں، زکوٰۃ مقدمہ نماز ہے جس سے نماز قائم ہوتی ہے کیونکہ نماز اور حاضری دربار میں اگر خارج ہے تو مال و منال اور اسی کی عیش کو شیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے اس لئے اسے زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے ترک کر کر دل سے اس کی محبت نکال جاتی ہے تاکہ موانع مرتفع ہو کر مقصود کا جمال سامنے آ جائے۔

ادھر روزہ مقدمہ حج ہے سرائے شاہی میں حضوری اور قرب خاص سے لذت اندوزی میں اگر خارج ہے تو نفس اور نفسانیت کے تقاضے یعنی وہ جاہ و اقتدار اور کبر و غرور ہوتے ہیں۔ اس لئے روزہ سے ترک کی ابتداء کی جاتی ہے اور اشہر حج پر لا کر انہیں ختم کر دیا جاتا ہے تاکہ موانع ختم ہو کر مطلوب ہو جائے اس لئے اشہر حج کو رمضان سے متصل رکھا گیا کہ ابتدائی ترک ختم ہوتے ہی انتہائی آ لگیں اور ترک کا سلسلہ متصل رہے۔

پس اسلام میں بنیادی عبادتیں دو ہیں، نماز اور حج اور عبادتیں ان کے مقدمات اور تمہید ہیں یعنی زکوٰۃ اور صوم، بنیادی عبادتوں میں اصل حصہ افعال کا ہے جو مقصود اصلی ہیں اور نفس ان سے آراستہ ہوتا ہے اور تمہیدی عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور صیام میں اصل حصہ ترک کا ہے جو مبادی ہیں جن سے نفس کا رذائل سے صاف ہونا ہے۔

اجتماعی دین..... اسلام چونکہ اجتماعی دین ہے اس لئے اس کی یہ اصل عبادتیں نماز اور حج تو اجتماعی رکھی گئیں چنانچہ دونوں میں اصل اجتماع ہے اور دونوں کے لئے امام و امیر ناگزیر ہے جو اجتماعی رنگ کا خاصہ لازمہ ہے اور تمہیدی عبادتیں چوں کہ محض ان اجتماعی عبادتوں کے لئے نفس کو تیار کرنے کے لئے تھیں اور نفس ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ دونوں عبادتیں (صوم و زکوٰۃ) بھی انفرادی رنگ کی رکھی گئیں چنانچہ ہر ایک کا مال اور اس کی مقدار الگ الگ ہے۔ اس لئے ہر ایک کی زکوٰۃ بھی مقدار و مدت کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ اسی طرح ترک طعام و شہوات بھی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے روزہ بھی ہر شخص کا اپنا اپنا الگ ہے۔ غرض اسلام کے اجتماعی دن ہونے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کی بنیادی عبادتیں تو اجتماعی ہوں اور تمہیدی عبادتوں میں اجتماعیت کی شرط نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تربیت میں ایک مسلم کا عباداتی سال افعال و ترک اور بر و تقویٰ سے مخلوط اور بلا جلا رکھا گیا ہے اگر اس کی بنیاد عبادتوں میں سے دو عبادتیں افعال کی قسم سے رکھی گئی ہیں۔ یعنی نماز اور حج تو دو ترک کی قسم سے رکھی گئی ہیں یعنی صوم و زکوٰۃ اور اگر اس عباداتی سال کے ابتدائی مہینے (رمضان) میں افعال بر، تلاوت و تراویح وغیرہ رکھے گئے ہیں تو اسی ماہ میں ترک تقویٰ (ترک طعام و شہوات) بھی رکھے گئے۔

عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت..... اسی طرح اگر اس عباداتی سال کے درمیانی حصوں مثلاً اشہر حج میں بر، طواف و زیارت اور صلوٰۃ و تلاوت کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے تو ان ہی مہینوں میں جاہی و باہی دونوں قسم کے انتہائی ترک بھی جمع کئے گئے ہیں جن میں صیام عشرہ ذی الحجہ اور بالخصوص صوم یوم عرفہ خاص اہمیت رکھتے ہیں یا مثلاً اشہر حج کے بعد محرم میں جہاں افعال بر تلاوت و نماز اور اذکار وغیرہ معمولاً رکھے گئے ہیں۔ وہیں ترک کے سلسلہ میں یوم عاشورہ کا روزہ بھی اہمیت کے ساتھ رکھا جاتا ہے جس سے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے ان درمیانی مہینوں میں سلسلہ افعال بر خاص فرائض ہی پر نہیں قناعت کی گئی بلکہ عام نوافل و تطوعات بھی رکھے گئے ہیں ایسے ہی سلسلہ ترک تقویٰ محض خاص روزوں صوم یوم عرفہ اور صوم یوم عاشورہ وغیرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ماہ میں ایام بیض کے تین روزے اور ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے روزے بھی رکھے گئے ہیں تاکہ درمیان سال کا کوئی مہینہ بھی افعال بر اور ترک تقویٰ سے خالی نہ رہے اور رمضان کی یاد فعل و ترک دونوں حیثیتوں سے تازہ ہوتی رہے، اسی طرح اسی عباداتی سال کے نقطہ اختتام یعنی شعبان میں شب برات کے افعال بر بصورت صلوٰۃ و تلاوت اور مجاہدہ مراقبہ رکھے گئے ہیں جس سے اس رات کا احیاء ہوتا ہے۔

تو وہیں یوم برات کا روزہ بھی سنت اسلام قرار دیا گیا اور پھر بطر ز سابق اس خاص فعل و ترک ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ افعال بر کے ساتھ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کی تھی۔ گویا شعبان افعال و ترک سے بھرپور رہتا تھا۔ جس میں شب برات کے افعال اور یوم برات کے ترک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہ و سال کا توازن..... بہر حال سال جس کی ابتداء میں رمضان اور اس کے افعال و ترک ہوں اور جس کے

درمیانی مہینوں میں اشہرج اور محرم وغیرہ کے جامع ترین افعال و ترک ہوں اور جس کی انتہا میں شعبان اور اس کے مخصوص افعال و ترک ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سال کی برکت و ہدایت اور نورانیت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے کیونکہ جس چیز کا اول و آخر اور وسط درست و صحیح ہو وہ یقیناً محفوظ اور نجات یافتہ اور ہلاکت سے دور ہوتی ہے۔

پس جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مرحومہ کے اول و آخر اور وسط کا ذکر کر کے بحیثیت مجموعی امت کی نجات اور عدم ہلاکت کا یقین دلایا اور فرمایا: ”كَيْفَ تَهْلِكُ أُمَّةٌ آتَتْهَا وَالْمَهْدِيُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِيحُ آخِرُهَا“ ”وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کا اول میں ہوں اور جس کے درمیان مہدی ہوں اور جس کا آخر حضرت مسیح علیہ السلام ہوں“۔ ① ایسے ہی بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرد مومن کیسے ہلاک ہو سکتا جس کے عباداتی سال کا اول رمضان المبارک ہو اور جس کا اوسط اشہرج اور محرم الحرام ہو اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مومن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہیں تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول و آخر اور وسط کے ساتھ جاہ و باہ کے ترک کے ذریعہ نفسانی خس و خاشاک سے پاک ہوگی اور افعال طاعت و عبادیت اور برکے ذریعہ نور و برکت سے چمک اٹھے گی، اس کے ردائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے۔ وہ نار سے بچ جائے گا اور نور سے سرفراز ہوگا جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔ ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ إِذْ أَخَذَ الْأَمَانَ﴾ ② ”جو نار سے نکالا گیا اور جنت (نور محض) میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ نہیں۔“

ان اوراق پریشان سے امید ہے کہ ناظرین پر رمضان عید اور مناسک حج کی حقیقت اور حکمتیں اور ان کے آثار و نتائج ایک حد تک واضح ہو گئے ہوں گے جو ان سطور کا مقصد اور اس زیر نظر رسالہ کا نصب العین ہے۔ زیادہ تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہ تھے اس لئے اسی قدر قلیل پر قناعت کی گئی۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے بیان کیا۔ جب رمضان آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ان کلمات کی تعلیم دیتے۔ ”اللَّهُمَّ سَلِّمْ لِي رَمَضَانَ وَسَلِّمْ رَمَضَانُ لِي وَسَلِّمْ لِي مُتَقَبِّلًا“ ③ ”اے میرے اللہ! مجھ کو رمضان کے لئے محفوظ کر دے اور رمضان کو میرے لئے محفوظ کر دے۔ اور اس رمضان کو بحفاظت میرے لئے قبول فرما۔“

اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا. اللَّهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ وَالْحَقُّنَا بِالصَّلَاحِينَ آمِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ.

① مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب تسمیة من سمي من اهل البدر، ج: ۳، ص: ۳۷۱.

② بارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۸۵.

③ کنز العمال، ج: ۸، ص: ۵۸۳، رقم: ۲۴۲۷۷ (طب فی الدعاء والدیلمی وسندہ حسن)

فضیلت تقویٰ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَلَّةٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۝ إِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۝ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ
قَدْرًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ.

احوال واقعی..... بزرگان محترم! یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بیماری کا سلسلہ
شروع ہو گیا اور زلزلہ زکام بخار وغیرہ کی وجہ سے کچھ کمزوری پیدا ہوئی تو میں نے معذرت کر دی کہ بھائی! آج رہنے
دو پھر دیکھی جاوے گی چنانچہ ہمارے بھائی رشید نے یہ بھی فرمایا کہ واپسی میں ایک دن دیا جائے اس میں کچھ بیان وہ
جائے گا۔ میں نے اس پر کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آج میں نے سوچا کہ شاید بھول گئے ہوں گے اور یہ
دیکھ کر کوئی سامان بھی جلسہ و اجلاس کا نہیں بالکل مطمئن تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سب جمع ہیں تو اچانک ایک چیز
سامنے آئی اور مجمع کے احترام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کچھ بیان کر دیا جائے چاہے ہو مختصر ہی ہو۔ اس لئے زیادہ
وقت بھی نہ لے سکوں گا۔ مختصر طریق پر چند باتیں گزارش کروں گا۔

طریق سلف اور وصیت تقویٰ..... سلف صالحین یعنی حضرات صحابہؓ اور حضرات تابعینؓ کی یہ عادت رہی ہے
کہ جب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تو کہتے تھے کہ کچھ نصیحت کیجئے چھوٹے اپنے بڑوں سے نصیحت کی
فرمائش کرتے تھے اور بڑے اپنے چھوٹوں سے نصیحت طلب کرتے تھے، عام طور سے سلف کی یہ نصیحت ہوتی تھی کہ
”أَوْصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ“ ”میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔“

یہ سلف کا عام جواب ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص

اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس کے لئے مشکلات میں ایسے راستے کھولتا ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہے ہر طرف سے راستے بند ہیں غیب سے سامان ہوتا ہے اور راہ نکل آتی ہے اور وہ شکل سے نکل جاتا ہے۔

نتائج تقویٰ..... اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا﴾ ① ”تقویٰ پر مرتب شدہ پہلا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے کام آتے ہیں“۔ اور دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ﴿وَنَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② ”حق تعالیٰ اس کو ایسے انداز سے رزق دیتے ہیں کہ اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ میرا رزق یہاں سے پہنچ جائے گا اور پہنچتا ہے وہیں سے“۔ تیسرا وعدہ یہ فرمایا ہے ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ﴾ ③ ”کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں“۔ اور چوتھا ثمرہ اور نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے ﴿وَيُعْظِمُ لَهُ أَجْرًا﴾ ④ ”اللہ اس کے اجر و ثواب کو بہت بڑھا دیتا ہے“۔

تو تقویٰ اختیار کرنے پر ان آیات میں چار وعدے دیئے گئے ہیں مشکلات میں راستہ کھول دینا، رزق بے شان و گمان پہنچانا، معصیت کا کفارہ کر دینا، اجر و ثواب کو بڑھا دینا، تقویٰ کے ایک معنی تو لغت میں ڈرنے اور خوف کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ”اللہ سے ڈرو اور خوف و خشیت اختیار کرو“۔ کسی حالت میں بے فکر ہو کر مت بیٹھو، خواہ دولت مند ہو خواہ مفلس ہو۔ ہر حالت میں اللہ کا ڈر انسان کو رہنا چاہئے۔

تقویٰ، امن عالم کا ضامن ہے..... اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی جرائم اور معصیتیں ہیں وہ اللہ کے ڈر سے ہی ختم ہوتی ہیں۔ جرائم کو نہ پولیس روک سکتی ہے نہ فوج روک سکتی ہے اور نہ ہتھیار روک سکتے ہیں۔ جب تک کہ دل میں ڈر اور خوف خداوندی نہ ہوگا۔ آدمی جرائم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر محض پولیس اور فوج کی طاقت سے جرائم بند ہو جایا کرتے تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوجوں کی کمی ہے اور نہ پولیس کی کمی ہے اور نہ ہتھیاروں کی کمی ہے بلکہ آج کل ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں کہ دنیا نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ تو ہیں بھی ہیں ہم بھی ہیں، غرض ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کے اثرات دور دور تک جاتے ہیں۔

ایک ہم سے لاکھوں آدمی ختم ہو سکتے ہیں، اگر ان ذرائع سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا اور جرائم مٹ سکتے تو آج کی دنیا میں کوئی جرم باقی نہ رہتا، سب کے سب متقی اور پرہیزگار ہوتے لیکن جتنی پولیس بڑھتی جاتی ہے اور جتنی فوج اور ہتھیار بڑھائے جاتے ہیں اس سے دگنے جرائم بڑھتے جاتے ہیں اور عام طور سے دنیا میں فقر و فجور مار دھاڑ اور بد امنی، بد نیقی اور فسادات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ارتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے، بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے۔ اگر یہ ہو تو آدمی کو ارتکاب جرائم کی ہمت ہی

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیہ: ۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیہ: ۳۔

③ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیہ: ۵۔ ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیہ: ۵۔

نہیں ہوگی خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔
تقویٰ کے بغیر قیام امن ناممکن ہے..... مثلاً آپ کے سامنے لاکھوں روپے کا خزانہ رکھا ہوا ہے اگر آپ اٹھا کر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں کیونکہ وہاں نہ پولیس ہے نہ فوج ہے مگر آپ اسے نہیں اٹھاتے! کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر دل میں گھر کئے ہوئے ہے کہ میں نے اگر ایسا کیا تو اللہ کے سامنے قیامت کو کیا جواب دوں گا۔ جب پوچھا جائے گا کہ تو نے غیر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا تھا۔ تو سب سے بڑی پولیس جو دلوں پر بیٹھی ہوتی ہے وہ خوف خداوندی ہے۔ وہی تمام جرائم سے بچانے والی ہے اور معصیت سے روکنے والی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی صورت نہیں ہے جرائم سے روکنے کی اور جرائم سے بچنے کی۔ اسلام نے آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو ہر وقت یہ تصور رہے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ہر شخص سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ زندگی کس طرح سے گزاری۔ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے انسان حرکات ناشائستہ سے رک سکتا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ اور ہر شخص ارتکاب جرائم سے بچ سکتا ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے اختیار کرنے سے جرائم سے بچ سکتے۔

باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے..... جبلی طور پر انسان درندہ واقع ہوا ہے مارکٹ چیر پھاڑ اس کا خاصہ ہے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور حضرت حواؑ بھی اتریں تو فرمایا ﴿اٰهْبِطُوْا اَبْعَضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ① جاؤ تم دنیا کے اندر اور ایک دوسرے کی دشمنی تمہارے اندر ڈال دی گئی ہے۔ اس لئے انسان ایک دوسرے کا دشمن بھی ہے اور برا چاہنے والا بھی۔ اس کے قلوب میں کہیں حرص رکھی گئی ہے کہیں بغض رکھا گیا ہے کہیں حسد رکھا گیا ہے کہیں تکبر رکھا گیا ہے۔ ان اخلاق رذیلہ کی بناء پر جب آدمی حریص ہوگا تو دوسرے کے مال پر نگاہ ڈالے گا۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا پھر اسے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ ہوگی، چوری ڈکیتی بے تحاشہ کرے گا، اس لئے کہ اس کے اندر حرص کا مادہ موجود ہے اور اگر انسان میں حسد کا مادہ موجود ہے تو وہ اپنے کسی بھائی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہے گا۔ دنیا میں کوئی عزت کے اعتبار سے ذرا بڑھا تو دلوں میں حسد شروع ہو جاتا ہے کہ یہ کیوں بڑھ گیا، لوگ اس پر تو غور نہیں کرتے کہ اس نے اپنی صلاحیتیں استعمال کیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔ ہم بھی وہ صلاحیتیں پیدا کریں مگر یہ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ترقیات و مراتب اس کے پاس نہ رہیں چاہے مجھے ملیں یا نہ ملیں، یہ حسد کا خاصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کو زائل ہوتا دیکھ کر خوش ہو، چاہے خود بالکل محتاج اور مفلس کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی تکبر، طمع، لالچ وغیرہ ہیں۔ ان اشیاء رذیلہ پر اگر بریک لگانے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ اور خوف خداوندی ہے اگر یہ نہ ہو تو سوائے ماردھاڑ کے اور ڈکیتی ڈالنے کے اور کیا کرے گا تو اس سے دنیا میں ایک عجیب

انار کی پھیل جائے گی۔ یہ اخلاق عام ہیں اور یہ انسان کی جبلت ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنا قانون اتارا کہ ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزارو۔

اس لئے حکم ہے کہ حسد ختم کرو اور ایثار اختیار کرو اگر اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ دولت ملی ہے تو اس پر اتنے ہی خوش ہو جیسے کہ یہ دولت مجھے ہی مل گئی اور یہ سمجھو کہ وہ میری ہی دولت ہے اگر کسی کو عزت ملی ہے تو یہ سمجھو کہ یہ میری عزت ہے، اگر خدا نخواستہ یہ ذلیل بنا تو یہ میری ذلت ہے۔ یہ جذبہ دین نے پیدا کیا ہے کہ حسد کو چھوڑ کر ایثار اختیار کرو۔ لالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو کہ جتنا تمہیں اللہ نے دیا ہے اس پر خوش رہو، شکر کرتے رہو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا دے گا۔ اسی طرح کبر سے بچا کر دین نے تواضع کی تعلیم دی ہے کہ خاکساری برتو، ہر ایک کے سامنے چھوٹے بن کر پیش ہو کر تم بڑے ہو، میں چھوٹا ہوں۔ لڑائی دنگا جب بھی ہوتا ہے تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور قاعدہ ہے کہ دو بڑے ایک جگہ نہیں ساکتے۔ یقیناً ایک گھٹے گا ایک بڑھے گا۔ ایک ختم ہوگا ایک آگے آئے گا۔ لیکن جب ہر ایک یوں سمجھے گا کہ میں بڑا نہیں۔ بڑا تو وہ ہے۔ جو یہ کہے کہ میں بڑا نہیں یہ بڑا ہے۔ تو پھر لڑائی جھگڑا کس چیز کا ہوگا؟

اس لئے اسن واماں کا ذریعہ تواضع اور خاکساری ہے اور لڑائی جھگڑوں کا سبب تکبر اور نخوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان میں موجود ہیں ان کا علاج اگر کیا ہے تو دین نے کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں آکر اس کی تعلیم دی اس کے طریقے بتلائے ہیں کہ اگر یہ طرز اختیار کرو گے تو تمہاری حرص زائل ہو جائے گی اور یہ طریقہ اختیار کرو گے تو تمہارا حسد ختم ہو جائے گا۔ یہ تمام طریقے دین کے بتلائے ہوئے ہیں۔

تقویٰ محاسبہ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے..... یہ دو بنیادی باتیں ہیں ایک دل میں اللہ کا ڈر، دوسرے آخرت کے عقیدے میں مضبوطی اور پختگی کہ جو کچھ دنیا میں کر رہا ہوں مجھے جواب دینا ہے اور حق تعالیٰ کے پاس ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ حتیٰ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی نعمت ہے اسکا بھی احسان جتلا یا جائے گا کہ ہم نے سردیوں میں گرم پانی دیا تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی نعمت ہے اس کا حساب ہوگا کہ تم نے اس ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے کیا شکر یہ ادا کیا۔ وہاں ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ تمہیں اتنی عمر دی تھی تم نے کا ہے میں صرف کی۔ تمہیں اتنی دولت دی گئی تھی تم نے اس کو کا ہے میں صرف کیا۔ تو سب چیزوں کو الگ الگ پوچھا جائے گا۔

یہ نہیں کہ سارے نبی آدم سے مشترکہ طور پر سوال ہوگا اور وہ سب مل کر جواب دیں گے نہیں بلکہ ہر کسی کی پوری زندگی سامنے کر دی جائے گی اور پھر اسی کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔ یہ عقیدہ جب ایک مومن کے دل میں جما ہوا ہے تو وہ جرات و ہمت نہیں کر سکتا۔ خیانت کی بدیانتی کی۔ اور جب بھی یہ حرکت کرے گا تو معلوم ہوگا کہ عقیدے میں ڈھیلا پن آ گیا ہے۔ وہ عقیدہ دل میں چھپ گیا ہے۔ سامنے نہیں رہا ہے لیکن اگر سامنے ہو تو پھر

یقیناً جرات نہیں ہوگی اور اگر کر رہی گزرے گا تو پھر جلدی سے توبہ کی توفیق ہوگی اور ندامت ہوگی کہ میں نے بہت بری حرکت کی ہے۔ اس کے نیچے میں توبہ کرے گا، استغفار کرے گا۔ یہ ندامت توبہ واستغفار اسی وجہ سے کہ یہ دو بنیادیں ہیں اس کے ذہن میں۔

تقویٰ میں احتیاط کا پہلو..... تقویٰ کے ایک معنی ہیں ڈرنے کے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور یہ ہی گویا جرائم سے انسداد کا طریقہ ہے۔ تقویٰ کے دوسرے معنی ہیں احتیاط۔ کہ میں آدمی محتاط زندگی بسر کرے جس میں بڑے جرائم سے بچنے کے لئے چھوٹے جرائم کو چھوڑ دے کہ اگر میں نے مکروہ فعل کیا تو ممکن ہے کہ کل کو فعل حرام کروں اور مکروہ سے بچنے کے لئے بعض جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑتی ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ جائز میں گھر گھر اگر مکروہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام سد ذرائع ہے یعنی ذرائع اور وسائل کو ترک کر دو تا کہ ناجائز مقاصد تک پہنچنے نہ پاؤں اور پہلے ہی رک جاؤں۔

مثلاً زنا کاری ایک فعل خبیث ہے اور حرام ہے۔ اس سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ اجنبی عورت پر نگاہ بھی مت ڈالو۔ اجنبی عورت سے خلوت بھی مت اختیار کرو۔ اجنبی عورت کی آواز پر کان بھی مت لگاؤ یہ ساری چیزیں سد ذرائع ہیں۔ جوان چیزوں میں پڑا تو اندیشہ ہے کہ مبتلا ہو جائے گا۔ اصل گناہ سے بچانے کے لئے شریعت نے یہاں سے روکنا شروع کیا کہ نگاہ ہی مت ڈالو، کان ہی مت لگاؤ۔ اور اگر عورت خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اپنی ناک کو موڑ لو۔ گویا ہم خوشبو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ خوشبو ذریعہ بنتی ہے خیال کے متوجہ ہونے کا۔ یہ ہے احتیاط جسے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت وضو کرے اور اس کا بچا ہوا پانی لوٹے میں موجود ہے اس سے وضو مت کرو۔ دوسرا نیا پانی لو۔ اس لئے کہ اس کے بچے ہوئے پان سے دھیان جاسکتا ہے کہ یہ فلاں عورت کا وضو ہے۔ اس خیال کو اگر متوجہ کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ دل کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے شریعت نے احتیاط کی رو سے حکم دیا کہ تم اس پانی کو چھوڑ دو نیا پانی الگ لو۔ کیوں اپنے خیال کو گندہ کرتے ہو۔ خیال گندہ ہوا تو ارادہ گندہ ہوگا اور ارادہ گندہ ہوگا تو فعل ناپاک ہو جائے گا۔ اس لئے شروع اور ابتداء ہی سے بچتے ہیں۔

زنا گناہ کبیرہ ہے اور یہ جوابدہائی وسائل ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہوں سے اس لئے بچایا گیا ہے کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ احتیاط کی زندگی ہے۔ چوری کے اندر جو اصل فعل ہے اور جس کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غیر کے مال کو بلا اس کی مرضی کے اٹھالائے لیکن شریعت نے اس سے بچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا ہے کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے سامان کو مت دیکھو ممکن ہے خیال پیدا ہو کہ آنکھ بچا کر اٹھا لوں یہ تا تک جہانک پیش خیمہ ہے اور چوری تو انجام کار اور آخری فعل ہے جو اصل میں ممنوع ہے۔ اس سے بچانے کے لئے یہ لمبا سلسلہ قائم کیا ہے۔ ہاں اگر خود مالک ہی دکھلائے کہ مجھے اللہ نے یہ نعمت دی ہے تو آدمی شوق سے دیکھے اور دیکھ کر شکر یہ ادا کرے اور خوشی کا اظہار کرے گویا کہ یہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے ہمیں ہی دیا ہے لیکن از خود تا تک

جھانک کر نایا یہ غور کرنا کہ کس مکان میں ہے مال اور یہ دھیان جائے کہ اگر نقب لگاؤں تو یہاں سے مناسب رہے گا یہاں سے یہ نقب لگانے کا دھیان اور تا تک جھانک کرنا اور نگاہ ڈالنا۔ صغیرہ گناہ ہیں۔ شریعت نے ان صغیرہ گناہوں سے روکا ہے تاکہ اصل گناہ جو کہ چوری ہے اس تک نہ جانے پائے۔ اسی کو کہتے ہیں سد ذرائع اور وسائل پر پابندی تاکہ اصل مقصد تک نہ پہنچنے پائے۔

درجاتِ تقویٰ..... یہ ہی ہے وہ سد ذرائع کہ ابتداء میں جو ہلکی صورت ہے اسے بھی اختیار مت کرو تا کہ بڑی صورت تک نہ پہنچ سکے۔ تو شریعت اسلام نے ایک سلسلہ کبار کا رکھا ہے۔ کہ یہ حرام ہے مثلاً زنا کاری، چوری، بے ایمانی اور کچھ اس کے دوائی و اسباب ہیں ان تک کو روکا ہے تاکہ اصل مقصد تک پہنچنے نہ پائے، اب اگر تقویٰ کے لغوی معنی بھی مراد لئے جاویں۔ یعنی ڈرنے کے تو بھی اپنی جگہ درست ہیں اس لئے کہ ڈر سے معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور اگر تقویٰ سے احتیاط کے معنی لئے جاویں تو بدرجہ اولیٰ معصیت سے حفاظت ہو جائے گی کہ بعض جائز چیزیں بھی چھوٹ جاتی ہیں۔

پھر اس کے بعد آدمی کی زندگی پاک بن جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آدمی کو جہنم سے ہٹا کر جنت میں ابدال آباد والی نعمتوں میں داخل کر دیتی ہے اور آدمی کو اللہ کا مقرب بنا دیتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اس درجہ کا حصول موقوف ہے بادشاہ حقیقی کے مرتبے کے معلوم ہونے پر یہ محتاط زندگی والا تقویٰ تو بڑوں کا نصیب ہے۔ ہم اور آپ جیسے بہت مشکل سے اس کی طرف جا سکیں گے کہ ناجائز سے بچنے کے لئے جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیں تو بہت اونچا مقام ہے مگر ابتدائی درجہ ہر ایک کے بس کا ہے کہ اللہ اسے ڈرے۔

حصولِ تقویٰ..... اور ڈرنے کی صورت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار اور قبضے کو تصور میں لاتا رہے کہ وہ مالک ہے جس طرح چاہے کرے۔ جب چاہے موت دیدے جب چاہے حیات دے، جب چاہے صحت دے دے، جب چاہے بیماری مسلط کر دے، جب چاہے امن دے دے اور جب چاہے بد امنی مسلط کر دے۔ اسی کی یہ قدرت ہے اور اس کی اس قدرت کا جب دھیان ہوتا ہے تو ڈر پیدا ہوتا ہے کہ میں بڑے قادر کے قبضے میں ہوں معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو آدمی حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور کرتا رہے اس سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جاہل مقامِ تقویٰ سے نا آشنا ہے..... اگر کوئی بالکل انجام اور جاہل محض ہے اسے کبھی بھی ڈر نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے بادشاہ کے اقتدار سے۔ ایک دیہاتی اگر بادشاہ کے دربار میں آئے تو وہ زیادہ نہیں ڈرے گا۔ اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا ہیں اس کا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کو یوں ہی سمجھے گا کہ مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر وزیر اعظم تھرایگا، کپکپائے گا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ کے اختیار و اقتدار کو جانتا ہے۔ وہ آنکھ نیچی رکھے گا۔ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھے گا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میری گردن نہ مار دی

جائے۔ تو جس کو علم اور پہچان ہوگی باری تعالیٰ کی بڑائی اور اقتدار کی اور اس کے جلال کی اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہوگا۔ اور جو جاہل ہے اس کے دل کے اندر کچھ بھی پیدا نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے مشاعرہ کی مجلس کی کہ شعراء آئیں اور اپنا اپنا کلام سنائیں اور اعلان کیا کہ جس کی نظم عمدہ ہوگی اسے انعام دیا جائے گا۔ سینکڑوں شعراء نے نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بہت بڑا دربار ہوا۔ گاؤں کے ایک دیہاتی نے بھی ارادہ کیا کہ میں بھی کچھ تک بندی کر کے لے جاؤں تو مجھے بھی بادشاہ انعام دے گا۔ تو چودھری صاحب بھی دربار میں کچھ لکھ کر لائے۔ وزیر اعظم نے دیہاتی آدمی سمجھ کر اسے بلایا اور پوچھا کہ تو کیا لایا ہے اسے شبہ ہوا کہ پتہ نہیں کیا اتنا پ شاپ لکھ کر لایا ہوگا، الٹا بادشاہ ناراض ہو کر اس کی گردن نہ مار دے۔ اس بنا پر وزیر اعظم نے دیہاتی سے کہا۔ کہ چودھری صاحب! تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مجھے سنا دو۔ اس نے کہا اچھا سن لو۔ چودھری صاحب نے وہ قطعہ سنایا۔ قطعہ یہ تھا کہ ۔

سب درکھت ماں بزرگ بڑے ہرے ہرے پتو میں لال لال پھل

یعنی سارے درختوں میں جو بڑا درخت ہے وہ بڑکا درخت ہے جس کی ڈاڑھی اور چھالیں لٹکی رہتی ہیں اور اس کے سبز سبز پتے ہوتے ہیں اور سرخ سرخ پھل ہوتے ہیں۔ گویا یہ قطعہ کہا اور اس قطعہ کے اخیر میں کہا کہ ۔

اکبر بادشاہ گیدی خ

یعنی اکبر بادشاہ حرام زادہ ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم تو کانپ گیا کہ اس کینخت نے خود بھی جان کوئی اور مجھے بھی پٹوائے گا، تو خیر وزیر اعظم نے کہا کہ چودھری صاحب! شعر بڑے عمدہ ہیں مگر یہ جو اخیر کا شعر ہے (اکبر بادشاہ گیدی خ) یہ نہ لکھو۔ اس نے کہا کہ اور کیا لکھوں؟ وزیر اعظم نے کہا کہ یہ لکھو کہ.....

اکبر بادشاہ بخروڑ

یعنی اکبر بخروڑ کا بادشاہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا اونچا بادشاہ ہے۔ اس نے کہا جی اچھا کہہ دوں گا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اعلان ہوا کہ چودھری صاحب بھی ایک قطعہ پڑھیں گے۔ چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک قطعہ پڑھا کہ

سب درکھت ماں بزرگ بڑے ہرے ہرے پتو میں لال لال پھل

اکبر بادشاہ بخروڑ

اکبر نے کہا چودھری صاحب! یہ مصرع تو بہت عمدہ ہے مگر یہ اخیر کا مصرع ہے ۔

اکبر بادشاہ بخروڑ

یہ بہت بڑا مصرع ہے۔ اکبر سمجھ گیا کہ مصرع اس کا نہیں ہے۔ یہ اس کو کسی نے بتایا ہے تو چودھری نے وہیں کھڑے کھڑے وزیر اعظم کو ماں کی گالی دے کر کہا کہ اس حرام زادے نے کہا تھا کہ اس طرح کہنا ورنہ میں تو یوں

لکھ کر لایا تھا۔

اکبر بادشاہ گیدی خر

اکبر بادشاہ نے کہا یہ بہت عمدہ ہے وہ ٹھیک نہیں تھا۔

چودھری صاحب نے کہا جی ہاں! میرا تو یہ ہی مصرعہ ہے پھر اس کو بادشاہ کی طرف سے بہت انعام و اکرام ملا۔ اس نے یہ مصرعہ ”اکبر بادشاہ گیدی خر“ کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ دیہاتی ہے۔ نہ اکبر کی جاہ و جلال سے واقف اور نہ اس کی عظمت و اقتدار سے واقف فقط ایک دیہات کا رہنے والا ہے۔ تو دیہاتی لوگ بیچارے بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں چھل فریب مکر و فریب و غابازی دھوکہ دہی کچھ نہیں ہوتی ہے۔ سادہ زندگی ہوتی ہے جو دل میں آیا بے تکلف کہہ دیا۔

قدرِ تقویٰ بقدرِ عظمت..... اس واسطے احادیث میں آیا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آ کر سوال کرے تاکہ علوم کھلیں اور ہم سب کو اس کی بدولت تازہ علوم حاصل ہوں۔ صحابہؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ و جلال کی عظمت غالب تھی اس لئے ہر ایک کو سوال کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ شانِ نبوت سے واقف تھے۔ اس لئے ان کی دل پر ہیبت تھی اور خوف تھا۔ اور دیہات والے بیچارے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی جو چاہے آ کر پوچھ لیا جو چاہے آ کر کہہ دیا۔ جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے ایک دیہاتی بھی آ گیا اس کو دینے میں دیر لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوروں کو دے رہے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر فوراً کہا کہ ”اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے اس میں ہمارا بھی تو حق ہے“۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”چودھری صاحب تمہیں بھی ملے گا گھبراؤ مت۔“

یہ کہہ دینا کہ یہ مال تیرا نہیں اور نہ تیرے باپ کا ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے شانِ نبوت کا پتہ نہ ہو۔ اس لئے صحابہؓ منتظر رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آ جائے اور آ کے سوال کرے حضورؐ جواب دیں گے اور ہمارا علم بڑھے گا، جتنا جلال و عظمت دل میں پیدا ہوگی اور ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمتِ خداوندی سے جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی آزاد ہوگا جو چاہے کر گزرے۔

تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ..... تو اس کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں خوفِ خداوندی پیدا کریں تاکہ جرائم سے بچیں اور خوف پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہم تصور کریں کہ اللہ مالک الملک ہے۔ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ موت و حیات اسی کے قبضے میں ہے۔ صحت و بیماری اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تو نگری و مفلسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ”جو کچھ وہ کر دے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ کیوں کیا ہے؟“۔ وہ بری ہے ان سب چیزوں سے تو جب یہ یقین و تصور ہوگا بندہ کو کہ وہ غنی مطلق ہے جو چاہے کرے، تو دل میں ہیبت پیدا ہوگی کہ میں ایک بندہ ذرہ بے مقدار ہوں اور مالک الملک کے سامنے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بے ادبی ہو جائے۔ تو دل میں ڈر بیٹھ جائے گا

تو پہلا درجہ یہ ہے تقویٰ کا جس کے معنی خوف کے ہیں کہ دل میں اللہ کا ڈراختیا کرے تاکہ مصیبت سے بچ جائے۔ فقر و غنا میں تقویٰ کی ضرورت..... بہر حال خوفِ خدا جب دل میں ہوگا تو آدمی مالداری میں بھی گناہ سے بچے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور کیسی پاک نصیحت ارشاد فرمائی ہے۔ حدیثِ قدسی ہے آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اپنے بندوں سے کہ ”اے بندے! تو نگری اور دولت مندی کے زمانے میں تو مجھے یاد رکھتا کہ تیری مفلسی کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھتا کہ میں تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ تو نگری کی حالت میں ہو تو جب بھی خوفِ خدا ضروری ہے اور مفلسی کی حالت میں ہو تو جب بھی خوفِ خدا ضروری ہے۔ اگر تو نگری میں خوفِ خدا نہیں تو ڈر ہے کہ تو نگری چھن جائے اور اگر مفلسی میں خوف ہے تو ممکن ہے کہ وہ تو نگر بن جائے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہے جسے چاہے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ جس کو دینا بہتر سمجھتے ہیں اس کو دے دیتے ہیں مگر دیتے ہیں اسی حد تک جس حد تک باری تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اجازت دیتی ہے۔ معاذ اللہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جسے چاہیں لکھ پتی بنادیں اور جسے چاہیں مفلس۔

تقسیمِ دولت احوالِ قلوب کے مطابق ہے..... اس نے جیسی خلقت بنائی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ دینا مصلحت ہے اور اس کو نہ دینا مصلحت ہے اسے تو نگر بنانا حکمت ہے اور اسے مفلس بنانا مصلحت ہے۔ قلوب کی حالت کو وہی بہتر جانتا ہے جس نے خلقت بنائی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ چار پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہی اور دوسروں کو حقیر جاننے لگتے ہیں ایسوں کو اگر دنیا کی دولت دیدی جائے تو ظلم کا کارخانہ کھل جائے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لاکھوں روپے آجائیں پھر بھی انسان بنے ہوئے ہیں پھر بھی ان میں وہی دینداری ہے پھر بھی ان میں وہی جذبہ ہے۔ پھر حق تعالیٰ ان کو دولت دنیا میں ترقی دیتے ہیں۔ تو باری تعالیٰ جسے دولت دیتے ہیں اسے جانتے ہیں کہ کس مصلحت کے تحت اسے دولت دی گئی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”كَأَذِ الْفَقْرَانِ يَكُونُ كُفْرًا“ ① بعض دفعہ فقر و فاقہ کفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور آدمی اللہ کی شکایتیں کرنے لگتا ہے اور ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو پیسے دے دیئے جائیں تاکہ ایمان محفوظ رہے اور بعض ایسے ہیں کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں انہیں مفلس رکھا جاتا ہے تاکہ وہ آپے میں رہیں۔

تو مفلس اور تو نگری من جانبِ اللہ ہے۔ جیسی جیسی جس کی خلقت بنائی ہے اس کی مناسبت سے اسے دیتے ہیں۔ ﴿وَنَحْنُ قَسَمًا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ ② ہم نے ہی رزق تقسیم کیا ہے ہم نے ہی معاش تقسیم کی ہے اور ہم نے ہی درجے قائم کئے ہیں بعضوں کو اونچا بنایا بعضوں کو نیچا بنایا۔ اب اونچے کا کام یہ ہے

① شعب الایمان للبيهقي، الثالث والاربعون من شعب الایمان وهو باب في الحث على ترك، ج: ۱، ص: ۱۲۵، مشکوٰۃ

المصابيح، كتاب الآداب، باب السلام، الفصل الاول، ج: ۳، ص: ۹۵، رقم: ۵۰۵۱، ② پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآية: ۳۲

کہ وہ بچکے اور شکر کرے اور نیچے کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دعاء کرے اور مانگے۔ اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔ اللہ نے دونوں کے لئے راستہ رکھ دیا ہے۔ تو مگر بھی نجات پائے اور مفلس بھی نجات پائے۔

باطنی دولت..... حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک کے کچھ درجات ہیں، کچھ نعمتیں دولت مندوں کو بھی ملیں گی اور کچھ مفلسوں کو بھی ملیں گی یعنی مایوس نہ ہوں کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھنے کی دوسری چیزیں ان کو دے دیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے صدقات و خیرات کے فضائل بیان فرمائے کہ صدقات دیں گے، زکوٰۃ دیں گے، دین کا کام ان سے چلے گا۔ وہ بہت دین کا کام کریں گے انکا مال آخرت کا ذریعہ بنے گا، درجات کمائیں گے، ان فضائل سے مفلسوں کا دل ٹوٹنے لگا۔ کہ بھائی یہ تو مگر تو بڑے اچھے رہے کہ دنیا میں بھی انہوں نے مزے کی زندگی گزاری اور آخرت میں بھی ان کے درجات بلند ہیں اور ہم نے دنیا میں بھی مصیبت جھیلی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے کچھ نہیں۔ یہ مالدار لوگ بڑھ گئے اور ہم رہ گئے۔ تو یہ گروہ مفلسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ۔ ”يَا رَسُولَ اللَّهِ! سَبَقَ أَهْلُ الْأَمْوَالِ الذُّنُوبَ بِالْآخِرِ“۔ ① یہ مالدار تو جیت گئے ہم سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مالدار اپنی دولت کا حساب دیتے رہ جائیں اور تم پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو۔

انہوں نے کہا کہ بس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لئے کافی ہے۔ ہمیں دولت نہیں چاہئے تو بہت سی دولتیں مفلسوں کو بھی دی گئی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ تو مگروں کو ہی نعمتیں دی گئی ہیں۔ نہیں بلکہ سب کو دی گئی ہیں۔ کسی کو یہاں دی گئی ہے کسی کو وہاں کیا گیا سب کو برابر۔ یہ مالک کی حکمت ہے کہ کسی کو یہاں بڑھا دیا مگر فیضان سب کے اوپر عام ہے اگر کسی کی ظاہری دولت بڑھادی تو کسی کی باطنی بڑھادی۔ وہ اپنے رنگ میں خوش ہے یہ اپنے رنگ میں خوش اور بسا اوقات باطنی نعمت مال سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایمان کی دولت مضبوط ہے اور توکل کی دولت مضبوط ہے تو ہزاروں مال اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور یہ دولت سب اونچی ہو جاتی ہے۔

دولت معرفت کا تفوق..... ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے۔ بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔ دیکھا کہ سارے دروازے بند ہیں۔ اور ہزاروں مال گاڑیاں ادھر رکی ہوئی کھڑی ہیں اور ہزاروں مال گاڑیاں اندر رکی ہوئی کھڑی ہیں۔ دن کا وقت ہے اور شہر میں بالکل آمدورفت نہیں ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا تجارتی شہر ہے کہ کروڑوں کا بیوپار ہے اس میں اور دروازے بند ہیں۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی شہر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب! بادشاہ کا بازگم ہو گیا ہے (باز ایک شکاری پرندہ ہوتا ہے) اس لئے بادشاہ نے کہا ہے کہ شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ جاسکے اور پھر ڈھونڈتے پھریں۔

بزرگ بڑی حیرت میں رہ گئے کہ بادشاہ بے وقوف ہے کہ ایک پرندہ کے لئے دروازے بند ہیں۔ بھلا وہ

① مسند الحمیدی، احادیث ابی ذر، ج: ۳، ص: ۲۹۷۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۳، ص: ۱۱۷۔

اڑ کر نہیں جاسکتا چھتوں کے اوپر سے؟ دل ہی دل میں کہا کہ بڑا بیوقوف ہے بادشاہ اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ ”خدا یا تیری قدرت! کہ کندہ ناتراش کو تو نے بنادیا بادشاہ جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ جانور کو روکنے کے لئے جال ڈالنے کی ضرورت ہے یا شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کی۔ اسے تو نے ملک دے دیا اور ہم جیسا فضل جو تیاں چنچا تا پھر رہا ہے جس کے اندر علم بھی ہے معرفت بھی اور کمالات بھی بھرے ہوئے ہیں ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں، ایک وقت کھالیا اور ایک وقت فاقہ ہے۔ تو جس میں یہ دولت موجود ہے وہ جو تیاں چنچا تا پھرے اور جو ایسے احق اور کندہ ناتراش ہیں وہ تخت سلطنت پر بیٹھ جاویں۔ آپ کی عجیب قدرت ہے۔“

یہ گویا ایک سوال اور غلبان اللہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اچھا کیا۔ تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم، تمہاری معرفت، تمہارا ایمان چھین کہ اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی ساری سلطنت تمہیں دیدیں۔ تیار ہو؟ انہوں نے کہا نہیں اس پر تیار نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی قوت زیادہ تھی اور توکل کی قوت زیادہ تھی دولت سے ورنہ راضی ہو جاتے کہ میں نے علم بھی دیا ایمان بھی دیا۔ لائیے مجھے تخت سلطنت دیجئے نہیں بلکہ تخت سلطنت پر لات مار دی اور ایمان و علم اور معرفت نہیں چھوڑی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی دولت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دونوں دولتیں دے دے کہ مال کی دولت بھی ہو اور ایمان کی قوت بھی ہو اور اللہ پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے پاس اللہ نے دین دنیا دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ تو بہر حال دولت دنیا بھی ایک نعمت ہے اور دولت دین اس سے بڑھ کر نعمت ہے اور جمع ہو جاویں تو سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔

مصر و شکر کے ذریعے ترقی در جائد دونوں کے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ مالدار کی کے اندر آدمی غرور میں نہ پڑے اور ہر وقت شکر گزار رہے اپنے پروردگار کا اس لئے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ محض عطاء خداوندی ہے۔ اللہ کے اوپر کسی کا حق نہیں۔ جب فضل سے ملے تو شکر واجب ہوتا ہے لہذا ملنے پر شکر ادا کرے اور جس کو مفلسی دی ہے وہ عدل سے دی۔ گویا حکمت و انصاف کا یہی تقاضا تھا کہ اس کو اس حالت میں رکھا جائے تاکہ وہ مبر کرے کیونکہ دونوں ہی راستے جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ مبر اپنے راستے سے جنت میں پہنچائے گا اور شکر اپنے راستے سے جنت کی طرف لے جائے گا، ہیں دونوں کامیاب اور ناجی! اور محبوب خداوندی شاکر بھی ہے اور صابر بھی۔ علماء میں ایک عالم گذرے ہیں فن نحو کے بہت بڑے امام جن کا نام ہے اشعم اور انتہائی درجہ بد صورت تھے۔ جتنی بد صورتی کی علامتیں ہیں وہ سب ان میں جمع تھیں، رنگ بے حد کالا، دانت بہت چوڑے چوڑے، آنکھیں نہایت چھوٹی اور کرنچی اور آنکھوں میں چڑے لگے ہوئے، دانتوں میں زردی لگی ہوئی غرض جتنی بد صورت کی علامتیں ہو سکتی ہیں ساری ان میں جمع تھیں اور علم و ہنر کا یہ عالم کہ بہت اونچا اور بہت بلند، ان کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی کہ دور دور تک اس کی نظر نہیں تھی، جب خاوند اور بیوی آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے

دھوپ چھاؤں، کہ ایک طرف دھوپ نکل رہی ہے اور ایک طرف سایہ ہے اور ایک طرف نور اور ایک طرف ظلمت۔ تو آنے سے سامنے بیٹھ کر بیوی سے کہتے ہیں کہ میں بھی قطعی جنتی ہوں اور تو بھی قطعی جنتی۔ بیوی کہتی کہ کیا بات ہے۔ فرماتے کہ میں تو اس لئے جنتی کہ تجھ جیسی مجھے بیوی ملی میں رات دن شکر ادا کرتا ہوں اس شکر کے راستے سے جنت میں پہنچوں گا اور تو اس لئے جنتی کہ مجھ جیسا بد صورت خاوند تجھے ملا تو رات دن صبر کرتی ہے کہ کس بلا میں گرفتار ہوگئی۔ اسلئے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچے گی۔ تو میں نے بھی جنتی اور تو بھی جنتی۔ اس بناء پر دولت مند کے لئے اللہ نے شکر کا راستہ رکھا ہے اور وعدہ ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① ”جتنا تم شکر کرو گے اتنا ہی میں اس نعمت کو بڑھاتا چلا جاؤں گا“۔ یہ صاحب دولت کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

غریب اور مفلس کو حکم ہے کہ تو کسی دولت مند کی دولت پر نگاہ مت کر، صرف میرے اوپر نگاہ رکھ اور صبر اختیار کر میں نے کتنی دولت تیرے لئے جمع کر رکھی ہے۔ تجھے معلوم نہیں ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عنقریب ملنے والی ہے۔ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے دے، مجھے دولت دے دے، فاقے اتر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ دعا پوری نہیں ہوتی مہینے گزر گئے، برس گزر گئے، حتیٰ کہ عمر گزر گئی۔ اب اس نے کہا کہ کچھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے، مانگتے مانگتے تھک گیا، نہیں ملا، قیامت میں جب میدان محشر میں پہنچے گا تو دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر بھرے ہوئے ہیں، ہزاروں، لاکھوں کو وہ نعمتیں نہیں ملیں جو اس کے لئے جمع ہیں۔

عرض کرے گا کہ اے اللہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں۔ میں نے تو کوئی عمل نہیں کیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تو دعائیں نہیں مانگا کرتا تھا؟ اس دعا کو ہم نے پالا پرورش کیا، بڑھایا۔ یہ تیری ان دعاؤں کے ثمرات ہیں۔ وہاں دنیا میں اگر دیدیتے تو تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے تیری دعا کو ذخیرہ کیا۔ اب تو ابدی طور پر عیش و آرام کر تیرے لئے انتہائی درجات ہیں۔ تو غریب کے لئے موقعہ مایوسی کا نہیں اور امیر کے لئے موقعہ کفرانِ نعمت کا نہیں، اس پر شکر واجب ہے، اس پر صبر واجب ہے اور دونوں کے اوپر اعتماد علی اللہ واجب ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو میرا کوئی حق نہیں محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اسے اگر نہیں دیا تو کوئی ظلم نہیں ہے وہ عدل ہے جس کا وجہ سے نہیں دیا ہے، دونوں انشاء اللہ کامیاب ہیں۔ باقی جسے بھی جو ملتا ہے وہ ملتا ہے، فضل خداوندی سے کسی کا کوئی حق اللہ کا اوپر نہیں کہ وہ مجبور کرے بھلا اللہ پر کس کا جبر چل سکتا ہے، بہر حال تقویٰ اور اس کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور اپنے نیک بندوں میں شامل

فرمائے۔ (آمین یا رب العالمین)

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراہیم، الآیۃ: ۷۔

اسلام میں عید کا تصور

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا مُهَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
اللَّهُ إِلَيْنَا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى
آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْعِيدُ
لِمَنْ خَافَ الْوَعِيدَ لَا لِمَنْ لَبَسَ الْجَدِيدَ (صَدَقَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

اجتماعیتِ عامہ!..... بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر قوم تہوار رکھتی ہے، اور اپنی حد تک اسے شاندار طریقے سے مناتی
ہے، پارسیوں میں نوروز اور مہر جان کی عیدیں ہیں، عیسائیوں میں کرسس اور بڑے دن وغیرہ کے نام سے عید ہے،
ہندوؤں میں ہولی، دیوالی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں تہوار اور آئے دن کے میلے ٹھیلے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عیدین (عید الفطر اور عید قربان) کے تہوار عطا فرمائے، فرق یہ ہے کہ اقوامِ عالم
میں عید اور تہوار کے معنی رنگ رلیاں منانے یا اپنی قومیت کو مستحکم کرنے اور یا کسی مقتدا شخصیت کی یاد تازہ کرنے
کے ہیں۔ اسلام میں عید اور تہوار کے معنی اجتماعی طور پر خدا کی یاد کرنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کا
قرب حاصل کرنے اور اس کے نام پر غریبوں کی مدد کرنے کے ہیں۔ تاکہ اجتماعیتِ عامہ کا ظہور عادت اور عبادت
دونوں میں ہو جائے، پس اگر مذاہب کے ناموں کے سلسلہ میں ہر مذہب کا نام اس کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے،
ہندومت کے لفظ سے طہیت پر روشنی پڑتی ہے، عیسائیت کے لفظ سے ایک ہادیِ اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے،
یہودیت کے لفظ سے ایک قومیت کا تصور بندھتا ہے، پارسیوں سے ایک ملک کا دھیان دلوں میں جمتا ہے جس کا
حاصل حدودِ بندی اور محدودیت ہے تو اسلام کے لفظ سے نہ وطن سامنے آتا ہے نہ ملک، قوم نہ شخصیت بلکہ اطاعت
حق میں فنایت اور مالکِ الملک میں تجویت کے جذبات کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس کی طرف صاف اشارہ ہے
کہ دنیا کے مذاہب نسل و قوم، وطن اور شخصیت پرستی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن اسلام نے اپنے سادہ عنوان

① مرقاة المفاتیح، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ العیدین، وانما قال: لبس العید لمن لبس الجديد انما العید لمن امن

ہی سے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالمگیر تصور سامنے رکھا اور وہ اطاعت حق ہے کیوں کہ حق خود لا محدود اور وسیع ہے اس کی اطاعت کا دم بھرنے والی قوم بھی اپنے کو مسلم کہہ کر عبادت گزار بن کر اور عبادت غیر سے منقطع ہو کر گویا اعلان کرتی ہے کہ وہ ایسی ذات سے تعلق رکھتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہے دنیا کی پوری زمین اور اس کے رقبے اور رقبوں پر بسنے والی قومیں اپنی حد بندیوں سے اس کی لا محدود وسعتوں میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔

حکمتِ دو گانہ..... ٹھیک اسی طرح تہواروں اور عیدوں کے سلسلہ میں اپنے تہواروں سے ہر قوم اگر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر اپنی نفسیات کی پابند ہے یا کسی بڑی شخصیت کا میلاد منا کر وہ صرف اس عظمت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے جو اس کے دل میں اس شخص کو موجزن ہے گویا وہ اپنی شخصی عقیدت مندوں کی پابند ہے یا کسی وطن اور قوم کا نام اچھا کر کے اپنے کی اس کا اسیر اور پابند دکھانا چاہتی ہے۔ تو مسلم قوم عیدوں کے تہواروں میں خدا کی جناب میں دو گانہ ادا کر کے اور اسکے نام پر قربانی دے کر حاجت مندوں پر فطرہ کا صدقہ اور قربانی کا صدقہ بانٹ کر گویا یہ بتلانا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو وہ صرف خدائی نام لیوا ہے اور اس کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔

حکمتِ فطرانہ و قربانی..... اور دوسری طرف دنیا کے مفلوک الحال انسانوں کو اس خوشی کے موقع پر صدقہ اور خیرات دے کر یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ ایک عوامی اور عالمی قوم ہے جس کو نہ قبیلے تقسیم کر سکتے ہیں نہ ملکوں کی حد بندیاں بانٹ سکتی ہیں۔ نہ شخصیتوں کی عقیدت مندیاں اسے دوسری شخصیتوں کی عظمت و عقیدت سے روک سکتی ہیں۔ اور یہ ہی وہ جماعت کبریٰ ہے جسے لے کر اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا اعلان اس نے اپنے نام اور اپنے کام سے قدم قدم پر کیا ہے۔

روحِ عید..... بہر حال اسلامی تہوار نفسیاتی یا قومی یا شخصیتی تصورات کے آئینہ دار نہیں بلکہ اجتماعیت عامہ کے حامل ہیں اور یہ اجتماعیت عامہ وطن، قوم، نسل، شخصیت کے تصور سے نہیں بن سکتی تھی بلکہ ان سب سے بالاتر اور مافوق ذات سے وابستگی سے ہی بن سکتی تھی جس کا نام پاک اللہ رب العزت ہے۔ تو ان تہواروں کی روح اسی کا نام اور اسی کی عظمتِ مطلقہ قرار دی گئی ہے چنانچہ عید کی نماز کے لئے جب مسلمان چلتے ہیں تو رنگ بھینکتے ہوئے۔ یا کسی شخصیت یا قومیت کے نعرے لگاتے اور بے کار کرتے ہوئے نہیں چلتے بلکہ۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

عید الفطر میں آہستہ آہستہ اور عید قربان میں آواز بلند تہوار کے لئے روانگی ہوتی ہے تو تکبیر یا والہی عظمتِ خداوندی اور توحید کے اعلان کے ساتھ ہوتی ہے اس میں نہ شور ہے نہ شر نہ ہنگامہ آرائی نہ میلوں، ٹھیلوں کی شان ہے بلکہ قدسیوں، سیوچیوں اور مقدس ملائکہ کی صفوں کی طرح تسبیح الہی اور تقدس ربانی کہتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں عید گاہ میں پہنچ کر بھی تسبیح و تہلیل جاری رہتی ہے اس کے بعد امام آگے بڑھتا ہے اس کے تکبیر تحریر کہتے ہیں مکرم

تجسیرات کی آوازیں بلند کرتے ہیں، تلاوت قرآن ہوتی ہے سب مقتدی سکون و خشوع کے ساتھ اسے سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود سے اپنے مالک کے سامنے بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور آخر کار سلام پھیر کر پھر تجسیرات کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

عظیم اجتماعیت..... نماز سے فارغ ہوتے ہی امام خطیب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ممبر پر کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت اور احکام سناتا ہے جس کو تمام مقتدی سماع عظمت و قبول سے سنتے ہیں۔ اس عبادت سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس خوشی کے موقع پر جبکہ ہر طرف چہل پہل اور روحانی مسرتوں کا دلوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس میں کسی نفسانی تفرق یا دنیا داری کے جذبات کی آمیزش ہو جائے، تو ان تہوار منانے والوں کے لئے مسنون کیا گیا کہ قبرستان میں جا کر اپنے مردہ بھائیوں کی ارواح سے ملاقات کریں۔ ان کو ثواب پہنچائیں ان سے قریب تر ہوں تاکہ ان کو آخرت کے گھرانے دیکھ کر خود بخود اپنی آخرت کی یاد تازہ ہو جائے اور دنیا میں اس خوشی کے موقع پر ادھر سے دھیان نہ ہٹ جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بتانا ہے کہ مسلمان اجتماعیت کبریٰ کو لے کر اٹھا ہے اس کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ عالم برزخ کے اربوں کھربوں انسان بھی اس کی اجتماعیت کے ممبر ہوں اس کی بنیاد ڈالی ہے جو دنیا سے گزر کر برزخ سے گزر کر عالم حشر تک جا پہنچتی ہے جس میں دنیا کے کسی ایک قرن کے ہی انسان نہ ہوں گے۔ بلکہ آدم کی ساری اولاد اور اولین و آخرین کی ساری شخصیتیں مجتمع ہوں گی۔

عوالم گیر اجتماعیت..... پس جو لوگ مسلمانوں سے سن کر اجتماعیت کا نام لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ علمی اجتماعیت کا دم بھریں گے اور وہ بھی صرف اپنے زمانے کے ملکوں اور قوموں سے کوئی سیاسی رابطہ قائم کر لیں گے۔ لیکن حقیقتاً جو قوم اجتماعیت کے لئے دنیا میں برپا کی گئی ہے وہ عید کے وظائف کی رو سے گویا اس اجتماعیت کو پھر ایک غیر محدود اجتماعیت ظاہر کرتی ہے اور اس کا رابطہ اجتماعی دنیا سے اتر کر برزخ کے ان تمام پاکباز انسانوں سے قائم ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ اس عالم سے گزر کر اس عالم میں پہنچ گئے ہیں اور گویا وہ محض دنیا والے بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اس ساری اجتماعیت کی حقیقی روح جس سے یہ عالم گیر ہی نہیں عوالم گیر اجتماعیت بن جاتی ہے۔ خدا کا نام ہے کہ اس سے زیادہ واسع اور وسیع کوئی نہیں۔ اس لئے عید کے لئے جسے اس دنیا میں ایمان کی قید ہے ایسے آخرت کے باشندوں کی ملاقات کے لئے بھی وہی ایمان کی شرط ہے اور ایمان کے معنی جو اس کے دوسرے نہیں کہ اللہ رب العزت کی ذات و صفات، افعال و ادا و نواہی اور اس کے قوانین کو مانا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ وسعت و اجتماعیت قائم ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے زیادہ وسیع رشتہ اور معیار ہی دوسرا نہیں۔

خوش قسمت قوم..... اس لئے عید تہوار تو ہے، مگر محض لفظ ”تہوار“ کی وجہ سے اسے دنیا کی عام اقوام کے تہواروں کی نظر سے نہ دیکھا جائے، کہ اس کی غیر معمولی وسعتیں ان دوسرے ظرفوں میں کسی طرح نہیں ساسکتیں۔

پس خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے تہوار دیئے جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد، جوان تہواروں میں ان کی شرعی حدود و شروط کے مطابق شرکت کریں، تہوار عید بندگی حق اور خدمت خلق ہے۔ نہ کہ محض نیا اور فاخرہ لباس، عطر و خوشبو اور شیریں چیزیں کھائی لینا۔ اسی لئے حدیث نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم) میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ”الْعِيدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِيدَ لَا لِمَنْ لَبَسَ الْجَدِيدَ“..... ترجمہ: ”یہ عید اس کے لئے ہے جو خدا سے ڈرا اور اس کی طرف جھکا نہ کہ اس کی جس نے عمدہ اور نئے کپڑے پہن لئے۔“

عید کا اصل اصول..... پس عید کا حاصل؟ ذکر الہی، ذکر ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیت دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا نہ کہ ظاہر داری اور دنیا سازی، تاکہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اصول ثابت ہو۔ سال بھر کے لئے نورانی اثرات..... ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادتیں دو طرح کی ہیں ایک فعلی اور ایک ترکی، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ فعلی ہیں جس میں کچھ افعال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ترکی عبادت روزہ ہے جس میں ترک اکل، ترک شرب اور ترک لذات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورے ایک ماہ تک محبت حق میں دنیا کے اس معظم حصے کو ترک کئے رہنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں بلکہ نفس کی ایک عظیم قربانی ہے۔ جیسے بغیر مدد خداوندی پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ماہ رمضان المبارک میں دن بھر اس مجاہدے سے نفس کو رگڑ کر اور مانجھ کر اس میں صفائی پیدا کی جاتی ہے لیکن کسی طرف میں محض صفائی آ جانا اور میل کچیل دور ہو جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں آب نہ آ جائے اور وہ چمک نہ اٹھے ایک قلعی گر بھی برتن کو اول رگڑتا اور مانجھتا ہے، اینٹ، پتھر سے برتن کو رگڑ کر اپنے پیروں تک اسے پامال کرتا ہے تاکہ برتن کا میل صاف اور رنگ دور ہو جائے لیکن محض صفائی کے لئے برتن قلعی گر کے یہاں نہیں بھیجا جاتا بلکہ اصل مقصود اس کی آراستگی اور جگمگاہٹ ہوتی ہے چنانچہ قلعی گر بھی اس صفائی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ صاف برتن کو آنچ دیتا ہے اور تپا کر جب صاف شدہ برتن پر قلعی پھیرتا ہے تو اسی دم برتن چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے اور قلعی گر کے پاس برتن بھیجنے کا مقصد اب آ کر پورا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ظرف قلب کو صاف کرنے کے لئے تو رمضان کے روزے رکھے گئے ہیں تاکہ نفس کی محبوبیت اس سے چھڑا کر اسے رگڑ دیا جائے، اور غیر اللہ کی محبت والفت کی ان آلائش سے اسے صاف کیا جائے پس روزے کے یہ تروک نفس کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو برتن مانجنے کے لئے اینٹ، پتھر اور مٹی کام کرتی ہے۔ دن بھر جبکہ نفس کی رگڑائی ہوئی اس کا دانہ پانی بند کر کے اس کی نفسانی لذات کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس عمل سے اس کی روحانی آلائشوں کا میل کچیل نکال دیا گیا تو شب کو اس پر قلعی کا سامان تراویح اور تلاوت قرآن سے کیا جاتا ہے تاکہ دن بھر تپائے ہوئے نفس پر کلام خداوندی کی قلعی سے آب اور چمک پیدا کر دی جائے اور اس کی روح نور الہی سے جگمگا اٹھے۔ یہ تیس کے تیس دن دن بھر کی کمائی رگڑائی اور منجھائی اور پھر شب بھر قلعی ایک ماہ میں انسانی

نفس کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس چمک دمک سے فائدہ اٹھاتا رہے اور میل پکیل سے برابرہ کران نورانی اثرات کو سال بھر تک استعمال کرے بشرطیکہ اس مجاہدہ کے اثرات کو سال بھر باقی رکھنے میں ساعی رہے۔ اجتماعاتی صلاحیت کا شکرانہ..... بہر حال یہ ایک ماہ سال بھر کی نورانیت کی کفالت کرتا ہے اور بندے کے خدا سے قریب تر ہونے کے تمام موانع کو دور کر دیتا ہے تاکہ اس سے قریب ہو کر بندہ وسیع الظرف اور وسعت عامہ کا اہل ہو جائے اور اس کی ذات اسلام کی اجتماعیت کبریٰ کی طویل و عریض زنجیر کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہو۔ پورے ایک ماہ کی اس مشقت محنت اور اس پر مرتب شدہ اجتماعاتی صلاحیت جیسی عظیم نعمت ملنے پر جو محض خدا کی مدد اور اس کی توفیق ہی سے اسے میسر ہو سکتی تھی، اتنی ہی بڑی شکر گزاری کا فریضہ بندے پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ادائے شکر کا طریقہ دو گانہ عید کو قرار دیا تاکہ ادھر رمضان کا میاب ہو کر ختم ہوا ادھر اسی دم ہلال عید آسمان سے سر نکال کر یہ اعلان کرے ”اے بندو! اس عظیم کامیابی پر جو تمہیں اجتماعیت کبریٰ کی صلاحیتوں کے ملنے کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ اپنے مالک کا شکر ادا کرو، یا بالفاظ دیگر رمضان میں جو صلاحیتیں تمہیں عطاء کر دی گئی ہیں ان کو عید کے میدان میں فعلیت میں لا کر ان صلاحیتوں کا عملی ثبوت دو اور اجتماعیت عامہ کی صورت اور حقیقت اجتماع عید میں توجہ الی اللہ کے ساتھ نمایاں کر کے دکھاؤ۔

حقیقت رمضان..... پس رمضان المبارک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مہینہ ہے اور ماہ عید ان صلاحیتوں کے عملی آغاز کا مہینہ ہے جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہتا ہے، اس درمیان میں اگر کچھ کی یا کوتاہی راہ پاتی ہے تو اگلا رمضان پھر اگلے سال کے لئے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ان صلاحیتوں کی تجدید کر دیتا ہے تاکہ نہ مجاہدے کا سلسلہ ختم ہو، نہ اجتماعیت کی روح مضحک ہونے پائے اور انسانی عمر اسی مبارک سلسلہ میں ختم ہو جائے۔ فرد مسلم کا درجہ امت..... تاکہ جب وہ اپنے رب سے ملے تو تنہا اپنا نفس ہی ساتھ نہ لے جائے بلکہ اس کے ساتھ اجتماعی نسبتوں کی ایک عظیم کمک ہو۔ لاکھوں دعائیں ہوں جو اس اجتماع میں مل کر گئی تھیں۔ ہزاروں ایصال ثواب ہوں جو عید کے موقع پر اموات تک پہنچائے گئے تھے۔ کروڑوں باطنی جہتیں ہوں جو صف بند یوں میں ایک کی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دنیا و برزخ کے تعلقات کے بے شمار رشتے ہوں جو اس کے لئے جناب باری میں سفارشی اور مساعی ہوں تاکہ اس فرد پر جو اجتماعی صلاحیتوں سے ایک امت بن کر اپنے خدا کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اللہ کی لاکھوں رحمتیں متوجہ ہوں اور وہ اسی طرح اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر کے سرخروئی کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔

﴿فَمَنْ رُخِزَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْفُرُودِ﴾ ①

محبت و معیت

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ، وَذَاعِيًا إِلَيْهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالٰی عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَنَزَّلَ وَسَلَّم تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ وَقَالَ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُهُ:
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا. ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ وَصَدَقَ رَسُولُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيمُ.

حقیقت ہر شے بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر چیز بلکہ ہم اور آپ بھی دو چیزوں سے مرکب ہیں۔ ایک ہمارا
ظاہری حصہ ہے جس کو ہم بدن کہتے ہیں یہ بیت و شکل ہے مثلاً آنکھ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کی شکل و صورت
دیکھ کر پہچانتے ہیں۔ یہ ظاہری حصہ اور ظاہری پیکر ہے اور ایک اس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے۔ وہی درحقیقت
انسان ہے۔ اس صورت ظاہری کا نام انسان نہیں۔ انسان حقیقت کا نام ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے اس کے دکھلانے
کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت بنادی ہے جو کہ دراصل ذریعہ تعارف ہے اصل مقصود نہیں ہے۔ پھر مقصود کہاں ہے؟
شریعت اسلام پتہ دیتی ہے کہ اندرونِ باطن ایک قلب ہے اسی میں ساری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسی کا نام انسان
ہے، اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے جب پھیلایا اور صورت و شکل دی تو قالب نمودار ہو گیا۔ شکل بن گئی۔ اب اسے دیکھ کر
پہچان گئے کہ یہ فلاں ہے یہ فلاں ورنہ حقیقت میں انسان قلب ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔

تائید و توثیق چینی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدم کو پیدا فرمایا اور بدن بنایا۔ ابھی اس میں روح
بھی نہیں ڈالی تھی تو ملائکہ علیہم السلام اس کی زیارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عجیب شکل و صورت بنائی ہے
اور بہت ہی عمدہ ہے اور سب کے دل میں ایک عظمت و محبت اس صورت کی بیٹھ گئی۔ ادھر ابلیس کو بھی حکم ہوا کہ تو بھی اس
صورت کو جا کر دیکھ۔ اس کے دل میں عداوت چھپی ہوئی تھی، اس نے جا کر دیکھا اور حضرت آدم کے پتلے کے اندر گھسا

اور ریزے ریزے میں سرایت کی، بعد میں اس نے کہا کہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے اور کہا کہ نَفْس لَا تَمْلُکُ یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہے جب تک کہ باہر سے اس کی مدد نہ ہو اور غذا، ہوا، گرمی باہر سے نہ پہنچے اس کے اندر کوئی طاقت نہیں۔ اس ابلیس نے اپنی شیطنت اور عداوت کے مطابق رپورٹ دی۔

سارے ملائکہ نے تو تائید کی اور مدحت کی اور اس کبخت نے آر کر تکتہ چینی کی مگر یہ کہا کہ میں نے سارے بدن میں گھس کر دیکھا ہے یہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے البتہ اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پوٹی ہے اس میں سب کچھ ہوگا اگر ہوا۔ وہاں میں گھس نہ سکا۔ اشارہ تھا قلب کی طرف کہ جو کچھ حقیقت ہے وہ اس قلب میں رکھی گئی ہے اس کی حقیقت اس لعین کے سامنے نہ کھل سکی وہاں جا کر مجبور ہو گیا۔

اقلم بدن کا بادشاہ..... چنانچہ سب سے بڑی چیز انسان میں قلب ہے۔ اور باقی جتنے اعضاء ہیں سب اس کے خدام ہیں۔ قلب میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ سب خدام اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں آیا کہ کسی چیز کو دیکھوں تو دل آنکھ کو زبان سے آرڈر نہیں دیتا کہ تو دیکھ بلکہ دل میں خیال آتے ہی آنکھ اپنا کام شروع کر دیتی ہے، دل میں خیال آیا کہ میں چلوں، تو دل کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ پاؤں کو زبان سے حکم دے کہ چلو، بلکہ دل کا غشاء ہوا اور پیروں نے حرکت شروع کر دی۔ دل نے کسی چیز کو پکڑنا چاہا تو دل ہاتھوں کو لفظوں میں حکم نہیں دے گا کہ اے ہاتھو! تم پکڑو۔ بلکہ دل میں جذبہ آیا اور ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو انسان کے تمام اعضاء خدام ہیں۔ اصل حاکم اعلیٰ اور اس اقلیم بدن کا سلطان وہ دل ہے اور دل میں ہی سب کچھ ہے۔

قلب اصل ہے یا دماغ؟..... اس میں اطباء اور موجودہ زمانے کے ڈاکٹروں کا اختلاف ہوا ہے کہ اصل انسان میں دماغ ہے یا قلب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل انسان میں دماغ ہے کیونکہ اسی سے تمام چیزیں چلتی ہیں اسی میں شعور ہے، اسی میں ادراک ہے، اسی میں علم ہے، اسی میں احساس ہے اور قلب صرف ایک آلہ ہے جو خون کے ذریعے سے دماغ کو بنا دیتا ہے اور دماغ کے اندر کچھ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر حال وہ کہتے ہیں کہ قلب آلہ کار ہے اصل نہیں ہے۔ یہ بعض اطباء کا بھی خیال ہے اور اس زمانے کے ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ بالکل صحیح ہے بہت سی اس میں صحت بھی ہے اور بہت سی اس میں غلطیاں بھی ہیں۔

مدیر اعمال قلب ہے..... چنانچہ ہم بنانے والے کی طرف رجوع کریں گے کہ اس نے کس چیز کو اصل کہا ہے حق تعالیٰ خالق ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے اور کس لئے بنائی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو علم دیا گیا ہے اس بات کا کہ دل کیا ہے اور دماغ کیا ہے اور ہاتھ پیر کیا ہیں اس لئے ہم نے رجوع کیا کہ بنانے والے سے پوچھو کہ اصل کیا چیز ہے قلب ہی اصل ہے یا دماغ اصل ہے۔ تو شریعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب ہی اصل ہے وہی حاکم مطلق ہے اس اقلیم بدن کا۔ بدن کی ساری حکومت اسی سے چل رہی ہے۔ حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”إِنِّ فِي الْجَسَدِ مُضَغَةً إِذَا صَلَحَتْ

صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ“ ① ”انسان کے بدن میں ایک گوشت کا ٹوٹھڑا ہے وہ اگر صحیح ہو تو سارا انسان صحیح ہے وہ اگر غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور فرمایا کہ وہ قلب ہے۔“

تو انسان کی خوبی و خرابی کا دار و مدار قلب پر ہوتا ہے۔ دل ہی کے اندر نیت پیدا ہوتی ہے اور نیت سے سارے اعمال بنتے ہیں اور فرمایا گیا کہ ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ ② ”سارے اعمال کا مدار نیت پر ہے۔“ نیت اچھی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور نیت اگر بری ہے تو عمل بھی برا ہوگا اور نیت کا دار و مدار قلب کے اوپر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے اعمال و افعال کا دار و مدار انسان کے قلب پر ٹھہر گیا اور فی الحقیقت زندگی بھی قلب ہی سے چلتی ہے۔

مدار حیات قلب ہے..... جیسے اعمال کا مدار قلب پر ہے ایسے ہی حیات کا مدار قلب پر ہے، کیونکہ قلب پہلے زندہ ہوتا ہے پھر حیات دماغ میں پہنچتی ہے۔ تو اس بناء پر مدار حیات دل کے اوپر رکھا گیا ہے اور اطباء بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ آدمی جو غذا کھاتا ہے وہ اولاً معدے کے اندر پہنچتی ہے۔ معدے کے اندر خار ہوتے ہیں جو اسے پیستے ہیں اور پیس کر حریرہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں جو حصہ فضلات کا ہے وہ زائد ہے وہ انٹریوں میں چلا جاتا ہے اور بول و براز ہو کر نکل جاتا ہے اور جو رقیق جو ہر ہے اس کو قلب معدے کی طرف سے جگر کی طرف بھیجتا ہے۔ معدے کی طرف سے جگر کی طرف کو جانینوالی نالیوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں ان کے ذریعے سے وہ غذا جگر میں پہنچتی ہے۔

جگر کو کہتے ہیں کہ وہ طباق اور بدن کا باورچی ہے، جگر میں گرمی اور حرارت ہے وہ اس گرمی سے حریرے کو پکاتا ہے اور خوب گرمی پہنچاتا ہے جب وہ ہنڈیا پکتی ہے تو اس میں ایک حصہ ابال کا آتا ہے جھاگ کی شکل میں ایک حصہ نیچے بیٹھ جاتا ہے جسے تلچھٹ کہتے ہیں۔ ایک حصہ بیچ میں پانی میں رہتا ہے وہ کھولتا رہتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ جو اد پر کا حصہ ہے جھاگ کا وہ بلغم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور نیچے کا حصہ جو تلچھٹ ہے سیاہ ہوتا ہے اسے سوداء کہتے ہیں اور بیچ میں جو رقیق اور پتلا حصہ ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ وہ صفراء ہے۔

تو سوداء، صفراء، بلغم۔ یہ تین حصے ہیں جن کو جگر تیار کرتا ہے اور پکاتا ہے ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے خون بنتا ہے تو جگر کا کام ہے خون بنانا، معدہ کا کام تھا غذا کو پینا۔ پھر جگر اسی خون کو بھیجتا ہے قلب کی طرف۔ جگر سے قلب کی طرف جانے والی بہت باریک رگیں ہیں جن کو طب کی اصطلاح میں شراکین کہتے ہیں (شرائین جمع ہے شریان کی) ان ہی باریک رگوں سے خون قلب کے طرف پہنچتا ہے۔ اور قلب کی شکل تو مڑی کی سی ہے کہ اوپر سے پتلا، بیچ میں سے موٹا، پھر نیچے سے پتلا۔

اوپر کے حصے کو کہتے ہیں لطن عالی اور نیچے کے حصے کو لطن سافل۔ ان میں باریک اور رقیق خون پہنچتا ہے اور قلب

① الصحيح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ج: ۱، ص: ۹۰۔

② الصحيح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی، ص: ۱۰۱، رقم: ۱۔

ستراشہر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ دوست کہے گا کہ خدا کے بندے آنکھیں تیری کھلی ہوئی تھیں۔ چیزیں سامنے تھیں اور تو ہٹتا ہے کہ نہیں دیکھیں تو جواب میں کہتا ہے کہ اوفو میرا دھیان دوسری طرف تھا، مجھے خبر نہیں ہوئی کہ میرے سامنے کیا چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں نہیں دیکھتی بلکہ دل دیکھتا ہے اگر دل ہی دھیان نہ کریں تو آنکھوں کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی گھٹنے بج رہے ہیں آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ سارے سن رہے ہیں مگر آپ کو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا لوگ کہتے ہیں کہ بہت گھٹنے بجے آوازیں آئیں، آپ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نے تو سب کچھ سنا ہے، وہ کہتا ہے کہ اوفو اصل میں میرا خیال دوسری طرف متوجہ تھا، مجھے سننے کا خیال ہی نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ کان نہیں سنتا بلکہ دل سنتا ہے۔ دل متوجہ ہو جائے تو ساری آوازیں کان میں آئیں گی اگر دل ہی متوجہ نہیں تو کوئی چیز بھی کان میں نہیں آئے گی ذائقہ ہے وہ بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذا آئیں کھائیں اور دل متوجہ ہو دوسری طرف نہ کھئے کاپتہ چلے گا نہ میٹھے کاپتہ چلے گا۔ اگر کوئی کھئے میٹھے کاپتہ پوچھے گا تو کہے گا کہ بھائی میرا دل تو دوسری طرف تھا مجھے کچھ خبر نہیں۔

مجھے ذائقہ پر ایک حکایت یاد آگئی کہ حضرت مولانا غلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ایک سالے تھے حاجی مقبول صاحب بہت نیک صالح تھے اور حضرت ہی کے یہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اتفاق سے چار پانچ روز تک مسلسل چنے کی دال پکتی رہی۔ اور روزانہ تو آدھی سے پلاؤ کھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے جب تک کہ غذا نہ بدلے۔ انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ کیا تمام دالیں مٹ مٹا کر ایک ہی چنے کی دال رہ گئی ہے ہفتہ بھر ہو گیا ہے اس ایک دال کو ہی کھاتے ہوئے اور جی بھر گیا کبھی دوسری دال بھی پکالیا کرو۔ انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی۔ کھانے کے بعد کہنے لگے۔ آج پھر وہی چنے کی دال پکائی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ مار کر کہا آنکھیں ہیں کہ نہیں چنے کی دال ہے یا ماش کی؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کچھ دھیان نہیں رہا میں سمجھا کہ وہی چنے کی دال کھا رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چکھنا دل سے ہوتا ہے۔ زبان نہیں چکھتی۔ کھئے میٹھے کا ذائقہ اس کا احساس اور اس کا ادراک یہ سب دل سے متعلق ہے۔ اس لئے اصل چیز انسان کے بدن میں دل ہے اور باقی سب اعضاء اس کے تابع ہیں۔ مرکز اصلاح قلب ہے..... دماغ بہت اعلیٰ چیز ہے مگر دماغ تفصیل کرتا ہے اس علم کی جو قلب کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قلب اپنے اس علم اجمالی کو دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے وہ دماغ کی تالیوں میں چکر کھاتا ہے پھر نظریہ بن جاتا ہے اور نظریہ سے پروگرام بن جاتا ہے پروگرام سے اس کی اشاعت ہو کر پارٹی بن جاتی ہے۔ قلب اگر دماغ کے اندر علم نہ بھیجتا تو نہ نظریہ بنتا، نہ پارٹی وجود میں آتی۔ اسی لئے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ دل اصل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ ہاتھ پیر بھی اس کے تابع ہیں۔ پیٹ اور پیٹھ بھی اس کے تابع ہیں۔

اسی بناء پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اصلاح کا مرکز دل کو بنایا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نگاہ بھی

میں گرمی، جگر سے بھی زیادہ ہے اور دل پھر اس لطیف جوہر کو پکاتا ہے اور پکانے سے ایک لطیف بھاپ اٹھتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ بھاپ رگ و پے میں سرایت کرتی ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ یہ روح حیوانی ہے اسی روح سے آدمی میں حس ہے، احساس ہے عقل ہے زندگی ہے۔ اطباء کی اصطلاح میں اس کو روح حیوانی کہتے ہیں۔

اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام روح نسمۃ ہے اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ نفس کے معنی پھونکنے اور پھیلنے کے ہیں چونکہ یہ پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مدار ہے۔ انسان کی زندگی کا وہی حیوانی پیدا کرتا ہے جس سے انسان کے بدن میں حس، حرارت اور احساس وغیرہ طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ بدن میں قلب اصل ہے دماغ اصل نہیں ہے۔ تمام اعضاء کا تعلق قلب سے ہے دماغ سے نہیں اور زندگی کا مدار بھی دل ہی پر ہے۔ عمل کا جذبہ بھی دل ہی سے ابھرتا ہے۔ محبت اور عدوات بھی دل ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔

دماغ قلب کے تابع ہے..... تو شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اصل چیز انسان میں قلب ہے دماغ نہیں بلکہ دماغ قلب کا تابع ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قلب میں جو علم اور شعور ہے وہ اجمالی ہے، مختصر ہے اور مجمل ہے۔ دماغ میں جا کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور پھیل کر جزئیات نکلتی ہیں۔ پھر آدمی ان سے نظریات قائم کرتا ہے۔ نظریات سے پھر پروگرام بنتے ہیں۔ تو علم اجمالی قلب میں ہے دماغ میں آ کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور چونکہ تفصیل ہوتی ہے اجمال کیلئے اس لئے دماغ تابع ہے قلب کے برعکس نہیں۔ یہ شریعت کا منشاء ہے اس لئے شریعت اسلام کا موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جاوے اگر دل درست ہو گیا تو دماغ بھی درست ہے۔ ہاتھ پیر بھی درست ہیں۔ اخلاق بھی درست ہیں۔ اگر انسان کا دل بگڑ جائے تو نہ زندگی ہے اور نہ عمل ہے نہ ہنر ہے نہ کمال ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل زندہ ہے تو سارا انسان زندہ ہے۔ دل مردہ ہے تو سارا انسان مردہ ہے تو دار و مدار حقیقت میں دل ہی کے اوپر ہے کیونکہ ہر چیز دل سے چلتی ہے اس لئے شریعت نے دل کو اپنا موضوع بنا لیا ہے اگر دل درست ہوگا تو اعمال شرعیہ بھی درست ہوں گے اور سارا بدن درست ہو جائے گا اور دماغ بھی صحیح ہو جائے گا اور اگر قلب بگڑ گیا تو دماغ بھی خراب رہے گا اور تمام اعضاء بھی خراب رہیں گے۔

مُد رک حقیقی قلب ہے..... یہی وجہ ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ تو اطباء کہتے ہیں کہ یہ سارا دماغ سے ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دل سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بھرے بازار میں جائیں اور اچھی اچھی بلڈنگیں دیکھیں بڑے اچھے اچھے مناظر سامنے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کا دوست کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑی بڑی عمدہ عمدہ بلڈنگیں دیکھی ہیں۔ یہاں تو بڑے اعلیٰ اعلیٰ مناظر ہیں۔ بڑی بہترین سڑکیں ہیں صاف

ٹھیک ہو جاتی ہے کان بھی درست، ناک بھی درست، یہ غلط ہے تو ساری چیزیں غلط ہیں۔ اگر دل میں خرابی ہے اور نیت بری ہے تو نگاہ بھی لامحالہ غلط جگہ پر پڑے گی اور دل میں تقدس، تقویٰ اور طہارت ہے تو نگاہ بھی غلط جگہ نہیں جائے گی۔ اگر دل میں صلاح تقویٰ ہے تو غلط قسم کی آوازیں باجے گا جیسے نہ سنے گا۔ اس طرف توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر دل میں دیانت و تقویٰ نہیں ہے تو اس کے لئے جائز و ناجائز سب برابر ہے۔ باجے گا جیسے بھی سنے گا، حرام آوازیں بھی سنے گا، حلال آوازیں بھی سنے گا۔ اگر دل میں دین ہے تو راستہ درست رہے گا، اچھی چیزوں کی طرف طبیعت جائے گی بری چیزوں سے ہٹ جائے گی۔

افتائے قلب..... چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ”اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ“ ① کہ جب تمہیں کوئی معاملہ درپیش ہو تو تم اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو، دل آدمی کا مخلص ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ بات صحیح ہے کہ غلط ہے۔ آپ نے دوست کے اوپر دعویٰ کر دیا کہ یہ جائیداد میری ہے فلاں کی نہیں۔ حالانکہ دل سے جانتا ہے کہ یہ اسی کی ہے میری نہیں ہے۔ آپ نے قانونی طور پر مقدمہ بنایا تا کہ جائیداد میرے نام پر آ جائے۔ اس پر وکلاء بحث کریں گے، ممکن ہے آپ کا میاب بھی ہو جائیں، جائیداد آپ کی ہو جائے گی، مگر دل آپ کا ملامت کرے گا کہ کبخت تو غیر کا حق مار رہا ہے۔ دل فتویٰ دے رہا ہے کہ زمیں تیری نہیں ہے۔ اگر آدمی دل کی طرف متوجہ ہو جائے تو سارے قصے ختم ہو جائیں لیکن بات تو یہ ہے کہ لوگ مطلب کے پیچھے رہتے ہیں۔

ایک عالم نے فتویٰ دیا جو کہ مرضی کے خلاف تھا۔ اب اس سوال کا دوسرا رخ بدل کر فتویٰ بھیج دیا۔ اب اس فتوے کا دوسرا جواب آ گیا وہ بھی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ اب پھر تیسرے مفتی کے پاس بھیج دیا تو جو فتویٰ مرضی کے مطابق ہوا اس پر عمل کر لیا اور جو مرضی کے مطابق نہ ہوا اس پر عمل نہ کیا۔ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے؟ یہ کیا شریعت کا پیرو ہے؟ یہ تو اپنے نفس کا تابع ہے، نفس میں جو چیز آگئی چاہتا ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ مل جائے، اس لئے شریعت نے کہا کہ مفتیوں سے فتویٰ بعد میں لینا پہلے اپنے دل سے فتویٰ لے لو، دل انسان کا مخلص ہے وہ سچا مشورہ دے گا اور صحیح فتویٰ دے گا۔

ایمان کا مورِ داؤل قلب ہے..... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے دل کو پکڑا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے کہ انسان کے ضمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور بحث سے اور نفسانی خواہشات سے جو بھی رائے قائم کرے دل اس کو جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، ہاتھ چوری کرتا ہے مگر دل ملامت کرتا ہے کہ تجھے حق نہیں دوسرے کے مال چرانے کا، اگر دل کی بات مانے تو کبھی چوری نہ کرے۔ بہر حال دل انسان کا اصل ہے اس لئے شریعت نے دل کو تاکا ہے کہ اس کی اصلاح کر دو، بنیاد درست ہو جائے تو سارا انسان ہی درست ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے انسان درست نہیں ہو سکتا۔

شریعت نے دل کی اصلاح کے لئے ایمان رکھا ہے، اس لحاظ سے ایمان کا محل بھی قلب انسان ہے۔ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دل کے اندر ہوتی ہے یہی محبت آدمی سے عمل کراتی ہے۔ دل کے اندر جذبہ پیدا ہوئے ہیں۔ اسی جذبہ کے مطابق انسان چلتا ہے۔ تو اولاً ایمان قلب انسان پر وارد ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ ترقی کر کے دوسرے مقامات پر پہنچاتا ہے، اس کی تاثیر سارے بدن پر پہنچتی ہے تو پھر ہاتھ بھی مومن بن جاتا ہے اور کان بھی مومن بن جاتا ہے اور سب اعضاء میں ایمان داری پیدا ہو جاتی ہے، اگر دل میں بے ایمانی گھسی ہوئی ہو تو ہاتھ پیر بھی بے ایمان ہوں گے اور بے ایمانی کی حرکتیں کریں گے اور دماغ بھی بے ایمان ہو جائیگا، سوچے گا تو بے ایمانی کی باتیں سوچے گا اس لئے کہ دل کی نیت خراب ہے۔

چنانچہ دل کو اصل قرار دے کر انبیاء اسی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کہ اس کے اندر نور و چمک پیدا کریں تاکہ اس کے اندر علم غیب کی چیزیں روشن ہو جائیں اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ قلب پر ایمان وارد ہو۔ اور قلب چونکہ پاک ظرف ہے اس لئے اس میں پاک چیز یعنی ایمان داخل ہوتا ہے اور پھر عمل بھی ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر دل میں خوشی ہے تو چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں گے چونکہ خوشی درحقیقت قلب کی صفت ہے، مگر چہرے سے نظر آتی ہے۔ دل میں اگر غم بھرا ہے تو چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آج تم بڑے غمگین نظر آتے ہو حالانکہ غم چھپی ہوئی چیز ہے وہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے چوں کہ دل کا اثر چہرے پر پڑتا ہے تو ہر جاننے والا جان لیتا ہے کہ یہ غم زدہ ہے اور واقعی وہ غم زدہ ہوتا ہے۔ تو نئی خوشی، محبت و عداوت اور کرنا نہ کرنا یہ چیزیں انسان کے قلب سے متعلق ہیں۔ اگر دل درست ہے سب چیزیں درست ہیں۔ اگر دل خراب ہے تو اس کی وجہ سے سب چیزیں خراب ہیں اور اسی وجہ سے ہاتھ پیر پر اثر پڑتا ہے اور وہ اثر جو قلب پر وارد ہوتا ہے وہ متعدی ہو کر اعضاء و جوارح پر طاری ہوتا ہے، اچھا ہو یا برا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی کے انتقال کا وقت قریب آتا ہے اور ملائکہ نزاع روح کرتے ہیں تو ہاتھوں اور پیروں کو سونگھتے ہیں اور دماغ کو دیگر بدن کو بھی سونگھتے ہیں اور ایمان کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔ دل میں اگر ایمان ہے تو ہاتھ پیر میں بھی ان کے اثرات رچے ہوئے ہوتے ہیں، ہاتھوں کو بھی سونگھتے ہیں کہ ان میں بھی ایمان کی خوشبو ہے یا نہیں، اصل خوشبو کا مرکز تو دل ہے مگر اعضاء پر اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں، جیسے خوشبو کا مخزن تو باغ ہے اور پھول ہے مگر کپڑوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے اور باغ والی خوشبو کے اثرات سے جہاں جہاں ہوا پہنچے گی وہ شے معطر ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دل اصل ہے اس کو درست کیا جائے اور اسکی درستگی کی پہلی بنیاد ایمان ہے، ایمان رہتا ہے کہ قلب کے اندر اور ان کے اثرات ہاتھ پیر عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

محل اسلام..... اس سے معلوم ہوا کہ دل ایمان کی جگہ ہے اور ہاتھ پیر اسلام کی جگہ ہیں۔ ایمان چھپی ہوئی شے

ہے جو دل میں رہتا ہے اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ اور پیروں پر آتا ہے۔ آپ نے نماز پڑھی ہاتھ پاؤں سے پڑھی۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھی مگر اس فعل کا سرچشمہ قلب کے اندر ہے۔ اگر اس میں جذبہ عقیدت کا، محبت کا اور اللہ کی چاہت کا پیدا نہ ہوتا تو کبھی نماز نہ پڑھتے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں نماز پڑھنے والا دل ہے لیکن عمل کی صورت ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتی ہے، ایمان کا مغل دل ہوتا ہے اس کے اثرات جب ہاتھ پاؤں پر آتے ہیں تو وہ اسلام بنجاتے ہیں۔

چونکہ ایمان پوشیدہ شے ہے اور اسلام ظاہر شے ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ **إِلَّا يَمَانُ مِسْرٌ وَالْإِسْلَامُ عَلَانِيَةٌ**..... کہ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جس کو دل لئے ہوئے ہے اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ پاؤں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہی اندرونی شے جب تک چھپی رہتی ہے اسے ہی ایمان کہتے ہیں اور وہی شے جب ہاتھ پاؤں پر آتی ہے تو اسے اسلام کہتے ہیں۔

حقیقت ایمانیہ..... ایمان کے معنی کیا ہیں؟ اور کس طرح سے ہمارے اندر آتا ہے؟ اور اس کے آثار کیا ہیں؟ اور کیسے پہچانا جاتا ہے؟ تو سنئے! ایمان کی حقیقت ہے محبت اگر اللہ کی محبت کامل ہے تو کہیں گے کہ اس کا ایمان کامل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں رچ گئی ہے تو کہیں گے کہ ایمان آ گیا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ **﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾** ① جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اللہ کی محبت اور عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اگر عشق و محبت نہ ہوتا تو ایمان کبھی نہ آتا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کے رگ و پے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بس گئی ہے اور اللہ کی محبت جم گئی ہے۔

تو محبت درحقیقت ایمان کا دوسرا نام ہے۔ ایمان نہیں محبت نہیں۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ اصل چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ یہی چیز ایمان بناتی ہے یہی اعتقاد قائم کرتی ہے۔ اسی کو فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: **لَ "إِيْمَانٌ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ"** ② کوئی بھی تم میں مومن نہیں بنے گا جب تک قلب میں میری اتنی محبت نہ ہو کہ اس کو اتنی نہ اپنے ماں باپ سے اور نہ اولاد سے محبت ہو اور نہ کسی اور سے اتنی محبت ہو۔ بغیر حب نبی کے ایمان کامل نہیں ہوتا۔

آثار ایمانیہ..... علامت اس کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہے اولاد کی محبت ایک طرف اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، جب ٹکرا جائیں تو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اختیار کرے اور اولاد کی محبت چھوڑ دے، یہ علامت ہوگی کہ واقعی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے اگر آدمی نے اولاد کی محبت کو اختیار کیا اور رسول کی محبت کو چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ رسول سے محبت نہیں بلکہ اولاد سے محبت ہے تو ٹکراؤ سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی محبت

① پارہ ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۶۵۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ص: ۳، رقم: ۱۴۔

غالب ہے، مثلاً آپ لحاف میں آرام سے پڑے ہوئے ہیں بڑی خوشگوار نیند آرہی ہے۔ اچانک مؤذن نے آواز دی: حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ، حَسْبِيَ عَلَى الْفَلَّاحِ..... ”دوڑ و نماز کی طرف“ دوڑو کامیابی کی طرف“۔ آپ نے لبیک نہیں کہا تو کہیں گے کہ نفس کی محبت غالب ہے اور اگر آرام چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور وضو کیا اور مسجد میں گئے نماز پڑھی تو کہیں گے کہ محبت خدا اور رسول غالب ہے۔ تو لکراؤ کے وقت ہی آدمی جدھر مائل ہوتا ہے اسی طرف کی محبت کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم مومن نہیں بن سکتے جب تک میری محبت اولاد، ماں باپ وغیرہ سب کی محبت سے غالب نہ ہو جائے کہ جب ماں باپ کی محبت میری محبت سے ٹکرائے تو مجھے اختیار کرو، ماں باپ کو چھوڑ دو اور جب میری محبت اولاد کی محبت سے ٹکرا جائے تو مجھے اختیار کرو، اولاد کی محبت کو چھوڑ دو۔ یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرامؓ میں محبت نبوی اتنی غالب تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو صحابہؓ نے بھی اس محبت کی وجہ سے وطن چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا۔ عزیز و اقارب چھوڑے، جائیدادیں چھوڑیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لئے مکہ میں ساری تجارتیں ترک کیں اور مدینہ میں غربت کی زندگی اختیار کی ان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ یہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تو تھی۔ اس محبت کی وجہ سے عیش و آرام کا سب سامان ترک کیا، مفلس و فلاں ہو کر رہنا گوارہ کیا مگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔

مقام صدیقیت..... حدیث میں ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں ۳۱۳ صحابیؓ شریک تھے۔ ان میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بیٹے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے بعد میں وہ ایمان لائے وہ اس غزوہ میں کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے تھے ایمان لانے کے بعد ایک روز صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ ابا جان غزوہ بدر کے موقع پر کئی موقعے ایسے آئے کہ آپ بالکل میری تلوار کی زد پر تھے اگر میں وار کرتا تو آپ بچ نہیں سکتے تھے۔ مگر نے سوچا میرے باپ ہیں کس طرح ان پر حملہ کروں تو میں ایک طرف ہو گیا، یہ بات بیٹے نے باپ سے کہی: ”حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اچھا یہ موقعے آئے ہیں کہ میں اور تو آمنے سامنے آگئے تھے۔ بیٹے نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ مجھے خبر نہ ہوئی اگر تو میری زد پر آتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا۔ اس واسطے کہ تو دشمن تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور رسول کی محبت کے مقابلے میں اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہے۔“

غلبہ محبت..... معلوم ہوا ہے کہ ایمان جب کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے اور محبت غالب آ جاتی ہے تو اپنے کو اس محبت کے بدلے فروخت کر دیتا ہے۔ پھر محبوب کی ہر ادا سے محبت ہو جاتی ہے اس کے مقابل میں نہ اولاد سے محبت رہتی ہے اور نہ ماں باپ کی محبت کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ سب کی محبتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی محبت غالب آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے ہجرتیں کیں، جائیدادیں چھوڑیں، تجارتیں ترک کیں، یہ سب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

محبت کا نتیجہ تھا۔ ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ کی اس لئے کہ رسول کی محبت غالب تھی۔

تو پہلا حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ محبت ہو۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ ایمان نہیں تو پھر اسلام ہی نہیں۔ تو بنیادی چیز محبت ہے۔ اسی واسطے محبت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی صحابہؓ کا طریق تھا اور یہی بعد میں اہل اللہ کا طریق رہا ہے۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ جس شخص کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔ اس کا چلنا پھرنا بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا لباس بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا ذکر اور چرچا بھی محبوب بن جاتا ہے۔ فقط محبوب سے ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کے نام سے جو چیز منسوب ہو جاتی ہے، اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ لیلیٰ کے مکانوں کی اینٹ اینٹ کو چومتا پھر رہا ہے کسی نے کہا۔ احمق! تو یہ کیا کر رہا ہے اینٹوں میں کیا رکھا ہوا ہے اور اینٹوں کو چومنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس نے دو شعر میں جواب دیا۔
 أَمَرْتُ عَلَى الدَّيَّارِ دَيْئَارَ لَيْلَى أَقْبَلْتُ ذَا الْجِدَارِ وَذَا الْجِدَارَا
 کہ میں لیلیٰ کے مکان پر جب گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں۔ کبھی اس دہلیز کو چومتا ہوں اور کیوں چومتا ہوں۔

وَمَا حُبُّ الدَّيَّارِ شَغَفَنَ قَلْبِي وَلَكِنْ حُبُّ مَنْ نَزَلَ الدَّيَّارَا
 مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ہے وہ جو ان اینٹوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس سے محبت ہے اس کی وجہ سے ان اینٹوں سے محبت ہو گئی ہے، اس کے کتے سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کی بلائیں لینے کو بھی تیار ہوں۔ تو جب محبت ہوتی ہے تو ایک محبوب ہی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جو چیز اس کے نام سے لگ جاتی ہے وہ بھی محبوب بن جاتی ہے۔ چونکہ آپ کو محبت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو گنبد اخضرؑ بھی محبوب ہوگا۔ اس کی زیارت کو آپ عبادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ایک آنکھ گنبد پر پڑ جائے تو دنیا و آخرت کی سعادت مل جائے گی۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ گنبد خضرؑ خود محبوب نہیں بلکہ اس میں جو آرام فرما ہیں اصل میں وہ محبوب ہیں۔ چونکہ اس گنبد پر نام لگ گیا ہے ان کا اس لئے وہ بھی محبوب ہو گیا گنبد تو پھر قریب ہے، مدینہ سے محبت ہے، شہر اء کو دیکھو تو مدینہ تو صرف ایک شہر ہے جیسے ہمارے یہاں شہر ہیں۔ یہ شہر زیادہ خوبصورت ہیں، وہ شہر اتنا خوبصورت بھی نہیں مگر پھر بھی محبت ہے اصل میں محبت ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے گنبد خضرؑ بھی محبوب ہوا۔ اس محبت کی وجہ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی محبوب ہوئی اسی محبت کی وجہ سے مدینہ بھی محبوب ہوا۔ تو سلسلہ بسلسلہ ہر چیز تک محبت پہنچ جاتی ہے۔

آپ بیت اللہ شریف کی اینٹ اینٹ کو چومتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بیت اللہ کے مقام پر تجلی ربانی اتری ہوئی ہے۔ اصل میں محبت اللہ سے ہے چونکہ بیت اللہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اس لئے اس سے بھی محبت ہوئی ہے اور جب خانہ کعبہ محبوب ہو تو پوری مسجد حرام بھی محبوب ہو گئی اور اس کی محبت ظاہر ہوئی اس طرح پر کہ آپ اس

کی عظمت کرتے ہیں۔ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، جب مسجد حرام محبوب ہوئی تو مکہ محبوب بن گیا کہ وہ شہر پناہ ہے اس مسجد حرام کا، لہذا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔ اور چونکہ حجاز میں واقع ہے تو ہم حجاز مقدس کہتے ہیں کیونکہ سارے حجاز سے محبت ہو گئی ہے۔ تو حجاز کے جتنے باشندے ہیں ان سب سے محبت ہو گئی۔ یہ پڑوسی ہے اس کا لہذا یہ بھی محبوب ہے تو جب آدمی کے دل میں محبت آتی ہے تو فقط ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا، بلکہ محبوب کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں، چال ڈھال بھی محبوب، لباس بھی محبوب، کھانے کا طرز بھی محبوب، رہن سہن کا طرز بھی محبوب، وہ تمام چیزیں محبوب بن جاتی ہیں جو محبوب کی پسندیدہ اور محبوب ہیں۔

آثارِ محبت..... بہر حال یہیں سے اتباعِ سنت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ محبت کا اثر ہے اگر محبت ہے تو اتباعِ سنت اختیار کرے گا ورنہ نہیں۔ محبت ہی آمادہ کرتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کرنے پر کہ جس طرح آپ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اسی طرح بیٹھ کر کھانا کھائیے۔ جس طرح آپ آرام فرماتے تھے اسی ڈھنگ سے آرام ہو۔ جس ڈھنگ سے دشمنوں سے برتاؤ کرتے تھے وہی ڈھنگ تم بھی اختیار کرو۔ ان چیزوں سے اتباعِ سنت کا جذبہ غالب ہو جائے گا۔

اگر محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ غالب ہے تو بدعات سے نفرت ہو جائے گی، سنت کی پیروی سے محبت ہوگی کیونکہ محبوب کی ذات محبوب ہے اور جب ذات محبوب ہے تو ذات کی ادا بھی محبوب ہوں گی۔ آپ کا طرزِ سلام و کلام بھی محبوب ہوگا۔ ہر چیز محبت کے نیچے آتی چلی گئی اس کا نام اتباعِ سنت ہے کہ ہر شعبہ میں پیروی ہو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اس میں خیر و برکت ہے حتیٰ کہ معاملات و معاشرت میں بھی جب پیروی کریں گے تو صدیق بن جائیں گے۔

سونے کا مسنون طریق اور قوتِ ارادی..... میں کہتا ہوں۔ مثال کے طور پر ہم سوتے ہیں اس میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں پابند ہیں سنت کے کہ اس طرح سے سوئیں جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے۔ سونا تو ہے لیکن حضور کے طریقے پر سوئیں گے تو عبادت بن جائے گا۔ اور آدمی چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر سوئے گا۔ چت لیٹ کر سوئے آیا او نہ حالیت کر یا دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ پر سوئے گا۔ بس یہی چار طریقے سونے کے ہیں۔ کوئی ثالث گرتو سونے سے رہا۔ ان چار طریقوں میں ہم آزاد نہیں بنائے گئے بلکہ پابند ہیں سنت کے۔

اوندھا لینے کو شریعت میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ مسجد میں اوندھے لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیروں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابو ہریرہؓ اوندھے لیٹ کر مت سوؤں اس لئے کہ یہ دو زنجیوں کی ہیئت ہے کہ ان کو اندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اس لئے مومن کا کام نہیں کہ وہ جہنمیوں کی ہیئت اختیار کرنے اور جہنمیوں سے مشابہت اختیار کرے۔ اور پھر اوندھا لینا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اس سے انتڑیاں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں ممکن ہے کہ کسی انتڑی میں گرہ لگ جائے اور

پیٹ میں درد شروع ہو جائے یا کوئی تکلیف ہو جائے اس لئے شریعت نے مکروہ سمجھا ہے۔ اگر سوتے سوتے اوندھا ہو جائے وہ دوسری بات ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اپنے ارادے سے آدمی اوندھا نہ لیٹے۔ ①

اب رہ گیا چٹ لیٹنا تو چٹ لیٹ کر سونا جائز تو ہے۔ شرعاً ممنوع نہیں حرام نہیں مگر شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ چٹ لیٹنا بے قابو ہو جانے کی علامت ہے۔ اور جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو چٹ لیٹ جاتا ہے اسی واسطے اگر کوئی پہلوان کسی کو بچھاڑ دے تو کہتے ہیں کہ چاروں شانے چٹ گرا۔ کوئی نہیں کہتا کہ چاروں شانے پٹ گرا کیونکہ جو پٹ ہوتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے اسے کچھ قابو ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جائے۔ مگر چٹ لیٹنے والا بالکل بے قابو ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ضعیفوں کی ہیئت پسند نہیں کی گئی، مومن کا کام ہے مضبوط ہونا، مومن کا کام بیماروں کی طرح پڑنا نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ”الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ“ ② قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے، قوت ہوگی تو جہاد کرے گا، قوت ہوگی تو مجاہد کرے گا اور ضعیف بیچارہ چار پائی پر بس پڑا ہوا ہے۔ نہ جہاد کے کام کا، نہ جنگ و جدل کے کام کا، نہ مجاہدے کے کام کا کسی کام کا نہیں، یہ شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ پسند کیا ہے کہ ہر معاملہ میں بہادارانہ افعال صادر ہونے چاہئیں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: آدمی مریکوں اور ضعیفوں کی چال نہ چلے بلکہ اس طرح چلے بلکہ اس طرح چلے کہ دیکھنے والا دیکھے کہ اس کے بدن میں کچھ جان ہے، کچھ قوت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوتے تو رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجی ہے کہ آدمی بغیر رکاب کے سوار نہ ہو سکے بلکہ کوڈ اور چھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ شجاعت اور بہادری ظاہر ہو۔

بہر حال اسلام نے مومن کے لئے کوئی ایسی حرکت پسند نہیں کی جس سے ضعف ٹپکتا ہو۔ مجبوری ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ چٹ لیٹنا بے قابو ہونے کی علامت ہے۔ ضعیفوں اور بیماروں کی علامت ہے اس لئے جائز تو ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت نہیں کی مگر اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ اب رہ گیا بائیں کروٹ سونا تو مخالفت تو اس کی بھی نہیں جائز ہے مگر پسندیدہ یہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ بائیں جانب قلب ہے۔ جب بائیں کروٹ پر سوائے گا تو آدمی کے قلب کو راحت زیادہ ملے گی اور جب راحت زیادہ ملے گی تو نیند گہری آئے گی اور جب نیند گہری آئے گی تو اندیشہ ہے کہ تہجد قضا ہو جائے اور صبح کی نماز بھی قضا ہو جائے۔ اور دوسرے معمولات قضا ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ آدمی اتنی زیادہ راحت کرے کہ گھوڑے سچ کر سو جائے اور مردوں سے شرط باندھ کر سو جائے۔ آدمی کو چوکنا ہو کر سونا چاہئے تاکہ جس وقت چاہے آنکھ کھلے۔ آدمی کا قلب مضبوط ہو۔

① السنن لابن ماجہ، کتاب الادب، باب النهی عن الاضطجاع علی الوجه، ص: ۲۶۹۹، رقم: ۳۷۲۵، حدیث صحیح دیکھئے: صحیح وضعیف ابن ماجہ ج: ۸ ص: ۲۲۳، ② السنن لابن ماجہ، کتاب الزہد، باب التوکل والیقین، ص: ۲۷۳۰، رقم: ۴۱۶۸، وزاد: المؤمن القوی خیر و احب الی اللہ.

راحت میں غرق ہو کر بے قابو نہ بنے۔

اسی واسطے عزم پیدا کیا کہ اگر آدمی سوتے وقت یہ ارادہ کر کے سوئے کہ ہماری آنکھ صبح کو چھ بجے کھلنی چاہئے تاکہ جماعت قضا نہ ہو تو ٹھیک چھ بجے آنکھ کھلے گی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ کھلے۔ اٹھنا نہ اٹھنا تو آدمی کے نفس کی بات ہے۔ سستی سے نہ اٹھے مگر آنکھ ضرور کھل جائے گی۔ تو مضبوط عزم و ارادہ ضرور کام کرتا ہے اس کے لئے شریعت نے طریقہ یہ بھی رکھا ہے کہ سورہ کہف کی جو آخری آیتیں ہیں وہ پڑھ کر سو یا کریں ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ ① تا آخر سورہ۔ ان آیتوں کا اثر یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کو پڑھ کر ارادہ کرے کہ فلاں وقت اٹھنا ہے تو ضرور آنکھ کھلے گی۔ مگر پہلی چیز عزم اور عزیمت ہے کہ ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے اٹھنا ہے اور اگر ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے تو سونا ہے چاہے اٹھے نہ اٹھے تو اٹھ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی۔ انسان کے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت دی ہے، انسان کی عزیمت کو بڑی طاقت بخشی ہے۔ ارادے پر ان آیتوں کو بھی پڑھ لے تو زیادہ مدد ہوگی۔ بہر حال شریعت کا منشاء یہ ہے کہ گہری نیند مت سوؤ کہ سارے اذکار، سارے اعمال، ساری نمازیں نیند کی نذر ہو جائیں، اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ انسان بائیں کروٹ پر سوئے اور گہری نیند سوئے۔

اب دائیں کروٹ رہ جاتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی سارے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ آپ دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ جب آدمی دائیں کروٹ سوئے گا تو قلب متعلق رہے گا اور جب دل لٹک گیا تو زیادہ راحت نہیں ملے گی قلب چونکا رہے گا۔ ایسی نیند نہیں آئے گی کہ جس میں آدمی غرق ہو جائے اس لئے دائیں کروٹ پر لیٹنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دیا ہے اور دوسری بیٹوں کو ممنوع قرار تو نہیں فرمایا مگر پسندیدہ نہیں فرمایا کیونکہ دوسری بیٹوں میں مومن کا مقصد اصل فیوت ہو جاتا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز روزہ تو بجائے خود عبادت ہے مگر عام زندگی میں بھی آپ آزاد نہیں پیدا کئے گئے بلکہ قانون خداوندی کے پابند بنائے گئے ہیں کہ سو تو اسی ہیئت سے سو جس ہیئت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے، کھانے بیٹھو تو اسی ہیئت سے کھاؤ جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر کھاتے تھے۔ جب آپ کوئی کام کریں تو اسی ہیئت سے کریں جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو کرتے تھے۔

ابتدا بالتیمین..... چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی جیسے کہ روایت میں ہے: ”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيْمَنَ“ ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے کاموں میں ہمیشہ دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ اگر کنگھا کرتے تو پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب، اگر جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پیر میں پھر

① پارہ ۱۶، سورۃ الکہف، الآیہ: ۱۰۷۔ ② السنن للنسائی، کتاب الزینۃ، باب التیامن فی الترحل، ص: ۲۳۲۳۔

رقم: ۵۳۲۲۔ حدیث صحیح ہے دیکھیے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۱ ص: ۲۵۶۔

بائیں پیر میں اگر کرتے پہنچتے تو پہلے آستین میں دایاں ہاتھ ڈالتے پھر بایاں۔ دانتوں میں اگر مسواک کرتے تو پہلے دائیں جانب لے جاتے پھر بائیں جانب۔ ہر اچھی چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب کو پہلے اختیار فرماتے تھے۔ یہی کام مومن کا ہونا چاہئے کہ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پہلے اختیار کرے گا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کوئی چیز آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تقسیم فرماتے تو دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ دائیں جانب تقسیم فرما کر پھر بائیں جانب متوجہ ہوتے۔ اور ہر بری اور خسیس ترین شے کی ابتداء بائیں جانب سے فرماتے ناک صاف کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے استنجا کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ یہ ہے سنت، اگر آپ سنت پر عمل کریں تو آپ کی ساری دنیا دین بن جائے گی، نہ کھانا پینا، رہنا سہنا اتباع سنت کی وجہ سے دین بنتا چلا جائے گا۔ اور اتباع سنت کب ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے محبت کے غلبے کی وجہ سے اگر محبت غالب نہ ہو تو آدمی کبھی بھی اتباع سنت نہ کرے بس یہ سوچے گا کہ مطلب نکل جانا چاہئے، کہاں کی محبت اور کہاں کا اتباع محبت غالب رہے گی تو قدم قدم پر خیال رہے گا۔

معیار عقل..... حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ تھے وہ سہارنپور سے سوار ہوئے۔ جانا تھا ان کو کانپور، پہلے سہارنپور کے گئے بہت مشہور تھے۔ اب وہ گنا نہیں ہوتا وہ گئے بہت ملائم۔ بہت میٹھے اور بڑے ہی عمدہ ہوتے تھے، تحفے کے طور پر لوگ بہت دور دور تک لے جاتے تھے تو انہوں نے بھی گئے خریدے کہ کانپور جا کر احباب میں تحفے کے طور پر تقسیم کر دوں گا۔ مگر گنوں کا وزن چالیس سیر سے بھی زیادہ تھا اور ایک ٹکٹ سے اتنا وزن نہیں لے جاسکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ زائد محصول دے دوں گا۔ بابو سے انہوں نے ذکر کیا تو بابو نے ایک نیک صورت دیکھ کر کہ بھولا بھالا ہے۔ بڑا مقدس آدمی ہے، کہا کہ آپ لے جائیں۔ کوئی محصول وغیرہ نہیں ہے۔ گویا اس نے اپنے نزدیک بڑی عقیدت سے کام لیا کہ نیک صالح آدمی ہے کیا اس سے پیسے لئے جاویں۔ اس نے کہا کہ معاف ہے آپ لے جائیں۔

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ محصول لے لیں اگر ریل میں چیکر آگیا تو محصول بھی لے گا اور جرمانہ الگ وصول کرے گا۔ وہاں ڈبل دینا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہدیں گے وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! جب میں غازی آباد اسٹیشن پر دوسری گاڑی بدلوں گا تو دوسرا چیکر آئے گا، وہ جرمانہ وصول کرے گا۔ مال زیادہ ہے ٹکٹ میں اتنی گنجائش نہیں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہوگا اتنا ہی جرمانہ بھی ہوگا تو وہاں مجھے چوگنا دینا پڑے گا۔ آپ مجھ سے یہیں لے لیں اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہدیں گے وہ اس چیکر سے کہدے گا۔ وہ آپ کو کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جب میں کانپور میں اتروں گا اور گیٹ سے پاس ہوں گا تو وہ گیٹ بابو کہے گا کہ بلی (BUILETY)؟ وہ میرے پاس ہوگی نہیں وہ مجھ سے چوگنے وصول کرے گا اتنے میری جیب میں ہوں گے بھی نہیں۔ اس بابو نے کہا کہ اس چیکر سے کہلوادیں گے وہ اس گیٹ بابو سے کہدیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں

کہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہوگا؟ بابو نے کہا پھر تمہارا گھر آجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ گھر تو گر جائے گا۔ مگر خداوند عالم نے اگر یوں پوچھ لیا کہ ریلوے کی چوری کیوں کی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔ تو اب وہ بے چارہ خاموش ہوا اس بابو نے کہا کہ یہ بیچارہ مجنوں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اس کو مجنوں ہی کہتے ہیں۔

اہل دنیا عقلمند اس کو کہتے ہیں جو بے ایمانی زیادہ کرے، چالاکیاں زیادہ کرے، دھوکہ زیادہ دے لے کہتے ہیں کہ بڑا بھاری دانشمند ہے۔ اور اگر بے چارہ بھولا بھالا سیدھا ایمان داری اور امانت داری سے پیش آئے اسے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ پہلے زمانہ کی روح اس میں آگئی ہے مگر حقیقت میں عقلمند وہی ہے جو اپنی آخرت کو پیش نظر رکھے۔ وہ عقلمند نہیں جو انجام کو بھلا دے اور بعد میں مصیبتیں اٹھائے جس کو مولانا ردیؒ نے کہا ہے کہ۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد اوست فرزانه کہ فرزانه نہ شد
دیوانہ وہی ہے جو کہ دیوانہ نہ بنا اور عقلمند، وہ ہے جو عقلمند بننا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیوانگی ہی چاہتا ہے۔ حقیقت میں دانشمندی وہی ہے جو شخص اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام زیادہ لے گا وہی لقب پائے گا مجنوں کا خطیوں کا۔ اور جو شخص چالاکیاں زیادہ کرے گا وہ لقب پائے گا اہل دنیا کے نزدیک دانشمند اور عقلمند ہونے کا۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ”يَقَالُ لِلرَّجُلِ مَا أَعْقَلَهُ وَمَا أَظْرَفَهُ وَمَا أَجْلَدَهُ وَلَيْسَ فِي قَلْبِهِ مِنْ شَقَالٍ ذَرَّةٍ مِّنَ الْإِيمَانِ“ ① ”ایک آدمی کو کہا جائے گا کہ کتنا بڑا دانشمند ہے اور کتنا بڑا عقلمند ہے اور کیا وسیع النظر ہے اور کیا دانا ہے اور کیا سادہ بر ہے حالانکہ اس کے قلب میں ذرہ برابر ایمان نہ ہوگا۔“ اور دنیا کہے گی کہ بڑا عقلمند ہے بڑا دانش مند ہے، مگر چونکہ اس میں ایمان کا نشان بھی نہ ہوگا جو کچھ ہوگی وہ خود غرضی ہوگی۔ دنیا داری اور دنیا سازی ہوگی اس لئے وہ عقلمند نہیں ہے۔ شریعت اسے عقلمند کہتی ہے جو اپنے انجام کو سوچے اور دنیا کے بارے میں خیال کرے کہ بھلی بری جیسی بھی ہوگی گزر جائے گی وہاں جو مصیبت ہے وہ ابدی ہے وہ ہمیشہ جھیلی پڑے گی جو کہ قابل برداشت نہیں ہے نہ یہاں کی مصیبت باقی رہنے والی ہے اور نہ یہاں کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔ اس لئے جو آدمی آخرت کے مصائب کی رعایت کر کے دنیا کے مصائب کا تحمل کرے وہ عقلمند ہے۔ فرمایا گیا: ﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى﴾ ② ”آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور شدید ہے۔“ اور یہاں کی مصیبت نہ شدید ہے اور نہ دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

راستے کا رنج و راحت اور منزل مقصود..... اکبر نے کیا خوب بات کہی ہے اور بڑی عمدہ بات کہی ہے لقب ہی اس کا لسان العصر ہے۔ اس بناء پر ان کی بات بڑی حکمت کی بات ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب رفع الامانة والايمان من بعض القلوب، ص: ۷۰۲، رقم: ۳۶۷۔

② پارہ ۱۶، سورۃ طہ، الآیۃ: ۱۲۷۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
یہ کام تمہیں بھی کرنا ہے اور مجھے بھی کرنا ہے اور سب کو کرنا ہے کیونکہ سب ہی کو جینا اور مرنا ہے۔ آگے کہتا ہے۔
رہ گئی بحث رنج و راحت کی وہ فقط وقت کا گزرنا ہے
رنج بھی گزر جائے گا اور راحت بھی گزر جائے گی، بڑی ہی حکیمانہ بات کہی ہے کہ راستہ کے رنج و راحت
پر نظر مت رکھو اور انجام پر نظر رکھو۔ منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اگر منزل پر پہنچ کر مصیبت میں مبتلا رہے تو وہ
نا قابل برداشت ہے۔ تو اکبرؒ نے کہا ہے کہ راستے کا رنج و راحت فقط وقت کے گزر جانے کا نام ہے۔

یہاں میرے دل میں ایک خلیجان یہ پیدا ہوا کہ بات تو بڑی حکیمانہ کہی ہے راستے کے رنج و راحت کا خیال
مت کرو مگر منزل مقصود نہیں بتلائی کہ جانا کہاں ہے۔ اسی بناء پر دو تین شعر میں نے اس میں جوڑ دیئے ہیں اپنی
طرف سے اکبرؒ نے راستہ کا پتہ دیا ہے، میں منزل کا پتہ بتا دیتا ہوں کوئی شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر کہتا میرا مشغلہ
ہے، پھر اکبر جیسا شاعر اور اس کے شعر میں اپنا شعر ملانا ایسا ہے جیسے محل میں ٹاٹ کا پوند لگا دیں۔ بس ایک تک
بندی ہے جو میں نے کر دی ہے اور میں نے اکبر کے اشعار پر اضافہ کر دیا ہے۔ تو دو ان میں راستے ہی کے بارے
میں ہیں ان میں ایک آخری منزل کے بارے میں۔ اکبرؒ نے تو کہا ہے کہ —

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
رہ گئی بحث رنج و راحت کی وہ فقط وقت کا گزرنا ہے
آگے میں کہتا ہوں۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
یعنی عزت ہم کہتے ہیں یہ فقط خیالی شے ہے اور خیال بھی دوسرے کا۔ اگر ہمارے خیال سے ہماری عزت
ہو تو جو بیس گھنٹے ہم خیال کے بیٹھے رہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دوسرا بڑا مانیں تو عزت ہوتی
ہے ہمارے خیال باندھنے سے عزت نہیں ہوتی اور دوسروں کا خیال آپ کے قبضے میں نہیں۔ اگر خیال بدل گیا بس
جب ہی ذلیل ہو گئے۔ آج خیال یہ ہے کہ فلاں آدمی بہت بڑا ہے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتے ہیں،
لیڈر بن جاتے ہیں اور کل کو خیال بدل گیا تو دوسرے کے گلے میں ڈال دیا۔ پہلے کی ساری عزت ختم ہو گئی۔ بس
ذلیل ہو گیا یہ صرف خیالی عزت ہے۔

اصل عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ
وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ① تو اصل عزت یہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کر دی ہے، اس لئے میں نے کہا کہ —
رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

اور میں آگے کہتا ہوں۔

قابل ذکر ہی نہیں خورد نوش یہ بھی کی خو سے لڑنا ہے
کھانا پینا یہ کوئی قابل ذکر نہیں اس لئے کہ یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ چوپائے بھی کھاتے پیتے ہیں
اگر آدمی نے کھالیا تو کونسا کمال کیا ہے۔ جانور کی حد سے نہیں نکلے گا۔ وہ بھی کھاتے ہیں تو کھانا کوئی کمال کی بات
نہیں ہے۔ بہر حال تین چیزیں ہو گئیں اکبر نے کہا تھا کہ راستے کے رنج و راحت کی پرواہ مت کرو، یہ گزر جانے
والی ہے، میں کہتا ہوں کہ کھانے پینے کا خیال مت کرو یہ تو جانوروں کی علامت ہے نہ عزت و ذلت کا خیال کرو
کیونکہ وہ خیالی شے ہے بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرو اور کوشش کرو۔ آخری شعر میں اسی کا پتہ دیا ہے:

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

مدارِ نجات..... اصل مقصد اطاعتِ خداوندی ہے یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا اگر محنت کر کے دنیا کا جغرافیہ یاد
کر لیا اور اس پر عبور بھی ہو گیا کہ نگلوں میں اتنے درخت ہیں، فلاں شہر ایسا ہے، آخرت میں ایک بھی نہ پوچھا جائے
گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کونسی سنت پر عمل کیا۔ علم دین کیا سیکھا تو آپ کہیں کہ حضور! عبادت تو نہیں کی البتہ دنیا
کا جغرافیہ لے کر آیا ہوں یہ کام نہیں دے گا کیونکہ اس سے نجات نہ ہو سکے آپ کہیں گے کہ معلوم کر کے آیا ہوں کہ
دنیا میں اتنے پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں دنیا میں پہاڑ گننے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ تم کو
طاعت و عبادت کے لئے بھیجا تھا۔ قانونِ خداوندی کی پابندی کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ بتاؤ کتنی کی ہے۔ نجات کا
مدار اسی پر ہے نہ جغرافیہ پر نہ سائنس پر نہ جدید تعلیم پر اس آخری شعر میں مقصدِ زندگی اور منزل کا پتہ دیا گیا ہے۔

محبت کی تلخیاں..... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر محبت سے ایمان بنتا ہے پھر اس ایمان ہی کی
وجہ سے اعمال ہاتھ پیر پر آتے ہیں اور انسان کی زندگی بنتی ہے۔ محبت سے ہی سارا کام چلتا ہے۔ آدمی اس محبت
میں مصائب بھی جھیلتا ہے۔ تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے، مگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہے تو پرواہ بھی نہیں
ہوتی کسی چیز کی۔ اہل اللہ جیل خانے میں بھی گئے مگر انہیں پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تعلق مع اللہ قومی ہے۔ فقر و فاقہ
آیا مگر انہیں پرواہ تک بھی نہیں اس لئے کہ دل میں تعلق موجود ہے۔ قلب مطمئن ہے اور اگر دل کا تعلق اللہ سے نہ ہو
تو انسان ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ ہمیشہ اس پریشانی اور پراگندگی و تشتت میں ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ
زندگی کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ کسی اور چیز میں نہیں۔

کر وڑوں کا مالک ہو اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ بلکہ قلب بے سکون، غیر مطمئن، پریشان، پراگندہ ہی
رہے گا کہ اس کی حفاظت کیسے کروں اسے ڈاکو نہ لے جائیں کہیں پہریدار ہیں۔ کہیں چراسی ہیں کہ چوروں سے
حفاظت کرتے ہیں، مگر قانونی چوری بھی تو ہوتی ہے اس سے کیسے حفاظت کرے گا؟

بہت سے لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر چوری کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالنے ہیں مثلاً کہیں فیس کی شکل میں

رقم و کلاء کے پاس جارہی ہے۔ کہیں بیرسٹروں کے پاس جارہی ہے۔ کہیں ڈاکٹروں کے پاس جارہی ہے۔ غرض روپیہ کیا ایک دہال جان بنا ہوا ہے ہر وقت پریشانی ہی پریشانی ہے۔ نہ اس سے سکون ملتا ہے نہ بلڈنگ سے سکون ملتا ہے اگر سکون ملتا ہے تو صرف اللہ کے نام میں ملتا ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① ”اللہ ہی کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں۔“

دنیا کے ذکر سے چین نہیں ملتا وہ تو استعمال کی چیز ہے اسے کھاؤ پیو، استعمال کرو مگر مقصود مت بناؤ۔ اس سے محبت مت کرو۔ اس میں دل مت لگاؤ اس کو جائز طریق پر استعمال کرو۔ اچھا کھانا بھی کھاؤ۔ اچھے مکان میں بھی رہو۔ مگر مکان کو خدا مت سمجھو۔ لباس کو کعبہ مت بناؤ، خادم سمجھو، محبت کے لئے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اختیار کرو۔ ہماری زندگی یہ ہے ”کہ دل بیار دست بکار“ ہاتھ اور پاؤں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور دل لگا ہوا ہے خالق و مالک کے اندر کہ دنیا میں رہو تجارت بھی کرو، زراعت بھی کرو۔ جب تک انسان دنیا میں رہے گا سب ہی کام کرے گا اور کرنے بھی چاہئیں مگر دل کی توجہ اللہ کی طرف دینی چاہئے، اس سے تجارت بھی بابرکت بنے گی۔ سب چیزیں عبادت بنتی چلی جاویں گی۔ تو اصل چیز ہے قانون کی پیروی اور وہ ہونہیں سکتی جب تک محبت نہ ہو۔ تو محبت اصل ایمان اور اصل اسلام ہے اور۔

در محبت تلخیا شیریں بود

یعنی محبت میں تلخیاں بھی شیریں بن جاتی ہیں کیونکہ آدمی کا دھیان محبوب کی طرف رہتا ہے تلخیوں کی طرف نہیں رہتا، اس لئے وہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ اور محبوب کی ہر ادا محبوب بن جاتی ہے۔

غلبہٴ ادب ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ جو ہماری ساری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں اکابر اولیاء میں سے ہیں سن ۱۸۵۷ء میں انہوں نے جہاد کیا ہے پھر حضرت نے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مکہ معظمہ میں پہنچ کر پوری عمر کبھی سیاہ جوتا نہیں پہنا۔ لوگوں نے شروع شروع میں تو اتفاقی بات سمجھا مگر جب کالے رنگ کا جوتا لاتے تو ان سے فرماتے کہ دوسرے رنگ کالاؤ یا سفید لاؤ یہ جوتا نہیں پہنوں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا طریقہ ہے تو پوچھا کہ حضرت! سیاہ جوتے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ بیت اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے ادب مانع ہوتا ہے کہ وہ رنگ میں اپنے پیروں میں استعمال کروں، حالانکہ سیاہ جوتا پہننا شرعاً جائز ہے کوئی قباحت و نقصان نہیں ہے مگر چونکہ ادب کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو آدمی بعض جائز چیزوں کو بھی ترک دیتا ہے کیونکہ اس جائز چیز کے استعمال کرنے میں ادب مانع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ مجھے حیا آتی ہے۔ ہے کہ وہ رنگ جو بیت اللہ کے غلاف کا ہے اس کو پاؤں میں ڈالوں۔

تو ظاہر بات ہے کہ جائز و ناجائز کی بحث نہیں یہ تو محبت کا غلبہ ہے چونکہ محبت خداوندی اتنی غالب تھی اسی

کے مطابق محبت کعبہ بھی اسی قدر غالب تھی کہ اس رنگ کو پاؤں میں لانا گوارہ نہ کیا۔ کیا ادب کی انتہا تھی۔
حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کلیر شریف جاتے تھے۔ حضرت صابر کلیریؒ کے مزار کی زیارت کرنے کے واسطے۔ کلیر، رڈ کی سے پانچ میل دور ہے، نہر کی پٹری پٹری پر چلے جاتے تھے۔ اب تو سواری کا بھی انتظام ہے اس زمانے میں لوگ عموماً بیدل ہی جاتے تھے، تو حضرت جب نہر کی پٹری پر جاتے اور سامنے کلیر ہوتا تو جوتے اتار کر بغل میں دبالیٹے اور ننگے پیروں جاتے۔ تو کیا جوتے پہن کر جانا ناجائز تھا؟ نہیں بلکہ محبت کا غلبہ تھا۔ حضرت صابر کلیریؒ کی محبت دل میں جا گریں تھی۔ ادب کا غلبہ تھا۔ جب روضہ نظر آتا تھا تو جوتا پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے۔ چونکہ ادب کا غلبہ تھا۔ اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے۔

جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابر اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا۔ آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیبہ بالکل سامنے آ جاتا ہے اور حرم شریف کے مینارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس آخری منزل کا نام ہے ”بیسر علی“ یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے مینارے سامنے آ جاتے ہیں۔ تو یہ قافلہ جب ”بیسر علی“ پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اچھل کر کرز میں پر گر پڑے جوتے اتار کر رکھے اونٹ کے کباوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جا رہے تھے۔ عرب کی کنکریاں جو ہیں وہ نو کیلی ہیں۔ پیروں میں ایسے جھپتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہو لہان ہو گئے۔ مگر حضرت محبت و عشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔

دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے۔ یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم پر چل کر رک گیا۔ کوئی سو قدم چل کر رک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا مشکل ہے مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ معذور ہے اسے تو کچھ خبر نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش و حواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اتر سکتے۔ اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا۔ اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرت حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہو لہان اور خون خون بھی ہو گئے تو۔ در محبت تلخ ہا شیریں بود۔ یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔

استغراقِ محبت..... غزوۂ اُحد میں جنگ شروع ہوئی۔ اُحد کے پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر چالیس تیر اندازوں کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ وہ یہاں بیٹھے رہیں، فتح ہو خواہ شکست ہو۔ ہر صورت میں وہاں سے بغیر اجازت نہ ہٹیں۔ چنانچہ صحابہؓ وہاں بیٹھے رہے، جنگ شروع ہو گئی۔ ان حضرات نے سوچا کہ ہم خالی

بیٹھے ہیں کچھ کام ہی کر لیں، دوسرے حضرات نے کہا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ صرف بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا کہ ایسے بیٹھنے سے تو عبادت میں لگنا اچھا ہوگا۔ یہ سوچ کر نفلوں کی نیت باندھ لی اور نفلیں پڑھنا شروع کر دیں ترکیب یہی کہ چار نفلیں پڑھیں اور باقی حفاظت کریں۔ اسی طریقے سے رات گزاری اور نوافل پڑھتے رہے۔

مشرکین مکہ نے تاک لیا کہ یہ صحابہ بیٹھے ہوئے ہیں، کفار نے ان پر تیروں کی بارش کی، جو لوگ نماز میں مصروف تھے وہ سامنے تھے، اسی لئے کسی کی گردن میں لگا، کسی کے سینے میں لگا اور کسی کی پیٹھ میں لگا، بدن ابو لہان ہو گئے اور کپڑے خون میں رنگ گئے مگر ان کو کچھ خبر نہیں وہ اپنی نماز میں مستغرق ہیں۔ نہ تیروں کی خبر اور نہ نیروں کی خبر جب اخیر شب میں سلام پھیرا تو معلوم ہوا کہ کپڑے رنگے ہوئے ہے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیر یہاں گھسا ہوا ہے۔ کوئی تیر سینے میں۔ کوئی تیر پشت میں، پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ نے تیر مارے ہیں۔

اتنا استغراق اور غلبہ تھا محبت کا نہ انہیں تیروں کا پتا چلا اور نہ انہیں نیروں کا پتا چلا، نماز کے اندر غرق ہے اور حق تعالیٰ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو آدمی ساری تلخیاں جھیل جاتا ہے جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے پھر نہ زخم کی پرواہ نہ تلواروں کی نہ نیروں کی پرواہ ہوتی ہے یہی شان اہل اللہ کی بھی ہوتی ہے کہ جب محبت خداوندی اور محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم غالب آجاتی ہے تو نہ عیش کی پرواہ نہ آرام و راحت کی پرواہ ساری چیزوں کو نچ دیتے ہیں۔

ظرف محبت چنانچہ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز محبت ہے اور محبت کا ظرف دل ہے جب دل میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آجائے گی تو ہاتھ پاؤں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اعمال صالحہ بھی صادر ہوں گے اور اگر دل میں محبت نہیں تو نہ ایمان بنے گا اور نہ اعمال بنیں گے۔ مسلم نام کے تو ہوں گے مگر کام اسلام کے نہیں ہوں گے۔ جب دل میں ایمان ہوگا جب ہی کام اسلام کا ہوگا۔ اس لئے ہمیں نام کا مسلمان نہیں ہونا چاہئے، دل میں محبت رچی ہو اور ہاتھ پیر پر عمل ہو یہی عمل شہادت دے گا ایمان ایک چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے۔

دعویٰ محبت کا ثبوت جب قیامت میں آدمی اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرے گا تو اس سے دلیل طلب کی جائے گی کیونکہ کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابل سماعت ہوتا نہیں۔ اس بنا پر اس سے پوچھا جائے گا کہ تیرے ایمان کا ثبوت کیا ہے وہ کہے گا کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں، زکوٰۃ دی ہے، حج کئے ہیں، یہ ثبوت ہوگا ایمان کا پھر اسے نجات ہوگئی۔ مگر آپ نے اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور دلیل طلب کی گئی مگر وہاں نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوٰۃ ہے، نہ حج ہے۔ تو یہ دعویٰ بغیر دلیل کے رہ جائے گا وہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ اس کی گردن ناپی جائے گی اور اس کے دعوے کی تکذیب کی جائے گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تمہارے اندر ایمان کہاں ہے، اگر ایمان ہوتا تو اس کے آثار ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتے، حالانکہ کوئی اثر ظاہر نہیں اس لئے کہ اندر کچھ نہیں۔ لہذا انتہائی ذلیل ہوگا اور کہا جائے گا کہ اپنے کئے کو بھگتو۔ پھر وہاں کی سزائیں دی جائیں گی۔ مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس لئے جب دعویٰ ہو تو اس کی دلیل بھی مہیا ہونی چاہئے۔ اطاعت، عبادت، اتباع سنت حضور

کی پیروی ہونی چاہئے۔ آگے قبول کرنا نہ کرنا مالک کا کام ہے مگر ہمیں ثبوت مہیا کر دینا چاہئے اور اس ثبوت پر ناز نہ ہو کہ میں نے اتنی عبادت کی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بڑوں کی بڑی بات..... حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد اولیاء کبار میں سے ہیں وہ رات دن طاعت و عبادت میں لگے رہتے ہیں لوگوں نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں کہ راتوں کو ذکر اللہ دن بھر ذکر اللہ۔ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟

جب ہم نے یہ سوال پڑھا تو ہم یہ سمجھے کہ حضرت نے یہ جواب دیا ہو گا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اس لئے میں یہ عمل کر رہا ہوں مگر یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب اور ہے۔ یہ تو ہمارے فہم کی رسائی تھی حضرت نے وہ جواب دیا جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اور اپنے مرتبے کے مطابق جواب دیا کیونکہ بڑوں کی بات بڑی ہی ہوتی ہے۔ حضرت نے ان پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ میں رات دن اس لئے عمل کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیا گیا ہوں عمل کرنے کی خاطر۔ یعنی مقصد زندگی ہی میرا یہ ہے، راضی ہونا نہ ہونا ان کا کام ہے۔ راضی ہونا یا ناراض ہونا یہ فعل خداوندی ہے۔ ہم کون ہیں ان کے فعل میں دخل دینے والے۔ ہمارا کام تو ہونا چاہئے جس کے لئے ہم پیدا کئے ہیں اور ہم پیدا کئے گئے ہیں طاعت و عبادت کے لئے، بس ہم اپنا کام کئے جائیں۔ اگر وہ راضی ہوں تو ان کا فضل ہے اگر وہ ناراض ہوں تو ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ اس سے فریادی ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل مت دو۔ صرف اپنا کام کرتے رہو۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن

اپنے کاموں میں لگے رہو قبول کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے۔

محبت آمیز غم..... یحییٰ بن اسلم بہت بڑے عالم گزرے ہیں امام کے درجے کے عالم ہیں ان کی وفات ہوئی تو بعض اہل اللہ نے انہیں خواب میں دیکھا اور خواب بھی کشف جیسا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئی ہے۔ ”حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا چیز لے کر آئے ہو ہمارے لئے؟ جواب دیا کہ اے اللہ تعالیٰ میں نے بچپن ۵۵ حج کئے ہیں۔ فرمایا: ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا: باری تعالیٰ میں نے ایک سو باون ۱۵۲ قرآن ختم کئے ہیں۔ فرمایا: ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ پوری زندگی کے اعمال ذکر کئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک بھی قبول نہیں۔ اور بتاؤ کیا لے کر آئے ہو۔ آپ عاجز ہو گئے۔ آخر میں کہا کہ اے اللہ! بس تیری رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ لے کر نہیں آیا۔ فرمایا کہ اب بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ وَجَبَتْ لَكَ رَحْمَتِي میری رحمت تیرے لئے واجب ہو گئی ہے جا تیرے لئے جنت اور مغفرت ہے“ تو اس عمل کے ساتھ ساتھ رضاء خداوندی اور رحمت خداوندی کی توقع اور امید بھی ہونی چاہئے، اعمال پر گھمنڈ اور ناز نہیں ہونا چاہئے، جس عمل میں محبت کی آمیزش اور رحمت کی امید نہ ہو وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر

اس کے بعد عمل کا مرتبہ ہے۔ اور اس محبت سے ہی عمل پیدا ہوتا ہے عمل ہی محبت کی علامت ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دل میں محبت ہے یا نہیں۔

دوامِ معیتِ نبوی کی بشارت..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: ”مَنْ أَحَبَّنِي فَقَدْ أَطَاعَنِي وَمَنْ أَطَاعَنِي كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ“ ① ”جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا اور جو میری سنتوں کی پیروی کرے گا وہ میرے ساتھ بھی جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا“۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو۔ کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ میری اطاعت کر رہا ہے اور میری اطاعت کرنا علامت ہے اس بات کی ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباع سنت ہے جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ“ ② ”تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ میری اس آدمی کو اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی اس کی نہ اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اپنی اولاد سے ہو، نہ اپنے سامان سے ہو، نہ اتنی محبت اس کو اپنے عزیز و اقارب سے ہو“۔ جب دو محبتوں کا ٹکراؤ ہو تو برحق دے میری محبت کو، تو کہا جائے گا کہ یہ مومن کامل ہے کہ اصل شے محبت ہی ہے۔

محبت و خواہش کا ٹکراؤ!..... ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ“ ③ ”کہ تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں بن سکتا اس وقت تک جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میرے لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں“۔ ایک طرف شریعت ہے اور ایک طرف خواہش نفس ہے۔ اگر خواہش نفس کو ترجیح دی تو معلوم ہوا کہ خواہش کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی مرضی کو ترجیح دی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اس لئے یہ خواہشات نفس اور ہوائے نفس کا تابع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہوتا تو اسی کو ترجیح دیتا۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ مومن کامل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا تابع ہونا چاہئے۔ جو کچھ کرے اتباع میں کرے، نماز پڑھے تو اتباع میں پڑھے روزہ رکھے تو اتباع سے، سوئے تو اتباع سے، جاگے تو اتباع سے، کھائے پیئے تو اتباع میں، غرض یہ کہ پوری زندگی پر اتباع چھا جائے جب ہی اس کے ایمان میں کمال آئے گا اور اس کو مومن کامل کہیں گے۔

صُدورِ معصیت اور تقاضائے محبت..... اب رہی بات غلطی سے گناہ کا صادر ہونا تو بندہ بشر ہے۔ معصوم تو

① السنن للترمذی، ابواب العلم عن الرسول، باب ماجاء فی الاخذ بالسنة.

② الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ، ص: ۲۸۸، رقم: ۱۶۹.

③ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ۱ ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷.

صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہے۔ ہم تو دن رات سینکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور گناہ بے شک ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل یہ فرمایا کہ جب گناہ ہو جائے تو توبہ کر لے پھر اتباع شریعت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اتباع کر رہے ہیں اور درمیان میں گناہ ہو گیا کہ یا اللہ میری توبہ پھر نہیں کرونگا۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا۔ پھر اتباع میں مصروف ہو گئے۔ اتباع سنت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کبھی بھی غلطی نہ ہو اور گناہ نہ ہو۔ یہ شان تو انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ ہم سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور ہم گناہ کرتے بھی ہیں مگر اس کا حل یہ ہے کہ فوراً توبہ کر لے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے: **التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ** ① گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ توبہ کرتے ہی اس کا ریکارڈ صاف ہو گیا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کی وہ گناہ پھر باقی نہیں رکھا جاتا۔ اسی لئے جب بھی کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر کے پاک ہو جائے۔ یہ مومن کی شان ہے اور یہ محبت اور ایمان کی کمال ہے۔ بس دعاء کیجئے کہ اللہ رب العالمین اپنی رضا نصیب فرمائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور معیت عطا فرمائے اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر فرمائے۔ (آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

① السنن لابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر التوبہ، ص: ۲۷۳۵، رقم: ۴۳۵۰، حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح

الترغیب والترہیب ج: ۳ ص: ۱۲۲۔

تعلیم جدید

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيَا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَبَارَكَ وَسَلَّم تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. ﴿۱﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَتَخَرَّجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ
سُودَۃٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَأَلْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ
الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿۲﴾ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيمُ.

بے انتہا خوشی..... بزرگان محترم اخیال یہ تھا کہ اس وقت کالج کی جو جدید عمارت تیار کرائی جا رہی ہے، اس کو
دیکھنا اس سے مستفید ہونا اور سرور ہونا ہے۔ اسی غرض سے حاضری ہوئی تھی، جلسہ کا کوئی تصور اور اس میں بھی کسی
تقریری اور خطاب کا کوئی گمان حاشیہ خیال نہیں تھا۔ بہر حال جب جلسہ کی صورت بن گئی ہے تو اس کے کچھ نہ کچھ
لوازم پورے کرنے پڑیں گے اور ذمہ داروں نے اپنے محبت اور خلوص سے جو شکل پیدا کر دی ہے اس کا احترام تو
کرنا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی جدید عمارت میں حاضر ہو کر غیر معمولی مسرت ہوئی اور شام کے زندہ دل
مسلمانوں کے حوصلے اور جذبات خیر سامنے آئے اس سے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

تعمیر معنوی کی علامت..... ظاہر میں یہ ایک تعمیر ہے جو اینٹ اور پتھر سے کی جا رہی ہے۔ اور سینٹ اور چونا ہی
میں ڈالا جا رہا ہے لیکن اگر حقیقت پر نگاہ کی جائے تو یہ علم کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ یہ تعمیر دراصل علم کی ہے۔ در سگاہ کا
وجود حقیقتہً علم کے لئے ہے۔ اس لئے یہ جی تعمیر علامت ہے معنوی تعمیر کی جو اس کے اندر کی جائے گی ظاہر تعمیر سے
توالب کی ایک ہیئت بنائی جا رہی ہے اور معنوی تعمیر سے قلوب کی ایک ہیئت بنائی جا رہی ہے۔ اس ہیئت ظاہری میں
نفسانی اخلاق و جذبات کی اصلاح کی جائے گی اس اعتبار سے یہ بہت مستحق اقام اور مبارک عمل ہے۔

اقسام علم..... امام شافعیؒ کا مشہور مقولہ ہے۔ اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْيَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ..... یعنی اللہ کی طرف سے جو علم دنیا کے اندر آئے وہ دو طرح کے ہیں ایک ادیان کا علم۔ جس کا نام شریعت ہے اور ابدان کا علم جس کا تعلق انسان کے ظواہر بدن اور اس کے عوارض بدن سے ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں علم جزء ہیں شریعت کے۔ شریعت اسلامی نے جس طرح سے شریعت اور دین کے علم کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح سے ابدان کا علم اور ضرورت زندگی کے علوم مثلاً سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیان کا علم اصل مقصود ہے اور ابدان کا علم اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور دونوں کا مقصد ہے معرفت خداوندی۔ حدیث شریف میں ہے زَاوَسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللَّهِ۔ یعنی علم کا راس المال اور خلاصہ خدا کی معرفت اور اس کی پہچان ہے۔

علمی کہ راہ حق نہ نماید جہالت است!

جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ حقیقت میں جہالت ہے اس کو صورت علم کہا جائے گا۔ حقیقت علم نہیں کہا جاسکتا۔ علم دین کے ساتھ علم دنیا کی ضرورت..... جس طرح حقائق کا علم ضروری ہے اسی طرح معاشیات و معاشرت اور کائنات کے علم کے سلسلہ میں ان علوم کی بھی ضرورت ہے جن کو آج کل علم سائنس، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو آیت ہے ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ ① اس میں حصر کر دیا گیا ہے کہ علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ یعنی خوف و خشیت انہیں کے قلوب میں ہے۔ یہاں علماء سے مراد علماء فقہ ہی نہیں ہیں جو جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے مسائل سے واقف ہوں۔ بلکہ قرآن کریم کے ان نشانوں سے بھی واقف ہوں جو ضروریات زندگی کے سلسلے میں دنیوی علوم کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس میں ستاروں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس زمین کے مخفی عجائبات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن خلا و فضا کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور ان کی طرف اشارات بھی کئے گئے ہیں۔

نظام محکم کی شہادت..... ان سب کا مقصد بھی درحقیقت معرفت الہی اور اللہ کو پہچانا ہے اس کہ آثار کو دیکھ کر ہی ذی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کہیں دھواں دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہاں آگ موجود ہے ورنہ دھواں نہ ہوتا۔ کہیں آپ رطوبت اور خنک محسوس کریں گے ضرور یقین کریں گے کہ قریب میں کوئی دریا موجود ہے ورنہ بردت نہ ہوتی تو آثار کو دیکھ کر موخر کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کائنات کے نظام محکم اور عجیب و غریب انتظامات کو دیکھ کر دل خود بخود شہاد ہوتا ہے اور گواہی دیتا ہے کہ کوئی بہت بڑا صنّاع اور حکیم ہے جس نے یہ نظام کائنات بنایا ہے اور عجائبات قدرت کو نمایاں کیا۔ یہ محض مادہ اور اس کی حرکت کا کام نہیں ہے اس لئے کہ مادہ خود اندھا اور بہرہ ہے نہ اس کو اپنی خبر اور پرند دوسرے کی خبر۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایک اندھی بہری اور اپانچ چیز کوئی نظام محکم تیار نہیں کر سکتی۔

اور مادہ کی حرکت بھی وہ ہے کہ بغیر محرک کے وہ واقع نہیں ہو سکتی۔ حرکت ایک وصف ہے وہ اسی وقت پایا جائیگا جب اس کا موصوف موجود ہو اگر وہ ذات موجود نہ ہو جو موصوف ہے تو صفت یعنی وہ حرکت بھی نہیں پائی جائے گی۔ تو چونکہ مادہ اپنا جیج اور لایعقل ہے اس لئے اگر حرکت تعلق مادہ سے ہوگا تو عجائبات اور نظامِ علم کی نئی نئی چیزیں نہیں پیدا ہوں گی جب تک کہ علم اللہ اور قدرت الہی اس کے اندر شامل نہ ہو۔ بہر حال عجائب کی طرف بھی قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ روحانی عجائبات ہیں جن کو ارباب حقیقت نے کھولا ہے اور معرفت و بصیرت سے ذاتِ خداوندی کا پتہ چلایا ہے۔

متقدمین کی بنیاد پر متاخرین کی تعمیر..... اسی طرح سے مادیات میں عجائبات رکھے ہوئے ہیں وہ تدریجاً کھلتے ہیں اور کھل رہے ہیں۔ جس طرح سے قرآن کے عجائبات دور نبوت میں ظاہر ہوئے وہ سب اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے عقدے صحابہؓ نے کھولے اور ان کے بعد تابعینؓ نے ان کو کھولا اور اس میں شاخیں پیدا ہوئیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعینؓ متوجہ ہوئے اور ان عجائبات میں علمی عجائبات نکالے۔ یہاں تک کہ بے شمار تصانیف وجود میں آگئیں جن میں ان علوم کو مدون کیا گیا جسکے اندر یہ عجائبات اور حقائق الہیہ تھے اسی طرح سے کائنات کے سلسلے میں بھی ابتداً سادہ سادہ تحقیقات تھیں۔ ان سادہ تحقیقات پر اگلوں نے دوسری تعمیر کھڑی کی کہ اس کے اندر سے اور عجائبات نکلے یہاں تک کہ صدیاں اور قرون گزرنے کے بعد اب اس میں اتنی شاخیں پیدا ہو گئیں کہ انسان زمین میں ہی نہیں بلکہ فضا میں گھوم رہا ہے۔ فضا میں ہی نہیں آسمانوں کے قریب پہنچ رہا ہے اور چاند تک اس کی پرواز ہو چکی ہے تو فضا کے عجائبات بھی قرآن شریف کی روشنی میں سامنے ہیں یہ اتنا جو کچھ ہوا پچھلوں کی تحقیقات پر تعمیر کی گئی ہے۔ اگر پچھلے بنیاد نہ رکھتے تو اگلی تعمیریں نہیں ہو سکتیں تھیں جس طرح سے حقائق الہیہ کے بارے میں بھی پچھلوں نے بنیادیں رکھیں اس پر بعد والوں نے تعمیریں کیں اور نئے نئے حقائق کھولے۔

اسی طرح مادی حقائق کے بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی درحقیقت انہیں پچھلوں کا طفیل اور صدقہ ہے۔ اور انہیں کے فکر کا ثمرہ ہے انہوں نے بنیادیں قائم کیں اور اس سے آگے ہم نے دیواریں اٹھائیں اور دیواروں پر چھتیں ڈالیں اور پھر دو منزلہ، سہ منزل تعمیر کی، اگر بنیاد رکھنے والے بنیاد نہ رکھتے تو ہم آج یہ تعمیریں نہیں بنا سکتے تھے۔ دونوں علوم کا حقیقی نقطہ..... تو اس پوری گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں علوم کا حقیقی نقطہ یہ ہے بنانے والے کو پہچانا جائے اور یہ تمام ثرات و آثار دلالت کرتے ہیں اس موخر حقیقی کی معرفت پر تا کہ اس کی طرف جھکا جائے اور اس کے قانون پر چلا جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دوسو کے قریب آیتیں ذکر کیں جن میں عجائبات کائنات ذکر کئے ہیں۔ کہ زمینوں سے لے کر فضاؤں اور آسمانوں تک اور زمین کی گہرائیوں میں اور آسمان کی بلندیوں میں عجائبات قدرت پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کی آیتوں میں حقائق الہیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی آیتوں میں احکاماتِ خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اور چوتھی قسم کی آیت میں قصص و عبر اور امثال بیان کی گئیں ہیں تاکہ لوگ

عبرت پکڑیں نصیحت حاصل کریں۔

حقائق شریعت اور عجائبات کائنات کا باہمی تعلق..... بہر حال مقصد یہ ہے کہ کسی سکول یا کالج میں صرف ایک چیز کا ہونا کافی نہیں اس لئے کہ شریعت اسلام اور اس کے حقائق کا تعلق کائنات کے ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ اگر ان عجائبات قدرت کی طرف توجہ نہ کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان دوسری آیتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے جن میں مادی کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی اور علماء نے اس میں تحقیقات کی ہیں۔ علم ابدان اور علم ادیان میں سے ہر ایک کے مختلف گوشے ہیں۔

مثلاً مختلف ضروریات بدن ہیں جن کا ایک علم بن گیا کہ اگر بدن کو بیماری یا کوئی روگ لاحق ہو جائے اس کے علاج کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے لئے علم طب ہے تاکہ اصل بدن کی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی اصلاح نہ ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ بدن جو روحانیت کا سفر کر رہا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ بدن ہی تو اس کے لئے سواری ہے۔ بدن کا یہ گھوڑا اگر چلنے والا نہ ہو تو شرعی اعمال بھی انجام نہیں پاسکتے۔ پھر طب کے سلسلے میں ہزاروں حقائق ہیں جو انسان کی تکوین سے متعلق ہیں کہ کس طرح انسان پیدا ہوا اور باری تعالیٰ نے کن عجائبات میں سے اس کو ظاہر کیا یہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو بہت سے حقائق شریعت نہیں کھل سکتے جن کا مدار ان طبی تحقیقات کے کھلنے پر ہے تو انسان میں سب سے پہلے بدن کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ صلاح اور صحت ہے اور وہ موقوف ہے علم طب پر۔ اس بناء پر اس کے لئے علم طب ضروری ہے۔

اور علم طب انبیاء علیہم السلام پر بھی اترا ہے۔ وحی کے ذریعہ اس کے اصول آئے ہیں اور پھر تجربہ کاروں نے اس کو بڑھایا۔ اسی طرح بدن کے دوسرے عوارض ہیں مثلاً تن ڈھانپنے کا قصہ ہے اس کے لئے کپڑا بنانا یا بنا ہے۔ اسی طرح سے اثاثا البیت ہے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ہیں۔ کھانے پینے سے رہنے سے۔ مکان بنانے سے متعلق قرآن کریم میں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور احسانات خداوندی کے تحت مکانات کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْاَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَ اُنْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَا اَثَانًا وَمَتَاعًا اِلٰى حِينٍ﴾ ① یعنی کپڑوں کے گھر اور اینٹ پتھر کے گھر اور پہاڑوں کے گھر دیئے گئے تاکہ ان میں سکونت حاصل کرو تم۔ اسی طرح قرآن کریم نے ہر چیز کی طرف توجہ فرمائی ہے خواہ لباس ہو، خواہ کھانے پینے کی شے ہو خواہ رہن سہن اور صحت و مرض، اور تمام مستقل فن بن گئی ہیں اور ہر فن ایک مستقل موضوع پر مشتمل ہے اور ان کے احکام الگ ہیں اس کے عوارض الگ ہیں اس کے احوال الگ ہیں۔ تو کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو، اسلام نے ان چیزوں کی طرف

توجہ محض عیش کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش و عشرت کوئی دوا می چیز نہیں، یہ تو چند روزہ قصہ ہے۔

منزل مقصود اور اس کائنات کی حقیقت آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چونکہ راستے کے نشیب و فراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس دنیا کے عجائبات کا دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی تو راستہ ہے کہ جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔ تو ہماری منزل بھی آخرت ہے وہ اسی دنیا میں سے بنتی ہے۔ یہ تصور غلط ہوگا کہ آخرت کا کوئی مکان الگ ہے اور دنیا کا مکان الگ ہے۔ بلکہ اسی دنیا میں سے آخرت نکلتی ہے۔ اور اسی میں سے وہ اعمال پیدا ہوتے ہیں کہ جس سے آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے، مثلاً دولت کمائے گا تو اسی دولت کے ذریعہ وہ زکوٰۃ صدقات دے گا۔ اور دیگر کار خیر انجام دے گا۔ تو دولت میں سے ہی اس کی آخرت نکل رہی ہے۔ اگر دولت سامنے نہ ہوتی تو یہ آخرت کا محل کیسے تعمیر ہوتا۔ اسی طرح سے دوسری چیزیں ہیں۔ بدن کی صحت ہے اگر بدن صحیح نہ ہوگا تو آخرت کے اعمال کیسے انجام پائیں گے۔ اسی لئے دنیا کو رہ گزر فرمایا ہے اسی بناء پر راستہ کے نشیب و فراز سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ رہنے کا طریقہ جاننا بھی ضروری ہے۔

انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد بلڈنگ انسانوں کے لئے بنتی ہے۔ اور انسان اخلاق سے بنتا ہے۔ جب تک انسان کا کردار اور کریکٹر اچھا نہ ہو اور اونچا نہ ہو اور اس کی اخلاقی حالت بلند نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہے۔ انسان اچھے کپڑوں کا نام نہیں ہے۔ انسان نام ہے اچھے کردار کا اچھے کریکٹر کا اور سب سے پہلی چیز ہے انسانیت اور انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد ہے انس و مودۃ اور اخوت کا باہمی سلوک کہ تمام آدمی بھائی بھائی بن کر رہیں اور آدمی ایک دوسرے کی ہمدردی میں غرق ہو اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لئے مستعد ہو اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہو کہ میں خود تکلیف اٹھا لوں گا اپنے بھائی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے خود راحت اٹھانا انسانیت نہیں اور نہ حقیقت میں راحت ہے بلکہ اس کا نام خود غرضی ہے۔

معرفت الہی غرض ان تمام چیزوں کا مقصد معرفت الہی ہے اور معرفت الہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ معرفت نفس نہ ہو اس لئے کہ صوفیاء کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ”مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ“ ① جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس کو پروردگار کی معرفت حاصل ہوگئی۔

اسی ذیل میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جس کا نام علم النفس ہے جس سے نفس کے اتار چڑھاؤ نشیب و

① مرقاة المفاتیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، ج: ۱، ص: ۳۵۰، علامہ سیوطی فرماتے ہیں: قال النووي: غیر

ثابت، وقال ابن السعانی: هو من كلام يحيى بن معاذ الرازي رضي الله عنه وكتبه: الدر المنثور في الاحاديث

المشتملة حرف الميم ج: ۱، ص: ۸۱.

فراز کو پہچانا جائے کہ کیا کیا چیزیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ ان علوم سے نفس کی کمزوریوں اور انسانی طبائع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے ان کا حاصل کرنا مفید ہے اگر نقطہ نظر صحیح ہو اور کسی علم و فن کی اصل بناء میں کوئی فساد نہ ہو تو اس علم کو کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور اصل نقطہ کو سامنے رکھ کر ان علوم کو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں!

متاع مشترک..... بہر حال اس کی بہت زیادہ مسرت اور خوشی ہوئی کہ مسلمانان میل شارم نے اپنی حوصلہ مندی سے اور اپنے ظرف کی وسعتوں سے ایک اتنی بڑی تعمیر کھڑی کر دی۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ معنوی تعمیر کو بھی اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسانیت اور علم کی تعمیر کو بھی اونچا لے جانا چاہتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان کے ارادوں میں برکت دے، آمین۔ اور جو جوان کے مقاصد ہیں ان کی تکمیل فرمائے۔ اس سے نہ صرف میل شارم کے لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ آس پاس کے علاقہ اور تمام لوگوں کو توفیق دے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ تعلیم گاہ درحقیقت سب کے لئے ہوتی ہے علم کسی خاص قوم کی وراثت نہیں بلکہ علم سارے انسانوں کی ایک مشترک پونجی ہے۔ مسلم ہو غیر مسلم ہو۔ کسی بھی ملت کا ہو علم سب کی ایک مشترک متاع ہے۔ کسی کالج یا سکول کا قیام اسی لئے ہوتا ہے کہ نئی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا جائے۔ خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ تو ایک بڑی خوشی کی بات ہے کہ میل شارم میں اس قسم کا کالج قائم ہوا۔

اور جہاں تک میرے علم میں آیا اس کا فیضان عام ہے کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بلا امتیاز مذہب و ملت ہر قوم کے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس کی ضرورت بھی ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقاصد حسنہ میں کامیاب کرے اور ان مقاصد کی تکمیل فرمائے۔ آمین۔

شہ کا مصاحب..... میں آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں ذمہ داران کالج کا کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو یاد فرمایا۔ میرا تعارف اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ میری اصلیت نہیں اور نہ کوئی تعارف ہے۔ اگر کوئی کام بن پڑتا ہے تو وہ درحقیقت اثران اکابر اور ان بزرگوں کا ہی ہے۔

بقول غالب کے علماء کے لئے ان کا ایک شعر کافی ہے۔ اس نے کہا۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھر اتراتا وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذاتی اور شخصی کوئی آبرو نہیں ہے۔ البتہ بڑوں کی ایک جماعت ہے۔ اور وہ جماعت بین الاقوامی بزرگوں کی ہے۔ ان کی شخصیتیں بہت بلند ہیں۔ ان سے وابستگی اور ان سے نسبت ایک بڑی چیز ہے۔ ذرے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

نسبت کی عظمت..... لیکن چونکہ اس کو نسبت ہے آفتاب سے اور وہ نسبت بڑی ہے اس لئے اس درجہ کی بھی بڑی حیثیت ہوتی ہے اور وہی ہم بھی کہتے ہیں۔

اگرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تا بانیم
ہم تو خورد اور لاشی ہیں لیکن نسبت ایک بڑی چیز سے قائم ہے اور وہ نسبت بڑی ہے جو اس کے پلیٹ میں آجائے
گا وہ بڑا دکھائی دے گا۔ حقیقت میں بڑائی انہیں بزرگوں کی ہے۔ ہماری کوئی بڑائی نہیں۔ مخلص بزرگوں کی ایک جماعت
ہے وہ بہت سچے لوگ تھے ان کی سچائی آج تک چل رہی ہے۔ اخلاص سے جو روح انہوں نے پھونکی وہ اسی شان سے
قائم ہے، اسی کی چمک اور روشنی میں جو آگیا بن گیا۔ اس کے نتیجے میں اہل علم بنے اہل فضل بنے، اہل کمال بنے۔
تو ہمارا اس سے زیادہ تعارف کچھ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے اور وہاں کے بزرگوں سے ایک تعلق ہے۔
آپ نے جو کچھ بھی قدر دانی اور قدر افزائی فرمائی درحقیقت ان ہی کی قدر فرمائی ہے۔ میں صرف ایک واسطہ ہوں
میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدر دانی انہیں بزرگوں کی طرف جارہی ہے۔ آپ نے جو کچھ اچھے اور اونچے کلمات فرمائے۔
درحقیقت میں واسطہ ضرور ہوں میرے ذریعہ سے یہ کلمات خیر وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں اخیر میں پھر مکرر
شکریہ ادا کرتا ہوں آپ حضرات کا کہ یاد فرمایا اور کچھ خیالات ظاہر کرنے کا بھی موقع عنایت فرمایا۔
وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مرکز سعادت

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كَافَّةٍ لِلنَّاسِ بِشِيرَا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللَّهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ!..... عَنْ أَنَسٍ بْنِ
مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُوَ مَن لَا يَشْبَعَانِ مِنْهُوَ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ
مِنْهُ وَمِنْهُوَ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا. (صَدَقَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

فاتحہ الکلام..... بزرگان محترم، برادران عزیز! آپ حضرات کی دعوت پر میں حاضر تو ہو گیا لیکن سوچتا ہوں کہ
آپ کے سامنے کیا کہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ کہوں گا وہ آپ جانتے ہیں۔ ایسی کوئی نئی بات سمجھ میں نہیں آتی جو
آپ کے علم میں نہ ہو اور میں اسے علم میں لاؤں۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں علم کی دولت سب سے بڑی دولت
ہے اور علم کی روشنی سب سے بڑی روشنی ہے۔ آپ کو سورج کی روشنی سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ پورے عالم
میں پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس کے ذریعہ صرف رنگ اور صورت کا علم ہوتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی اسلام اور کفر کا
فرق بتلاتی ہے، سنت اور بدعت میں امتیاز سکھاتی ہے۔ حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا
طفیل ہے۔ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان حضرات کا لاکھ لاکھ کرم و احسان ہے کہ انہوں نے علم کی روشنی پیش کی
جو ہمارے لئے اچھائی، برائی، بھلے اور برے کے درمیان تمیز کا ذریعہ بنی۔

تحصیل حاصل..... آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ علم، تعلیم سے آتا ہے اور آپ سب ہی حضرات تعلیم میں مشغول
ہیں۔ اسباق میں حاضری ہے، مطالعہ ہے، آپس میں مذاکرہ ہے۔ غرضیکہ رات دن آپ علم ہی کے حصول میں
لگے رہتے ہیں۔ اس لئے اسکی نصیحت کرنا تحصیل حاصل ہے اور اگر عمل کے سلسلے میں کچھ کہا جائے تو آپ کہیں گے
کہ سب سے بڑا عمل خود علم کا حصول ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کے درمیان جب یہ بحث ہوئی کہ کثرت نوافل افضل ہے یا زیادت علم۔

① حدیث کی تخریج گزربجلی ہے۔

تو کثرت سے فقہاء زیادت علم ہی کی افضلیت کے قائل ہوئے۔ آپ حضرات تحصیل علم میں لگے ہوئے ہیں، جو سب سے بڑا عمل ہے۔ اس کے علاوہ فرائض وغیرہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ نماز کے لئے آپ جوق در جوق آتے ہیں، ہر وقت مسجد بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دارالعلوم کی مسجد تو آپ سے پر رہتی ہی ہے۔ شہر کی مسجدیں بھی آپ لوگوں سے آباد ہیں، لہذا اگر عمل کے سلسلے میں کچھ عرض کروں تو بھی آپ کہیں گے کہ عمل تو ہم کر رہے ہیں۔

جہاں تک آپ لوگوں کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے وہ بھی درست ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہم پچھلوں کے اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن اگر ہم دور حاضر کے دوسرے طبقوں کے اخلاق و کریکٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف یہ کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، بلکہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ حضرات ہی کا وہ طبقہ ہے جو اس اخلاقی قحط کے دور میں بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ لہذا اس سلسلے میں کچھ کہنا فائدے سے خالی ہی ہوگا اور اصولی و نوعی طور پر یہی کچھ دائرے تھے کہ جن کے متعلق کچھ کہا جاسکتا تھا اور بفضلہ تعالیٰ یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چیز آپ کے سامنے رکھی جائے جو مفید ہو۔

محرم القسمت کا حال..... اس وقت مجھے مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اور مقولہ یاد آیا وہ یہ کہ آپ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہو کر واپس ہوئے تو کافی عرصے تک کوئی خط و کتابت نہیں کی۔ آخر کار حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا کے پاس ایک خط لکھا، کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایک مدت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہو سکی، اپنے حالات لکھتے تاکہ اندازہ ہو سکے۔ مولانا نے جواب دیا اور ابتداء اس طرح کی: ”حضرت مجھ محرم القسمت کا تو کوئی حال ہی نہیں اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا“۔ پھر اخیر میں لکھا کہ البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک یہ کہ امور شرعیہ امور طبعیہ بن گئے ہیں، گویا نماز، روزہ اور دوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔ دوسری بات یہ کہ مدح و ذم یکساں نظر آتے ہیں کوئی ہزار تعریف کرے، ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے اس کی نہ کچھ پرواہ ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا۔ تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کئی اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست دکھائی دیتی ہے۔

مرکز سعادت..... ۱۔ امور شرعیہ امور طبعیہ بن جائیں یہ قوت عملیہ سے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی تعریف و برائی کا یکساں معلوم ہونا قوت اخلاقی کا تقاضا ہے۔ قوت عملی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہو جائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے۔ قوت اخلاقی کی انتہا یہ ہے کہ اس درجہ غنا پیدا ہو جائے کہ

لوگوں کی تعریف اور برائی یکساں معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح قوت علمی کی انتہا یہ ہے کہ قرآن و سنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل درست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعت اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو۔ سعادت انسانی کے لئے انہیں تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ (۱) علمی قوت (۲) عملی قوت (۳) اخلاقی قوت اور آپ ایسی جگہ میں ہیں جو علمی، عملی، اخلاقی قوتوں کا مرکز ہے۔ جہاں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جو ہر اعتبار سے کامل و مکمل تھیں۔ میں اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسی باکمال شخصیتوں کی شکلیں دیکھی ہیں۔ بعض سے کچھ استفادہ کا بھی موقع ملا۔ استاذ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اللہ ”اکبر“ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ اتباع سنت کا یہ حال کہ ان کے عمل کو دیکھ کر مسائل نکالے جاتے تھے۔ ایسے ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، ان تمام حضرات کی زیارت کے شرف کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ استفادہ کا بھی موقع ملا۔ استاذ محترم حضرت تھانویؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور حسب توفیق استفادہ کا بھی شرف نصیب ہوا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کا ایک ایک شخص پوری پوری قوم کے برابر ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ملک کے گوشے گوشے میں مواظف کئے اور ایک ہزار کے قریب تصانیف کیں۔ بہت سے علماء مل کر بیٹھیں تو بھی اتنا کام مشکل سے ہو سکے گا۔ حق تعالیٰ نے آپ سے ایسے کام لئے جس کا ایک قوم اور ایک جماعت سے ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جائے بزرگان بجائے بزرگان!..... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان بزرگوں کے اثرات اس جگہ اور اس ادارہ میں نہ ہوں ایک پھول کپڑے کو لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دیر تک کپڑے سے خوشبو آتی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شجرۃ الرضوان کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو صحابہؓ سے بیعت لی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تھوڑے سے قیام کی وجہ سے اس جگہ کو آپ سے ایک نسبت حاصل ہوئی تھی اور وہ جگہ مقدس و متبرک ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ ان برکات کو محسوس کرتے تھے، اس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے دعائیں مانگتے تھے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ابھی تو خیر القرون ہے اور اس درخت کے ساتھ امت کی عقیدت کا یہ حال ہے، بہت ممکن ہے کہ کل کو ایسی نسلیں آئیں جو عقیدت میں غلو سے کام لیں اور اس کی وجہ سے شرک و بدعت کا دروازہ کھل جائے اس درخت کو کٹوا دیا۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بتانا تھا کہ جائے بزرگان بجائے بزرگان، والا مقولہ بالکل صحیح ہے۔ پس یہ ادارہ جہاں اکابر اولیاء اور اپنے وقت کے مسلم قطب اور ولی رہ چکے ہیں ان کے پاکیزہ اثرات سے اس کے در و دیوار کب خالی رہ سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آپ ایک ایسے ادارے میں ہیں جسے طرح طرح کی نسبتیں اور تقدس حاصل ہے جو برکات یہاں ملتی ہے وہ دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ دارالعلوم کی ایک ایک جگہ کے بارے میں اکابرین کے مکاشفات ہیں۔ نودرہ کی عمارت کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ عرش سے ایک مسلسل لڑی ہے جو نودرہ کی درسگاہوں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا یہاں بیٹھ کر کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔

دوسری جگہ نہیں آتیں۔ نودرہ کے سامنے کی جگہ جہاں جنازہ رکھا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ جس جنازے کی نمازیہاں ہو جائے وہ مغفور ہوتا ہے۔

الہامی درس گاہ..... بھائی! یہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا ہے۔ اس کی تعمیر بھی الہام سے ہوئی اور طلباء کا داخلہ بھی الہام سے ہی ہوتا ہے، بلکہ بعض واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے اساتذہ کا تقرر اور تعین بھی خاص زاویوں میں ہوتا ہے اور یہاں کی خدمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس مدرسہ کا آغاز اور مدرسوں کی طرح کی رسمی مشورے سے نہیں ہوا بلکہ وقت کے اکابر و مشائخ کا ایک اجماع سا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس کے وقت میں کسی کو کشف ہوا کہ یہاں پر ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔ کسی نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر ایک مدرسہ کا قیام ہونا چاہئے۔ کسی پر القا ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام کا تحفظ دینی اداروں سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے وقت بنیاد کھودنے کے لئے کچھ نشانات لگادیئے گئے۔ جتنا اب ہے اس سے آدھے پر نشان لگایا گیا تھا۔

الہامی اہتمام..... دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تبارک الدنیا اور نہایت ہی قوی النسبت بزرگ تھے۔ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ کتاب پڑھ سکتے تھے۔ مولانا ناتو توئی نے انہیں بلایا اور اہتمام پیش کیا، آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نہ تو لکھنا جانتا ہوں، نہ پڑھنا، مجھے مہتمم بنا کر کیا کیجئے گا۔ حضرت نے فرمایا نہیں۔ منجانب اللہ یہی مقدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اہتمام قبول کریں۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمایا۔

الہامی طلباء..... حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطہ میں جو کنواں ہے اس کی منڈیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ دودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چلو ہی سے پی لیتا ہے۔ حضرت جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔ کچھ دیر مراقبہ رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دودھ صورت مثالی علم کی ہے۔ اور قاسم العلوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ علم تقسیم فرما رہے ہیں اور طلباء فرق مراتب کے ساتھ علم حاصل کر رہے ہیں۔ اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ احاطہ مولسری میں کھڑے تھے ایک طالب علم شور بہ کا پیالہ آپ کے سامنے لے کر آیا اور اسے پھینک کر کہنے لگا۔ ”نہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ ہے اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دیدیں یہ ہے آپ کا اہتمام؟“

جب وہ طالب علم چلا گیا تو آپ نے پوچھا کیا یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں حضرت! یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے اور مطبخ سے اس کا کھانا ہے اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں! یہ مدرسہ کا طالب علم معلوم نہیں ہوتا۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسی نام کا ایک دوسرا طالب علم

ہے۔ اصل میں کھانا اس کا تھا۔ لیکن نام میں اشتراک کی بناء پر غلطی سے نکت اسے مل گیا تھا۔ طلبہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! بات تو وہ ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپ نے دودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو میں ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا۔ اس طالب علم پر میں نے تین مرتبہ نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں شریک نہیں تھا۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مدرسہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا اور طلباء کا انتخاب بھی الہام سے ہوتا ہے۔

الہامی سنگ بنیاد..... اور اس کا سنگ بنیاد بھی الہام ہی سے رکھا گیا۔ بنیاد کے لئے لوگوں نے جو نشان لگایا تھا اس پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ عصائے مبارک ہاتھ میں ہے اور فرماتے ہیں کہ ”یہ احاطہ تک رہے گا کافی نہیں ہوگا“۔

چنانچہ آپ نے مولانا نصیر احمد صاحب کی درسگاہ کے پاس نشان لگایا۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لکیریں بالکل اسی طرح موجود ہیں۔ پھر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بنیاد اسی پر کھودی جائے گی، اب مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حقائق و کیفیات کا فرق..... آپ حضرات ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جسے سینکڑوں بزرگوں کی نسبتیں حاصل ہیں۔ مجموعی اور غیر شعوری طور پر وہ ساری نسبتیں کام کر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ جو علم اور جو خیر و برکت یہاں ہے دوسری جگہ نظر نہیں آتی، کتابیں وہی ہوتی ہیں، الفاظ وہی ہوتے ہیں، مگر حقائق و کیفیات میں فرق ہو جاتا ہے۔

میں نے مشکوٰۃ شریف اپنے والد مرحوم مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھی ہے۔ والد صاحبؒ جس وقت برزخ، موت، قیامت، حشر و نشر سے متعلق احادیث پر پہنچے اور تقریر شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدان قیامت سامنے ہے، یہ قبر ہے، حساب، کتاب ہے، عذاب و ثواب ہے۔ اس انداز اور ایسی کیفیت سے تعلیم ہوتی کہ ہم محسوس کرتے کہ یہی حالات ہمارے اوپر طاری ہو رہے ہیں۔

نسبتوں کا چمن..... دارالعلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب اہل نسبت بزرگ تھے۔ حاجی عبد اللہ صاحبؒ دربان تھے۔ نوشت و خواند کچھ نہ تھی، لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے۔ صبح صادق پر جو دارالعلوم میں گھنٹہ بجتا ہے، اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا، دوسری پر الحمد للہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔ حاصل یہ کہ یہ ایک مثالی جگہ ہے۔ اسے نہ جانے

کیسی کیسی نسبتیں حاصل ہیں۔ یہاں کم سے کم درجے کا طالب علم آتا ہے، اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے، اس جگہ پر رہ کر محروم رہنے کا کوئی سوال نہیں۔ تو بھائی اگر نسبتوں کے بارے میں کچھ بات کی جائے تو بفضلہ تعالیٰ وہ بھی موجود ہے۔ زیادۃ فی العلم..... مگر ہاں اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ ایک تو اصل علم اور اس العلم ہے، جسے آپ حاصل کر رہے ہیں اور جو آٹھ دس سال میں حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ اضافہ کی برابر کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ جس طرح اصل علم مطلوب ہے ویسے ہی زیادۃ فی العلم بھی مطلوب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے ﴿رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ ① حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ علوم دیئے گئے تھے جو ساری کائنات میں سے کسی کو نہیں دیئے گئے، چونکہ یہ انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات غیر محدود ہیں اس لئے آپ جتنا بھی علم حاصل کرتے جائیں گے، جہالت دور ہوتی چلی جائے گی اور آگے میدان مزید نظر آئے گا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ مرض وفات میں ہیں۔ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے۔ مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپ فوراً مطالعہ میں مشغول ہو جاتے لوگ کہتے کہ حضرت! ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ تو فرماتے بھائی! کیا کروں یہ مرض مطالعہ کا بالکل لا علاج مرض لگا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ چند ساعت ہی ترک مطالعہ کرتے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ آپ کی دلالت اولیٰ مطالعہ پر ہی تھی، حضرت کو زیادۃ فی العلم کی ایک دھن لگی ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حفظ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی۔ خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گزر جاتی ہے پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں مشہور و معروف کتب تو درکنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ بقیہ صفحات و سطور اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گذشتہ رات ہی حضرت نے ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اس قدر قوت حفظ کے ہوتے ہوئے حضرت نے تیرہ بار فتح الباری کا ازاول تا آخر مطالعہ کیا تھا۔ بتائیے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی مستحضر تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا۔ آپ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا۔ افسوس کہ آپ کی بتائی ہوئی باتیں اور تقریر محفوظ نہ رکھ سکا۔

علم کی دھن..... تو بھائی! علم آدمی کو محنت سے ملتا ہے، دھن سے ملتا ہے۔ یہ دھن پیدا ہو جانی چاہئے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس کو سودور سودر کے بڑھاتے ہی چلے جانا ہے۔ جب دھن پیدا ہو جائیگی تو آپ زیادہ سے زیادہ کتب بینی کریں گے اور جب آپ کتب بینی کے عادی ہو جائیں گے، تو پھر آپ میں تفقہ پیدا ہوگا۔ اور جب تفقہ پیدا ہو جائے گا، تو آپ کسی شے کے محض حکم ہی پر قناعت نہ کریں گے بلکہ اس کی حکمت کو بھی معلوم کرنے کی

کوشش کریں گے۔ اور جب حکمت معلوم کر لیں گے تو اس سے بڑھ کر علت معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جب علت معلوم ہو جائے گی تو آپ اسی پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس علت کا رابطہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کس صفت سے ہے۔

علم و عمل کی سند..... ایک بات آپ حضرات سے کہہ دوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے مجاہدہ کرتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا، جب تک سلسلہ عمل کو بھی متصل نہ کیا جائے۔ ایک عالم میں اگر کبر ہو، حسد ہو، بغض ہو، کینہ ہو، جب جاہ ہو، تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا۔ اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے۔ خود دار العلوم پر نصف صدی ایسی گزری تا وقتیکہ شیخ کامل سے اجازت نہ ہوتی دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا گویا علم و عمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔

علم و خشیت..... میں نے آپ کے سامنے جو حدیث پڑھی تھی۔ یعنی نہ تو کوئی طالب علم کبھی سیر ہوتا ہے اور نہ طالب دنیا سیر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالب مال کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے۔ اور نہ طالب علم کو بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس سو روپیہ ہے تو وہ دو سو کی خواہش میں لگا ہوتا ہے۔ اگر دو سو ہیں تو چار سو کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہو گئے تو دو سو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ** ① جس قدر علم بڑھتا جائے گا خشیت بڑھتی جائے گی۔ اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے۔ اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے۔

راہنمائی کی تیاری کا زمانہ..... اب تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے ابھی آپ دوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں۔ مگر یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگران بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، آپ کے سامنے ملک و قوم کے حالات ہوں گے اور آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں کون سی بیماریاں ہیں؟ کیا کوتاہیاں ہیں؟ ان کے اسباب کیا ہیں؟ اور ازالہ کی تدبیر کیا ہوں گی؟

ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپ کے سامنے شرک و بدعت کا میدان ہوگا اور عیسائیت و یہودیت سے بھی مقابلہ رہے گا۔ اگر آپ نے ان کاموں کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت و مستقّت کر کے میدان کو ہموار نہ کر لیا، تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

میری خواہش ہے کہ آپ یہاں سے صرف عالم اور صالح بن کر نہ نکلیں بلکہ معلم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش

کریں۔ اس لئے کہ قوم منتظر ہے کہ ہمارے نو بہال دارالعلوم میں پڑھنے گئے ہیں، وہ آئیں گے ہماری اصلاح کریں گے۔ ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوں گے۔ لہذا پہلے ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں۔ اس کا حل نکالیں۔ اپنے اساتذہ سے سوالات کریں پھر نہ آپ کو ایسا وقت ملے گا نہ ایسے اساتذہ ملیں گے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم یہ سب کرتے رہتے ہیں تو خیر کوئی حرج نہیں، اس لئے میں نے یہ چند باتیں آپ لوگوں سے عرض کر دیں۔

خلوص و محبت کا شکریہ..... آپ نے جس محبت و خلوص سے یاد فرمایا میں اس کا شکر گزار ہوں اور صرف شکر گزار ہی نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک وقتی اور رسمی چیز ہو گئی ہے۔ میں آپ حضرات کے لئے خلوص قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔ میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔ بس ایک نام ایک نسبت لگ گئی ہے، ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل میں ہم اور آپ آج یہاں موجود ہیں۔ غالب نے کہا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے۔ ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں۔ تو انہیں بزرگوں کے طفیل میں، سپانے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اس میں ایران توران کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ آپ لوگوں کی جانب سے جو سپانہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

امتیاز دارالعلوم

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَّاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا.

اُمَّا بَعْدُ اَفْأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ
وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ. ①

ایک بڑی کمی..... بزرگان محترم اور برادران عزیز طلبہ! پروگرام میں عربی تقریروں اور نظموں کے بعد حضرت مولانا
سید حسین احمد مدنی کا نمبر تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ورنہ ارشادات گرامی سے مستفیض فرماتے۔
اگر حضرت موجود ہوتے تو ہم سب کے لئے کارآمد اور مفید ہوتا۔ میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ
جلسہ انعام کی تاریخوں میں شرکت نہ فرما سکیں تو جلسہ کو موخر کیا جائے۔ مگر حضرت نے پسند نہ فرمایا اور وعدہ کیا کہ حتی
الامکان شرکت کی سعی فرمائیں گے۔ اس وقت ہمیں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے جلسہ کی غرض و غایت تقسیم انعام اور
طلباء کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور جس شعبہ کے طلبہ کو یہ انعام دیا جاتا ہے اس شعبہ کے صدر حضرت مولانا ہیں۔

مہمانوں کا شکریہ..... جلسہ کے واجبات کے متعلق چند ضروری باتیں بھی مجھے عرض کرنا ہیں۔ دارالعلوم کی جانب
سے باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کا شکر گزار ہوں کہ اس سخت اور تکلیف دہ گرمی کے موسم میں انہوں نے
شرکت کے لئے زحمت گوارہ فرمائی۔ بالخصوص دہلی سے آنے والے حضرات کاروباری لوگ ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو
چھوڑ کر ہماری طلب پر تشریف لائے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات ہمارے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ ان حضرات
کا یہاں آنا کسی مالی غرض کی بناء پر نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کا سبب وہ محبت ہے جو انہیں دارالعلوم سے ہے۔

اس سال جلسہ کے انعقاد میں کچھ موانع تھے اور خیال تھا کہ جلسہ نہ ہو سکے گا مگر ابھی چند دن ہوئے کہ یہ ارادہ
ہوا۔ اس لئے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے دعوت مختصر دی جائے۔ مجھے آپ

حضرات سے دارالعلوم کا تعارف کرانا نہیں ہے اور نہ آج دارالعلوم کی تعارف کا محتاج ہے۔

تاسیس دارالعلوم کا امتیاز..... مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہے۔ جو ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ چند اہل الزائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ سے سوچ کر ایک چیز طے کرتے ہیں۔ مگر دارالعلوم کی تاسیس اس سے مختلف ہے۔ دارالعلوم الہام غیب اور اہل اللہ کے قلوب پر انکشاف و ادرات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تو اتر کے ساتھ سنا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر اہل اللہ اور بزرگ تھے ان سب کے قلوب پر یہ منکشف ہوا۔ غرض یہ کہ اس طور پر ان حضرات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انکشاف اور منجانب اللہ الہام کا اظہار فرمایا۔ اس طرح پر یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ دارالعلوم کی بنا الہامی طور پر ہے رسی اور حی طور پر نہیں ہے۔ دارالعلوم کے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب تھے جو اگر چہ امی محض تھے مگر نہایت باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے۔ دارالعلوم کے لئے جب بنیادیں کھودی گئیں تو وہ احاطہ جو اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا بہت مختصر تھا۔ رات کو حضرت مولانا خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ بلا کسی مشورہ کے ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کی بنیاد الہامات پر قائم ہو اس کی کیفیت یقیناً دوسرے اداروں سے مختلف ہوگی۔

طلباء کرام کا امتیاز..... یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر جاتے ہیں ان کا تعین بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو طلباء یہاں پڑھتے ہیں وہ بھی منجانب اللہ منتخب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم مطبخ سے کھانا لیکر آیا اور شور بہ کا پیالہ مولانا کے سامنے اوندھا کر کے کہنے لگا کہ ”یہ شور با کھانے کے لئے ہے یا وضو کے لئے؟“ اس طرح تند و تیز باتیں کر کے چلا گیا۔ مولانا نے دریافت فرمایا یہ کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں طالب علم ہے۔ مولانا نے وثوق کے لہجے میں فرمایا کہ یہ طالب علم نہیں ہے اور نہ یہ طالب علم ہو سکتا ہے چنانچہ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے فرضی طالب علم ظاہر کر کے دھوکہ سے کسی طرح مطبخ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوا لیا ہے اور فی الحقیقت طالب علم نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ نے وثوق کے ساتھ کس طرح اس کے طالب علم ہونے سے انکار کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہاں جس قدر طالب علم پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سب کی شکلیں مجھے دکھادی گئی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے اس شخص کو بغور دیکھا تو دکھلائی ہوئی شکلوں میں اس صورت کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرگز طالب علم نہیں ہے۔

حصول علم کا امتیاز..... احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے اس کے متعلق مولانا نے خواب میں دیکھا کہ کنواں

دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض کے پاس چھوٹے برتن میں اور بعض کے پاس بڑے برتن ہیں۔ ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھرا کر لے جاتا ہے۔ مولانا نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعبیر یہ فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا ظرف علم مراد ہے۔ جس شخص کا جس قدر ظرف ہے اس مقدار میں علم اس کے نصیب وجہ میں آئے گا۔

دارالعلوم کے انتظام و انصرام کا امتیاز..... اس ادارہ کے اصول و فروع بھی الہامی طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے ۲۵-۲۶ سال کے زمانہ اہتمام کا تجربہ ہے۔ اس دوران یہ چیز نہایت شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارہ کو چلا رہی ہے اور اس کا دار و مدار ظاہری جد و جہد سے بالاتر کوئی باطنی قوت ہے جو اس کو کھائے ہوئے ہے، ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا برکات فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے ورنہ آج کے دور میں علوم دینیہ کا ذوق رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانہ میں ملا میہ فرقہ تھا۔ اسی طرح آج جس کو ملامت سننی ہو وہ مولوی ہو جائے۔ عدم اعتناء دین کے اس دور میں جب کہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے۔ اس دارالعلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال نسبتاً زیادہ آیا اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور پر فتن میں دارالعلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد و اعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

غالباً سن ۴۹ ہجری کا واقعہ ہے اور یہ پہلا سال ہے میرے اہتمام کا، مولوی گل محمد خان صاحب جو خزانہ کے تحویلدار اور تقسیم تنخواہ کے ذمہ دار تھے۔ رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی نہیں ہے اور کل پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کی صورت میں تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا۔ ان کو رخصت کر کے حضرات مدرسین کو میں نے کوشی پر بلا کر دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم میں کیوں پڑے ہوئے ہیں اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے یا تنخواہ حاصل کرنا۔

مدرسین کرام کا امتیاز..... سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس مقدس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے۔ حاشا وکلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ فاقہ کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ مطمئن رہیں۔ دارالعلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہیں بھی ملتی رہیں گی خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے۔ دعا کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے میں اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔ سب نے مل کر خشوع خضوع کے ساتھ دعا کی جس کا اگلے دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کا وقت نہ آیا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دو ہزار روپے کلکتہ کے ایک تاجر کی طرف سے تھے اور پانچ سو میرٹھ کے مشہور رئیس خان صاحب شیخ رشید خان صاحب آرمی کنٹرکٹر کے جو اتفاقاً دہرہ دون جاتے ہوئے دیوبند تشریف لائے اور پانچ سو کا عطیہ دے گئے۔ غرض یہ کہ

دارالعلوم کی بناء بھی غیبی امور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی منجانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز دارالعلوم آگے بڑھ رہا ہے۔ عرصہ سے یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جلسہ انعام عظیم الشان پیمانہ پر کیا جائے اور ملک کے تمام ہی خواہوں کو دعوت دی جائے اور قدیم طلبہ کو بھی بلایا جائے۔ مگر ملک کے ہنگامی موانع نے ہمیں باز رہنے پر مجبور رکھا۔ بہت ممکن ہے کہ سال آئندہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

روح دارالعلوم..... تعلیمی اداروں کی اصل قابل اعتناء چیز روح ہے عمارات نہیں ہیں۔ یہاں کی اصل روح تعلیم ہے۔ اگر دارالعلوم تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہے تو اس نے اپنے مقصد کو پورا کر دیا اور اس روپیہ کو ٹھکانے لگا دیا جو قوم نے اس کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ امتحانات کے نتائج سے ہو سکے گا جو ابھی آپ کے سامنے بیان کئے جانے والے ہیں۔ اس سال دارالعلوم میں تین مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے۔ ایک شعبہ صناعات کا ہے جو طلبہ کو صناعات سکھائے گا۔ عام طور پر علماء کا نفقہ قوم پر ہے۔ جو لوگ فی سبیل اللہ کار خیر میں محبوس ہیں قوم کا فرض ہے کہ وہ ان کی امداد کرے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کو ان کی معاش سے مطمئن کر دیا جائے۔ اس شعبہ میں ۷۱ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا جز فن کتابت ہے۔ اس کی بنیاد سن ۶۴ ہجری میں ڈال دی گئی تھی۔ اس شعبہ میں اس وقت ۴ آدمی کتابت کا فن سکھا رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ ورزش کا ہے روحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا کے لئے شعبہ ورزش کھولا گیا اس شعبہ میں دو استاد کام کر رہے ہیں۔ آج صبح اس شعبہ کے معائنہ میں دہلی کے حاجی محمد یوسف صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے تین روپے بطور انعام کے طلبہ کو دیئے ہیں۔

تیسرا شعبہ جمعیت الطلبہ کا ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت قدیم ہے مگر اس سال اس کو باضابطہ بنادیا گیا ہے۔ سال آئندہ اس کی کارگزاری تفصیل کے ساتھ معائنہ کرائی جاسکے گی۔ اس کے چار شعبے ہیں۔ 1 عربی تحریر 2 اردو تحریر 3 عربی تقریر 4 اردو تقریر

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے اب انعام تقسیم کیا جائے گا۔ تاکہ کامیاب طلبہ میں شوق اور ترغیب پیدا ہو اور جو لوگ ناکام رہے وہ شرمندہ اور خجل ہو کر آئندہ محنت سے تعلیمی امور میں منہمک ہوں۔ اگرچہ یہ سلسلہ نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر اصل میں یہی تعلیم کے نتائج کا نچوڑ اور معیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری توجہ سے اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

آزادی ہند کا خاموش راہنما

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
اللَّهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشَيْرٍ وَلَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ !

آزادی کی خوشی کی تکمیل آج ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک
باشندہ خوشیاں منا رہا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی، جبکہ
آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی۔ اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم
برس نہیں گئی، بلکہ کتنے ہی صبر آزمائوں، مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دارورسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت
ناک کٹھروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گویا آج کی تاریخ میں
آزادی کا پارسل سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک غلیچیں اس کی
راہ میں حائل ہوئیں جن کا اپنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ
ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت
شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اولین علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی ہی ممکن ہو سکتی
ہے۔ اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خوار یوں کی اساس
پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دارورسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی۔ اس لئے
ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روشوں کا تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

آزادی کا ہیرو ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے موقع پر سرفروشی کے جوہر
دکھائے اور ایثار قربانی سے گواہی کو ختم کر لیا۔ مگر آنے والی نسلوں کے لئے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضا نہیں
ہموار کر گئے، ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن
بھر پور ہے۔ میں اس موقع پر اس نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس
نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالار افواج

کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آئیں بلکہ جنگ کی فتح و شکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتیں آزادی ضمیر، آزادی زبان و قلم اور آزادی ملک و ملت کے جذبات کی اساس راہ پر پڑ گئیں اور جو فتح شاملی کا میدان کارزارتیج و سنال سے نہیں پاسکا تھا، وہ ان اصولوں کے ہتھیاروں سے قلم و زبان کے میدان میں نظر آگئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہو گئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے۔ جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ کے دل و دماغ کے علما و عملا امداد الہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامہ رست و نیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم کی رومانیوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی..... گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔ فرق تیج و سنال اور قلم و زبان کا تھا۔ وہاں تشدد کے ساتھ آزادی ملک و ملت اور آزادی مذہب و دین کا نصب العین سامنے تھا۔ اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصب العین کے لئے افراد استعمال کئے جا رہے تھے۔ اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے۔ وہاں نام میدان جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسہ، مکتب امن و صلح کا تھا۔ وہاں قلب و دماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کر رہے تھے اور یہاں براہ راست دل و دماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔ غرض حضرت والا نے میدان شاملی کے نتائج پیش نظر رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز میں اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا تھا وہ اب ہو جائے۔

سیاسی محکومیت کے ازالہ کی واحد تدبیر..... حضرت والا نے دارالعلوم دیوبند بلکہ ۵۷ء کے بعد تمام دینی مدارس کے لئے آٹھ اصول کا ایک دستور اساسی مرتب فرمایا۔ جو دارالعلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے۔ جو ایک طرف اگر علاقہ کے خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطہ عوام سے تھی، ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ حضرت والا ان اصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراء عصر سے بے نیاز کر کے حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے، کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر جیتی ہے۔ اور وہ جینا زندگی نہیں، موت بصورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک و سیاست کے ساتھ علم و اخلاق اور ذہن و فکر میں بھی حق خود ارادیت باقی نہ رہا، تو اس قوم کی بنیاد ہی مہندم ہو جائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار

بن کر نہ ابھر سکے گی۔ اس لئے حضرت والا کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعہً یہی تھی کہ قوم کو علم و دین کے راستے سے اجتماعیت کی لاسٹوں پر ڈال دیا جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو شخصیتی لائن کے بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے تاکہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظام تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والا دہلی کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے۔ حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اگر یہ صورت حال خود روطریق پر ہوئی تو اسی عوامیت میں لادینی کے جراثیم کا فرما ہو جائیں گے جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی۔ اور اس کا قونی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔ اس لئے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی۔ اور نظام تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے، تاکہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خود اختیاری قوت پیدا ہو جائے کہ **الْمُلْكُ وَالِدِّينُ قَوَّامَانِ** (ملک اور دین دو جزواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شامی کے رُخ کی تبدیلی..... حضرت والا کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شامی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت و شکست کا منظر آپ کے سامنے ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت متسلطہ شکست خوردہ قوم کے حقوق آزادی کو پچل رہی ہے۔ اور اس کے بنیادی تشخص اور حق خود ارادیت کو ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی جن کا سلسلہ ۱۹۷۵ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

حضرت والا نے ۱۹۷۵ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے مقابلے کا وقت نہیں ہے۔ تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں۔ اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدان مقابلہ میں آجاتے ہیں، گویا شامی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔ اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی، جبکہ اسے تاثر بیتی اور لائیسٹی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لئے اس جدید اقدام میں تعلیم و تربیت کے راستے سے قدیم تاثر بیتی اور لائیسٹی کے اثرات زائل کرنے تھے احساس کتری کو دلوں سے دور رکھنا تھا تاکہ حوصلوں میں فرق نہ آجائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ..... دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت پاکیزگی نفس اور جذبات حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تاکہ آزادی ضمیری روح اس میں مستحکم ہو جائے۔ تیسرا قدم علم و عمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریت نفس اور آزادی ملک و ملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر و بصیرت کے ساتھ اخلاص و ایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت واضح فرمائے، جبکہ نئے تسلط و اقتدار کے زیر اثر سربراہ اور دگان ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر طاقت متسلطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے ”حریت کاری“ کے بجائے ”وفا داری“ کا شمار خود سروں کے سروں میں بھر چکا تھا۔ اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ حضرت نے اس وقت ان آٹھ اصولوں کے راستے سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کا پرواز ڈالا۔ اور ملک کے اونچے طبقہ سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستے سے کر لیا۔ ان اصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کوئلے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم اور اخلاق اور قال اللہ و قال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟ اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی رجحانات اور ان کے علمی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہنمائی کے آٹھ اصول..... سوان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لئے پہلے ان اصول ہشت گانہ کا متن پڑھئے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھئے! اصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے۔ حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے: وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس عنوان کے نیچے حسب ذیل آٹھ اصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

۱..... اصل اول یہ ہے کہ تمام مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲..... ابقاء طعام طلبہ بل کر افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ سامعی تر رہیں۔

۳..... مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی تچ نہ کی جائے۔ خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا پر تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اسکی پس پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کی سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔ یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش

نہ ہو کہ مجھ کو کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

4..... یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشر ب ہوں۔ اور مثل علماء روزگار خود بین اور

دوسروں کے درپے تو ہیں نہ ہوں۔ خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

5..... خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو

جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

6..... اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر

کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے

کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ساتھ سے جاتا رہے گا اور آمد انہی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں

باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

7..... سرکار کی شرکت اور اُمرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

8..... تا مقدور ایسے لوگوں کا چند زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔

بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ..... ان اصول ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے: 1 سب سے پہلے اس

ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تا کہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی

کا کہلانے کی بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے۔ پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی۔

جس کا سلسلہ واسطہ بلا واسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تا کہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستثنی نہ ہو اور

عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیر چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی، جس کی

کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تا کہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور

زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلس شوریٰ کو (جو اس نظم و نسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہل چندہ

اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام نہ صرف چندہ بلکہ بواسطہ مجلس شوریٰ اس

کے مالی مصارف کے نگران اور مجوز بھی ہیں اور اوّل سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل دخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے مختلف

ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطہ عوام کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس رابطہ

کی صورت آخر اس کے سوا کیا باقی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے۔ اور انہی کے

حصہ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر کنیت کی فیس رکھ

دی کانگریس کمیٹی رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۴۱۰۰ ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطہ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کی بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔ کیا اسی طریق کار کو بعد کے مبصرین نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے نہیں اپنایا، فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی۔ اور اس ادارہ کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادی وطن کے ساتھ آزادی مذہب و ملت کی روح بھی قائم کر دی۔

بہر حال اس اولین اصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا تھا۔ تاکہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ جنب ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ہر اجتماعی کام کا مدار اس رائے عامہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اصول مذکور کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر درحقیقت آزادی ملک و ملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کر لی گئی۔ اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری امداد کا بدلہ ۲ اسی کے ساتھ دوسرے اصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش و تکثیر ضروری قرار دی تاکہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطے سے قوم اور ملک کی اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اصول اگر رابطہ عوام کا رکھنا مقرر کیا جو پچاس برس بعد کے انقلاب اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا۔ تو دوسرے اصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقع دیا۔ تاکہ اس دو طرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف اس عوامی چندہ کی تحصیل و وصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھیک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لئے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی۔ اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دارالعلوم ہی تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن حضرت والا اپنے نو ر فرست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اور اس سرکاری امداد کا بدلہ مجبوری چندہ کے دوسرا فاصلہ نہیں اس لئے ان مطاعن کی پرواہ کئے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرغم ادارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطہ عوام کی ضرورت و اہمیت سمجھا دی۔ اور بھیک مانگنے اور بھیک منگے بنانے کا سسٹم بالآخر ہر قوم پرورد کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لئے

کہا جاسکتا ہے کہ اس بارہ میں دارالعلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیف خواص 3 رابطہ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقہ خواص بھی ناگزیر تھا۔ تو حضرت والا نے تیسرا اصول تالیف خواص کا رکھا۔ جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیتی یا انفرادی رکھنے کی بجائے شوریٰ قرار دیا۔ تاکہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں، کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقا پذیر رہتا ہے۔ ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے رد و قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شوریٰ ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لئے ہوئے ہوں۔ اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں۔ بات کی سچ اور سچ پروری کی خونہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آؤٹ کا جذبہ ابھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں، کہ اپنی رائے کے اظہار میں بھی حق نظر آئے تو گردن جھکا دیں۔

پس آزادی ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں۔ اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آ جانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس آزادی ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہوگی تو آزاد نظم و نسق بھی ہوگا تو آزاد۔ اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔

پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی، جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہو گئی۔ پھر اس تالیف خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر دور و دوسرے ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لئے کھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقہ خواص میں رابطہ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا، تاکہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالآخر نظم میں محدودیت و استبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں جو آزادی کے حق میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر بنادیا گیا جو اصول آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اتحاد و مشرب 4 مرکز میں مربیوں کا کارکنوں کا اتحاد و مشرب لازمی قرار دیا تاکہ اتحاد خیال سے جماعت کا نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ در صورت اختلاف مشرب تقابل باہمی پھر اس سے خود بینی و خود ستائی اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم ابھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں، انتظامات کی پارٹی فلیٹنگ شروع ہو جاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو زیادہ مستحکم کر دیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور

حریت طلب جماعت کے لئے سم قاتل ہے۔ اس لئے حضرت والا نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرمادیا یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کر لی۔ جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہو جاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد..... 5 تجویز نصاب، مقدّمہ خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامۃ الناس کے عامیانہ آراء و قیاسیات کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیاتِ وقت سے معزّی ہو۔ بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہل علم اور اہل تجربہ کی رائے پر مبنی رکھا جو مشعل علماء و روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے آزار نہ ہوں تاکہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامہ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظ نظر رہے، ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات و مقتضیاتِ تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہو سکتے تھے جو اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جاسکتی تھی ملک کی ساری قوموں کے لئے قابلِ قبول اور اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو۔ جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا، نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کر دی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لائی گئی۔ یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانٹنٹی یوٹیشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلا نہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونکتا ہے۔ اور متعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے، انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرستی کے۔ اس لئے حضرت والا نے نصاب کو کوری آزادی و بے باکی اور خالص ہنگی و غلامی دونوں ذہینوں سے الگ رکھ کر درمیان میں رکھا جو دل و دماغ میں ہر طبقہ کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کر سکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔

روحانیت و اخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل..... 6 عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں اُمراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے، تاکہ مرعوبیت اور اسیری دل و دماغ کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں اور اداروں یا خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے، جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کے دعوؤں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں یہی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں خارج

ہوتی ہے۔ حضرت والا نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔ حضرت والا اپنے نور فرست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے، اس لئے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جس کو اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا تاکہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ اور ادھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے، کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکار اور اس سے رقیبانه تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی مہووم اور فساد بیقینی تھا۔ اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن و اصلاح کے ساتھ نیز پہلی صورت میں شور و شر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم۔ اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے۔ اور دعوؤں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے۔ اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔ حضرت والا نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن و سلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اُتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کر سکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند درحقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی، ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہو گئی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہو گئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لئے حضرت والا نے ادارہ کی آمدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سرو سامانی توکل اور استغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غربیانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تاکہ کارکنوں میں تو سرمایہ دار سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آجائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے۔ اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔ پس حضرت والا نے اس اصول کے ذریعہ حصول آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی۔ مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت و اخلاق کے راستہ سے۔

سرکاری امداد سے احترام کی حکمت..... [7] ادارہ کے لئے گورنمنٹ کی امداد کو مضرتلا کر اس سے بچنے رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے، جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر یہی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے۔ اس لئے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترک موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بسلسلہ تحریک آزادی وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیشی کپڑے سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا؟ اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں؟ تاکہ خود اپنے ملک کی تجارت و صنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکیوں کا اقتصادی محتاج و غلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں، ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی تاکہ یہ قومی رنگ کے سرمایہ کار دست نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بننا رہے بہر حال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا وہی اس سرکاری ایڈ سے احترام اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مخفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت والا کی دور بین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضرب کاری..... [8] اس آٹھویں اصول میں کارکنانِ اداہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے۔ جیسا کہ چھٹے اصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفع کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے اور انہیں کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لئے یہی پائیداری اور چٹنگی کا سامان ہے۔ گویا اس دفع کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برادری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلا انداز تقابل و رقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت ہی میں رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بعد اور تغیر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کئے رہتے ہیں۔ اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب اکثریت اپنے کمال قناعت و توکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہو جائے تو قدرتا سرمایہ دار اس کے محتاج ہو جائیں گے اور بشوق و رغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر نثار کرنے کے آرزو مند ہو جائیں گے جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بخود باہر آ جائے اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔ اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک ضرب کاری ہے مگر

موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کی دراڑ بنے۔ اس لئے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ ہو جاتا ہے۔

تعلیم مدارس آزادی کی خشتِ اول ۹ یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اصول کی تشریح تھی لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیم مدارس کا اصول ہے کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصول ہشت گاہ کے نیچے جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے جو رابطہ مدارس کی ایک معقول اور موثر صورت ہے اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے اس لئے اس اصول میں تنظیم مدارس کے راستہ سے علمی فضلاء اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کر دی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لئے خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والا نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلا دیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔ گویا ۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کئے جائیں اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کئے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ: ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے انگریزی ہوں“ تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ: ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں“۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لئے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا۔ تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا، سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا امرتبہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبہہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔ غرض جہاں جہاں حضرات والا خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطے سے بتا کید تمام آزاد مدرسے قائم فرمائے جس سے اطراف میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقش قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں، جس سے آپ صرف بانی دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے بانی مدارس ثابت ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصول ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جن کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر ابھرے۔

جمعیت علماء کا پس منظر چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی طور پر بھی منظم ہو گئیں۔ اور انہوں نے جمعیت العلماء کے نام سے جنگ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جوشاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ جمعیت العلماء کے افراد پر

شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن اس کے اصول و مقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق در جوق آوازہ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادتہ مشکل تھا۔ اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لئے مذہبی آواز ہی میں جذب و کشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش برآواز نہیں ہوتا۔ اسی لئے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی ضرورت میں اس وقت حتم تھا جب عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصورات سے خالی تھے۔ ملت کا وقار بازیافت کرنے کے اُھول..... یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والاؒ ہی کے ان اصول ہشت گانہ اور طرز عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے اور جوں ہی اس مدرسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیت کے پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے وہیں عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش و خروش کے حیرت ناک منظر سامنے آ گئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی وطن دے سکتی ہے۔ بہر حال حضرت والاؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شامی میں مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہو سکتا تھا جو جناء مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔

سوانح مخطوطہ ① عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتیٰ کہ مخالفین تک بھی اس وقت جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہو سکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کے مرکزی حیثیت کے تباہ ہو جانے سے پورے ملک کے حال و مال کی تباہی عیاں تھی، صاحب سوانح مخطوطہ نظام۔ رسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اور جو فوائد معاش و معاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم سے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لئے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور

① سوانح مخطوطہ کے مولف جناب حاجی فضل حق صاحب مرحوم ہیں جو دارالعلوم کے اولین طبقہ میں ممبر کی حیثیت سے مجلس کے رکن رہے پھر ایک زمانہ تک دارالعلوم کے مہتمم بھی رہے۔ ممدوح دیوبند کے باشندہ اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے متقیدین خاص میں سے تھے۔ آپ نے حضرت والا کی سوانح مرتب کی جو زمانہ کی دست برد سے ضائع ہو گئی۔ اس کے کچھ بچے کچھ اور بچے ہوئے اور ان پرانے کاغذات میں دستیاب ہوئے جن سے کافی معلومات بہم پہنچیں اور سوانح قاسمی میں ان سے کافی مدد لی۔ اس مضمون میں جہاں سوانح مخطوطہ کا لفظ آئے اس سے یہی سوانح قاسمی مراد ہوگی۔

مغرب نسخہ کوئی نہیں۔“ گویا اس دور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی، ان اصولوں کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کی جا چکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ آج اجتماعی مساعی کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اس نے بدیشی غلامی سے نجات پائی۔ وہ سروان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والا تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجراء مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے۔ اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد و طبقات اپنی زندگی حکومت متسلطہ کے رحم و کرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت و وفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھ ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوت کا پرداز پھر حضرت والا نے ان اصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جبکہ ملک کے بارسوخ طبقات، بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف نشاء حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراک عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد و سرکف علماء و مفکرین کے ساتھ تحقیر و تمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جا رہا تھا۔

گویا ”اینٹی ملازم“ کا پروانہ بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جا رہا تھا لیکن حضرت والا کے ان اساسی اصول پر قائم شدہ نظام میں جہاں بدیشی اقتدار کی شکست و ریخت کے نتائج مخفی تھے وہیں ان میں اس تحقیر و تمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطہ حکومت نہ تھا بلکہ رابطہ عوام کا استحکام تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلط اقتدار کے خلاف مشینی قوت کی بجائے عوامی قوت ہی موثر ثابت ہو سکتی جسے حضرت والا نے پرکھ لیا تھا۔ جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوت براہ راست انہیں علماء کے ہاتھ میں تھی اور ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھلکا جو اس عوامی قوت پر قابض اور جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ جن علماء کو نکما اور بیکار یا قوم پر ناحق بار بار کرایا جا رہا تھا جو نہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوت سے حکومت متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو وہی ”اینٹی ملازم“ والے طبقات ملاؤں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور اسٹیجوں پر وہی تمسخر و نفرت اظہار عقیدت و نیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علماء جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے وہ بالاخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چاروناچار ان کے کارآمد ہونے کو تسلیم کر لیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر و بیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علماء بالاخر

آزادی ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے اور جو حکام شامی کے میدان میں تلواروں سے پورا نہ ہو سکا تھا وہ امن کی زبان و قلم سے پورا ہو گیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند نے جو مسجد چھترہ کے عناصر راجہ میں سے ایک عنصر تھے حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ ”اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ان کے بچے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔“ — ارشاد فرمایا۔ ”حاجی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں۔“

یعنی تشدد اور تلوار کے راستہ سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدم تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکہ کو ان اصول ہشت گانہ کی دفعات کے تعلیمی رنگ سے بھر دیا۔ جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے اور بقول صاحب سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور موثر تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی قدر و قیمت اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کیساتھ مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ناظم جمعیت علماء ہند نے اپنی مشہور تصنیف ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ تاہم اتنا کہ بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدین شامی نے بنایا اور ۱۹۴۷ء کے بعد ان کے پیشرہ حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے ابھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو جوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصول ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا۔ جو اس اقامتی تربیت گاہ ”دارالعلوم دیوبند“ کے لئے آپ نے وضع فرمائے۔ دارالعلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہندیا کا ابال چھلکا تو چوہے کے گرد و پیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر رہا۔

مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلا واسطہ سنا کہ ”میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی، بالخصوص یورپ و ایشیا کے متعدد انقلابات کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پاسکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کر دوں گا۔“

ریس الاحراز کا غایت تاثر..... رئیس الاحراز مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۳ء میں جب بسلسلہ تحریک خلافت دیوبند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے۔ اور غایت تاثر سے میساختہ فرمایا کہ ”یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا محفل محض سے کیا واسطہ؟“ چنانچہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوق اخفاء کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل نکل گئے ہیں کہ ”یوں معلوم ہوتا ہے“ اور ”یوں نظر آتا ہے“ اور ”ایسا ہو جائے گا“ وغیرہ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحب اصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیر و..... بہر حال ان اصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے۔ اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیر و قدرتا وہی سمجھے جاسکتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے۔ جس پر آزادی خواہ، طبقے بعد میں آئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول و عمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر ہے۔

بہر حال حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جلاز حقدار کو پامال کر چکی تھی ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ، ضعیف اور مظلومانہ فروتنی سے نچا دکھایا۔ صف کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں صبح کو جاگے قومی حکومت میں اور اسی طرح ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی گئی۔ گو متسلط طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کر دیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی تلافی والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لئے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جہاد کی قوت قائم رہے۔ اور اعلاۃ کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا۔ مدرسہ عربیہ ہو گیا تو حضرت والاؒ نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالت شرعیہ کا قیام..... دوسری طرف قومی حکمہ قضا قائم فرمایا تاکہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقہ اثر میں عدل و قسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ

میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ ابھرا رہے چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہل دیوبند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ ”کوئی مقدمہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے۔ اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسم صاحب تھے۔“

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوائفوں میں الجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری تھی کہ مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصوصیات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس دارالعلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ جب اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیوبند کی سرکاری منصفی کی رونق کھٹنی شروع ہو گئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلط قوت کا اثر و رسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دارالعلوم میں صنعت و حرفت کے شعبہ کا مقصد..... اسی کے ساتھ حضرت والا نے دارالعلوم میں صنعت و حرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاکہ ادارہ کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔

بظاہر یہ مقابلہ تھا اس رد کا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطہ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکاری جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کو علمی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا رد عمل صحیح معنی میں یہی ہو سکتا تھا کہ لوگ اس غلامی امور تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء و استغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت و حرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دارالعلوم کے ذریعے ”ہندو مسلم“ کا پرداز..... ایک طرف دارالعلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہو سکیں۔ چنانچہ دارالعلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت والا کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلا تفریق مذہب و ملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم کو عنایت کریں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع نول کشور لکھنؤ تھے جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دارالعلوم میں بھیجا۔ جس پر دارالعلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ و دعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کر کے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا اس ادارہ کو عوامی نہیں بلکہ ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پرداز بھی ڈال دیا گیا۔

دارالعلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر..... بلکہ سوانح مخطوط کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والا اس دارالعلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لئے حاصل ہوں بلکہ اسے عالمگیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس علمی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ترکی کی خلافت جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی سے انتہائی شد و مد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی جنگ روس سے ہوئی تو حضرت والا نے ترکی کے لئے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز کپڑا، زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لئے قربان کر دیا۔

تنظیم ملت کا نیا خاکہ..... اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دارالعلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خود مختاری، حق خود ارادیت، معاشی استغناء، وسائل قوت کی فراہمی، رابطہ عوام، تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کا رفا تھا۔ اور دارالعلوم کی تاسیس ایک خاص مکتب فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والا کے اصول ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہو سکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیرداروں پر تنگی کر کے ان کے فورانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ کہ حکومت وقت کے علی الرغم رابطہ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیم ملت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم و تعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فن سپہ گری کے شعبہ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جسے حضرت والا نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والا صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے؟ جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والا شرعی محکمہ قضا قائم فرما کر اعضاء مدرسہ کو اس کا حج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسہ کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کئے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہئے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بلا تخصیص مذہب و ملت چندے قبول کئے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا و شکر یہ سے

ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض محض کتابی درس و تدریس تھی تو حضرت والا اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ترکی سے رشتہ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتہ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتہ اتحاد کا سلسلہ پھیلا نا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتب درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرت اسے ایک ملی جلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرما رہے تھے جن کے نظام کار میں علم و عمل، معاش و معاد، قوم و وطن اور دین و مذہب کی حمایت و نصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے جو حضرت والا کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلا متوسلین میں حسب استعداد و قابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیام دارالعلوم کا بنیادی محرک!..... بہر حال دارالعلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کار اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کر رہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شمالی کے میدان سے لیکر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لئے بقول حضرت شیخ الہندؒ یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ، حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی اور حاجی صاحب کے لوگوں میں بالآخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب و دماغ کا جو ہر بن گئی جنہیں حاجی صاحب نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقا و ترویج اور اظہار و اعلان کی توقع ہو سکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول و نظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصول آزادی کی امین شخصیت..... بہر حال ان اصول ہشت گانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دارالعلوم دیوبند ہے اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی تلافی کر دکھائی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر دنیا اس کے نصب العین پر آ کر رہی اور آزادی ملک و ملت کے لئے جو خاموش راہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپگنڈوں کے شور و محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لئے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منارہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا، آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواغی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو ہو

کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے تا آنکہ آزادی سامنے آکھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقع ملا۔ ع

خدا رحمت کندا میں عاشقانِ پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء)

اکابر دیوبند اور آزادی ہند

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشَيْرِ أَنْبِيَآءٍ وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ !

شیریں شمر کے حصول پر تبریک..... بزرگان ملت! علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم! یہ آج کا مبارک ① دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندہ گلید سلون نے اپنے ایام زندگی میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذروں کے اڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جو ابوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانی اور مساعی نے یہ شیریں شمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

اکابر ملت اور جہاد آزادی..... ناپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم ان اکابر ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے ہیئتاً اس آزادی کا سنگ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب کہ آزادی کے تصور سے بھی اس ملک کے دل و دماغ خالی تھے وہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نور دی کر رہے تھے۔ آخر میں ۱۷۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اسی تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔

۱۷۵۷ء میں بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ بقول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت امداد اللہ

① ہندوستان کی آزادی کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں نماز تراویح کے بعد علماء و طلباء دارالعلوم اور اہل شہر سے خطاب۔

قدس سرہ کی قیادت میں تلوار اٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اترے۔ لیکن وقت مقررہ نہیں آ پہنچا تھا اس لئے فتح کا سلسلہ شمالی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا۔ ملک آزاد نہ ہوا۔ لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے الگ نہ ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دنیا و فاداری کے جذبہ سے سرشار تھی۔ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن سے آیات جہاد کو خارج کر دینے کے مشورے اور منصوبے قائم کئے جا رہے تھے۔ دیوبند کے لمبے کرتے والے مولویوں کو باغی کا نام رکھ کر مطعون کیا جا رہا تھا لیکن یہ جماعت اپنی دھن میں بھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس دنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے جو ان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے۔ اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریک آزادی اس وقت جاری رکھی جب کہ انگریزوں کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا۔ نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آ گئے اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق ”شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جتنے میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیاے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔“

بہر حال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ و منصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ایک جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حق بخقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے۔ شیخ الحدیث دارالعلوم کی پیشین گوئی..... ان بزرگوں کا ہر وقت یہی ذکر تھا اور یہی فکر، اسی کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں عام نظم اور انتظام چھتہ کی مسجد میں یہ سب بزرگ جمع تھے اور انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں نے گہرے پنچے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ فرمایا ”حاجی صاحب آپ کس خیال میں ہیں؟ وہ وقت دور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالت امن و سکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا اور انقلاب ہو جائے گا۔ رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں!“۔

لیکن آج دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پندرہ اگست کی رات لوگ حسب معمول دس گیارہ بجے سوئے تو انگریزوں کی عملداری میں تھے۔ اور جب پندرہ اگست کی تاریخ شروع ہوئی تو ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر دوسری

عملداری تھی۔ سوئے ایک عملداری میں اور جاگے دوسری عملداری میں۔

آزادی ہند کی جدوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے کی..... میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج کی آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں بیاگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا کہ ”ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا“۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخہ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا۔ شیخ الہندؒ نے اسی نسخہ کو معجون مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کر دیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کر سکے۔ چنانچہ وہ استعمال عام شروع ہو کر عام ہو گیا۔ تحریک خلافت میں بھی نسخہ گولخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہر حال استعمال عام شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گزر کر اہل اہل وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرہ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں جن کی تخم ریزی اور ترد سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات..... ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ ملک کی آزادی کی یہ پہلی قسط ہے۔ اس کی دوسری قسط جون اڑتالیس میں سامنے آنے والی ہے۔ لیکن ان اکابر مرحومین کا مقصد اس سے بھی آگے ہے۔ ہمیں آزادی کی دوسری قسط اور پاک نصب العین کی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے اور اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی کمر کھولنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہماری مبارکباد کی مستحق ہندوستان و پاکستان دونوں سلطنتیں ہیں۔ ”ہم پاکستان کو مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارکباد دیتے ہیں“۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل..... میں اس تصور کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمان اب ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات..... وہیں اس فکر کا موقع بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کر کے ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہو جائیں اور اسلام کے کلمہ پر ایک ہوں ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں۔ صرف ظاہری طور پر ایک نہ ہوں بلکہ حقیقی طور پر ایک

ہوں۔ اسی ایک جملہ میں ان کی حیات اجتماعی کی لمبی چوڑی داستان پنہاں ہے۔ ان کے لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کر دیئے جائیں طعن و طنز کا سلسلہ ترک کر دیا جائے ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ رکھیں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ انہیں متحد ہو جانے کے لئے اخوت و مساوات کی کتنی تدابیر ہو سکتی ہیں جو وہ آج عمل میں لا سکتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں وحدت جماعت کی ضرورت..... میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب وقت ہے کہ ہم متحد ہوں پہلے سے زیادہ اب امکانات ہیں کہ ہم متحد ہو سکیں۔ وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں۔ اس انقلاب سے منقلب ہو چکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں۔ اس لئے اب بجائے اس کے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی ختم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدت جماعت کا سنگ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں۔ میں آخر میں مکرر مبارک باد پر جو مسلمانوں کے لئے اور پورے ایشیاء کے لئے ہے اس تقریر کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

پس منظر..... حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی تحریک اور نائب مفتی احمد علی صاحب سعید کی تائید سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔ قاری حفظ الرحمن صاحب کی قرأت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ حافظ اخلاق احمد صاحب محرر دارالافتاء نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی جانب سے فارسی کا قصیدہ خیر مقدم پڑھ کر سنایا۔ محمد حبیب دیوبندی طالب علم نے اردو نعت اور فضل الرحمن ابن قاری حفظ الرحمن نے عربی قصیدہ سنایا۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا مے روی

نہایت خوشی کا مقام ہے جس جگہ ہم سب جمع ہیں یہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ تذکرہ الرشید میں ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ۔

”میں خانہ کعبہ کے در پر کھڑا ہوں اور میرے پیروں کے نیچے سے نہریں نکل کر تمام عالم میں پھیل رہی ہیں۔“ اس خواب کا مصداق دارالعلوم اور اس کی شاخوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے خلیفہ اعظم تھے۔ شاہ عبدالغنی صاحب تلامیذ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ پر اور خلفاء میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ تصوف میں مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا بڑا درجہ تھا۔ انہوں نے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ علم کی کتبیاں میرے ہاتھ میں دی گئیں وہ تعجب کرتے تھے کہ میرا علم میں کوئی بڑا درجہ نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہوا؟ مگر جب وہ دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعہ سے علم دنیا میں پھیلا۔

ایک دوسرا خواب انہوں نے ہی یہ دیکھا تھا کہ ”مدرسہ کے چمن میں خانہ کعبہ ہے اور لوگ اس کا طواف کر

رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی معنوی حیثیت اسلام میں وہ شان رکھتی ہے جو عالم میں خانہ کعبہ کے انوار و برکات لئے ہوئے ہیں۔ ہماری عملی حالت گو بہت گری ہوئی ہے مگر خدا کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے ہم سے اس مرکز کی خدمت لی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ کے ان مکاتیب میں جو ابھی چھپے نہیں ہیں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب جہانگیر نے ان کو قید کر کے دہلی بلایا تو ان کا دیوبند سے گزر ہوا تو فرمایا کہ ”اس جگہ سے علم نبوت کی بو آتی ہے۔“

چنانچہ اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے علم شریعت و علم نبوت کا مظہر قرار دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے جب ہمارے مہتمم صاحب کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرمائیں تو بگڑ کر فرمایا کہ ”کیا خوب! تمہارے مدرسہ کے لئے؟ نہ معلوم ہماری کتنی راتیں اس دعا کی نذر ہوئی ہیں۔ اور اب مدرسہ آپ کا ہو گیا۔ فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا خیال تھا کہ علم شریعت کا کوئی مرکز بننا چاہئے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دیوبند کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے۔“

بہر حال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم سب سے یہ خدمت لی۔ دارالعلوم کو جو فضیلت ان بزرگوں کے ذریعہ سے حاصل ہے وہ کسی دوسری جگہ کو نصیب نہیں ہے۔ علم کے اللہ نے بڑے بڑے مرکز مقرر فرمائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عراق، شام، مصر، خراسان، بخارا اور سمرقند وغیرہ۔ پھر دیوبند کے حصہ میں یہ دولت آئی۔ دینی علوم کی ترقی جس قدر آپ کو یہاں ملے گی وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے۔ ﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ هُوَ الْفَضْلُ الْعَظِيمُ﴾ ①

یہاں کے دیہات میں علم کا جواثر ہے وہ دوسری جگہ کے شہروں تک میں نہیں ہے۔ ہمارے محترم بزرگ حضرت مہتمم صاحب گو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ان کو خاندانی جو نسبت حاصل ہے اور ان کا جو منصب ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ ہمارے سب کے سردار ہیں۔ ہمارے لئے افسوس کا موقع تھا کہ وہ دوسری جگہ پاکستان رہ جاتے۔ اگرچہ جانا عارضی تھا مگر یہ انوہیں سن سن کر اب واپسی نہیں ہوگی، ہم کو تکلیف ہوتی تھی مگر۔

یوسف گم گشتہ باز آ یا یکنعان غم مخور

الحمد للہ! ہمارے صدر مہتمم صاحب حضرت نانوتوی کی آنکھوں کے تارے تشریف لے آئے ہیں۔ ہم جس قدر بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے۔ ان کا قیام اگر پاکستان میں ہوتا تو بھی فیض سے خالی نہ ہوتا مگر ہمارے لئے قلق کا باعث ہوتا۔ آپ کے لئے سرچشمہ فیض خانہ کعبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے سفر کے تاثرات سے بھی مستفیض فرمائیں گے تاکہ وہ مستقبل میں ہمارے کام آئیں۔

حضرت مولانا کی تقریر کے بعد مولوی غلام حیدر اور مولوی عبدالاحد صاحبان کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد ذیل کا شعر پڑھ کر اپنے تاثرات بیان فرمائے۔

حدیث پاکستان

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَ نَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشَيْءٍ نَدْبِرُ، وَدَاعِيَا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ !
عظیم الشان نفع..... بزرگان محترم!

کہاں میں اور کہاں یہ نکلت گل نسیم صبح تیری مہربانی

میں حیران ہوں کہ بیان تاثرات کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤں مجمع اکابر کا ہے۔ اساتذہ کا اجتماع ہے۔
بزرگوں کے اجتماع میں قوت گویائی یا رائے دہی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ارشاد ہے کہ اپنے ان
تاثرات کا اظہار کروں جو ہر شخص کچھ نہ کچھ سفر سے لے کر آتا ہے۔

اول تو پاکستان جانے میں جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا وہ دعائیں ہیں جو بزرگوں نے فرمائیں۔ اگر میں
پاکستان نہ جاتا تو یہ دعائیں حاصل نہ ہوتیں۔ پھر بزرگوں کے حوصلہ افزا کلمات میسر نہ ہوتے۔ حضرت مولانا سید
مہدی حسن صاحب نے اپنی نظم میں جس تاثر کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ اور حضرت شیخ مدظلہ العالی
کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں وہ تو ہم سب کے لئے انشاء اللہ وسیلہ نجات ہیں۔ حضرت نے اس ناکارہ کے
بارے میں جو کلمات فرمائے ہیں۔ ”میری درخواست یہ ہے کہ وہ انہیں یاد رکھیں اور قیامت میں انہی الفاظ میں گواہی
دے دیں تاکہ میرے لئے وہاں نجات کا باعث ہوں کہ یہ کلمات ہی میرے لئے دستاویز نجات ہیں۔“

(اس موقع پر وفور جذبات سے حضرت مہتمم صاحب پر رقت و گریہ طاری تھا۔ مدوح کی اس حالت کا مجمع پر
بھی زبردست اثر پڑا اور لوگوں کے بے ساختہ آنسو نکل آئے) چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔

پاکستان جانے کے مقاصد..... میں یہاں سے پاکستان تین مقصد لے کر گیا تھا۔ ایک عزیز اقرباء سے ملاقات
تھی، جن کا عرصہ سے تقاضا تھا۔ وہاں کے مدارس سے بھی طلبہ تھے اور جلسوں میں شرکت کے خطوط بھی برابر
آ رہے تھے۔ اس مرتبہ کوشش کی کہ ہواؤں۔ چنانچہ سفر کا یہ مقصد میں نے حکومت کے سامنے بھی ظاہر کر دیا تھا۔

دوسری غرض دارالعلوم کا مفاد تھا۔ دارالعلوم ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہاں سفر بھی

کئے۔ اور بساط کے موافق جتنی کوشش ہو سکتی تھی، اس کے اثرات اور منافع بھی بحمد اللہ ظاہر ہوئے۔ تیسرے تبلیغ و اصلاح کا سلسلہ جو ہر شخص کا فرض ہے اور قدرتی طور پر میرے دل میں بھی ہے ایک اہم مقصد سفر تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور اصلاح دینی کی سعی کی گئی۔ میں نہ سیاسی آدمی تھا، نہ ہوں۔ اس لئے زیادہ تر اجتماعات، اخلاقی مواعظ و پندر پر مشتمل ہوتے تھے۔

دنیا کا عمومی دینی انحطاط..... دینی حالت پاکستان و ہندوستان کیا، ساری دنیا کی یکساں ہے۔ آج حقیقی طمانیت تمام دنیا سے مفقود ہے۔ دنیا اس وقت ایک بے اوڈھک کرہ کی طرح اضطراب اور حرکت میں ہے۔ ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے۔ آج جہاں سے بھی خبریں آتی ہیں وہ عام بد امنی، عام طور سے بے چینی، بے سکونی، لڑائیوں اور فسادات کی تو آتی ہیں۔ صلاح و رشد کی اطلاعات کہیں سے نہیں آتیں حجاز سب سے بڑا مرکز دین ہے۔ خود وہاں کی حالت بھی دینی اور اخلاقی حیثیت سے بلند پایہ نہیں۔

تیسرے سال جب مجھے وہاں حاضری کا موقع ہوا تو میں نے دیکھا کہ عصر کے بعد ہزاروں آدمی جبکہ طواف بیت اللہ اور ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ مکہ کے چند نو جوان جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔ حرم محترم میں انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ جس میں عریاں تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کی خوبیاں بیان کرنے اور یورپ و لندن کے تمدنی مسائل کی بحث میں مشغول تھے۔ گویا وہ ان طواف و ذکر کرنے والوں کو احق سمجھ رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک ان عریاں تصاویر کی دید بیت اللہ کی دید کے مقابلہ میں زیادہ با وقعت تھی۔ مجھے بڑی ضیق ہوئی۔ حرم محترم میں بیٹھ کر بیت اللہ کے سامنے قبولیت کے اوقات میں تصاویر پر بحث کرنا نہایت ہی ناگوار گزر رہا تھا۔ میں چپ رہا یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی اور لوگ نماز میں مشغول ہو گئے۔ نماز کے بعد دیکھا تو انہوں نے پھر یہ مصوٰر اخبار سنبھالے اور پھر وہی بحث چھیڑی تنگ ہو کر میں نے عرض کیا کہ ”عزیزو! مشرق و مغرب کے لوگ جو آپ کی تقلید کرنے یہاں آتے ہیں جب آپ عمل کا یہ نمونہ پیش کریں گے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ آپ کو اپنا مقام خود سمجھنا چاہئے۔ آنے والے آپ سے اسلام کا نمونہ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں۔“ حاصل یہ ہے کہ اخلاقی حالت آج ہر جگہ یہ ہے تو ہندوستان اور پاکستان تو پھر بعد کی چیز ہے۔ بہر حال ہر ملک کی طرح پاکستان بھی دین کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاج اصلاح ہے۔

اصلاح کی ذمہ داری..... اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہے؟ حقیقت میں مسلمانوں پر، مسلم کو خیر الام کہا گیا ہے جس طرح جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء ہیں۔ اسی طرح آپ کی امت بھی امام الام ہے۔ اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو مقتدیوں کی تو نماز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ پھر مسلمانوں میں سب سے زیادہ اصلاح خلق اللہ کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری بھلا دی ہے۔ اگر وہ خود خلق ہوں تب دوسرے با اخلاق بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے..... وہاں اس وقت دینی حیثیت سے تین فتنے مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ ایک قادیانی فتنہ۔ دوسرا شیعیت کا فتنہ۔ اور تیسرا مغربیت کا فتنہ۔

قادیانیوں نے اپنا مرکز کوئٹہ بلوچستان کو بنالیا ہے۔ مرزا بشیر الدین نے اعلان کر دیا ہے کہ قادیانی بلوچستان کو سنبھالیں۔ چنانچہ انہوں نے کوئٹہ میں اپنا مرکزی دفتر کھول دیا ہے۔ جو ایران، مصر اور دوسرے ممالک اسلامیہ کا دہانہ ہے۔ انہوں نے ملتان میں ایک عظیم جلسہ کا اعلان کیا ہے جس میں ان کے نزدیک پچاس ہزار قادیانیوں کے جمع ہونے کا امکان ہے۔ جلسہ کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا میں پھیل کر قادیانی مسلک کی اشاعت کی جائے۔

انہوں نے اپنے چند افراد مصر وغیرہ بھیج کر انہیں عربی بول چال کا ماہر بنالیا ہے۔ اور بطور شو کے ان کی عربی تقریریں پبلک کے سامنے کراتے ہیں۔ تبلیغ کا نظم سامنے لاتے ہیں اور اپنی مساعی کی روداد پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سے اہل حق اس باطل کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ادھر ان عربی دانوں کے ذریعہ ممالک اسلامیہ میں اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسری طرف شیعوں نے ملک میں مختلف انداز سے شیعیت کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔ جس سے سادہ لوح عوام شیعیت کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ فتنہ بھی فروغ پا رہا ہے۔

تیسرا فتنہ مغربیت یا آزادی اور بے قیدی کا ہے جس کے راستے سے بے دینی اور بے حیائی کی ختم ریزی ہو رہی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک سرے سے مذہب ہی کی اہمیت نہیں۔ مغربیت کے اس فتنہ سے الحاد اور بے دینی بڑھ رہی ہے۔ گویہ فتنہ اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔ تاہم ہمیں اور جگہ سے بحث نہیں۔

فتنوں کا سبب باب..... ایک زمانہ میں ان فتنوں کا دارالعلوم نے سد باب کیا تھا اور آج بھی دارالعلوم ہی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ذیل میں کمیونزم اور کپٹل ازم وغیرہ کے سیاسی فتنے پھر سر ابھار رہے ہیں۔ جن کا سد باب علمائے حق کا کام ہے۔ میں نے تو وہاں کے علماء کو توجہ دلائی کہ اگر مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست ہو جائے تو دوسری اقوام کی حالت درست ہو جائے گی بلکہ اخلاق درست کر لئے جائیں تو پاکستان و ہندوستان دونوں کے درمیانی معاملات کی حالت بھی درست ہو سکتی ہے۔

ایک حدیث قدسی میں یہ فرمایا گیا ہے ”حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی قوم کی بد عملی پر ناخوش ہوتا ہوں تو دوسری اقوام کے دل میں اس بد عمل قوم کی طرف سے بغض و عداوت بٹھادیتا ہوں اور وہ جلاوطن کر مجرم قوم پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ اور قتل و غارت کے ذریعہ اسے سزا دیتی ہیں۔ پس اگر تمہیں یہ سزا اور بے کسی اور مغلوبیت ناگوار ہے تو تم کسی قوم کو برا مت کہو۔ میرے ساتھ معاملہ درست کرو، میں اقوام کے قلوب میں پھر تمہاری محبت ڈال دوں گا۔“ اس لئے میں تو دوسری اقوام کی بد حالی کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد کرتا ہوں۔ اگر یہ قوم درست ہو جائے تو سب اقوام درست ہو جائیں۔

اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات..... بہر حال جیسے عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاج اصلاح ہے۔ جو علمائے حقانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آگئی ہے اور اصلاح کے راستہ کچھ بند سے ہو گئے ہیں۔ طلباء کا ادھر سے آنا منقطع ہو گیا ہے اور دارالعلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کی سعی پر حکومت ہند نے طلباء کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔

اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دارالعلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلبائے علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ نہ صرف وہاں سے طلبہ کی آمد پر ہی سے پابندی ہٹا لینے کی ضرورت ہے بلکہ یہاں سے وہاں مبلغین کی آمد و رفت کو بھی آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے خیر سگالی کے وفود سے زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوگا۔ کیونکہ مبلغین ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کریں گے اور اخلاق جس حد تک درست ہوں گے اور کردار جس حد تک کسی ملک کا اونچا ہوگا۔ اسی حد تک دوسرے ممالک اس سے مطمئن ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیں گے۔

بڑی امید افزاء خوبی..... آج کل اخلاقی حالات کے بگڑ جانے سے ہی عموماً بگاڑ آیا ہوا ہے۔ ہاں! مگر جہاں عام دنیا کی حالت ہے وہاں دینی حیثیت سے یہ خرابیاں ہیں وہیں ایک بڑی امید افزاء خوبی بھی ہے جو اور جگہ کم پائی جاتی ہے اور وہ ہے طلب اصلاح اور حسن قبول یعنی وہاں پر ہر بڑے چھوٹے میں اصلاح کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے لئے ہر قسم کے علماء کی ضرورت ہے۔ ایک خالی الذہن کے لئے خطابات سے سمجھا دینا کافی ہوگا۔ ایک عقلیت پسند کے لئے حکمت و استدلال کی ضرورت ہوگی اور ایک کٹ حجت کے لئے الزامی جوابات اور خود اس کے مسلمات سے اس پر حجت قائم کرنا ضروری ہوگا۔ قرآن نے ان ہی تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ﴿أَذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ ① پس جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی زبان میں انہیں سمجھانا ہوگا۔ اس لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔

اعلان استغناء..... ہاں! پھر اسی کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کو قلبی استغناء کی بھی حاجت ہے۔ اصلاح میں جس قدر بھی رکاوٹ یا تاثیر میں جتنی بھی روک ہوتی ہے وہ مصلح کی طمع سے ہوتی ہے۔ مخاطب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مصلح غرض مند تو نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی غرض مندی کا شبہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اس لئے جہاں قلبی استغناء درکار ہے وہیں اعلان استغناء بھی ضروری ہے تاکہ اصلاح محض لوجہ اللہ ہونے سے قلوب پر اثر انداز ہو، گویا تبلیغ کی تاثیر کے لئے استغناء بالخاصہ ضروری ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موعظت و اصلاح کے وقت خصوصیت سے اعلان استغناء فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ﴿وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ

أَجْرِي إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١﴾ اگر اس طرف سے طلباء آنے لگیں اور اس طرف سے مبلغین جانے لگیں تو دونوں حکومتوں کے کردار پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے جیسا کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

دیانت عمل کی تاثیر..... تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے جلسہ کی صدارت کے لئے میرا حیدر آباد سندھ جانا ہوا تھا، جلسہ کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کرنا چاہا جس کو مان لیا گیا۔ عصر کے بعد موٹریں آئیں۔ شہر سے باہر ان کی کوشی پر پہنچے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اس لئے طبیعت نماز کے لئے بے چین ہوئی۔ جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور کہا کہ غالباً آپ لوگ نماز کی وجہ سے مضطرب ہیں تو مسجد یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے۔ مسجد تک جاتے جاتے نماز کا وقت جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو نماز ہمارے مکان ہی میں پڑھ لیجئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساری زمین ہمارے لئے مسجد ہے۔

اس قرارداد کے بعد کا منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ وہ لوگ پانی وغیرہ لارہے تھے سفید تو لئے لارہے تھے، چادریں بچھا رہے تھے۔ قبلہ کی سمت بھی انہوں نے تشخیص کر کے بتلائی۔ ہم نے اذان دی اور نماز ادا کی۔ اور وہ سب مرد، بچے، بڑے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ جب ہم لوگ نماز اور معمولات سے فارغ ہو چکے تو وہ آگے آئے اور کہا کہ ”ہماری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ہمارے گھر پر بھگوان کا نام لیا جائے“

مجھے ان کے ان الفاظ کی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ یہ آپ کی نیکی کی بات ہے مگر عام طور سے تو لوگ نماز کے بارے میں اور مسجدوں کے معاملہ میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مسجد اور بابہ وغیرہ کا جھگڑا روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا جیسے آدمی ہوتے ہیں ویسا ہی ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے چڑانے کو نماز پڑھیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے۔ بہر حال اگر مسلمان دیانت عمل کا مجسمہ بن جائیں تو خود بخود لوگوں کے دل میں کشش پیدا ہو جائے۔ غلط نمونہ پیش کر کے خود ہم نے لوگوں کو دین سے دور کر دیا ہے۔ گویا ہم مبلغ بننے کی بجائے تبلیغ دین کے حق میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا نمونہ عمل دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کے یہی معنی ہیں تو ہمارا اسلام کو سلام ہے۔ بہر حال دارالعلوم اپنی بنیادوں کے لحاظ سے مصلح ہے اور لوگ اس کی اصلاحی مساعی سے اثر لیتے ہیں۔ اس وقت اسے اخلاقی اور دینی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

قدر دارالعلوم..... ہم کو دارالعلوم کی قدر یہاں بیٹھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ دارالعلوم سے باہر جا کر قدر ہوتی ہے کہ وہ کیا نعمت ہے؟ جب مجھے واپسی کی راہ کچھ مسدود سی نظر آئی تو اس وقت دارالعلوم کی فضا ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے لگی کیونکہ یہ ماحول ہر جگہ میسر نہیں۔

مجھے عید الاضحیٰ کراچی ہی میں پڑھنے کی نوبت آئی اور ظاہر ہے کہ چودہ لاکھ کے شہر میں عید کے اجتماع کا منظر کتنا اعلیٰ ہوتا ہوگا۔ لاکھوں کے مجمع میں ایک جگہ عید پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تلاش طلباء و علماء کے ماحول کی

رہی۔ اور میں اس عید کا متلاشی تھا جس میں دارالعلوم جیسا ماحول ہو۔ میں نے مولانا محمد صادق صاحب کے مدرسہ کے مجمع کے ساتھ نماز عید پڑھی کہ وہاں کا ماحول کچھ طلباء اور علماء کا تھا مگر پھر بھی کمال تسکین و اطمینان حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مدارات میں کمی نہیں کی۔ قدم قدم پر وسائل راحت تھے۔ پبلک نے مجھے دارالعلوم قائم کرنے کو کہا اور تین لاکھ کانڈ بھی پیش کیا۔ لوگ وہاں کے قیام کے لئے مضبوط دلائل بھی بیان کرتے تھے مگر اس کے باوجود قلبی رجحان اور وجدان دارالعلوم کے ماحول کا متلاشی تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصرف..... میرے اصرار واپسی کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قلب میں قیام سے توحش کی بنا پر حقیقت حضرت شیخ مدنی کا تصرف ہے جو وہاں بیٹھ کر رہے ہیں۔ اور اس لئے آپ یہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ بہر حال میرا قلبی رخ کسی بھی وجہ سے ہو یہی تھا کہ میں حاضر ہوں۔ الحمد للہ کہ حاضری ہو گئی۔ اور آپ بزرگوں اور دوستوں کی زیارت کا حق تعالیٰ نے موقع میسر فرما دیا۔ پھر بھی وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی عبادت مہمان نوازی اور غرباء پروری کے نقوش دل میں نقش رہیں گے۔ باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کی حاضری حضرت شیخ کی ظاہری و باطنی توجہ بلکہ تصرف سے ہوئی اور دارالعلوم کی خدمت کا دوبارہ موقع ملا۔

قیص عثمانی..... میرے محترم بھائی مولانا عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی نبیرہ حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اس خدمت دارالعلوم کو قیص عثمانی سے تشبیہ دیتے ہوئے مجھے وہاں لکھا تھا کہ آپ کو اپنے ارادہ و اختیار سے اس قیص عثمانی کو نہ اتارنا چاہئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قیص عثمانی کو اتارنا نہیں ہے بلکہ تھوڑے وقفے کے لئے۔ جیسے غسل کے لئے کپڑے اتارے جاتے ہیں اور پھر پہن لئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے برائے تطہیر کچھ وقفہ کے لئے یہ لباس اتار کر رکھا ہے۔ عنقریب پہن لیا جائے گا۔

جذبات تشکر..... آخر میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ آپ حضرات نے کل سے اب تک جن پر خلوص جذبات محبت کو ظاہر فرمایا اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور اس کو اپنے لئے وسیلہ نجات تصور کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

امارت شرعیہ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرَا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ
مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا
الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ ① (صَدَقَ اللَّهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ)

روزِ مسرت..... بزرگانِ محترم! میرے لئے خصوصیت سے آج بہت ہی مسرت و خوشی کا دن ہے کہ اس مقدس
جمع میں کہ جس میں اس نواح کے امیر شریعت اور دوسرے بزرگانِ تشریف فرما ہیں۔ مجھے ان کی معیت کا بھی
شرف حاصل ہوا ہے۔ اور ان کی برکات سے مستفیض ہونے کا بھی موقع ملا اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے
کہ ان کی رعیت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے کہ امیر شریعت کے سامنے تو سب رعایا ہی ہوتی ہے وہ باہر کے
ہوں یا اندر کے ہوں۔

بہر حال ایک رعایا کی حیثیت سے اپنے امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ایک مستقل سعادت اور برکت ہے۔
اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امارت کے سلسلہ میں چند طالبِ علمانہ باتیں آپ کی خدمت میں گزارش کروں
زیادہ دیر تک تو عرض نہیں کر سکوں گا اس لئے کہ کچھ تو علیل ہوں اور باعتبار علم کے قلیل ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ
صبح سے دماغی کاوش کا بار بھی اوپر پڑا ہوا ہے جس وجہ سے تعب اور تکان بھی پیدا ہو گیا۔

معالجوں کی طرف سے بھی مجھے ہدایت ہے کہ عشاء کے بعد نہ کسی جلسے میں تقریر کروں۔ اور نہ شرکت کروں
لیکن بہر حال بزرگوں کا حکم و اکثروں کے حکم سے زیادہ اونچا ہے کیونکہ ڈاکٹر معالج جسمانی ہیں اور یہ بزرگانِ دین
معالجِ روحانی ہیں اور روح کو جسم پر قدرتی طور پر فضیلت حاصل ہے اس لئے معالجینِ روح کا حکم زیادہ واجب
الاطاعت ہے بہ نسبت معالجینِ جسم کے۔ اس لئے تعمیلِ حکم کے طور پر بھی کچھ عرض کرنا ضروری تھا۔ مگر میں زیادہ

وقت نہیں لے سکوں گا صرف تھوڑی دیر چند طالب علمانہ باتیں مختصر طور پر گزارش کروں گا۔
اسلام کی بنیاد..... اسلام وسیع ترین اور عالمگیر دین ہے اور ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے۔ اور اس کی عمارت پانچ شعبوں پر قائم ہے۔ گویا اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں کہ جس پر اسلام کی تعمیر کھڑی ہے۔

1..... اعتقادات 2..... عبادات 3..... اخلاقیات 4..... معاملات 5..... اجتماعیات

عقائد..... پہلا شعبہ اعتقادات کا ہے کہ آدمی کے عقائد درست ہونے چاہئیں اور عقیدے کی تین بنیادیں ہیں۔
1 مبداء 2 معاد 3 نبوت مبداء کے معنی یہ ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے۔ ہم کس طرح دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معاد کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ عمر گزار کر جائیں گے کہاں؟ اور نبوت کا حاصل یہ ہے کہ اس آمد و شد کے درمیان ہم زندگی کیسے گزاریں۔ یہ تین بنیادیں ہوں گی عقائد کی۔ مبداء ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے کہ جس سے ہمیں ہستی ملی ہے اور وجود ملا ہے۔ اور وہ ہمارے وجود کی اصل ہے اور معاد بھی وہی ہے کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو مبداء بھی وہی ہے۔ اور معاد بھی وہی ہے۔ اور ہدایت کرنے والا بھی وہی ہے۔ کہ ہم زندگی کیسے گزاریں۔ تو سب سے پہلی چیز عقائد ہے کہ جس سے قلب انسانی صحیح ہو جائے۔ کیونکہ تمام اعمال عقائد ہی کے تابع ہیں۔ عقیدہ اگر غلط ہے تو عمل خود بخود غلط ہو جائے گا خواہ آدمی اچھی نیت ہی سے کرے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو سارے اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ جب اعمال صحیح ہوں گے تو احوال بھی صحیح ہوں گے۔ اور جب احوال صحیح ہوں گے تو انجام بھی صحیح ہو جائے گا۔ تو ابتداء سے انتہاء تک انسان عقائد کی صحت کی بناء پر صحیح ہوگا۔ اس لئے سب سے بڑی بنیادی چیز اسلام میں عقائد کا درجہ ہے جو قلب کے اندر پوسٹ کیا جاتا ہے۔

عبادات..... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے کہ ان عقائد کے تحت اللہ تعالیٰ کو کس طرح سے یاد کیا جائے، عبادت کس طرح سے کی جائے۔ عبادت کے معنی ہیں غایت تذلل یعنی معبود کے سامنے ایسے ذلت اختیار کر لینا جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ کی عزت لامحدود ہے۔ کوئی عزت کا درجہ نہیں جو اس کی ذات میں موجود نہ ہو۔ اس کے یہاں عزت کامل ہے اس لئے اس کے یہاں ذلت کامل یعنی ایسی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے کہ آدمی اس کے سامنے ذلیل نہ ہو جائے۔

تو عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس عزیز مطلق کے سامنے ذلیل مطلق بن جائے۔ اس کی عزت کسی حد تک رکی ہوئی نہیں۔ ہماری ذلت کسی حد پر رکی ہوئی نہ ہو اور یہ غایت تذلل اور انتہائی ذلت اللہ کے سامنے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی میں انتہائی محتاجی ہو کیونکہ غنی کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا:

آنکہ شیراں راکند روباه مزاج احتیاج است و احتیاج است و احتیاج
جو شیروں کو بھی لومٹری بنادے وہ حاجت مندی ہے۔ غنا کے ساتھ کوئی کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ حق

تعالیٰ شانہ، غنی مطلق ہیں، رفیع المرتبت ہیں، انسان ان کے سامنے ذلیل مطلق ہے اس کا کام ان کے سامنے ہر وقت جھکنا ہے کہ دل سے بھی جھکے، روح سے بھی جھکے، بدن سے بھی جھکے، قول سے بھی جھکے، فعل سے بھی جھکے ہر اعتبار سے اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر دے۔ یہ ہے عبادت۔ عبادت کے معنی فقط نماز روزہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ قانون اسلام کے تحت ذلت کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہ اگر کہیں کہ گھر میں فلاں کام کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اسی طرح کریں۔ اگر وہ فرمائیں کہ مسجد میں جاؤ تو ہمارا فرض ہے کہ مسجد میں جائیں اگر وہ کہیں کہ تخت سلطان پر امیر شریعت بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا فرض ہے کہ امیر بن کر بیٹھ جائیں اگر وہ کہیں کہ غلام بن جاؤ، فلاں کے تو ہم غلام بننے کو تیار ہوں۔ تو اظہار ذلت کے یہ معنی ہیں کہ عمل سے قول سے، فعل سے، حال سے، چال سے ہر اعتبار سے آدمی اپنی پستی، اپنی احتیاج اور اپنی حاجت مندی کا اظہار کر دے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔

اخلاقیات..... تیسرا شعبہ اخلاقیات کا ہے۔ عبادات اور عقیدہ درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قلب کی حالت درست نہ ہو اور قلب محل اخلاقیات ہے۔ لہذا جب تک اخلاق انسانی صحیح نہ ہوں گے یعنی جب تک صبر نہ پیدا ہو، حیا نہ پیدا ہو، شکر نہ پیدا ہو، سخاوت نہ پیدا ہو، شجاعت نہ پیدا ہو، توکل علی اللہ نہ پیدا ہو۔ انابت الی اللہ نہ پیدا ہو۔ یہ ملکات جب تک ذہن میں نہ جنمیں گے عقیدہ درست نہ ہوگا۔ عقیدہ درست نہ ہوگا تو عمل درست نہ ہوگا۔ اور عبادت درست نہ ہوگی۔ تو مدار آ کر ٹھہر جاتا ہے اخلاق پر۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاق کا ہے۔ لہذا اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اخلاق کو بلندی پر پہنچایا جائے۔ اور انسان کو جبلی طور پر جو بداخلاقیوں کے روگ لگے ہوئے ہیں یہ دور کر کے پاکیزہ اخلاق سے بدلا جائے۔ جبلی طور پر انسان میں حرص بھی ہے۔ بخل بھی ہے۔ حسد بھی ہے۔ کبر و عنوت بھی ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو مخلوق کے آگے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کو نکال کر کبر کی بجائے تواضع پیدا کی جائے۔ بخل کی بجائے سخاوت پیدا کی جائے۔ خود غرضی کی بجائے ایثار پیدا کیا جائے ہوس رانی کی بجائے قناعت کا جذبہ پیدا کیا جائے جب یہ اخلاق درست ہوں گے تو عقائد درست ہوں گے پھر اعمال درست ہوں گے اور جب اعمال درست ہوں گے تو انجام درست ہوگا۔ پھر زندگی بھی صحیح ہو جائے گی اور موت بھی صحیح ہو جائے گی۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاقیات کا ہے۔

معاملات..... چوتھا شعبہ معاملات کا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس طرح کا برتاؤ کریں معاملات میں نزاع ہو، جھگڑا ہو، اس کا سلجھاؤ کس طرح سے کریں۔ ہم ایک دوسرے سے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کریں، لین دین کس طرح سے ہو، قرض ادھار کے طریقے کیا ہوں گے، امانت رکھنے کے طریقے کیا ہیں اور ادائیگی کے طریقے کیا ہیں، اجارہ کے احکام کیا ہیں، اور زمین کے احکامات کیا ہیں تو معاملات کا شعبہ بھی اہم شعبہ ہے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے، اگر دیانت نہ ہو، امانت نہ ہو۔ لازمی طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوگا اور جب فساد پیدا ہوگا تو بد امنی پیدا ہوگی، جب بد امنی پیدا ہوگی تو نہ جان کی خیر رہے گی نہ

مال کی خیر رہے گی۔ ہر شخص غیر مطمئن رہے گا۔ پریشان رہے گا۔ اضطراب اور بے چینی قلب کا جو ہر بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے معاملات کی صحت اور خوبی یہ بھی اسلام کا اہم ترین شعبہ ہے۔

اجتماعیات..... پانچویں چیز اپنی قومیت کو سنبھالنا ہے، یعنی اجتماعی حالت کو درست کرنا ہے قوم میں اجتماعی طور پر ایک تنظیم ہو، قوم ایک نظم کے تحت زندگی گزارے، بد امنی نہ ہو کہ ایک کا رخ ادھر ہو اور ایک کا رخ ادھر ہو، ایک مشرق کو جا رہا ہے اور ایک مغرب کو جا رہا ہے۔ یا ایک ادھر سے آ رہا اور ایک ادھر سے دونوں ٹکرائیں آپس میں اور جھگڑیں اور خونم خون ہوں، بلکہ ایک نظم کے اندر پوری قوم جڑی ہوئی ہو۔ ایک نظام کے تحت چل رہی ہو۔ ہر ہر چیز اپنے محل کے اوپر قائم ہو۔

یہ پانچ شعبے ہو گئے ہیں۔ اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور اجتماعیات۔ اس پانچ شعبوں کو علماء کے ایک ایک طبقہ نے سنبھالا ہے اور لاکھوں علماء ایک ایک شعبے کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سنبھالا اور اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

متکلمین اسلام کی خدمات..... اعتقادات کو سنبھالنے اور ان کو ثابت کرنے کے لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ کھڑا ہوا جنہیں متکلمین کہتے ہیں، انہوں نے عقلی اور نقلی انداز سے عقائد کو حق ثابت کیا، استدلال سے عقائد کا فطری ہونا ثابت کیا سب عقیدے فطرت کے مطابق ہیں، کوئی عقیدہ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اسلام میں اس کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ یہی عقیدہ ہونا چاہئے۔

فطرتیں مطمئن ہیں کہ یہی عقیدہ درست ہے۔ ان حکماء اسلام نے حسی، عقلی، نقلی، فطری، ہر طریقے سے ثابت کر دکھایا، ایک ایک عقیدے کے لئے ہزار ہا دلائل قائم کئے اور اس سلسلے میں بڑی بڑی ضخیم ضخیم، عظیم عظیم کتابیں لکھی گئیں اور حجت و برہان سے عقائد مضبوط ہو گئے۔ اس لئے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کے سامنے اور ان کے عقائد کے سامنے، اللہ جزائے خیر دے متکلمین حکماء اسلام کو کہ انہوں نے اس سلسلہ میں خدمت کی اور اس دائرہ اعتقادات کو سنبھالا اور ثابت کر دکھایا کہ حق یہی ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

ائمہ اجتہاد کی خدمات..... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے اس کو سنبھالا ہے فقہائے اسلام نے اور ائمہ مجتہدین نے اور پھر ان کے نیچے دوسرے ائمہ کھڑے ہوئے اور فقہ کے بڑے بڑے اکابر نے اس کو مدون کیا اور مرتب کیا۔ باب وار فصل وار مسائل مقرر کئے، اپنی ترتیب کے ساتھ مسائل کو ترتیب دیا، ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں مستقل ایک فن بن گیا جس کے اندر ہزار ہا فروع داخل ہوئیں، ائمہ اجتہاد نے اپنے فقہ کے اصول سے قرآن و حدیث سے مسائل کا استخراج کیا، خود مسائل کو نکال کر پیش کیا اگر کہیں اصول فقہ میں اختلاف ہو تو فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہو اگر سب ائمہ ہیں دین حق پر ہیں اور حق ان میں دائر و سائر ہے۔

اگر امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلافات ہیں تو وہ حق و باطل

کے نہیں کہ ایک سمت حق ہو اور ایک سمت باطل ہو، ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ خطا اور صواب کے اختلافات ہیں کہ ایک طرف صواب ہے اور ایک طرف خطا، لیکن ساتھ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ یہ صواب ہے مگر احتمال ہے کہ خطا بھی ہو اور یہ خطا ہے مگر احتمال ہے کہ صواب بھی ہو۔ اسی لئے حق دائر و سائر ہے تمام ائمہ کے اندر اور تمام کے تمام نجوم ہدایت ہیں جس کا دامن آپ تمام لیں گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی، اگر کوئی شافعی المسلک ہے تو وہ بھی نجات یافتہ ہے۔ اگر کوئی حنفی ہے تو وہ بھی نجات کے مراتب طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مالکی یا جہلی ہے تو وہ بھی نجات کے راستے پر جا رہا ہے اور سب اللہ و رسول کی طرف دوڑ رہے ہیں، اس لئے کہ بنیاد سب کی ایک ہے وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ البتہ استخراج مسائل میں اصول الگ الگ ہو گئے ہیں۔

اختلاف مشرب..... اور یہ خود شریعت کی عین حکمت ہے اس لئے کہ ائمہ کے اختلاف سے امت کے اندر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اتنے راستے نکل آئے ہیں کہ جو جس ذوق کا ہے اسی راستے پر چل کر حق کو پاسکتا ہے، اگر ایک عظیم دریا ہو اور بہت بڑا لہجہ اٹھا ہوا سمندر ہو لیکن پانی پینے کا گھاٹ ایک ہی ہو تو لوگ ہزاروں میل سے سفر کر کے آئیں گے جب ہی پانی مل سکتا ہے ورنہ وہ پانی سے محروم رہیں گے، لیکن دریا اگر ایسا ہے کہ ہزاروں مشرب اور گھاٹ موجود ہیں جس سمت سے آئے وہی پانی، وہی مزہ، وہی ذائقہ ہے۔ صرف سمت بدلی ہوئی ہے۔ ایک مشرق کی طرف ہے ایک مغرب کی طرف ہے تو کچھ آسانی ہوگی کہ دریا بڑا ہے اور مشرب اور گھاٹ بہت ہیں۔ ہر طرف سے پانی مل سکتا ہے تو اسلام ایک اتھاہ سمندر ہے اس کے مشارب بہت ہیں۔ ایک مشرب حنفی ہے اور ایک مشرب مالکی ہے۔ ایک مشرب جہلی ہے اور ایک مشرب شافعی ہے۔ اور یہ چار ائمہ وہ ہیں کہ حسن تدبیر کہئے یا تقدیر خداوندی کہئے کہ یہ چار مذہب دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔ ورنہ ائمہ اجتہاد سینکڑوں پیدا ہوئے، امام بخاریؒ خود مجتہد ہیں۔ عبد اللہ بن مبارکؒ خود مجتہد ہیں۔ حماد بن سلمہؒ خود مجتہد ہیں۔ سفیان ثوریؒ مجتہد ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ مجتہد ہیں۔ ہر ایک کی فقہ الگ الگ ہے۔ لیکن یہ خدا کی طرف سے بات ہے کہ بقیہ فقہیں مندلس ہو گئیں اور باقی نہ رہے اور یہ چار فقہیں دنیا کے اندر رائج ہو گئیں۔

فقہائے اسلام اور ان کا تادب..... امام ابو حنیفہؒ کوفہ میں پیدا ہوئے خراسان کی طرف ان کا فقہ چلا تو پورا خراسان حنفی پورا افغانستان حنفی، ہندوستان کا اکثر حصہ حنفی، پورا ترکستان حنفی، جہاں جہاں ان کا فقہ پھیلا وہاں وہاں حنفی ہو گئے۔ چونکہ اللہ و رسول کی محبت انتہا پر تھی اسی لئے ادب بھی بے حد تھا۔ چنانچہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئے، مدینہ منورہ روضہ اقدس پر بھی حاضری دی تو سات دن کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر تمام اہل مدینہ سر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ جب سارے مصر ہو گئے تو ٹھہر گئے، دس دن ہو گئے تو پھر اجازت چاہی۔ مگر اہل مدینہ نے پھر گھیرا ڈال لیا کہ ہم ابھی اجازت نہیں دیں گے، گیارہویں دن آپ نے فرمایا کہ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اس پر اہل مدینہ نے معلوم کیا کہ ناطقہ کی کیا بات ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ

جب سے مدینہ میں آئے ہیں۔ استنجا نہیں فرمایا ہے۔ نہ پیشاب نہ پاخانہ کہ مناسب نہیں۔ مدینہ کی ارض مقدس کو نجاست سے آلودہ کرنا اس لئے اب میرے اندر طاقت نہیں تو پھر اہل مدینہ نے خود باعزت و احترام رخصت کیا۔ یہ تھا ائمہ کا ادب و احترام کہ جتنی محبت غالب تھی ان حضرات میں اتنا ہی ادب و احترام تھا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ..... آپ کی پیدائش ہوئی مصر میں مقام غزا میں، ابتدائی زمانہ مصر میں گزرا اور عمر کا اکثر حصہ حجاز میں گزرا اور عمر کا آخری حصہ بھی مصر میں گزرا۔ مصر تقریباً سب کا سب شافعی المسلک ہے۔ حجاز میں بھی تقریباً سب فقہ شافعی پر چل رہے ہیں۔ محبت و ادب میں ان کا بھی وہی حال تھا۔ جو دیگر ائمہ کا ہے۔ خوف و خشیت غالب اور تقویٰ اونچے درجے کا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ..... امام مالک امام دارالہجرہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ مدینہ سے ان کو شغف تھا اور مدینہ شہر میں کبھی جوتے پہن کر نہ چلے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو اور وہاں میرا جوتا گزرے اور مدینہ منورہ میں کبھی پاخانہ پیشاب بھی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مدینہ منورہ سے کئی میل دور نکل جاتے تھے۔ یہ ادب تھا اور تمام ائمہ میں اسی طرح سے ادب کی انتہا تھی۔ امام مالکؒ نے مدینہ منورہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور وہیں ہجرت فرمائی۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ مجھے مدینہ کی زمین قبول کر لے اور میں وہیں دفن ہو جاؤں۔ نفلی حج بھی نہیں کرتے تھے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں باہر میری وفات نہ ہو جائے اور میں مدینہ کی زمین سے الگ نہ ہو جاؤں۔

امام مالک نے ایک روز خواب دیکھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار مبارک قائم ہے اور امام مالک حاضر ہیں عرض کیا یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کر لے اور مجھے معلوم ہو جائے کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں۔ سال ہے یا دو سال ہیں تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے اور میں عمرہ کراؤں اور حج کراؤں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ اٹھایا کہ پانچویں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اب امام مالک حیران ہیں کہ پانچ انگلیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی ہیں تو آیا یہ مطلب ہے کہ پانچ دن باقی ہیں میری عمر کے۔ یا پانچ مہینے یا پانچ برس ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ امام مالک کے ہم عصر امام محمد بن سیرین ہیں جو تعبیر خواب کے امام ہیں اور خواب کی تعبیر پر انہوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جلیل القدر امام ہیں اور ایسی تعبیر دیتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ان کو یہ مناسب تعبیر سے تھی۔ اس قسم کے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ تو امام مالک نے ایک شخص سے کہا کہ تم جا کر ابن سیرین سے میرا خواب بیان کرو مگر میرا نام مت لینا۔ یہ کہنا کہ مدینہ میں رہنے والے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ شخص حاضر ہوا اور اس نے ابن سیرین سے کہا کہ مدینہ کے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ دن مراد ہیں یا پانچ مہینے یا پانچ برس مراد ہیں؟ ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب تو

بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ جاہل کا کام نہیں کہ اس قسم کا خواب دیکھے اور نہ جاہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب دے سکتے ہیں۔ یہ جواب تو بڑے عالم کو ہی دے سکتے ہیں۔ اور مدینہ میں اس وقت امام مالک سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ تو کہیں یہ خواب امام مالک نے تو نہیں دیکھا؟ اب وہ شخص خاموش کیونکہ اسے تو روک دیا گیا تھا کہ میرا نام مت لینا، اس نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے اجازت لے آؤ۔ فرمایا ہاں اجازت لے کر آؤ۔ پھر ہم خواب کی تعبیر بتلائیں گے۔ وہ گیا اور جا کر عرض کیا کہ حضرات! وہ تو پہچان گئے کہ یہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں اور نام بھی لے دیا، مگر یہ کہا کہ پوچھ کر آ جاؤ پھر تعبیر بتاؤں گا۔ فرمایا اچھا جاؤ میرا نام لے دینا کہ مالک بن انس نے یہ خواب دیکھا ہے۔

اس شخص نے جا کر عرض کیا کہ حضرت! امام مالک نے ہی یہ خواب دیکھا ہے ابن سیرین نے فرمایا کہ ہاں امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ یہ خواب دیکھے فرمایا کہ: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھائیں اس سے نہ پانچ دن مراد ہیں نہ پانچ مہینے نہ پانچ برس مراد ہیں بلکہ اشارہ ہے کہ اس طرف کہ ﴿هِيَ خَمْسٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ﴾ ① یعنی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ﴿وَمَا تَذَرِي نَفْسٌ بَأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ ② کسی کو پتہ نہیں کہ میرا انتقال کس زمین پر ہوگا اور میں کہاں دفن ہوں گا اور کیا وقت ہے میرے انتقال کا۔ قرآن کریم کے اندر فرمایا گیا کہ اصول غیب کے پانچ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا فرمایا گیا ﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ ③ اس کے نظام کو صرف اللہ جانتا ہے قیامت کب آئے گی۔ کسی کو پتہ نہیں حالانکہ قیامت کا عقیدہ قطعی ہے، قرآن سے ثابت ہے ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر وقت کا پتہ کسی کو نہیں حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ جبریل امین نے آپؐ سے پوچھا مَتَى السَّاعَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ”مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ“ ④ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ مجھے علم نہیں ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ قیامت آئے گی مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ یہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تو امام ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب امام مالک ہی دیکھ سکتے تھے، خواب بھی علمی ہے جواب بھی علمی ہے اور حدیث کی طرف اشارہ ہے، امام مالک ہی اس کے مخاطب بن سکتے ہیں۔ ابن سیرین نے اس آدمی سے فرمایا کہ امام مالک سے کہہ دینا کہ حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ موت کہاں آئے گی کس زمین میں آئے گی۔ اس کا علم ان پانچ چیزوں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

① بارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۳۔ ② بارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۳۔ ③ بارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۳۔

④ الصحيح للبخاری، کتاب الايمان، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ، ج: ۱، ص: ۸۷، رقم: ۳۸۔

امام مالک یہ جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور پھر گھر سے نہیں نکلے یہاں تک کہ وفات ہو گئی اور مدینہ کی زمین نے قبول کیا اور جنت البقیع میں مزار ہے جو ہر مسلمان کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ تو بہر حال امام مالک امام دارالہجرہ ہیں اور ان کا زیادہ تر فقہ مغربی ممالک میں پھیلا ہوا ہے جو عرب کے مغربی حصے ہیں ان میں زیادہ تر مالکی ہی آباد ہیں۔
امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ..... امام احمد بن حنبل کا قیام نجد میں رہا ہے۔ اسی لئے نجد اور یمن کے لوگ بکثرت حنبلی ہیں اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں۔

احسانِ عظیم..... تمام ائمہ برحق ہیں جس کا دامن تمام لوگ انشاء اللہ نجات ہو جائے گی یہ سب حضرات حقانی ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے اصول فقہ اور اپنے اجتہاد سے کتاب و سنت سے مسائل اخذ کئے اور مسائل نکال کر دین کو باغ و بہار بنا دیا اور ایک لاء اور ایک قانون کی صورت میں فقہ کو مرتب کیا۔ جن کے ابواب الگ الگ ہیں۔ باب الافاضات، باب المعاملات، باب المساقات، باب المزارعة، باب الاراضی وغیرہ۔ سارے مسائل ان ابواب کے نیچے جمع ہیں۔ ساری چیزیں استخراج کر کے جمع کر دی ہیں۔ ان کا بھی امت پر احسان عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مقابر کو نور سے منور فرمادے اگر یہ استخراج نہ کرتے تو اتنی جزئیات ہمارے پاس فقہ میں موجود نہ ہوتیں۔ بڑی دقت اور دشواری پیش آتی۔

عرفاءِ اسلام کی خدمات..... عرفاءِ اسلام جن کا دوسرا نام صوفیاء کرام ہے۔ ان حضرات نے اخلاقیات کو سنبھالا ہے اس طرح پر کہ بال کی کھال نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کر دی۔ روح کی حکمت بیان کی اور بتایا کہ نفس میں اتنی مکاریاں ہیں ان کا توڑ یہ ہے۔ کہ اگر نفس میں یہ کید پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے اور نفس میں یہ خواہش پیدا ہو تو اس کا دفیہ یہ ہے۔ اور کوئی رغبت اور تمنا پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے۔ یہ ان حضرات صوفیاء ہی کا طفیل ہے کہ حکمتِ قلب کی انہوں نے تعلیم دی اور انہوں نے دلوں کو منور کیا اخلاق سے اور ان ہی اخلاق کے ذریعہ تزکیہ نفس کیا اور انسان کو انسان بنایا۔ فَجَزَاَهُمُ اللَّهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ

أُمرَاءِ اسلام کی خدمات..... أُمراءِ اسلام انہوں نے شعبہ معاملات کو سنبھالا۔ لین دین اور جھگڑوں کے فیصلوں پر أُمراءِ اسلام مقرر ہوئے، دنیا بھر کے جھگڑے منٹائے۔ لوگوں کے مقدمات فیصل کئے، فوجداری کے الگ دہوانی کے الگ ہر ہر دائرے کے مقدمات سنبھالے اور مستقل کتابیں لکھیں گئیں، حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ہے ”الہیاستہ الشرعیۃ“ اور اسی طرح بہت سے ائمہ علوم نے کتابیں لکھیں کسی نے سیاست کے اصول واضح کئے ہیں، فصل خصومات اور مقدمات کا فیصلہ کرتے کے لئے اس لئے ان امرائے بہت اونچا کام کیا ہے کہ اس شعبہ کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ فَجَزَاَهُمُ اللَّهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ

خلفاءِ اسلام کی خدمات..... اس پانچویں شعبہ کو سنبھالا ہے خلفاءِ اسلام نے جیسے صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ وغیرہ یہ حضرات درحقیقت ذمہ دار تھے ملک کے نظام کے تنظیم ملت اور تنظیم امت کے ان حضرات نے پوری امت

کو اور مغرب و مشرق کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا کہ نہ آپس میں لڑیں نہ جھگڑیں نہ تعصبات برتیں نہ آپس میں گالم گلوچ کریں نہ سب و شتم کریں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو محبت سے پیش کر دیں، دوسرا محبت سے جواب دے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے معذور سمجھو اور یہ خیال کرے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ دوسرا حق پر ہو۔ یہ کہنا کہ میں ہی حق پر ہوں، دوسرا غلطی پر ہے۔ رائے وہی کے معاملہ میں بالکل غلط چیز ہے۔ خلفاء کیلئے طریق عمل..... سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنے ایک خلیفہ کو خلافت عنایت فرمائی اس زمانے کے دستور کے مطابق پکڑی باندھی اور کچھ وصیتیں کیں اور کہہ دیا کہ تم میری طرف سے نائب اور خلیفہ ہو جا کر لوگوں کی تربیت کرو، اصلاح کرو ان خلیفہ نے رخصت کے وقت عرض کیا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرمائیے تاکہ میں اس نصیحت پر کاربند رہوں۔ حضرت نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ: نہ تو نبوت کا دعویٰ کرنا اور نہ خدائی کا دعویٰ کرنا۔

خلیفہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوئے کہ حضرت آپ کا خادم غلام برسوں آپ کی صحبت میں رہا کیا مجھ سے یہ ممکن ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا غلام ہو وہ کب نبوت کا دعویٰ کرے گا؟ تو حضرت نے یہ کیسی نصیحت فرمائی۔ نصیحت فرماتے کہ بھائی عبادت میں ثابت قدم رہنا اخلاق کی حفاظت کرنا مخلوق کی اصلاح کرنا اور یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا یہ تو ہم لوگوں سے ممکن ہی نہیں اس نصیحت سے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کہ اس کے معنی سمجھ لو پھر بات سمجھ میں آ جائے گی۔

فرمایا: کہ خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہہ دے وہ اٹل ہو۔ اگر وہ چاہے کہ زمین بنے تو زمین بن کر رہے۔ ناممکن ہے کہ نہ بنے۔ ارادہ خداوندی پر مراد کا مرتب ہونا قطعی اور لازمی ہے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ ارادہ فرمائیں اور وہ پورا نہ ہو وہ تو قادر مطلق ہیں۔ ﴿إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ ① اگر وہ ارادہ کرے کہ جہان بنے تو اسے محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسباب فراہم کریں، وہ اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب کے تو وہ خالق ہیں وہاں تو منشاء ہے کہ ہو جائیں وہ ہو جاتی ہے تو اللہ کی ذات وہ ہے کہ جو وہ ارادہ کرے اور کہہ دے وہ اٹل ہو ٹٹنے والی چیز نہ ہو۔

اور دعویٰ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ جو فرما دے وہ حق ہو۔ یوں ممکن ہی نہیں کہ نبی کی زبان سے کوئی ناحق چیز نکلے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے وہ حق ہوگا اور جو کر کے دکھائیں گے وہ بھی حق ہوگا۔ ناحق کا وجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ نبی جو کہے گا وہ حق ہوگا اور اس کے خلاف باطل ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کبھی خلاف حق نہیں ہو سکتی ہے، اگر تم نے جا کر یہ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اور میری رائے اتنی حق ہے کہ دوسرا سامنے نہیں آ سکتا۔ تو یہ درپردہ نبوت کا دعویٰ ہوگا۔ میں تم کو اسی کی

نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ نہ کرنا۔ نبوت کا دعویٰ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں کہو کہ میں نبی ہوں بلکہ اپنے اندر خاص وہ شان پیدا کر کے جو نبی کے اندر ہوتی ہے یوں کہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اس کخلاف سب باطل ہے۔ اس چیز کا مدعی بننا درپردہ نبوت کا دعویٰ ہے اور جو یوں کہے کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مخلوق کٹ جائے، خون بہہ جائے مگر یہ ہو۔ یہ درپردہ خدائی کا دعویٰ کرنا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے ارادے کو یوں مت سمجھنا کہ یہ اہل ہے اور ہونا ہی چاہئے اور اس کخلاف ممکن نہیں حالانکہ ہر چیز میں تمہارا خلاف ممکن ہے، یہ تو ہوا دعویٰ خدائی کا حاصل۔ اور دعویٰ نبوت کا حاصل یہ کہ جو تمہاری زبان سے نکل جائے اس پر جے رہو گویا کہ اس کخلاف باطل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے وہ خدا کا مقام ہے اور یہ نبی کا مقام ہے۔

تو حضرت شیخ نے بڑے بلیغ پیرائے میں نصیحت فرمائی۔ ظاہر میں تو بڑی وحشت ناک نصیحت تھی کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا، نبوت کا دعویٰ مت کرنا، مگر جب معنی بیان کئے خدائی اور نبوت کے تو سمجھ میں آ گیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی درپردہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جو جمود کرتے ہیں کہ وہی صحیح ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ وہ درپردہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ورنہ ان پر کوئی وحی یا الہام آ رہا ہے کہ وہی حق کہہ رہے ہیں دوسرا حق کہہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن وحدیث سے ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہی حق ہے اس کخلاف ہرگز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فکر کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ ہی حق ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ان جھگڑوں کا فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب امت کا نظام بنا ہوا ہو پھر اس قسم کے مدعی مغلوب ہو جائیں گے اور واقعی جو حقانی لوگ ہیں وہ غالب آ جائیں گے۔ یہ کام ہے نظام و تنظیم کا جب تک تنظیم نہ ہو، نظام نہ ہو اس وقت تک معاملہ نہیں سلجھ سکتا ہے۔ اس خدمت کو انجام دیا ہے خلفاء اسلام نے یہ ہی درحقیقت ملک کے نظام اور تنظیم ملت کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی حضرات نے امت کو جوڑا ہے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔

محققین شئون نبوت کی تعظیم ضروری ہے..... خلفاء اسلام نے تنظیم ملت کی ذمہ داری قبول کی۔ امراء اسلام نے جھگڑوں اور فیصلوں کو نمٹایا عرفاء اسلام نے اخلاق درست کئے فقہاء اسلام نے عبادات کو صحیح کیا اور حکماء اسلام نے عقائد کو درست کیا۔ یہ پانچ طبقے اکابر اہل اللہ کے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان پانچ شعبوں کو مضبوط کیا اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور امت کے سامنے پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ہوا تفصیل اس میں بہت ہے مگر میں زیادہ تفصیل نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ طالب علمانہ انداز میں کہوں گا یہ تو محض طالب علمانہ اندازہ ہے جو درس و تدریس میں طالب علموں کے سامنے کہا جاسکتا ہے اگرچہ آپ عربی طور پر طالب علم نہیں ہیں مگر حقیقتاً تو طالب علم ہیں ورنہ جلسوں میں کیوں آتے؟ علم کی طلب ہی تو آپ کو لے کر آئی ہے۔ آپ بھی طالب علم ہیں اور میں بھی ایک طالب علم ہوں۔ اور آپ سے کم رتبہ ہوں درس و تدریس نہ سہی مگر کچھ تو سمجھ جائیں گے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اتنی بات تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جو میں نے کہی ہے کہ پانچ شعبے ہیں اور ان پانچوں شعبوں کو پانچ طبقات نے اٹھایا ہے اور وہ طبقے سب کے نزدیک معظم و مکرم ہیں اس لئے امراء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اسی طرف عرفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اور خلفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ تو آدمی اپنی کس آنکھ کو پھوڑ لے؟ سب کو یکساں طور پر ہم کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا اسی بنا پر سب ہمارے نزدیک معظم و مکرم ہیں سب کے آگے گردن جھکانا ہمارا کام ہے۔

اگر کوئی شخص محدث کے آگے گردن جھکا دے۔ اور فقیہ کيخلاف کرے۔ وہ درحقیقت امتی ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ہے امت کا صحیح فرد وہ ہے کہ حکماء فقہاء صوفیاء عرفاء امراء خلفاء سب کو واجب التعظیم سمجھ کر سب کے آگے گردن جھکا دے۔ اس لئے کہ یہ پانچوں طبقے وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک شان کو سنبھالا ہے آپ کی ایک شان عقیدے کی ہے۔ ایک شان عبادت کی ہے ایک شان اخلاق کی ہے ایک شان معاملات کی ہے ایک شان خلافت و تنظیم ملت کی ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ شانیں ہیں انہیں نکرانے کا یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانوں میں تعارض پیدا کر رہے ہیں جو لوگ ان میں باہم ٹکرا دے رہے ہیں یہ سوائے جہل کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ شون نبوت میں ٹکراؤ پیدا کرنا علم والے کا کام نہیں ہے اور نہ علم والے کا کام یہ ہے کہ طبقات امت میں ٹکراؤ پیدا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے گردن جھکا دے اور ہر ایک تعظیم و تکریم ضروری سمجھے۔

نظم مسائل..... ایک دوسری بات اور سمجھ لیجئے وہ طالب علمانہ ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طبقے نے کتاب و سنت سے نظم قائم کیا ہے یعنی اسلامی مسائل بے تکتے نہیں ہیں ہر مسئلہ ایک لڑی کے اندر پرویا ہوا ہے اور مسائل کا ایک نظام ہے۔ اور پورے مسائل منظم ہو کر ایسے ہیں جیسے موتیوں کا ایک ہار ہوتا ہے اگر ایک موتی بیچ سے نکال دو تو ہار ناقص ہو جائے گا اور چونکہ ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے لہذا ہر شعبہ نہایت منظم ہے۔

تنظیم بلا امام ممکن نہیں..... آپ جاننے ہیں کہ نظم و تنظیم بغیر امام کے نہیں ہوتی مثلاً اگر تسبیح میں ایک ہزار دانے ہیں مگر امام نہ ہو جسے القند کہتے ہیں۔ وہ ایک لہبا دانہ ہوتا ہے تسبیح کے درمیان وہ اگر تسبیح میں نہ ہو تو وہ تسبیح نہ ہوگی بلکہ مالا کہلائے گی۔ اگر تسبیح ہی بنائی ہے تو ایک گرہ تسبیح میں ضرور ہونی چاہئے جسے آپ امام کہیں اسی سے سارے دانے جڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گرہ آپ اگر کھول دیں تو سارے دانے نکھر جائیں گے۔ جھاڑو میں ہزاروں سینکیں ہوتی ہیں ایک سینک کو آپ چٹکی سے مسل دیں تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر بندھن باندھ کر جھاڑو بنائیں تو گھر کا کوڑا کباڑ آدھ گھٹنے میں صاف کر دیں گی۔ ایک سینک یہ کام نہیں کر سکتی ہے ساری سینکیں مل کر پھینکیں گی۔ اور ملنے کی شرط یہ ہے کہ ان میں بندھن بندھے وہی بندھن ان کا امام ہے اگر ان میں بندھن نہ ہو تو وہ منتشر ہو جائیں گی۔ بکھر جائیں گی کوڑا کباڑ تو کیا صاف کرتیں وہ خود کباڑ بن جائیں گی۔ لیکن اگر بندھن باندھ دیا اور ایک ڈورے کے تابع کر دیا ان کو تو سارے گھر

کا کوڑا صاف ہو جائے اور جھاڑو ایک جگہ رکھی ہوئی موزوں نظر آئے گی۔ گویا کہ صاف کرنے کا آلہ موجود ہے۔ جو بڑے سلیقہ سے رکھا ہوا ہے۔ بغیر امام و بندھن کے نظام قائم نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ہر چیز میں اس نے نظم قائم کیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھوں اور جماعت کے اندر بھی پھر ترتیب قائم کی ہے کہ امام کیا کرے گا اور تم کیا پڑھے گا اور تم کیا پڑھے گے اس میں تمہیں آزادی نہیں بلکہ ایک نظم کے تحت نماز پوری کرنی ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے: إِذَا قَالَ الْإِمَامُ وَاللَّصَّائِلِينَ قُولُوا آمِينَ۔ یہ حدیث کا آخری ٹکڑا ہے مطلب یہ ہے جب امام اللہ اکبر کہے سب اللہ اکبر کہو جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، وہ سجدے کرے تم بھی سجدہ کرو، وہ قیام کرے تم سب قیام کرو اور جب امام ولا الصَّائِلِينَ کہے تم آمین کہو اور جب وہ سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔

تو تم کلیۃً امام کے تابع ہو ہر نقل و حرکت میں اگر تابع نہ ہوئے اور اطاعت نہ کی تو آپ جماعت سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا تو بس گئی آپ کی نماز اس لئے کہ آپ امام سے منحرف ہو گئے۔ جماعت کی نماز بن نہیں سکتی جب تک آپ اطاعت کامل نہ کریں۔ لیکن انفرادی طور پر بھی اللہ نے اجازت دی ہے کہ پڑھ لیا کرو جتنی چاہے پڑھو لیکن جماعت سنتِ موکدہ ہے اور بعض ائمہ کے یہاں واجب قرار دی گئی ہے اور بعض کے یہاں فرض ہے کہ اگر نماز یا جماعت ترک کر دی تو وہ اس کا مستحق کہ اس کو قتل کر دیا جیل میں ڈال دو۔ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں یہ سہولت ہے کہ وہ جماعت کو سنتِ موکدہ کہتے ہیں جو قریب قریب واجب کے ہوتی ہے تو جماعت بن نہیں سکتی جب تک امام نہ ہو اور امام، امام نہیں ہو سکتا جب تک کہ سب مطیع نہ ہوں امام بنادیا اور مقتدی کھڑے ہو گئے، لیکن کوئی تکبیر کہتا ہے تو کوئی تکبیر کے بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتا ہے۔ کسی نے سجدہ کیا تو کسی نے رکوع کیا۔ کسی نے مغرب کی طرف منہ کیا تو کسی نے مشرق کی طرف منہ کیا تو امام ہوانہ ہوا برابر ہے۔ امام جب ہی بنتا ہے جب سب مطیع ہوں۔

سمع و طاعت..... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَلَوْ أَمَرُ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ خَبِثَتْ يَدَايِهِ“ ① ”سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر امیر مقرر کر دیا جائے کسی ایسے حبشی غلام کو جس کے ہاتھ پیر بھی کٹے ہوئے ہوں“۔ کوئی صورت و جاہت کی نہ ہو اور تو مل کر اسے امیر بنادے تو ماورین پر سمع و طاعت فرض ہے اس کے خلاف مت کرو امت کا نظم جب ہی باقی رہ سکتا ہے، نماز فرض کی تو اس میں جماعت کا حکم دیا اور جماعت کے لئے امام بنانے کی لازمی طور پر ضرورت پڑے گی۔

فرائض امیر..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما ہیں اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے چند صحابہ کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھائی کسی کو امیر مقرر کرلو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے

زیادہ افضل ہم میں کون ہے؟ کہ جس امیر بنادیں آپ افضل الصحابہؓ ہیں فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کوئی اور بن جائے۔ عرض کیا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کار سب نے مل کر حضرت صدیق اکبرؓ کو ہی امیر بنادیا۔

حضرتؓ نے فرمایا کہ جب میں امیر بن گیا تو اطاعت کرو گے۔ عرض کیا کہ لازمی طور پر کریں گے عہد و پیمان لیا کہ منحرف تو نہیں ہو گے؟ عرض کیا کہ قطعاً نہیں۔ جب منزل پر پہنچے تو سب کے بستر کھول کر بچھانے شروع کئے لوگوں نے کہا حضرت ہم بچھائیں گے فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو امیر کی اطاعت واجب ہے کسی کو بسترہ نہیں بچھانے دیا کبھی جگہ صاف کر رہے ہیں کبھی کپڑا بچھا رہے ہیں جہاں کوئی آیا کہ حضرت میں کروں گا یہ کام فرماتے کہ میں امیر ہوں امیر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

لوگ عاجز آ گئے کھانا پکانے کا وقت آتا۔ تو جنگل سے لکڑیاں لا رہے ہیں کبھی بازار میں گوشت خریدنے جا رہے ہیں لوگوں نے عرض کیا حضرت! ہم یہ کام کریں گے۔ فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو لوگ عاجز آ گئے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ہمارے امام مقتداء بڑے اور ساری خدمات انجام دے رہے ہیں ہمارے جوتے بھی سیدھے کر رہے ہیں بستر بھی بچھا رہے ہیں کھانا بھی پکا رہے ہیں اور کوئی بول بھی نہیں سکتا اور جہاں کوئی بولا تو انہوں نے کہا کہ میں امیر ہوں واجب الاطاعت ہوں اس لئے لوگ عاجز آ گئے۔

عجیب لطیفہ..... اس سفر میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا۔ وہ بھی سنا دوں۔ گو مضمون سے متعلق نہیں مگر اس واقعہ کا جز ہے کہ ایک روز حضرت صدیق اکبرؓ نے کھانا وغیرہ پکا دیا مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی کام سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک صحابیؓ کو بھوک بے تحاشہ لگی۔ انہوں نے کھانے کے نگران سے کہا کہ بھائی کم از کم مجھے ایک روٹی دے دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔ نگران نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے اور ان کی جازت نہیں ہوگی تو میں کھانا نہیں دوں گا۔ انہوں نے بہت منت سماجت کی کہ بھائی مجھے ضعف طاری ہو رہا ہے۔ بھوک ستا رہی ہے۔ ایک آدھ روٹی دے دو! کچھ سہارا ہوگا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور ان کو روٹی نہیں دی۔

تو صحابہؓ جیسے مقدس ہیں ویسے ہی اندر خوش طبعی بھی ہے۔ فرمایا کہ اچھا میں تجھے سمجھوں گا نہ دے تو روٹی۔ اسی حال میں بھوکے بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ جنگل کی طرف اٹھ کر چلے، اچانک دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔ وہ گاؤں کا کھیا تھا۔ لباس سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاؤں کا بڑا آدمی ہے اور اچھی خاصی عمدہ اونٹنی پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ ان صحابیؓ نے کہا کہ چودھری صاحب کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے ایک غلام خریدنا ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس غلام موجود ہے اور پانچ سو درہم میں بیچ سکتا ہوں۔ چودھری صاحب نے کہا کہ پانچ سو درہم کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر غلام اچھا ہے انہوں نے کہا کہ بہت سمجھ دار ہے معاملہ طے ہو گیا اور پانچ سو درہم لے کر اشارہ ان کی طرف کیا جنہوں نے روٹی نہیں دی تھی کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو جا کر پکڑ لو اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے دماغ میں تھوڑی سی سنک ہے جب کوئی پکڑنے جاتا ہے تو کہتا ہے

کہ میں غلام کب ہوں؟ میں تو آزاد ہوں۔ اس کا خیال نہ کچھ انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا۔ بعضوں کے دماغ میں ہوا ہی کرتی ہے۔ ایسے میں انہوں نے کہا کہ چلائے گا بھی کہ میں غلام کب ہوں؟۔ میں تو حر ہوں۔ آزاد ہوں اس کا بھی خیال نہ کچھ یہ اس کی عادت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

چودھری صاحب نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل میرے ساتھ! اس نے کہا کہ: کہاں چلوں؟ چودھری صاحب نے کہا کہ: میرے گھر، اس نے کہا کہ: کیوں؟ کہنے لگے: میں نے تجھے خریدا ہے۔ اس نے کہا کہ: واللہ میں غلام نہیں ہوں، میں تو آزاد ہوں، اس نے کہا: مجھے معلوم ہے کہ تیری عادت یہی ہے۔ اب یہ چلا رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔ حر ہوں۔ مگر چودھری صاحب نے ایک نہ سنی۔ چودھری صاحب چونکہ طاقت ور تھے، زبردستی اٹھا کر اونٹ پر سوار کیا اور لے جانا شروع کیا اور اس نے ہائے وائے شروع کی کہ مجھے غلام بنا دیا، میں تو آزاد ہوں۔ اس نے کہا کہ میں تیری ساری داستان سن چکا ہوں۔ تیری عادت ہی یہ ہے۔

ادھر سے صدیق اکبرؓ چلے آ رہے تھے دیکھ کر یہ چلائے کہ امیر المومنین میرا تو ناطقہ بند کر دیا ہے اور مجھے غلام بنا دیا ہے اور یہ چودھری مجھے لئے جا رہا ہے۔ صدیق اکبرؓ کا سبھی لوگ احترام کرتے تھے۔ چودھری اتر اسواری سے اور سلام عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میرا ساتھی ہے اسے تو کہاں لئے جا رہا ہے۔ کہنے لگا حضرت جی میں نے تو اسے پانچ سو درہم میں خریدا ہے۔ فرمایا کہ یہ غلام نہیں، یہ آزاد ہے یہ کس نے بیچا ہے۔ اشارہ کیا کہ فلاں صاحب نے بیچا ہے۔ میں نے رقم بھی ان کو ہی دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ غلام موجود ہے لے جاؤ، حضرت صدیق اکبرؓ سمجھ گئے کہ کسی نے مذاق کیا ہے ان کے ساتھ جب واپس آئے تو جنہیں روٹی نہیں ملی تھی انہوں نے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اب کہو کیا حال ہے۔ تو نے مجھے روٹی سے عاجز کر رکھا۔ اب بتا۔ صدیق اکبرؓ جب پہنچے تو فرمایا: کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی میں نے اس کی بہت منت کی کہ بھائی آدھی ہی روٹی دے دو، کچھ سہارا ہو جائے گا۔ اس نے کہا: جب تک امیر نہیں آئیں گے میں نہیں دوں گا، تو میں نے بھی ایک مذاق کیا کہ اس کو پانچ سو درہم میں بیچ دیا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ بہت ہنسے وہ پانچ سو درہم واپس کئے گئے، جب اس کی گلو خلاصی ہوئی۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سنایا گیا تو آپ مسکرائے اور منہ پر رومال رکھ لیا جب بھی اس واقعہ کا ذکر آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے اور منہ پر رومال رکھ لیتے۔ گویا یہ عجیب لطیفہ بن گیا۔

نظم اجتماعیت..... یہ واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ نماز کے اندر بھی جماعت رکھی ہے اور اس جماعت کا ایک امام مقرر کیا ہے اور وہ بھی مطاع جس کی اطاعت کی جائے سفر پیش آئے تو اس میں ایک امام بنالیا جائے تاکہ سفر منظم ہو گھر میں اگر ہو تو ایک کو بڑا سمجھ لو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو گھر میں نظام پیدا ہوگا۔ حج رکھا تو اس میں امام الحج مقرر کیا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ زکوٰۃ رکھی تو بیت المال میں ایک کو امام مقرر کیا کہ وہ ہر چیز کی زکوٰۃ وصول کیا کرے تو ہر چیز میں ایک جماعتی اور

اجتماعی نظم قائم کیا اور اس کا ایک ایک امیر مقرر کیا اور اس کی سمع و طاعت واجب قرار دی کہ اس کی اطاعت کرو۔ اس طرح ہر فن کا ایک امام مقرر ہے عقیدہ میں مرکز حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے اس میں امام مقرر کئے گئے۔ چنانچہ عقائد میں دو بڑے بڑے امام ہیں۔ ایک امام ابو منصور ماتریدی ہیں اور ایک امام ابوالحسن اشعری ہیں یہ دو امام ایسے سمجھے جاتے ہیں کہ جن کی رائے فن عقائد میں فن کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اشعری ہیں اور بعض لوگ اپنی نسبت دوسرے امام کی طرف کر کے اپنے آپ کو ماتریدی کہتے ہیں ان میں آپس میں کچھ تھوڑے بہت اختلافات بھی ہیں مگر وہ اختلافات لفظی کے قریب قریب ہیں۔ عقائد سب کے ایک ہی ہیں جب اس فن کا کوئی بڑا مسئلہ پیش آوے تو رجوع کرو اس کی طرف کہ امام ابوالحسن نے یہ کہا ہے۔ فقہ کا مسئلہ ہو تو اس میں ایک امام مقرر کرو امام شافعی ہوں، امام ابو حنیفہ امام مالک ہوں جب کوئی مسئلہ اختلافی آئے تو کسی ایک کی اطاعت کر لو تاکہ تمہارے اندر نزاع نہ پیدا ہو۔

مبنی بر حجت اختلاف مذموم نہیں..... اس لئے کہ مسئلہ میں نزاع نہیں۔ مسئلہ میں اگر اختلاف ہو تو اختلاف حجت کا ہوتا ہے اور نزاع وجدال جو ہوتا ہے وہ نفسانی جذبے کے تحت ہوتا ہے اور وہ برا ہوتا ہے اور حجت سے جو اختلاف ہوتا ہے وہ برائیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ہر اختلاف برائیں ہے۔ مثلاً چور اور ڈاکو اتفاق کر لیں تو یہ اتفاق اچھا نہیں ہے۔ برائی میں اگر لوگ متحد ہو جائیں تو وہ اتحاد بھی برا ہوگا اور اگر بھلائی کے اوپر لوگ جمع ہو جائیں تو وہ اتحاد اچھا ہوگا۔

اب اختلاف کو لے لو اگر اختلاف حجت سے ہو اور اللہ و رسول کا حوالہ دیانت سے ہو تو وہ ایک پہلو ہوگا دین کا۔ وہ اختلاف ہوگا مگر جھگڑا نہ ہوگا۔ کیونکہ حجت اس میں موجود ہے۔ یہ جھگڑے اصل میں ہم اپنے جذبات سے کرتے ہیں اور مسلوں کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑنا نہیں ہے اگر مسلوں کی خاصیت لڑنا ہوتا تو پہلے تو صحابہؓ میں لڑائی چلتی کہ کوئی رفع یدین کر رہا ہے کوئی نہیں کر رہا ہے۔ کوئی امین بالجبر کر رہا ہے کوئی امین بالسر کر رہا ہے۔ کوئی فاتحہ کو امام کے پیچھے واجب قرار دیتا ہے اور کوئی ناجائز قرار دے رہا ہے تو سب سے پہلے تو صحابہؓ میں لڑائی چلتی اگر مسئلہ کی خاصیت لڑنا ہوتا۔ مگر سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت بھی قلب میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد ائمہ مجتہدین میں ڈنڈا چلتا جن میں اختلاف ہے۔ خوب لڑائی ہوتی مگر سارے ائمہ باہم متحد ہیں اس لئے کہ وہ اختلافات فروغی ہیں اور بنیادیں سب کی ایک ہیں۔ اس لئے قلوب میں سب ایک دوسرے کی عظمت لئے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا۔ وہیں مسجد تھی جب نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھی اور اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھی اور امام شافعیؒ کا مسلک جو کہ مستحب کے درجہ میں تھا یعنی رفع یدین نہیں کیا اور آمین زور سے نہیں کہی۔ پوچھنے پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ”مجھے صاحب مزار سے حیاء آتی ہے کہ ان کے قریب ہو کر ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔ جس جس مسئلہ میں گنجائش تھی اس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی اور جہاں جہاں جائز و ناجائز کا

اختلاف تھا اس میں وہ معذور تھے۔ چونکہ ان کی عظمت قلب میں موجود تھی اس لئے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ مسئلہ کہ خاصیت لڑائی نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات سے لڑتے ہیں اور مسائل کو اڑ بنا رکھا ہے۔

آمین بالشعر..... ہمارے بچپن کا زمانہ تھا ہمارے ہاں سہارنپور میں مارچ نام کا ایک کلکٹر تھا۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا نسلا یورپین تھا۔ مگر مذاق و ذوق اس کا ایشیائیت کا تھا کیونکہ اس کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ اس کے زمانے میں ایک جھگڑا پیش آیا کہ ایک حنفی کہیں اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ انہوں نے زور سے آمین کہی۔ اس نے آہستہ سے کہی۔ وہاں سب جہلا جمع تھے انہوں نے اس کی مار پٹائی کی کہ اس نے زور سے آمین نہیں کہی۔ پٹتے پٹتے وہ چلایا کہ خفیو! دوڑو، دوڑو، تمام حنفی جمع ہو گئے انہوں نے اہل حدیث پر حملہ کر دیا۔ اب اہل حدیث چلائے کہ اے الحمدیث دوڑو! ادھر سے اہل حدیث آ گئے۔ غرض لاشعی چلی کتنوں کے ہی سر پھٹے۔ بلوہ عام ہو گیا فریقین سے رپورٹ درج کرائی۔

مارچ کا زمانہ تھا اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین کے وکلاء نے بحث کی آمین کے مسئلہ میں۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آئی اس نے کہا کہ بھائی کیا آمین کسی جائیداد کا نام ہے؟ یا کوئی جاگیر ہے؟ یا کوئی بلڈنگ ہے؟ آخر تم کس چیز پر لڑ رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو؟ لڑائی عورت پر ہوتی ہے دولت پر ہوتی ہے۔ جائیداد پر ہوتی ہے۔ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو۔ آخر یہ لڑائی کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہ صاحب ایک حدیث میں آیا ہے کہ آمین زور سے کہو اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ آہستہ سے پڑھو۔ اس نے کہا بھائی، جسے زور سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ زور سے پڑھے اور جسے آہستہ سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ آہستہ سے پڑھے۔ آپس میں لڑتے کیوں ہو۔ اپنی اپنی حجت پر عمل کرو۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ آمین پر لڑائی کیسے ہو سکتی ہے۔ بات بھی ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے کی تھی۔ اس نے تحقیق کر کے فیصلہ لکھا اور فیصلہ بڑا دانش مندانہ لکھا۔ اس نے لکھا کہ میں روداد مسئلہ کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ: ”مسلمانوں کے یہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ 1 آمین بالجھر یعنی زور سے آمین پڑھنا۔ 2 آمین بالسسر یعنی آمین آہستہ سے پڑھنا 3 آمین بالشعر یعنی جھگڑا اٹھانے کے لئے آمین پڑھنا۔ یہ جتنا جھگڑا ہے نہ آمین بالجھر کا ہے اور نہ آمین بالسسر کا کیونکہ دونوں کے بارے میں پیغمبرؐ سے حدیث وارد ہے اور یہ جھگڑے کی چیز نہیں۔ یہ سارا جھگڑا آمین بالشعر کا ہے۔ لہذا یہ دونوں فریق مفسد ہیں۔ میں دونوں کو سزا کرتا ہوں۔“

مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا..... مطلب یہ کہ ہم لوگ آپس میں نفسانی جذبے کے تحت لڑتے ہیں اور مسائل کو اڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑائی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کی حجت ہے اس پر عمل کریں۔ لڑائی کے کیا معنی اور نفرت کے کیا معنی؟ آپس میں مل کر رہو اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو جبر تھوڑا ہی ہے۔ ان کے پاس بھی حجت ہے وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ فاسق ہے۔ کافر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ لہذا میری بات مانو۔ دوسرا باطل محض ہے۔ اس لئے وہ حق پر نہیں۔ یہ کہنا غلط بات۔ یہ

مسائل صرف آڑ میں ورنہ حقیقی لڑائی تو نفسانی جذبات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ لڑلڑ کر مسلمانوں نے حکومتیں برباد کیں۔ اپنی جائیدادیں تباہ کر دیں۔ اپنی بلڈنگیں برباد کر دیں، جب یہ دنیا چلی گئی تو رہ گیا دین اور لڑنا ضروری تھا۔ اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ کہا کہ اب دین کو آڑ بناؤ۔ اب جائیدادیں نہیں تو مسئلوں پر لڑو۔ فروعات پر لڑو۔ یہ صرف نفسانی جھگڑے ہیں۔ اگر حجت ہاتھ میں ہے تو اس میں جھگڑا ہی نہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اس لئے زور سے آمین کہتا ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ کہیں گے کہ آپ معذور ہیں کیونکہ آپ کے پاس حجت ہے۔ میرے پاس حدیث ہے۔ میں آہستہ سے آمین کہتا ہوں چونکہ میرے پاس حجت ہے امام شافعیؒ کہیں گے آپ بھی معذور ہیں چونکہ آپ کے پاس بھی حجت ہے۔ آپ بھی حق پر عمل کر رہے ہیں۔ میں بھی حق پر عمل کر رہا ہوں۔ معاملہ ختم ہوا نہ دوستی گئی، نہ نفرت پیدا ہوئی۔ نہ جھگڑا پیدا ہوا اس لئے کہ حجت ہے۔ جہاں اختلاف بلا حجت ہوتا ہے۔ تعصب سے، عناد سے، پارٹی بندی سے وہاں اصل میں لڑائیاں نفسانی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔ وہ مسئلے کی لڑائی نہیں ہوتی۔ وہ تو مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنا اندورنی بخار نکالنا مقصود ہوتا ہے۔

توحید مقصد..... میں عرض کر رہا تھا کہ فقہ کے مسئلے میں بہر حال کسی کو امام بنانا پڑے گا، جہاں اختلافی مسئلہ آوے کسی امام کی طرف رجوع کرے اور یہ فطری چیز ہے۔ مثلاً آپ علاج کرائیں اور چار طبیبوں کی چار رائیں ہو جائیں۔ ایک کہے کہ میں گرم دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں ٹھنڈی دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں خشک دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں تر دوائیں دوں گا۔ کیا کبھی آپ نے یہ کیا ہے کہ چونکہ طبیب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ لہذا مجھے انتقال کر کے قبر میں چلا جانا چاہئے۔ میں علاج نہیں کراؤں گا۔ چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ان اطباء میں سے آپ انتخاب کرتے ہیں کہ کسی ایک کی طرف رجوع کریں خواہ انتخاب کی کوئی بھی وجہ ہو۔ خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ جامعہ طبیبہ کا پڑھا ہوا ہے جو بہت بڑا طبی ادارہ ہے۔ لہذا یہ طبیب حاذق ہوگا۔ اس لئے اس کا علاج کراؤں گا۔

یا اس وجہ سے کہ اس کے مطب سے شفاء پانے والے بہت ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے تیر بہدف ہیں لہذا اس کا علاج کراؤں گا یا یہ وجہ ہو کہ یہ طبیب خاندانی طور پر طبیب ہے اس کے یہاں جدی طب چلی آ رہی ہے۔ لہذا طب سے جو مناسبت اسے ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔ اس بنا پر میں اس کا علاج کراؤں گا کہ کوئی بھی وجہ ہو مگر آپ انتخاب کریں گے۔ اس لئے کہ جان عزیز ہے محض اس بناء پر کہ اطباء میں اختلاف رائے ہے۔ آپ موت کو ترجیح نہیں دیتے زندگی پر۔ کہتے ہیں کہ زندگی ڈنی چاہئے اور علاج ہونا چاہئے۔ تو ان اطباء میں سے کسی کو بھی منتخب کرلو۔

اگر علماء میں اختلاف رائے ہو اور آپ یہ کہیں کہ علماء تو لڑ رہے ہیں لہذا ہم دین اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابدی موت کو ترجیح دیتے ہیں اور موت کو قبول کرتے ہیں۔ یہ آج تک کسی نے کیا ہے؟ انتخاب کرنا پڑے گا۔ جس کی طرف آپ جائیں یہ دیکھیں کہ اس کا علم مستند ہے۔ اس کے مشائخ سند صحیح کے ساتھ نبی کریمؐ تک پہنچے ہوئے

ہیں۔ اور جو احکام یہ بیان کرتے ہیں ان کی سند کا سلسلہ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہے۔ لہذا ہم ان کے مسائل پر عمل کریں گے۔ دوسروں کے مسئلے پر عمل نہیں کریں گے۔ کوئی بھی وجہ ہو مگر انتخاب کرنا پڑے گا۔

اطباء میں اختلاف رائے ہو تو ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اگر علماء میں اختلاف ہو تو دین سے بدظن ہو جاتے ہیں کہ صاحب! کس کی مانیں؟ مولوی تو آپس میں لڑ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جان زیادہ عزیز ہے ایمان زیادہ عزیز نہیں ہے۔ وہاں چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ڈاکٹروں میں کتنے ہی شدید اختلافات ہوں کسی کا انتخاب ضرور کریں گے۔ یہاں اگر ایمان عزیز ہوتا تو کتنا ہی اختلاف ہوتا علماء میں کسی نہ کسی کا انتخاب ضرور کرتے اور اس کی پیروی کرتے چونکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ جان تو عزیز ہے مگر ایمان عزیز نہیں ہے۔

بہر حال اپنا امام ضرور بنانا پڑے گا اور اشخاص میں سے انتخاب ضرور کرنا پڑے گا اور ایک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ طب کے اندر ہو تو رجوع کرنا پڑے گا کسی طبیب کی طرف۔ ایک دم چار کا علاج جاری کریں تو آپ کا مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا اور جلد ہی آپ قبر میں تشریف لے جائیں گے۔ اس لئے کہ ایک طبیب صبح کو ٹھنڈی دوا دے گا تو دوسرا شام کو گرم دوا دے گا، تیسرا تر دوا دے گا، چوتھا خشک دوا سے علاج کرے گا تو مریض تختہ مشق بن جائے گا اور وہ قبر میں جانے کی تیاری شروع کر دے گا۔ اس لئے ایک ہی کا علاج کریں۔

توحید مطلب..... طریقت میں آپ نے بیعت کی تو وہاں بھی توحید مطلب ہے کہ جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کریں یہ سمجھیں کہ میری دنیا و آخرت کی خوبی اسی شیخ میں ہے دوسرے کی طرف رجوع مت کرو۔ ہاں عظمت سب کی کرو۔ احترام سب کا کرو مگر قلب کا علاج ایک ہی سے کرو۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام توحید مطلب ہے۔ یہ ہے کہ وحدت ہونی چاہئے اس شخص کے لئے جس کو آپ نے شیخ بنالیا ہے۔ شیخ دو یا تین نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہوگا اور ایک ہی کے طریق پر چلنا پڑے گا۔

ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شیخ واقعی اہل سنت میں سے نہیں ہے بلکہ مبتدع ہے تو ترک کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر حضرات صوفیاء لکھتے ہیں کہ ترک کر کے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرو مگر اس پہلے کی شان میں بے ادبی مت کرو، چاہے وہ اپنی ذات میں کیسا ہی ہو، گستاخی مت کرو۔ ادب سے پیش آؤ۔ تو طریقت کے اندر توحید مطلب ہے اور طب کے اندر توحید مطلب ہے۔ تو آخر ظلم کے اندر توحید مقصد کیوں نہیں ہونا چاہئے اور کسی ایک امام کو کیوں مقرر نہیں کرتے کہ آپ اس کے فقہ پر عمل کریں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ ڈانواں ڈول رہیں گے، کبھی ادھر، کبھی ادھر اور یہ نفس کی اتباع ہوگی کسی امام کا اتباع بالکل نہ ہوگا اور شریعت میں نفس کا اتباع مطلوب نہیں۔

تو شریعت نے ہر معاملے میں نظم قائم کیا، عقائد میں الگ نظم ہے۔ اور فقہ کے مسائل میں الگ نظم ہے۔ مقصد یہ کہ امت جڑ جائے۔ چاہے اختلاف رائے بھی ہو مگر باہم متفق و متحد ہو جائیں۔ اسی طرح سے جب آپ حضرات صوفیاء کے پاس جائیں گے اور اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں گے تو ان کے بھی مختلف طرق پائیں گے۔

چشتیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ سہروردیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ قادریہ کے وظائف اور ہیں مگر ہیں سب حضرات اہل اللہ اور سب حضرات اہل حق ہیں۔ لیکن چاروں میں آپ ایک دم بیعت کرنے کے چاروں سے علاج کرائیں تو دین فاسد ہو کر رہ جائے گا اس لئے کہ متضاد چیزوں پر عمل کیسے کریں۔ لہذا ایک ہی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہاں عظمت و احترام سب کا کرنا پڑے گا اور خادم سب کا بننا پڑے گا مگر علاج ایک سے کرائیں۔ تو تصوف کے اندر بھی توحید مطلب ہے جیسے طب کے اندر توحید مطلب ہے۔ اور فقہ کے اندر توحید مقصد ہے۔

امیر معاملات..... اسی طرح سے جب معاملات پیش آئیں تو کسی نہ کسی کو امیر تو بنانا پڑے گا مثلاً کوئی جھگڑا ہو، اب راستہ چلتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی کیسے فیصلہ کروں، ایک نے کہا کہ یوں کرو، دوسرے نے کہا کہ یوں کرو، تیسرے نے کہا کہ یوں کرو۔ اگر تینوں کی رائے پر عمل کیا تو وہ جھگڑا تو یوں ہی رہ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ گھر بھی فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک متدین شخص کو اپنا امیر بنا لیا کہ بھائی! ہم تم سے فیصلہ چاہتے ہیں جو تم فیصلہ کرو گے ہمیں منظور ہے۔ اگر صحیح کرو گے۔ تب بھی عمل کریں گے۔ اور اگر کوئی فکری غلطی بھی واقع ہو گئی تب بھی عمل کریں گے۔ مگر کرائیں گے فیصلہ آپ سے ہی۔ تو ایک قسم کا اطمینان و سکون ہو جائے گا۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ قضاء قاضی ظاہر و باطن نافذ ہو جائے گی۔ قاضی جب حکم کر دے کہ یہ ہے مسئلہ تو وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی نافذ ہو جاتا ہے یعنی اس کے خلاف پھر کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر بعد میں یہ بھی ثابت ہو کہ رائے کی غلطی تھی تو یہ بات نہیں کہ فیصلہ ٹوٹے گا، ایسا نہیں بلکہ جو فیصلہ ہو چکا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ چونکہ وہ فیصلہ من جانب اللہ ہے اور اس کے بغیر سکون و اطمینان قلبی اور یکسوئی نہیں ہو سکتی اس بنا پر قاضی کی قضا ظاہر و باطن نافذ ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے تو امراء اسلام اس لئے مقرر کئے گئے تاکہ وہ جھگڑوں کے فیصلے کر سکیں۔

حق امارت..... اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے پھر جن کو وہ امیر مقرر کریں وہ امیر بن جائیں گے۔ اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اگر سارے ملک کے مسلمان ایک امیر پر جمع نہ ہو تو خطوں کے امیر بنائے جائیں۔ ہر صوبہ کا الگ امیر ہو اور تمام مامورین پر اپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ① یہاں پر تین اطاعتیں واجب اور فرض قرار دیں۔ اللہ کی اطاعت، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، اولی الامر یعنی امیر کی اطاعت۔

اطاعت ذاتی اور وصفی..... قرآن تو قرآن ہی ہے وہ تو سرچشمہ ہے بلاغت و فصاحت کا اور معجزہ ہے اس نے جہاں اللہ کی اطاعت فرض کی وہاں تو اللہ کا نام ذکر کیا کہ اطیعوا اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرو۔ اسکے معنی یہ ہیں اللہ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں کسی وصف کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت نہیں ہے کہ جب اللہ کا نام آئے تو گردن جھک جانی

چائے اطیعوا اللہ علم ذات کا ہے۔ اس لئے کہ وہ بالذات واجب الاطاعت ہیں۔ ہم اور آپ کسی وصف سے واجب الاطاعت بنتے ہیں۔ آپ میں اگر علم آگیا تو علم کی وجہ سے آپ کی اطاعت ہوگی۔ ورنہ آپ کی اطاعت نہ ہوگی۔ مثلاً کوئی جاہل ہے اس کی کوئی بھی اطاعت نہیں کرتا ہاں علم کا وصف اگر آجائے تو اطاعت کرنے لگیں گے۔

اگر کوئی باپ ہے تو باپ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی استاذ ہے تو استاذ ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت ہوگی کوئی شیخ ہے۔ تو شیخ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی تو انسان بذاتہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ بالاوصاف واجب الاطاعت ہے۔ جب کوئی وصف کمال پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی۔

لیکن حق تعالیٰ شانہ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں۔ صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں کیوں کہ وہ ذات کا پرتو ہیں۔ دراصل سرچشمہ کمالات کا ذات ہے اور صفات اس لئے مقبول ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں مگر اصل ان سب کی ذات ہی ہے اور جب آگے کی اطاعت بتلائی گئی تو یوں نہیں فرمایا گیا کہ۔ اَطِيعُوا عَيْنَسِي يَا اَطِيعُوا مُؤَسِي يَا اَطِيعُوا مُحَمَّدًا۔ بلکہ فرمایا اَطِيعُوا الرَّسُولَ یعنی رسول وصف رسالت کی وجہ سے واجب الاطاعت ہیں۔ اسی وجہ سے اگر وہ کوئی ذاتی مشورہ دیں تو واجب الاطاعت نہیں ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی محبت کی وجہ سے اس کی منشاء کی بھی اطاعت کریں۔ لیکن قانون شریعت یہ ہے کہ اگر رسول کوئی ذاتی رائے دیں تو واجب الاطاعت نہیں البتہ جب یہ فرمائیں کہ میں حکم خداوندی پہنچا رہا ہوں تو وہ واجب الاطاعت ہے جب رسالت پہنچائیں گے تو اطاعت کرنا فرض ہے اور جب یوں فرمائیں کہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو آپ مختار ہیں۔ اور معذرت بھی کر سکتے ہیں، ادا باچا ہے آپ عمل کر لیں مگر آپ کے ذمے واجب نہیں ہے۔

جیسے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہوا۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں اور ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ سے کر دیا تھا۔ حضرت بریرہؓ حسین و جمیل اور بہت خوبصورت تھیں اور حضرت مغیثؓ کا لے کلوٹے اور بد صورت تھے۔ اس لئے آپس میں بنتی نہ تھی۔ رات دن آپس میں کھٹ پٹ رہتی تھی اور رات دن لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرماتے تھے مگر بہر حال قصہ چل رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کر دیا اب وہ باندی نہیں رہیں اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ منکوحہ باندی جب آزاد ہوتی ہے تو نکاح اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ چاہے تو باقی رکھے چاہے تو فسخ کر دے۔ اب جب کہ آزاد ہو گئیں تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ میں نکاح کو باقی نہیں رکھوں گی بلکہ فسخ کر دوں گی کیونکہ حضرت مغیثؓ سے ان کی موافقت نہیں ہوتی۔ پکارا ارادہ کر لیا کہ اب میں ان کے نکاح میں نہیں رہوں گی۔

اور حضرت مغیثؓ ان پر سوجان سے عاشق تھے جب انہیں معلوم ہوا تو پریشان ہو گئے۔ کبھی صدیق اکبرؓ سے سفارش کراتے ہیں کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس جاتے ہیں کہ آپ ان کو سمجھا دیں کہ وہ نکاح باقی رکھیں۔

انہوں نے سب کو جواب دے دیا کہ نہیں میں نکاح باقی نہیں رکھتی۔ آخر میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یا رسول اللہ! آپ نے ہی یہ نکاح باندھا تھا۔ اب بریرہؓ اس نکاح کو توڑ رہی ہیں۔ آپ ان سے فرمادیں کہ اس نکاح کو باقی رکھو۔ اور حضرت مغیثؓ بے حد پریشان حال ہیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ وہ وقت دیکھنے کے قابل تھا کہ حضرت مغیثؓ مدینے کی گلیوں میں روتے ہوئے پھر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ داڑھی پر آنسو ٹپ ٹپ کر رہے ہیں کہ ہائے بریرہؓ جدا ہو گئیں۔ اس درجہ عشق تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ آپ فرمادیں نکاح باقی رکھنے کو۔ حضور شریف لے گئے اور فرمایا: بریرہؓ نکاح مت توڑو مغیثؓ سے۔ میں نے ہی وہ نکاح قائم کیا تھا تم اب بھی قائم رکھو۔ وہ بھی بڑی ذہین تھیں۔ انہوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟“ آپ نے فرمایا: کہ نہیں حکم شرعی نہیں شرعاً تو تم آزاد ہو۔ نکاح رکھو چاہے توڑ دو۔ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔“ ①

بریرہؓ نے کہا پھر تو میں نہیں ماننی۔ آخر کار نہیں ماننا اور نکاح توڑ دیا تو معلوم ہوا کہ اگر نبی اپنی ذات سے کوئی مشورہ دیں تو وہ قانون واجب الاطاعت نہیں ہوتا، اگر رسالت پیش کریں کہ یہ حکم خداوندی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انبیاء بھی ذاتی طور پر واجب الاطاعت نہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے اور میں ذاتی بات کہوں اور اس پر ضد کروں کہ نہیں اس کو ماننا ضروری ہے۔ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ صرف ایک رائے ہے آپ کی، میری بھی ایک رائے ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جو حق ہو اس پر عمل کریں۔ تو اللہ نے جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا وہاں اپنا نام لیا ہے اور فرمایا اَطِيعُوا اللَّهَ کہ اللہ کی ذات واجب الاطاعت ہے۔ آگے رسول کا نام نہیں لیا بلکہ ﴿وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ ② فرمایا یعنی وصف رسالت کا تذکرہ کیا کہ اسی وصف رسالت کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہیں کہ جب رسالت خداوندی پیش کریں تو گردن تسلیم خم کر دو۔

اطاعت! امیر کا معیار..... ﴿وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ یہاں اَطِيعُوا ﴿ۛ﴾ کا لفظ بھی خصوصیت سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ ﴿اَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ ③ میں ذکر کیا تھا یہ وَاُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ بچھلے اَطِيعُوا کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اُولَى الْأَمْرِ ہو گا وہ تابع ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چونکہ آپ کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس لئے واجب الاطاعت ہے۔ مستقلاً اس کی اطاعت نہیں۔ اللہ کے رسول کا فرمان نافذ کرے گا تو واجب الاطاعت ہوگی ورنہ محض ذاتی مشورہ ہوگا کوئی واجب الاطاعت نہیں اور اُولَى الْأَمْرِ کا لفظ آخر میں ہے۔ اس کے بعد کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اس بناء پر تین اطاعتیں ہو گئیں۔ اللہ کی اطاعت۔ رسول کی اطاعت۔ اُولَى الْأَمْرِ کی اطاعت۔ ہاں اگر اُولَى الْأَمْرِ کوئی غلط حکم دے۔ تو اس کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے ذاتی حکم

① الصحيح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعۃ النبی ﷺ زوج بریرہ، ج: ۱، ص: ۳۳۲، رقم: ۳۸۷۵.

② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹ ﴿ۛ﴾ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹ ﴿ۛ﴾ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

واجب الاطاعت نہیں۔ جب وہ یوں کہے کہ قرآن شریف میں یوں آیا ہے تو پھر وہ واجب الاطاعت ہے چاہے وہ استنباط ہی سے کہتا ہو۔ نص صریح نہ ہو کیونکہ وہ قرآن ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن ہی کا مصداق ہے۔ اس لئے اس سے گردن پھیرنا جائز نہیں ہے۔

صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جب امیر المومنین تھے تو دربار خلافت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین! میرے خاوند کی آپ کیا بات پوچھتے ہیں۔ صَائِمُ الدَّهْرِ ہے۔ قَائِمُ اللَّيْلِ ہے۔ تمام راتیں عبادتیں کرتا ہے اور تمام دن روزے رکھتا ہے۔

فرمایا کہ ماشاء اللہ اللہ مبارک کرے بڑا اچھا خاوند ہے کہ عبادت گزار ہے، راتوں کو تہجد پڑھتا ہے۔ دنوں کو روزے رکھتا ہے مبارک ہو۔ وہ بچاری چکی ہو کر چلی گئی۔ دربار میں ایک صحابی موجود تھے جن کا نام اکثم تھا وہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ امیر المومنین! آپ سمجھے بھی! یہ کیا کہہ کر گئی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خاوند کی تعریف کر کے گئی ہے اور کیا کہتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت! اسے کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ دربار خلافت میں آ کر خاوند کی تعریف کرے کہ نمازیں اتنی پڑھتا ہے۔ روزے اتنے رکھتا ہے۔

کہنے لگے پھر کیا کہہ کر گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا: خاوند کی تعریف کرنے میں آئی تھی بلکہ استغاثہ اور دعویٰ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دعویٰ کیا کر کے گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا کہ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ساری رات تو رہتا ہے عبادت میں اور سارے دن رہتا ہے روزے میں یہ اللہ میاں کے کام کا تو ہے میرے کام کا نہیں ہے۔ یہ ہے اس کا منشاء وہ استغاثہ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور فرمایا کہ مجھ جیسے کو امیر بنا دیا ہے معاملہ سمجھنے کی بھی طاقت نہیں۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ امیر بنایا جاتا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی سمجھ دی ہے تو تو ہی فیصلہ کر اس مقدمے کا جب اس نے استغاثہ دائر کیا ہے اور خاوند کی شکایت کی ہے تو کیا حکم شرعی ہونا چاہئے؟

انہوں نے فوراً ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کیا کہ ”امیر المومنین! اس کے خاوند کو حکم دیا جائے کہ چار دن میں سے ایک دن ضرور افطار کیا کرے اور خوب کھانا کھایا کرے اور چار راتوں میں سے ایک رات بالکل نہ جاگے۔ بیوی کے پاس سویا کرے۔ تین راتوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب تہجد پڑھے اور تین دنوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب روزہ رکھے۔ تو ہر چار دن میں سے ایک دن اور ہر چار راتوں میں سے ایک رات خالی چھوڑے۔“

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اکثمؓ! یہ حکم تم نے کہاں سے نکالا ہے۔ انہوں نے کہا قرآن سے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ کہ اگر کسی بیوی کا خاوند رات دن عبادت کرے تو وہ چار رات دن میں سے ایک رات دن بیوی کے پاس گزارے۔ عرض کیا قرآن میں حکم ہے۔ ﴿فَإِنْ كُنْتُمْ خَوَافًا فَلَا تَجْعَلُوا مَتَابًا لَكُمْ مِنْ النِّسَاءِ مَتًى وَلَكُمْ وَرُبَاعٌ﴾ ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار غورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اگر

چار بیویاں ہوں تو چار راتیں انکے گھر جائیں گے۔ اگر چار میں سے ایک بیوی ہو تو تین راتیں خدا کی اور ایک رات بیوی کی۔ فرمایا: سبحان اللہ کتنا اچھا فیصلہ ہے۔ مجھ جیسے کو امیر بنادیا جس نے قرآن سے اتنا فیصلہ نہیں کیا۔ اس دن حضرت عمرؓ نے ان کو چیف جسٹس یعنی قاضی القضاۃ بنادیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سمجھ کو تیز کیا ہے۔ اس لئے تم ہی فیصلے کرو آج سے مسلمانوں کے مقدموں کے۔ ایک چاول سے پوری دیگ پرکھی جاتی ہے جب ایک فیصلہ کیا کہ جو کہ معمولی مسئلہ تھا قرآن سے پیش کیا۔ فرمایا کہ تیری سمجھ اس قابل ہے کہ آج سے تو مسلمانوں کے فیصلے کرے۔ اس بناء پر ان کو قاضی القضاۃ بنادیا۔

انحرافِ اطاعت موجب تفریق ہے..... بہر حال اطاعتیں تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کے جو نمائندے اور نائب ہیں ان کی اطاعت جب کہ وہ رسولؐ کی رسالت کو جاری کریں اور ان کے علم پر اعتماد ہو تو وہ واجبُ الاطاعت بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنا قوم کے اندر تفریق ڈالنا ہے اس لئے مامورین کے ذمہ ہے کہ ہر صورت میں جب کہ وہ حکم شرعی بیان کریں تو ان کی اطاعت کریں۔ لہذا جب ہم نے اپنا امیر شریعت بنالیا ہے اور بحمد اللہ ان میں امیر شریعت کے اوصاف بھی موجود ہیں جو اوصاف کہ واقعی طور پر ایک امیر کے اندر ہونے چاہئیں۔ خدا نے ان کو اہل بنایا ہے۔ جب آپ کو ایک اہل ملا تو آپ کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ اب ایسے اشخاص تو آنے سے رہے جو کبھی بھی غلطی نہ کریں۔ ہمیں اپنے ہی میں سے ہر ایک کو بنانا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہاں اتنا دیکھ لو کہ وہ بشر عمدہ ہو جس کی تمام زندگی تقویٰ و طہارت سے گزری ہو۔ جس کی زندگی میں صلاح اور رشد پایا جاتا ہو وہ بے شک اس قابل ہے کہ وہ ہمارا مطاع بن جائے اور غلطی سے تو کوئی بشر خالی نہیں ہر ایک انسان غلطی بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود واجبُ الاطاعت ہے تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک امیر بنادیا آپ کے لئے جو اہل ہے امامت کا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر ان سے کوئی اور افضل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ امیر سب سے افضل ہو۔ اگر دوسرا کوئی افضل بھی ہو تو اطاعت اسے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ قوم نے نل کر ان کو امیر مقرر کر دیا ہے۔

امارت کی بنیادی شرط..... اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب! میں ان سے زیادہ کامل ہوں۔ اس لئے امیر میں بنوں گا۔ تو مدعی کو امیر بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ خود شریعت میں مسئلہ موجود ہے ”لَا نُولِيْ اَمْرًا هٰذَا مَنْ طَلَبَهُ“ ① جو خود عہدے کی طلب کرے اسے کبھی عہدہ نہیں دیں گے۔

جو شخص عہدے سے بچے اور الگ رہے وہ اس قابل ہے کہ عہدہ اس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس واسطے کہ جب مسلمانوں نے عہدہ ڈال دیا اس کے ذمے اور امیر بنادیا اور امیر نے پھر ایک قاضی مقرر کر دیا تو قوم کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی ایسی بات سامنے آئے کہ صریح قرآن و حدیث کے خلاف فیصلہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب النهي عن طلب الامارة والحرص عليها، ص: ۱۳۳۳.

دیا اور تخریب کر دی تو بھائی اس وقت غور کرنا! کہ ایسے کو امیر کیوں بنایا، لیکن قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کر رہا ہے۔ تو اس بیچارے سے کیوں انحراف کریں؟

اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری..... امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اپنے معاملات میں ان کی طرف رجوع کریں اور سمع و طاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔ وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہوگی اور ایک کے تابع ہوگی تو اغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد و منظم قوم۔ جب عید کی نماز ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے پچاس پچاس ہزار آدمی ہوتے ہیں تو بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ یہ نظام کسی قوم کو نصیب نہیں ہے جو اس قوم کو دیا گیا ہے کہ ایک کے اشارے پر لاکھوں آدمی جھک رہے ہیں۔ حرم محترم میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک امام کے پیچھے تیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک امام زکوٰۃ کے پیچھے سارے اپنی زکاتیں پیش کر رہے ہیں۔ تو اسلام نے ہر ہر جزئی میں ایک نظم قائم کیا ہے اور نظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک جماعت نہ ہو اور جماعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور امیر نہ ہو اور امیر ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ سمع و طاعت نہ ہو۔ تو سمع و طاعت ہم سب کا فرض ہے ہمیں اور آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی توفیق دی کہ ہم نے اپنا ایک امیر مقرر کیا اور امیر محمد اللہ ایسا کہ قابل اعتراض نہیں ہے۔

انتخاب امیر کے لئے مجموعی زندگی کو پیش نظر رکھا جائے..... دنیا میں کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اعتراض سے بچی ہوئی ہو۔ اعتراض سے کوئی خالی نہیں۔ اعتراض جس پر چاہو کر دو۔ حتیٰ کہ اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول پر بھی اعتراض کر دیئے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

فَدَقِيلَ إِنَّ اللَّهَ ذُو وَلَدٍ وَقِيلَ إِنَّ الرَّسُولَ قَدْ كَهَنَ
مَنْعَا اللَّهَ وَالرَّسُولَ مِنْ لِسَانِ الْوَرَى فَكَيْفَ أَنَا

کہنے والے نے کہا کہ اللہ صاحب اولاد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیٹے ہیں اور باپ ہیں۔ اور حضرت مریم بیوی ہیں۔ رسول کے بارے میں کسی نے کہا کہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ساحر ہیں، کسی نے کہا کہ مجنون ہیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ جب اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول کو بھی نہیں چھوڑا تو میں کون ہو۔ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ دنیا میں کون ہے ایسا جس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ بھائی تھوڑا بہت تو اعتراض سب پر ہوتا ہے۔ مجموعی زندگی کو دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی زندگی سچائی سے گزر رہی ہے یا مکر و فریب سے۔ صلاح و تقویٰ پر گزر رہی ہے یا جہالت پر اس لئے اگر تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جائے تو وہ قابل غصہ ہے۔ ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ① جن کی نیکیاں غالب ہیں وہ اللہ کے یہاں بھی نجات پا جائیں گے۔ معصوم تو انبیاء علیہم

الصلوٰۃ والسلام کی ذوات گرامی ہیں۔

لیکن انبیاء کے بعد اولیاء محفوظ ہیں۔ پھر اولیاء کے بعد جتنے ہم اور آپ ہیں نہ محفوظ ہیں نہ معصوم ہیں۔ کبھی نہ کبھی کوئی غلطی ہو ہی جائے گی مجموعی زندگی کو دیکھ کر حکم لگے گا۔ ایک ایک غلطی نہیں پکڑی جائے گی۔ یہ بدینی ہوگی کہ ساری زندگی کی اچھائیوں میں سے ایک برائی پر نظر پڑی تو اس کو آپ نے اچھا لے دیا یہ تو عناد کی بات ہے۔ یہ کوئی آدمیت نہیں ہے۔ یہ ہے خَلَّتْ مَا كَرِهَ نَبِيٌّ كَرِيمٌ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا کہ ”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ خَلِيْلٍ مَّا كَرِهَ عَيْنَاهُ تَرِيَانِيْ وَفَلْبُهُ يَرْعَانِيْ اِنْ رَاى حَسَنَةً دَفَنَهَا وَاِنْ رَاى سَيِّئَةً اَفْشَاهَا۔“ (۲) ”اے اللہ! میں ایسے مکار دوست سے تیری پناہ لیتا ہوں جس کی آنکھیں مجھے دیکھیں اور اس کا دل میری ٹوہ میں لگا رہے اگر نیکی دیکھے تو اسے چھپالے اور اگر برائی دیکھے تو اس کو پھیلانا پھرے۔“

ایسا دوست پسندیدہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی برائی آپ کے سامنے ہو تو اس کی اچھائیوں کو بھی دیکھنا چاہئے اور ان اچھائیوں کی وجہ سے اس کی برائی نظر انداز کر دینی چاہئے۔ یہی قرآن کا فیصلہ بھی ہے۔ ﴿وَإِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ ① کہ نیکیاں تمام برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب ختم ہو گئی پھر برائی رہ ہی کہاں گئی جس کو اچھالا جائے۔ لیکن کہنے والے اور اعتراض کرنے والے تو ہر وقت اور ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ کام کرنے والے اگر اس کی پرواہ کریں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ قیامت میں جب باری تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی تو اعتراض کرنے والے بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والے بھی کھڑے ہوں گے۔ مگر کامیاب و سرخرو کام کرنے والے ہوں گے، تو شکر یہ ادا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ہمیں اپنا امیر بنانے کی توفیق دی اور آگے ہم اس کی توفیق بھی بارگاہِ صدی سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے امیر کی سمع و طاعت کریں اور ہم کو راہِ راست پر چلائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ ہمیں اسلام پر قائم و دائم رکھے، ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

آمِنْ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

① کنز العمال، ج: ۱، ص: ۳۷۹، رقم: ۳۶۶۶۔ ابن النجار عن سعید المقبری مرسلاً۔

② پارہ: ۱۲، سورۃ ہود، الآیۃ: ۱۱۳۔

الواعظ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَيْنَا بِكَلَامٍ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا . أَمَّا
بَعْدُ أَفَاعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ ، وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ
فَقَدْ فَازَ ، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ)

فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے..... بزرگانِ محترم! آج بعض ضروری کام کی وجہ سے وعظ کرنے کا ارادہ نہیں
تھا مگر چونکہ موذن صاحب نے اعلان کر دیا اس لئے موذن صاحب کے اور دوسرے حضرات کے اس جذبہ اور
شوق کے پیش نظر کہ آپ لوگوں کو وعظ سننے کا شوق ہے اور اس خیال سے آپ لوگ جمع ہو گئے ہیں کہ خدا کی، دین
کی اور شریعت کی کوئی بات کان میں پڑ جائے۔ آج میں آپ لوگوں کو ایسی بات بتلا دوں کہ کوئی واعظ ہو یا نہ ہو۔
مقرر ہو یا نہ ہو آپ لوگ وقت صرف کر کے کہیں جمع ہوں یا نہ ہوں جس حال میں بھی ہوں خود وعظ کہہ لیں اور خود
سن لیں۔ خدا اور رسول کی بات کہہ اور سن کر اس پر عمل کر لیں کہ مقصود عمل ہے۔ فائدہ نہ صرف کہنے سے ہوتا ہے اور
نہ سننے سے ہوتا ہے فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے۔ فرمایا۔

عقل فکر و نظر کا واعظ..... انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اس کی عقل ہے۔ اگر انسان عقل و تدبیر اور تفکر
سے کام لے، انقلابات زمانہ اور لیل و نہار کی گردش پر غور کرے اور سوچے تو اس سے اس جہان کے خالق اور اس کی
مخلوقات، عجیب و غریب کرشمہ سازیوں اور یوقلموں ایجادات کی طرف رہنمائی ہوگی۔ علوم و حقائق کا انکشاف ہوگا۔
رشد و ہدایت کی راہ کھلے گی۔ حیات، زندگی اور دنیا کی ناپائیداری اور نا ثباتی کا پتہ چلے گا۔ موت اور بعد الموت
پیش آنے والے واقعات کا علم یقین حاصل ہوگا۔ خدا اور آخرت کی طرف طبیعت رجوع کرے گی۔ حق تعالیٰ کا
ارشاد ہے۔ ﴿سَتَرْنَاهُمْ اَبْصَارَهُمْ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ② آفاق اور انفس میں خدائے برتر و بزرگ کی ہزار

ہا نشانیاں اور علامات موجود ہیں اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے دھیان دیا جائے۔ قلب کو متوجہ کیا جائے۔ عالم کی ایک ایک جزئی سے خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور بالغ النظری نمایاں ہوگی۔ مگر شرط دھیان اور توجہ ہے، جب تک دھیان اور توجہ سے دیکھا نہ جائے اور غور نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ کوئی حکمت ظاہر ہوگی اور نہ کسی مصلحت و دانائی کا پتہ چلے گا۔ دن رات کا مشاہدہ ہے۔ بازار میں، مدرسہ میں، گھر میں، جب تک آپ دھیان نہ دیں کسی کام یا چیز کو خیال اور توجہ سے نہ کریں اور نہ دیکھیں۔ اس وقت تک آپ کو اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ حالانکہ وہ واقعات آپ کی نظروں کے سامنے گزر رہے ہیں۔ آپ کے کان آپ کی آنکھیں اسے سن اور دیکھ رہی ہیں۔ لیکن پوچھنے پر آپ انہیں بتا نہیں سکتے، اس واسطے کہ آپ نے اسے دھیان اور توجہ سے نہیں دیکھا۔ قلب کو متوجہ نہیں کیا۔ تو اصل قلب ہے۔ قلب اگر متوجہ نہ ہو تو نہ کوئی دکھائی دے اور نہ کان کچھ سن سکے۔

یہ آنکھ اور کان قلب کی عینک اور چشمہ ہیں۔ انسان اگر صرف اپنے نفس، اس کے عدم، پھر وجود اور پھر عدم پر غور کرے اور دیکھے کہ دن اور رات میں، صبح اور شام میں اس خاک کے پتلے پر کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اور کن کن حالات سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی پیدا ہوتا ہے کوئی مرتا ہے۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار و مریض، کسی کی زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی ہے اور کسی کی تنگی اور عسرت سے۔ بہر حال اگر انسان آفاق و انفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے، اس کے حوادث و واقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل و بصیرت، تدبر اور تفکر سے کام لے۔ تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی۔ اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ اس عالم کون و فساد، اس کے حوادث، واقعات، انقلابات اور صبح و شام کے تغیرات پر نظر ڈالو، غور کرو، دھیان اور توجہ سے سوچو۔ یہ انقلابات تمہیں خالق کا، صانع کا، اور مالک کا پتہ دیں گے، خالق کے اقرار کے بعد اس کی قدرت، حکمت، علم اور ملوکیت کا نشان ملے گا۔ اس کے بعد اس سے محبت عقیدت اور تعلق پیدا ہوگا۔ پھر اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت کی طرف میلان پیدا ہوگا۔ آخرت، دین اور خدا اور رسول کی طرف طبیعت رجوع کرے گی اور یہی حاصل ہے وعظ کا، نصیحت کا اور تقریر کا۔ غرض عقل اس عالم میں غور و فکر انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اور مفت کا واعظ ہے۔

موت ایک خاموش واعظ..... دوسرا بڑا واعظ موت ہے۔ اگر انسان موت پر اس کے احوال پر اور یہ کہ موت کے بعد کیا پیش آنے والا ہے؟ اور یہ کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیا رہا؟ اور موت کے بعد خدا ہم سے کیا معاملہ کرے گا؟ ان احوال پر غور کرنا خود دین اور منشاء شریعت ہے۔ موت کی یاد سے خدا یاد آتا ہے، آخرت کی یاد آتی ہے، دنیاوی لذات سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی حاصل ہے وعظ کا اور نصیحت کا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔
كَفَى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا. انسان کے لئے بڑا واعظ موت ہے۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے اَنْخِرُوا ذُنُكْرَ هَازِمِ اللَّذَاتِ لَتَذُوقُوا مَوْتًا (موت) کا ذکر زیادہ کیا کرو۔ موت سے غافل نہ ہو۔ موت کا دھیان ہر وقت

رکھا کرو۔ اس سے دنیا میں اس کی لذات اور آرائشوں میں انہماک کم رہے گا۔ آخرت کی توجہ ہوگی۔ عبادت اور اطاعت میں جی لگے گا اور یہی اصل ہے وعظ کا۔ غفلت بہت بری چیز ہے۔ غفلت سے انسان خسارہ اور نقصان میں رہتا ہے، دنیاوی معاملات میں رات دن کا مشاہدہ ہے، بارش کے وقت اگر کاشتکار آرام میں رہے۔ ٹھنڈی ہوا اور سہانے وقت کے عیش میں پڑا رہے، نہ کھیت پر جاوے اور نہ بیج ڈالے نہ نولائی کرے اور نہ کھیت کی دیکھ بھال کرے تو ظاہر ہے کہ جب دوسرے کاشت کار اپنی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھ کر خوش ہوں گے اسے کاٹیں گے۔ غلہ اور اناج گھر لائیں گے تو یہ غافل کاشت کار کف افسوس ملے گا اور شرمندہ ہوگا لیکن اس نے وقت کھو دیا وقت کو ضائع کر دیا۔ غفلت اور لاپرواہی برتی۔ افسوس اور پچھتاوا اب کچھ کام نہیں دے گا۔ یعنی یہی حال آخرت کا ہے۔ حدیث میں ہے ”الْذُّنْيَا مَزْدَعَةٌ الْآخِرَةُ“ ① ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے“۔

دنیا میں اگر انسان توجہ سے دھیان سے کام کرتا رہے۔ غفلت نہ برتے، وقت کو ضائع نہ کرے، قلب میں ایمان کا بیج ڈالے، اعمال سے اس کی آپاشی کرے، خیر خیرات اور صدقات سے اس کی دیکھ بھال اور نولائی کرتا رہے، موت کو یاد رکھے، اعمال کا محاسبہ اور نفس کا مراقبہ کرتا رہے تو آخرت میں سرخرو ہوگا۔ کامیاب ہوگا اور فائز المرام ہوگا اور نقصان میں رہے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا ”النَّاسُ نِيَامٌ إِذَا مَاتُوا فَانْتَبَهُوا“ ② لوگ سو رہے ہیں۔ غفلت میں ہیں۔ جب مریں گے حساب و کتاب دیں گے۔ سوال و جواب ہوگا۔ اس وقت چونکیں گے، غفلت سے بیدار ہوں گے لیکن دورانِ تدبیر اور عاقبت میں وہ انسان ہے جو سوال و جواب، حساب و کتاب اور محاسبہ سے پہلے ہی اپنا حساب پاک و صاف رکھے نفس کا مراقبہ کرتا رہے۔

روزمرہ کے واعظ..... فرمایا گیا: ”مُوتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا حَاسِبُوا قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا“ ③ مرنے سے پہلے اپنے کو مرا ہوا سمجھو۔ محاسبہ سے پہلے اپنے اعمال اور احوال کا حساب کرلو، پاک و صاف ہو کر جاؤ۔ خدا کے دربار میں سرخرو پاک و صاف ہو کر حاضر ہو۔ غرض موت بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہے۔ موت سے پہلے مرض، بیماری، بڑھاپا، مصائب اور تکالیف بھی کم از کم مسلمان کے لئے واعظ اور مذکر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کو غور و خوض، دھیان اور توجہ کی ضرورت ہے۔ غفلت اور سستی چھوڑو۔ ہمت اور عزم و استقلال سے کام لو۔ تم تھوڑا کرو۔ خدا زیادہ توجہ کرے گا۔ تم خدا کی طرف ایک قدم بڑھو گے تو خدا دو قدم بڑھے گا۔ ”مَنْ أَتَى إِلَى شَيْءٍ أَتَيْتُهُ“

① المقاصد الحسنة، قال السخاوی لم أفق علیه مع إیراده الغزالی له فی الاحیاء، حرف الدال، ج: ۱، ص: ۱۱۸.

② یہ حضرت علی کا قول ہے۔ دیکھئے: کشف الخفاء ۳۱۲/۲.

③ حدیث کے پہلے حصے ”موتوا قبل ان تموتوا“ کے بارے میں علامہ عجلوی فرماتے ہیں: قال الحافظ ابن حجر هو غیر ثابت وقال القاری: هو من کلام الصوفیة، دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲، ص: ۲۹۱ جبکہ دوسرا حصہ ”حاسبوا قبل ان تحاسبوا“ حضرت عمر کا قول ہے، دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ، کلام عمر بن الخطاب ج: ۸، ص: ۱۲۹.

ذِرَاعًا وَمَنْ أَتَىٰ إِلَىٰ ذِرَاعَا أَتَيْتُهُ بَاغًا وَمَنْ أَتَىٰ إِلَىٰ مَشْيَا أَتَيْتُهُ هَرُولَةً. ① ”جو میری طرف ایک بالشت آوے میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آوے میں اس کی طرف ایک قدم یا ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف متوسط رفتار سے چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔“ (المحدث) کیا ٹھکانا ہے اس کی رحیمی اور کریمی کا۔ البتہ اس کی رحمت اور کرم لینے کو لینے کی اہلیت کے ساتھ ساتھ سعی اور کوشش کو بھی دخل ہے۔ تمہاری ادنیٰ توجہ سے خدا کی زیادہ توجہ ہوگی اور تم انشاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر دنیا سے جاؤ گے۔

نصیحت اور دعا پر تقریر ختم فرمائی۔

① الصحيح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ويحذرکم اللہ نفسه ج: ۲۰۲ ص: ۴۰۹.

اظہار تعزیت

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَذَاعِيًا إِلَيْهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِيرًا. أَمَّا
 بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ
 الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ)

موت کا جام.....

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے
 بزرگان محترم! دنیا میں موت و حیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینش عالم سے جاری ہے، ولادتیں بھی ہو رہی
 ہیں اور موتیں بھی آرہی ہیں، ولادت کے بعد موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عالم میں ہر کلیہ میں کچھ نہ کچھ
 مستثنیات نکلتے ہیں۔ مگر جس کلیہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں وہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ..... کا کلیہ ہے، جب
 انبیاء اور اولیاء اور دنیا کے بڑوں میں امراء و سلاطین مستثنیٰ نہیں رہے تو کون ہے کہ موت کے پنجے سے اسے بچا ہوا
 باور کر لیا جائے۔ پس جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی آخری منزل موت ہی ہے۔

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید ز جام دہر مئے کل مَنْ عَلَيْهَا فَإِنْ
 یعنی جو بھی پیدا ہوا ہے اسے بہر حال موت کا جام نوش کرنا ہے۔
 فَإِنَّ الْمَوْتَ غَايَةَ كُلِّ حَيٍّ ”موت ہی ہر زندہ کی آخری منزل ہے“۔ اسی لئے ولادتوں کے ساتھ
 موت کا سلسلہ بھی دنیا میں قائم ہے اور رہے گا۔

کسی کا کندہ گنگینہ پر نام ہوتا ہے کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
 عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے
 فرق مراتب..... لیکن ولادت و موت سب کی یکساں نہیں ہوتی بلکہ جیسے پیدا ہونے اور مرنے والے مختلف

① بارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۵۷۔

مراتب کے لوگ ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی ولادتوں اور موتوں میں تفاوت اور فرق مراتب ہوتا ہے کسی کی پیدائش صرف ماں باپ کے لئے خوش کن ہوتی ہے۔ کسی کی خاندان بھر کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ کسی کی ولادت پر پورا شہر خوشی کرتا ہے اور کسی کی پیدائش پر ملک بھر اور دنیا میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی موت بھی برابر نہیں۔ کسی کے مرنے پر کوئی بھی رونے والا اور میراث بانٹنے والا نہیں ہوتا۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد ہے

قُلْتُ ثُرَاتُهُ وَقُلْتُ بَوَاكِيهِ۔ ”نہ اس کے رونے والے نہ میراث لینے والے“۔

کسی کی موت پر صرف اس کے ماں باپ یا قریبی عزیز غم کر لیتے ہیں۔ کسی کی موت صرف خاندان کے لئے غم ساتھ لاتی ہے، کسی کی موت سے شہر کا شہر سو گوار ہو جاتا ہے اور کسی کی موت پر شہر ہی نہیں ضلع اور صوبہ روتا ہے۔ خان بہادر مرحوم انہیں لوگوں میں سے تھے کہ جن کی ولادت بھی صرف ایک گھر کی خوشی نہ تھی بلکہ کئی خاندانوں اور ایک پورے علاقہ کی خوشی تھی۔

احسانات کا غم..... اور آج جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا غم بھی صرف ان کے گھر کا غم نہیں بلکہ خاندانوں پورے شہر والوں پورے ضلع والوں بلکہ بعض حیثیات سے پورے صوبے کا غم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی ذات کو نہیں روتا، بلکہ اس کے اوصاف کو، اس کے احسانات کو اور اس کی خوبیوں کو روتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کہ اچھے اوصاف کا انسان مرنے کے وقت ہنستا ہوا اور خوش ہوتا ہوا اپنے اللہ سے ملتا ہے اس وقت دنیا روتی ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

یاد داری کہ وقت زادوں تو ہمہ خنداں شوند تو گریاں

آں چناں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں شوند تو خنداں

مجھے یاد بھی ہے کہ تیری پیدائش کے وقت تو تو رہا تھا اور سب خوشی سے ہنس رہے تھے۔ بس زندگی ایسے گزار کر مرنے کے وقت تو تو خوشی سے ہنستا ہوا اور سب روتے ہوئے ہوں۔“ تو یہ واقعہ ہے کہ خان بہادر مرحوم اسی شعر کے مصداق تھے کہ وہ تو انشاء اللہ اپنے نیک کردار کے سبب ہنستے ہوئے اپنے مالک سے جا ملے اور دنیا ان کے ماتم میں زور ہی ہے تو یہ رونان کی ذات کا نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خوبیوں کا ہے جو آج ہم سے چھن گئی ہیں۔

سلامتی فطرت..... خان بہادر مرحوم کی جوانی اور پیری میرے سامنے گزری ہے۔ میرا لڑکپن تھا اور وہ جوان تھے ان کی زندگی کا ایک عجیب اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ لڑکپن میں بلا مربی کے رہ گئے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک نو نہال جو خاندانوں کی آنکھ کا تارا ہو اور دولت سے گھر بھر پور ہو تمام وسائل زندگی اور مال و جاہ خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہو اور اوپر سے کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں مال و دولت کی فراوانی کی جو بری لت بھی پڑ جائے وہ حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ہزاروں رئیس زادے اس طرح بگڑتے دیکھے گئے کہ سر پر بڑا اور مربی نہ رہا اور خاندانی دولت بلا محنت ہاتھ لگ گئی تو

بدکار یوں اور برائیوں میں مبتلا ہو کر دولت بھی برباد کر دی، جائیداد بھی ضائع کر دی اور خاندانی وجاہت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن یہ خان بہادر کی ہستی تھی کہ گھر کی ریاست ہاتھ میں ہے سر پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں لیکن اپنی سلامتی فطرت سے وہ کسی بری لت کے شکار نہیں ہوئے، کسی عیاشی کی قہیش، کسی فضول خرچی، کسی نمود و نمائش کے چکر میں نہیں پھنسے ان کی جائیداد نہ صرف یہ کہ محفوظ ہی رہی، بلکہ باغ و راغ کا اس میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ بلاشبہ ان کے قلب کی سلامتی اور فطرت کی خوبی تھی کہ وہ خود بخود اسی راہ پر چلے جس پر نیک دل رئیس کو چلنا چاہئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے انہیں دولت کے ساتھ عزت کے خزانے بھی بخشے، وہ آزیری کی مجسٹریٹ بھی ہوئے، چیئر مین بھی ہوئے اور برہما برسر رہے۔ صوبائی کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ اونچی سوسائٹی میں ان کا مقام بھی بنا اور شہر یا ضلع ہی کے نہیں صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ صوبہ بھر کے بڑوں میں شمار ہوئے، دوسرے لفظوں میں انہوں نے پوری صوبائی ملت کا اعتماد حاصل کر لیا جو ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔

ضمیر کی سچائی..... ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ وہ جس حالت میں قوم کے معتمد علیہ تھے اسی حالت میں گورنمنٹ کے بھی معتمد علیہ تھے۔ اعتماد کا آخری ڈپلومہ سرکاری خطاب ہے۔ سو وہ بھی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں عطا ہوا اور پھر عجیب تر یہ ہے کہ قوم اور گورنمنٹ کا ان پر اعتماد بیک وقت اس وقت بھی بدستور قائم رہا جب کہ قوم اور حکومت میں کشاکش اور مقابلہ ٹھن گیا اور جو لوگ قوم میں معتمد تھے ان کا اینٹی گورنمنٹ ہونا لازمی تھا اور جو گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہوتے تھے ان کا اینٹی قوم ہونا ضروری تھا لیکن خان بہادر کے قلب کی یہ جامعیت اور صفائی حیرت ناک ہے کہ وہ اس کشاکش کے دوران میں بھی بدستور قوم اور گورنمنٹ دونوں ہی کے معتمد علیہ رہے۔ کس طرح رہے؟ بعض لوگ دور خا اعتماد و نفاق سے حاصل کرتے ہیں کہ جدھر جاتے ہیں ادھر ہی کی کہہ کر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں انسان دونوں جانب سے دھککار دیا جاتا ہے۔ خان بہادر نے ان دونوں متضاد جانبوں کا اعتماد اپنے ضمیر کی سچائی سے حاصل کیا۔ وہ گورنمنٹ اور قوم کے سامنے سچائی سے وہی بات کہتے تھے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔ بے غرض کہتے تھے، وہ کسی لالچ یا طمع سے کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔ وہ گورنمنٹ پر تو قوم کے اثرات کا دباؤ ڈال کر گورنمنٹ کو قوم کی بھلائی کے لئے ہموار کرتے تھے اور قوم کو سچائی کے ساتھ اس کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی بات پہنچا دیتے تھے جس میں ان کے نزدیک قوم کی بھلائی و بہبودی ہوتی تھی، ان کی یہ سب باتیں اس قدر سلجھی ہوئی اور با اصول ہوتی تھیں کہ انہیں مانے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا تھا، اس لئے قوم اور حکومت دونوں ان پر اعتماد کرنے میں مجبور تھے۔ بہر حال انکے پیچھے جاہ و مال کی کوئی بری لت تھی، جس سے ان کی دنیوی جاہ و عزت بڑھی، دولت نے ترقی کی اور اونچی سوسائٹی نے انہیں قبول کیا اور دنیاوی حیثیت سے وہ کبھی کسی تنزل سے دوچار نہیں ہوئے۔

دینی مقبولیت..... ہاں! جوانی میں اگر ان کے پیچھے کوئی دولت لگی تو وہ بزرگان دین کی طرف رجوع ان کی

مجلسوں میں بیٹھنا ان کی عادت بنی۔ یہ بھی ان کے ضمیر کی خوبی اور دل کی ہدایت کی بات تھی کہ لت بھی لگی تو وہ جو دنیا و آخرت میں مقبولیت کا ذریعہ بنے اور ان کی عزت کو بڑا چاند لگا دیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس نشینی۔ میرے والد صاحب قبلہ کی مجلس مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اکثر و بیشتر والد مرحوم کے ساتھ ان کے گھر پر آنا مجالس میں بیٹھ کر کچھ حاصل کرنا ان کا امتیاز بن گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نیکوں میں بیٹھ کر آدمی نیک اور بدوں میں بیٹھ کر بد ہوتا ہے۔ خان بہادر جیسے سلیم الطبع انسان کو دل کی سلامتی کے ساتھ جب مجلسیں بھی اہل خیر کی ملیں تو ان کی طبعی نیکی اور زیادہ دو بالا ہوگئی۔ ماہ رمضان میں مجھے یاد ہے کہ کئی کئی بار میرا قرآن شریف سننے مسجد دارالعلوم میں آتے اور تراویح کے بعد ان بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر طویل صحبت حاصل کرتے تھے جس سے دنیوی مقبولیت کے ساتھ انہیں دینی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

اعتماد اکابر..... اور وہ جس طرح گورنمنٹ اور قوم میں معتمد علیہ تھے اسی طرح دینی طبقہ اور جماعت علماء میں بھی معتمد علیہ بن گئے، ان کی زندگی کا عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جس طبقہ میں بھی پہنچ جاتے تھے اس کا اعتماد لے کر واپس ہوتے تھے۔ جو ان کی طبیعت کے بے لوث اور صاف ہونے کی دلیل ہے۔ گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ خطاب یافتہ ہوئے۔ قوم کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ کونسل کے نمائندہ (ممبر) منتخب ہوئے، شہر کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ دیوبند کے چیئرمین ہوئے تو علماء کا اعتماد حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۳۵۳ء سے ۱۳۷۴ء تک اکیس برس انہوں نے رکنیت کی یہ خدمات اس خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں کہ ان کے دوست اور مخالف سب ان سے خوش رہے، جس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ وہ ہر اقدام اپنے ضمیر کی سچائی سے کرتے تھے۔ کسی رور رعایت سے ان کے یہاں کام کی انجام دہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے بڑے اور چھوٹے سب ان کے مداح تھے۔ کوئی بھی ان سے نالاں اور گریاں نہ تھا کیوں کہ نہ وہ خود غرضی سے کام کرتے تھے نہ انتقامی جذبات سے کام لیتے تھے، بلکہ اصول پسندی سے ان کی رائے اور عمل کا کام انجام پاتا تھا۔ اس دینی سلسلہ کی رکنیت اور علماء کی صحبت و معیت کا انجام دنیوی بہبود و فلاح کے ساتھ اخروی کامیابی کی صورت میں نمایاں ہوا، نماز، روزہ کی پابندی، زکوٰۃ کا حساب کتاب، حج کی توفیق، مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد کے کام ان سے بے تکلف سرزد ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے غرباء کی امداد گھر بیٹھ کر کرتے تھے۔ دومرتبہ ان کے عطیات کا امین میں خود بنا اور ان کے منشاء کے مطابق ان کی رقم مدینہ منورہ میں تقسیم کی گئی۔ پس مرحوم ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہیں دنیا کے ساتھ دین اور جائز عیش کے ساتھ طاعات و عبادت کی توفیق بھی بخشی گئی۔

انفرادی اعتماد..... آج اگر یہ شہر اور ضلع خان بہادر کو رو رہا تھا تو وہ ان کی ذات کو نہیں بلکہ ان کے اوصاف کو رو رہا ہے جن کی بدولت وہ ہر طبقہ میں مقبول، ہر طبقہ کے معتمد علیہ تھے اس پر مزید خوبی ان کی بے تکلفی تھی بڑے ہی نہیں

چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ چھوٹا انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ وہ خود اپنی نگاہ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ برادری میں برابر کے بھائی کی طرح، بزرگوں میں نیک سرشت خوردوں کی طرح اور خوردوں میں مشفق بزرگوں کی طرح پیش آتے تھے جس سے انفرادی اعتماد بھی ان کا افراد میں قائم تھا۔

بہر حال یہی وہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے شہر اور ضلع سوگوار ہے اور غم میں گریاں ہے۔ چنانچہ آج کی مجلس میں بھی وہی مجلس غم اور تعزیت کی مجلس ہے جو شہر کی طرف سے منعقد ہوئی ہے۔ اس مجلس کا موضوع یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے غم کو جو چھپایا نہیں جاسکتا اور دل میں اس کی سائی مشکل نظر آرہی ہے کھول دیں۔ اور آنکھیں اگر روتے روتے تھک گئی ہیں تو دل کو ہی گریہ و بکا سے ہلکا کر لیں۔

لیکن میں اپنے بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا کہ رونا اور غم کرنا نہ کوئی فائدہ مند بات ہے نہ اس سے دنیا و آخرت کا کوئی نفع متعلق ہے اگر رونے اور غم کرنے سے جانے والا واپس ہو جایا کرتا تو سو برس تک بھی رونا بند نہ کیا کرتے۔ بقول عرفی کے۔

عرفی گر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می توان بہ تمنا گریستن

”اے عرفی اگر رونے سے مرنے والا مل جایا کرتا تو سو سال بھی ہم رونے سے نہ تھکتے اور روتے رہتے۔“ رسمی نوحہ و بکا..... لیکن رونا اور غم کرنا کسی کو واپس نہیں لاسکتا اسی لئے شریعت کے نزدیک غم لے کر بیٹھنا اور بہ تکلف اسے نمایاں کرنا جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ بڑے لوگ مرتے وقت وصیت کر جایا کرتے تھے کہ ہمیں برس دن رویا جائے تاکہ دنیا پر واضح ہو کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ برس دو برس کون ہے کہ دل سے روے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں رونے والیاں کراہیہ پر رکھی جاتی تھیں اور انہیں اجرت دے دے کر رلایا جاتا تھا، جب کوئی تعزیت اور پر سہ کے لئے آتا تو وہ جلدی سے حلقہ باندھ کر بیٹھتیں اور آوازیں ملا کر نوحہ و بکا کرنا شروع کر دیتیں۔ موخر اشعار اور غم افزا کلمات سے دلوں کو کھلاتیں اور لوگ آنسو پونچھ کر یہ کہتے ہوئے چلے جاتے کہ حقیقتاً ایک بڑا آدمی دنیا سے اٹھ گیا جس کا یہ سوگ کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسمی رونے میں نہ رونے والیوں کا دل شریک ہوتا نہ رونا دیکھنے والوں کا۔ دونوں سازی سے روتے تھے برادری یا شہر کو دکھلانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے۔

میت کی راحت رسانی..... اس لئے ہماری مجلس اور ہماری انفرادی نشست کا موضوع غم و ماتم نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسم جاہلیت ہے۔ بلکہ موضوع یہ ہونا چاہئے کہ ہم سے تو میت کو نفع پہنچے اور میت سے ہمیں نفع پہنچے۔ شریعت نے ہم سے میت کو نفع پہنچنے کی صورت تو ایصالِ ثواب بتلائی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ”قبر کے اندھیرے گھرانے میں میت اپنے گھر والوں سے آس باندھتا ہے کہ شاید مجھے کوئی یاد کرے اور شاید مجھے کوئی ثواب پہنچا دے“۔ حدیث شریف میں ہے کہ ”قبر میں میت کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بیچ دیا میں مجدہار

کے چکولے کھا رہا ہو اور اسے تنکا بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بھی اپنا سہارا سمجھتا ہے، ٹھیک اسی طرح میت قبر میں راحت و نجات کی خاطر اپنے وارثوں اور دوستوں سے آس لگائے رہتا ہے کہ کاش مجھے کوئی یاد کرے اور ثواب پہنچائے جو میرے لئے تنکے کا سہارا ہو جائے۔ سو خان بہادر کی خیر خواہی یا ان کے حقوق کی ادائیگی جو ہم سب کے ذمہ ہے یہ نہیں ہے کہ اس نیک ہستی کے غم میں ہم چار آنسو بہا لیں اور رومال سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے گھر روانہ ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی راحت و رسانی کا سامان ہم پہنچائیں اور وہ ایصال ثواب ہے۔

ایصال ثواب کی آسانی..... کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر ہر شخص روزانہ یا دوسرے تیسرے روز قتل ہوا اللہ شریف تین بار پڑھ کر مرحوم کو ثواب اور دعائیں یاد کر لیا کرے۔ قل ہو اللہ کو تین دفعہ پڑھنے کا ثواب حدیث شریف میں ہے کہ ”ایک پورے قرآن کے ثواب کے برابر ہے۔“

اللہ نے کس قدر آسانی فرمادی کہ دو منٹ میں تین دفعہ قل ہو اللہ پڑھو اور ثواب حاصل کرو جس بارہ گھنٹے کی محنت سے پورا قرآن شریف پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس لئے چند آنسو بہا لینا یا چند کلمات تعزیت زبان سے ادا کر دینا مرحوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ ایصال ثواب کرنا حقیقی خیر خواہی ہے خواہ جان سے جیسے تلاوت نماز اور دوسری عبادات کا ثواب پہنچانا یا مال سے جیسے غرباء و مساکین کو یہ نیت ایصال ثواب کھانا یا کپڑا پہنچانا وغیرہ۔

محاسن مرحوم..... پس ہماری مجلس یا انفرادی نشست کا ایک موضوع تو بحکم شریعت یہ ہونا چاہئے کہ ہم میت کو نفع پہنچائیں اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ میت سے ہم خود نفع حاصل کریں اس کی صورت شریعت نے یہ بتلائی ہے کہ اَذْكُرُوا مَحَامِلَ مَوْتَانِكُمْ ① ”اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو“۔ تاکہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔ پس! ایصال ثواب سے میت کو ہم سے کچھ ملتا ہے اور میت کے عمدہ تذکرہ سے ہمیں میت سے کچھ ملتا ہے۔ اس لئے ہماری اس مجلس کا موضوع رونا اور اظہار غم کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ خان بہادر مرحوم کو نفع پہنچانا اور ان سے خود نفع حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

مرحوم کی یادگار..... خان بہادر مرحوم کی عمدہ ترین یادگار ”یہ ہائی اسکول ہے جو تنہا انکی کوششوں سے قائم ہوا۔ اور اس وقت قائم ہوا جب کہ سب اس کے قیام سے مایوس تھے لیکن ان کی ہمت مردانہ تھی کہ مایوسیوں کے ہجوم میں پامردی کے ساتھ وہ کھڑے ہوئے اور اسکول قائم کر کے چھوڑا، جس کا نفع آج قصبہ کے ہندو، مسلمان دونوں کو پہنچ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں ایسا وقت بھی آیا کہ اسکول باقی رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، مرحوم نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ لوگوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ میں نے بھی ان کے بزرگانہ ارشاد کی

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النہی عن سب الموتی ج: ۱۳ ص: ۵۱۔

تعمیل میں اسکی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی ہوئی جس پر ہمیشہ مدوح مسرت کا اظہار فرماتے تھے لیکن ہتھیاقیہ کام صرف ان کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا کہ اسکول کو مایوسیوں کے جہوم میں بھی چلاتے رہے۔ حتیٰ کہ انہیں کتنے ہی ماہ تنخواہ میں اپنی ذات سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ مگر اس کا خیر سے نہ ہٹے۔ علم کی بقاء کا راستہ پیدا کرنا خواہ وہ کسی بھی چیز کا علم ہو امر خیر ہے۔ جبکہ حسن نیت سے ہو اور صدقہ جاریہ ہے کیوں کہ عمل تو عامل کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن علم عالم کے ساتھ یا علم کا انتظام کرنے والے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے۔ یہ مادی دولت نہیں ہے کہ اسے جتنا خرچ کر گھٹتی ہے بلکہ روحانی دولت ہے کہ جتنا خرچ کر دے بڑھتی ہے۔

اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے اور محاسن کے ساتھ ان کے اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے کی امکانی سعی کرتے رہیں، جس سے مرحوم کی روح خوش رہے گی اور اجر دائمی سے مشفق ہوتی رہے گی۔ بہر حال رونے اور غم والہم کے اظہار کے بجائے ہمارا کام ایصال ثواب اور ذکر محاسن ہونا چاہئے کہ یہی ان کے دلوں میں ہمہ وقت زندہ رہنے کی سبیل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان بہادر مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقامات عطا فرمائے اور جس طرح انہیں دنیا میں اس نے قبول فرمایا تھا اس طرح آخرت میں انہیں قبول فرمائے اور ان کے پسماندگان اور تمام وارثوں اور عزیزوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے اور صبر و تسلی عطا فرمائے۔ ہم سب ان کے دکھ درد کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

جامع مذہب

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. أَمَّا
بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ
لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ.

جامع مذہب..... آیت کے ذیل میں دین اسلام کو جامع بتلایا۔ یہود و نصاریٰ کی مختلف جزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ دین اسلام پچھلے تمام آسمانی دینوں اور ملتوں کا جامع بنایا گیا ہے، اس دین میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نختی موجود ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نرمی اور درگزر بھی موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہیں اگر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم بھی ایک تھپڑ مارو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہارے گال پر اگر کوئی ایک طمانچہ لگائے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

دین اسلام میں نہ وہ سختی ہے اور نہ یہ نرمی ہے، بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ② ”برائی کا بدلہ بُرائی لیکن اتنا ہی“۔ اس کی وضاحت دوسری آیت میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہاری کوئی ایک آنکھ پھوڑے تو تم بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو تمہاری ناک پر اگر کوئی گھونٹہ مارے تو تم بھی اس کی ناک پر ایک گھونٹہ مار دو تمہارے کوئی اگر دانت توڑ دے تو تم بھی اس کا ایک دانت توڑ دو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاف کر دیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے گویا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور معاف کر دینے کی بھی اجازت ہے۔ اس طرح اس دین میں شریعت موسوی بھی آگئی ہے اور شریعت عیسوی بھی آگئی۔ متعدد واقعات اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اس جُز کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے مختلف ادیان اور مختلف شریعتیں جاری تھیں اور آپس میں اختلاف اور عداوتوں کی خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام نے آکر اختلاف اور عداوتوں کی خلیج کو پاتا، اتفاق واتحاد پیدا کیا اور تمام اقوام عالم کو

① پارہ ۶: سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۳. ② پارہ ۲۵: سورۃ الشوری، الآیۃ: ۴۰.

ایک دین پر جمع کر دیا۔

طبقائی اجتماعیت اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات بلکہ امراء کو، صوفیاء کو، سلاطین کو، وزراء کو، غرض ملک میں پھیلے ہوئے تمام منتشر طبقات کو جمع کرنے کی کوشش کی، خطوط روانہ فرمائے پیغامات روانہ کئے اور ملت کے تمام طبقات کو ایک نقطہ پر جمع فرمایا۔

دارالعلوم کی شان اجتماعیت یہ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز پر قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے پہلے ہندوستان میں اہل علم کے مختلف طبقے تھے۔ کوئی متکلم اور کوئی منطقی تھا۔ اور کوئی اہل حدیث تھا۔ کوئی اہل قرآن تھا۔ کوئی فلسفی تھا۔ مگر دارالعلوم کے اکابر، اس کے بانیوں نے ایک ایسا نصاب جاری فرمایا جس سے ملک کے تمام طبقوں میں وحدت اور یکسانیت پیدا ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند نے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں محدثین پیدا کئے، ہزاروں مفسرین قرآن اور متکلم پیدا کئے جنہوں نے دین اسلام کی حقانیت، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی۔ دارالعلوم کا فاضل بیک وقت محدث بھی ہے مفسر بھی ہے، متکلم بھی ہے، مبلغ اور صوفی بھی ہے، حق تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسی جامعیت اور مرکزیت عطا فرمائی ہے کہ اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی خدمت کر رہے ہیں یہ وہی جامعیت اور مرکزیت ہے جس پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ملک کے تمام طبقات کو جمع فرمایا۔

وفاق المدارس دارالعلوم دیوبند نے اجلاس صد سالہ کے موقع پر متحدہ اہم و مفید اور کارآمد تجاویز منظور کرائیں۔ ان تجاویز میں سے ایک اہم تجویز وفاق المدارس کی بھی ہے اس تجویز کا مقصد بھی ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، اگر ہندوستان کے تمام مدارس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پہلے سے بنا بنایا مرکز موجود ہے تو اس میں نفع دونوں کا ہے۔ مدارس اور مکاتب کا بھی اور دارالعلوم دیوبند کا بھی، ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کی خدمات سے دارالعلوم باخبر رہے گا۔ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ حضرات کی شہرت اور ان کی خدمات سامنے آئیں گی۔ مدارس اپنے مرکز دارالعلوم دیوبند کی خدمات، حالات اور کارگزاریوں سے واقف ہوں گے۔ تو یہ وفاق مدارس کی تجویز ایسی تجویز ہے۔ جس کے رو بہ عمل آجانے کے بعد فضلاء کی تنظیم بھی قائم ہو جائے گی۔ تنظیم فضلاء نہ تھا کوئی مقصد ہے نہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اصل وفاق المدارس اور تنظیم مدارس ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب منظم ہو کر اپنے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو فضلاء کی تنظیم خود بخود قائم ہو جائے گی کیوں کہ ان مدارس اور مکاتب کے چلانے والے اس کے اساتذہ اور ذمہ دار اکثر و بیشتر فضلاء دارالعلوم ہی ہیں۔

افادات علم و حکمت

مختلف علمی سوالات کے جوابات کے سلسلے میں
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کا اظہار خیال
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
حَامِدًا وَمُصَلِّيًا

حسن نیت سے حرام حلال نہیں بنتا..... ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا، مثلاً لاکھ دو لاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطور قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے سودی قرض لیتا ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تاکہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اجتہادی یا فروعی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے: ﴿أَحْلَلْنَا لَكَ الْبَيْعَ وَخَرَّمْنَا لَكَ الْبَيْعَ﴾ ① ”اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا“ (القرآن) سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہے گا اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبال جان بنے گی دنیا میں بھی آخرت میں کسی عمل کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں جب تک کہ وہ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو۔ اچھی نیت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیت کا کوئی اعتبار ہوگا۔

جب دو چیزیں تھیں بیع اور سود۔ ایک کو حلال قرار دیا اور ایک کو حرام۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا کریں۔ اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیں، خواہ ایک شخص وکیل بن جائے۔ سب کی طرف سے نفع و نقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ اس المال کو بھی حرام اور ناجائز کر دے تو اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہنچے گا، یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو۔ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا

① پارہ ۳، سورۃ البقرۃ، الآیہ: ۲۷۵۔

جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہنچے، لیکن وہ تو شریعت کے مکلف ہی نہیں مگر جو لوگ شریعت کے مکلف ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اویہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر رہی ہے۔ پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اور اس پر اعتماد بھی کر لینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کی بجائے درپردہ دشمنی ہے، دنیاوی بھی اور اخروی بھی۔

عمل مشروع میں ہی حسن نیت کا اعتبار ہے..... لہذا کسی کام کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں۔ اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی نفع ہوگا، تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر مادی جائیں گی۔ تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے۔ حسن عمل یا عمل صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اخلاص اور حسن نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی جو شریعت سے ثابت ہو۔

اسی لئے سورہ ملک میں فرمایا گیا ہے: ﴿تَبَرَّكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَسْئَلُوْكُمْ اَيْتُكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ① برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی۔ (القرآن) کسی کو جو دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مردہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ دوڑ۔ عالم میں یہ تغیرات، موت، حیات، نعمت، سلب نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی: ﴿لِيَسْئَلُوْكُمْ اَيْتُكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ② تاکہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا برا۔ جب تم اس کے ملک میں ہو، اس کے اقتدار کے نیچے ہو، اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کے حکم کی اتباع کرو گے یا نہیں اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیرات رکھے ہیں تاکہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں اَحْسَنُ عَمَلًا ہے۔

عمل صالح کی دو بنیادیں..... اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے کی ہے کہ ”اَنِ اخْلَصْهُ وَاقْبَتْهُ“ ③ حسن عمل اور علم صالح وہ ہے کہ خالص ہو، رضاء خداوندی کے لئے اخلاص کے ساتھ ہو مخلوق کی رضاء یا اپنی رضاء نفس شامل نہ ہو۔

اگر رضاء خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت بالسنہ ہو اور بطریق صواب ہو یعنی اس نیچ پر ہو کہ جس طرح شریعت نے بتلایا ہے، تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں ایک اخلاص للہ کو جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اللّٰہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہی برحق ہے۔ اسی کا حکم ماننے کے قابل ہے۔ اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جُزْ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ سے نکلتا ہے اتباع سنت۔ اس لئے کہ بطریق صواب وہی ہے۔ جس کو سرکار

① ہمارہ ۲۹، سورۃ الملک، الآیہ: ۲-۱۔ ② ہمارہ ۲۹، سورۃ الملک، الآیہ: ۲۔

③ قال البغوی: قال فضیل فی تفسیرہ: اخلصه واصوبه، ج: ۸، ص ۷۶، تفسیر البغوی، سورۃ الملک۔

دو عالم نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپ کے متبعین حضراتِ صحابہ کا تعامل ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ شامل ہو گا وہی عمل صالح ہو گا۔

عمل صالح اسے کہتے ہیں کہ میں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے، رفاہ عام کا کام کیا بہت ہی عمدہ کام کیا ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عمل صالح نہیں بنے گا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے بلکہ عمل صالح بنتا ہے دو بنیادوں سے اخلاص للہ اور دوسری بنیاد ہے اتباع سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباع سنت بھی ہے وہ عمل صالح ہو گا۔

شرک و بدعت کی بنیاد..... اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضا خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہوگئی۔ یا نفس کی رضا مخلوط ہوگئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا، اس لئے جس درجہ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہوگی، شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاوے گی اور شرک فی العمل ہو جائے گا۔

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ کے معنی ہیں اتباع ہو رسالت خداوندی کا۔ اب جس درجہ اتباع میں کمی آتی جائے گی اسی درجہ اتباع اور بدعت کی بنیاد پڑتی جائے گی جو شرک تک پہنچائے گی۔ تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں اخلاص اور اتباع سنت۔ اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں شرک اور بدعت۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ شامل ہے یا نہیں؟ جس پر اس کا ایمان ہے، اگر ہے تو عمل صالح ہے۔ نہیں تو پھر وہ عمل طالح۔ تو ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحتہ ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا وہ کام رضا حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیر باد کہہ دیا کہ وہ ریاست کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہوگی؟ اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے اس لئے کہ معذہ ہی درحقیقت حوض بدن ہے اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معذہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہوگی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے، ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو، پیروں کو، منہ کو ناگوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی کس قدر خوشبو ہے؟

ابتدا سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو۔ اور ہر عمل میں اتباع کا دخل ہو۔ ایمان میں کمی آئی۔ شرک پیدا ہوا۔ اتباع میں کمی آئی تو بدعت پیدا ہوئی۔ اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پہلے ہی خیر باد کہہ دے۔ یہ ہمدردی

کیا ہوئی، یہ تو نہ اپنی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

قوم کے اخلاق کا تحفظ..... محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذائیں پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنانا، مکینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کون سی ہمدردی ہے؟ لہذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع کیا محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہئے کہ تاکہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق پیدا نہ ہوں اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

اگر اس کی غذا لقمہ صحیح ہے تو اخلاق صحیح ہیں، لقمہ ناپاک ہے تو اخلاق بھی ناپاک ہیں، اس لئے ہم نے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے، کہ تمہارے پاس مورچی زمین تو نہیں ہے کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو، پہلے اس سے توبہ کرو، جب بیعت کریں گے۔ اس لئے کہ جب غذا ہی تمہاری مشتبہ ہوگی تو ذکر اللہ تمہارے اندر کیا اثر کرے گا، اگر اللہ کا نام لو گے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہوگی۔ اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی طرف چاہتا ہے ناپاک ظرف کے اندر پاک چیز نہیں بھری جاتی۔ وہ بھی ناپاک بن جائے گی تو غذا پر اور اکل حلال پر دار و مدار ہے اخلاق حسنہ کا۔

ظلمت اخلاق..... اسلام نے سب سے زیادہ زور اکل حلال پر دیا ہے۔ اس لئے جتنی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حرمت پیدا ہو۔ کوئی ناجائز شکل پیدا ہو۔ ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا۔ سود کو حرام کر دیا۔ احتکار کو حرام قرار دے دیا۔ احتکار کے معنی ہیں، گرانی کی امید پر مال کو روک رکھنا، احتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ ”مگر ہی“ ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا ہو۔ کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے، دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے، وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد میں بھی گندگی آجائے گی وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہوگا۔ اسی لئے مقصود اصلی آخرت ہے۔ گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے اس کے قواعد بنادیئے ہیں کہ جائز طریق پر کمائیں۔ جائز طریق پر خرچ کریں۔ ناجائز اور حرام، مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچیں، نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے۔ عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے..... اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کر دیں یا صریح حرام چیزیں داخل کر دیں تو اس سے برکت کیا ہوگی؟ بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے، غلاظت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی خیر و برکت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تاکہ قوم کو فائدہ پہنچے۔

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے، یہ شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے؟ مضاربت کی صورت کر لیں۔ دو چار افراد اپنی تجارت میں لگا دیں اور حسب رقم اس کا منافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ مسلمان نفع کمائے تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے؟ جبکہ وہ اللہ اور رسول کو مانتا ہے۔ اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز اور حلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو تو بھید یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب! سود سے کریں گے قوم کی خدمت کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی۔ ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے یہ کسی طرح مناسب نہیں۔ حرام میں شفاء نہیں..... بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے: ”إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيْمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ“ ① اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفاء نہیں رکھی، جو دوائیں حرام ہیں۔ شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جو ہے، ان میں شفاء نہیں ہے۔ اگر ظاہری طور پر شفاء ہوئی بھی تو روح اتنی بیمار ہوگی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہوگا۔ پھر بیمار پڑے گا جب مادی امراض کی شفاء بھی حرام میں نہیں تو روحانی امراض کی شفاء کیسے ہو جائے گی حرام کے اندر؟ اور وہ بھی قطعی حرام، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہئے۔ نیت نیک ہے۔ جذبہ نیک ہے۔ پھر قومی خدمت کرے۔ تو کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت ہو۔ ذرا سا تغیر کر دو وہی نفع رہے گا۔ مگر جائز بن جائے گا۔

متبادل صورت..... تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سا تبدیل کر کے حد جواز میں لے لیا جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔ تو مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ معاملہ ہو۔ اطاعت ہو، عبادت ہو، اس میں حرام و مکروہ سے بچ کر حد جواز کی طرف آئے، یہی معنی اس کے اسلام کے ہیں ورنہ تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا رہ گیا۔ وہ بھی سود خور، تم بھی سود خور، وہ بھی حرام خور اور تم بھی حرام خور۔ تو ہم تمہیں حلال خور بھی نہیں بنانا چاہتے (برسبیل لطیفہ فرمایا) اور حرام خور بھی نہیں بنانا چاہتے۔ آدمی اکل حلال پر رہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نیت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک ذرا سا تغیر کر کے اس کو حد جواز میں لے لیں۔ کیوں حرام کی طرف جارہے ہیں؟ کہ قوم کی روح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مواخذہ الگ کوئی بینک قائم کر دیں یا کوئی ایسی صورت قائم کر دیں کہ اپنی تجارت میں لگا لیں، یا کوئی کمپنی تجارت کی بنادیں اور اس میں شرکاء ہوں نفع نقصان کے شریک رہیں اور پھر وہ رفاہ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے اس المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اسلام ہے جو اس پر آمادہ کر رہا ہے؟

مطالعہ کا علم لائق اعتماد نہیں..... سوال: حضرت کہا جاتا ہے کہ اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً رِوَا ہے صرف رِوَا حرام نہیں ہے۔ اس پر حضرت نے دریافت کیا کہ یہ علماء کہتے ہیں۔ یا تا جبر کہتے ہیں۔ سائل نے کہا کہ حضرت! یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمن نے کہی تھی۔ رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے اس کا بہانہ بنایا جا رہا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مضامین آتے رہتے ہیں۔ اہل حق کے بھی اور اہل باطل کے بھی مُتَوَلِّین کے بھی اور مُكَذِّبِین کے بھی، کہیں ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدین علماء کا کام ہے۔ اور تا جبر جو تمہم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو ایسی چیزوں میں حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے۔ یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدین ہوں۔ ملک و قوم کو جن کے دین و دیانت پر اعتماد ہو اور ان کا علم مستند ہو۔ قوت مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے جو چاہے کرے اور نفس ہے تاہذیب یافتہ اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں ڈاکٹر منظر صاحب نے یہ کہہ دیا۔

تو جس کے آخر میں ”ن“ ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔ (برسبیل لطیفہ فرمایا) کوئی عالم متدین کہے یا فتویٰ دے یا مستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دے دیں تو آپ بے تکلف کریں۔ فلاں نے کہہ دیا، اس نے کہہ دیا یہ قابل اعتبار بات نہیں۔

مسلم و حربی کے درمیان سودی معاملہ..... سوال: ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حدیث لا رِبَا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِيِّ کے تحت مسلم اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ہو سکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث لا رِبَا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِيِّ کہاں ہے؟ اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔ یہ ائمہ میں خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں، اب جو کہتے ہیں لا رِبَا اس کا یہ مطلب نہیں کہ رِبَا جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رِبَا ہوتا ہی نہیں۔

مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دارالحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو، حالت امن نہ ہو۔ اس وقت کا یہ مسئلہ ہے، ایک دارالحرب کا یہ معنی ہیں کہ شعائر اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔ اس کے مسائل دوسرے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دارالحرب مان لیا جائے تو دارالحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں؟ دارالحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا..... دارالحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے۔ ملک چھوڑ کر دارالسلام کی طرف جائے۔ اس کی توجرات نہیں کرتے کہ یہ دارالحرب ہے، اسے چھوڑ کر دارالامن اور دارالاسلام میں جانا چاہئے اس کا دھیان کسی کو نہیں آتا، جب دھیان جائے تو پیسہ کی طرف جائے۔ تو دارالحرب کا حیلہ مل گیا ہے، پیسہ بٹورنے کو۔ یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے۔

اگر دارالحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے۔ مثلاً تجارت ضروری ہے وہ قوت پیدا

کرنی ضروری ہے جس سے دارالحرب دارالاسلام بنے، کفار سے جنگ کرو اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو، اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں، کوئی صاحب آمادہ نہیں۔ دارالحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور اب تک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دارالحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ ہجرت بھی ہے۔ جہاد بھی ہے، قومی معاملات بھی ہیں۔ کتنے ہی مسائل دارالحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دارالحرب حیلہ ہے اور جذبات دوسرے ہیں، دارالحرب کی آڑ لے کر پیسہ بنونا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کا فتویٰ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں ہے، پھر ان کا کیا جواب ہوگا، اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی فتویٰ ہے، تو کیا ان کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ سودی لین دین کرو، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا۔ لیکن کیا انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کر دو۔ سوڈ پر دلچسپ مباحثہ..... حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندی پوری لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور صحیح دین دار لوگوں میں سے تھے۔ بی اے بھی تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا ”سود مند“ نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت و طباعت کی گئی۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لوئٹے کی بات کا کیا اعتبار، ذکر کرنے والے نے کہا کہ حضرت! لوئٹا ہے؟ وہ تو مولانا طفیل صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام طفیل ہے (طفیل کے معنی ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لوئٹا نہیں تو اور کیا ہے؟ تو خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہنچے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم (ایڈیٹرزمیندار) اور ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان صاحبؒ بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحبؒ کا تھا۔ انہوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مدلل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے، ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا، ان کی بات تو ایسی تھی۔ فرمایا کہ: ”بھائی ہم پل نہیں بننا چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے۔ ہماری گردن پر پیر رکھ کر نہ جائے“

یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے۔ علامہ اقبال بھی مولانا ظفر علی خان صاحب بھی، کسی کو بولنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ پھر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصل تقریر کی جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حکم شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے..... یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے۔ اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گزر بھی گئے۔ اور دوسرے بھی پیدا ہوئے اور بھی گزر گئے۔ اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ بھی گزر جائیں گے۔ مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خلیجیان ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ جو معتد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کر لیں۔ اس میں منشاء ظاہر کر دیں کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشاء یہ ہے کہ قوم کی خدمت اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے۔ تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ جو وہاں سے مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کو فائدہ بھی ہوگا۔

مدار دین حجت ہے..... ایک صاحب نے پوچھا اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کر دیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے۔ اس میں کچھ حرج نہیں تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار مجاری پر یا سروں کی گنتی پر نہیں۔ یہ کوئی کنسل یا اسمبلی کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سرگئے جاتے ہیں۔ سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلہ ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے۔ اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحب نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

بترس از طرز جمہوری البیر پیر دانا شو کہ از مغز دو صد خر فکر انسان نمی آید
کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیر دانا کے قیدی بن جاؤ اگر دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو انسانی فکر تھوڑا ہی ان کے دماغ سے نکلے گی۔ دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا، انسانی فکر کہاں سے نکلے گا؟ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے۔ تو بے وقوفی کا خیال ذہن سے برآمد ہوگا۔

اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے: ﴿وَأَن تَطْعَمَ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ①
زمین میں بے وقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کر رہے ہیں، حق کے راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہو سکے گا۔ خواہ پوری

دنیا کے انسان فیصلے کو مل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہذا سود حرام ہی رہے گا، جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پانخانے کو کتنا ہی دھولو۔ صاف کر لو وہ پانخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا۔ ناپاک ہی رہے گا۔ اور اس پانی کو بھی ناپاک کر دے گا۔ جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہوگی۔ اوپر سے ان اذہان کو بھی اپنی رو میں بہا کر گندہ کر دے گی جن اذہان میں اس قسم کے تصورات ذہن میں نہ جانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہیں، جب کوئی شے حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں؟ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں۔ اس قسم کے خیالات سے۔

مراتب عصمت..... سوال: ایک صاحب نے سوال کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام باجماع امت معصوم ہیں۔ ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں اور قبل البلوغ بچے از روئے شرع معصوم ہیں۔ کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعل شنیع پر رد وارو گیر نہیں کی۔ لہذا ان کی عصمت بھی متفق علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں، اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہو گئے تو اب حضور والا وضاحت فرمادیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی عصمت ایک ہی قسم کی ہے؟

جواب: اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں وہ ابھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ ابھری ہوئی نہیں ہے صرف مادہ موجود ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کر کے گناہ سے بچتے ہیں۔ اور یہ کمال ہے۔ منشاء گناہ..... فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشاء صرف دو چیزیں ہیں: حب جاہ اور حب باہ۔ اسی لئے بعض گناہ تو سرزد ہوتے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے۔ تذلیل کرتا ہے، زبردستی دباتا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں۔ یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے۔ پھر چاہے دوسروں کا خون ہو مگر اسے کرسی ملی۔ اسے عزت ملی۔ ہزاروں مخلوق برباد ہوتی، کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشاء ہوتا ہے حب جاہ اور حب اقتدار۔ ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے کو عار محسوس کرے گا، وہ چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں۔ میں بڑا آدمی ہوں۔ یہ چھوٹے ہیں، ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں۔ تو کبر کے معنی لفظ بڑا بننے کے نہیں ہیں بلکہ تحقیر ناس یعنی لوگوں کو تحقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر اور بڑا جاننا۔ یہ حقیقت ہے کبر کی۔ اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے، اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں۔ لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ، مار پیٹ، قتل و غارت گری اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں، آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔ ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت ہے، ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔

ایک شہوتِ بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے۔ اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش رتا ہے۔ تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے گا۔ چوری ہو، رشوت ہو، سود ہو، بہر حال کسی طرح سے پیسہ جمع ہوں اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہو سکیں تو شہوتِ بطن کا حاصل ہے۔ مرغوباتِ نفس کو بڑا کرنا اور جمع کرنا۔ مال ہو، لباس ہو، سامان ہو۔ آدمی اسے حاصل کرے جس طرح سے بھی ہو سکے۔ جب اس وقت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کے حرام و حلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں۔ چوری کرنے والے چوری کرتے ہیں۔ ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بڑا جاتا ہے۔ خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ کہ جرم ہونہ ہوا سے ڈرایا دھمکایا اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں ایک شہوتِ فرج یعنی شرم گاہ کی شہوت ہے۔ اس سے آدمی بدکاری، زنا کاری، فحش، عریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جیسے شہوتِ بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں اسی طرح شہوتِ فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش عالم ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدمؑ سے سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشاء تھا جاہِ طلی جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدمی کو سجدہ کرو۔ تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں؟ یہ حکم عدولی کی۔ اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کردی ہو۔ بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں ”میں میخ“ بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلافِ فطرت ہے۔ ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخُلِقْتُ مِنْ طِينٍ﴾ ① آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے۔

اور آگ کی فطرت ہے سراونچا کرنا۔ اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سر بلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں؟ یہ گناہ حکمِ عدولی کا سرزد ہوا ابلیس لعین سے جس کا منشاء تھا جاہِ طلی، عزت، کبر، رعونتِ فرعونیت۔ اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ حقیقتاً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی اور وہ یہ کہ شجرہ ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس جانا تک ممنوع تھا۔ کھانا تو درکنار، وہ درخت حضرت آدمؑ نے کھا لیا لیکن حکمِ عدولی کا کوئی واہمہ بھی نہ تھا۔

تلبیس ابلیس حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً و سوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کر کے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت ابدی نہیں ہے۔ بلکہ خاص وقت تک تھی وہ وقت نکل گیا۔ اب تمہارا معذہ اس نعت

کو ہضم کرنے کا متحمل ہے۔ اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھالے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اس نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔ جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی۔ ﴿وَقَالُوا سَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِیْنٌ النَّصِیْحِیْنَ﴾ ① قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم کھا لو گے تو ابدی طور پر جنت میں رہو گے۔ اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ اور ان کو سمجھایا کہ ابدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب و ہوا آپ میں اثر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھالیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرت تھی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں کیسے کھاؤں اور حکم خداوندی کے خلاف کیسے کروں؟

مگر ادھر تو اس کج بخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام پاک قلب ہیں۔ سچے قلب والے ہیں۔ نہ دھوکے سے واقف نہ فریب۔ اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے یہ تو گویا ان کے وہم میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہی بات ہو اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ وہ تو جھوٹ کو بہت بری چیز سمجھتا ہے۔ اس لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔

اسی واسطے محدثین لکھتے ہیں۔ اِنَّ اَکْثَرَ اَلْحَدِیْثِ اَلْحَدِیْثُ الصَّالِحِیْنَ کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (معاذ اللہ) وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا نام لے کر کوئی روایت کرے کہ اللہ کے رسول نے یہ فرمایا ہے۔ تو ان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے بتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب دھوکہ سے، فریب سے پاک ہے تو ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سمجھائی بلکہ قسم بھی کھائی۔ ادھر آدم پاک قلب ہیں۔ دھوکہ سے فریب سے واقف نہیں۔ اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ تو حضرت آدم کا وہم بھی نہیں جھوٹ بولنے پر۔ ادھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا۔ ادھر حضرت حوا نے کہا کہ اجی کھا لو! ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی سنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف بھی نہیں کرتا اتنا کہنے سننے سے حضرت آدم کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہ ہی بات ہو کہ اس کی ممانعت ابدی نہ ہو۔ ابتداء میں ہوا جب کہ یہاں کی آب و ہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھالینے میں کیا حرج ہے۔ اوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور بیوی نے دیا سہارا تو کھالیا درخت۔ خطا اجتہادی اور عصمت..... اس لئے حقیقتاً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ حضرت آدم جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہو سکتا ہو کہ حکم خداوندی کے

معنی اور مطلب یہی ہوں جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں آ کر مبتلا ہو کر وہ کھالیا۔ یہ لغزش ہوئی صورت اور حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ خطا فکری ہے، یا خطا اجتہادی ہے۔ یہ سرزد ہو گئی ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطا اجتہادی ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھ جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مطلع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کوئی مجتہد خطا اجتہادی کرے تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھر اسے صواب سمجھتا رہے اور وہ وہ حقیقت میں خطا تو غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے وہ درخت کھالیا۔

لغزش اور گناہ کا فرق..... مگر اس کا منشاء کبر اور جاہ نہیں تھا۔ خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروں لیکن معنی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیے اور چیز تھی کھانے پینے کی اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوت باہ اور شہوانی قوت آگے بڑھتی ہے۔ کبر و نخوت اس میں نہیں ہوتا۔ شیطان کے گناہ کا منشاء کبر تھا اور تکبر تھا۔ اور آدمؑ کی لغزش کا منشاء حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر درحقیقت شیطان کی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے وہ معاف نہیں ہو سکتا جب تک متکبر پوری توبہ نہ کرے۔ اس نے توبہ نہ کی ابدالاباد کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور ابدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدمؑ سے جو لغزش سرزد ہوئی اس میں کبر اور نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اوپر سے غلط فہمی اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سرزد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے تو آدمؑ کی خصوصیت ہے اور کبر سے سرزد ہوا تو وہ تکبر ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْكِبْرِ“ ① وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو، (جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے)۔

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر و نخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشاء حرص ہے۔ حرص سے سرزد ہونا یہ تو آدمی کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کا کہ آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو بیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں۔ اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔ اب نتیجہ نکالنے کے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے؟ ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے لہذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابدالاباد کے لئے ملعون ہو گیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے

حد تو بہ واستغفار کیا۔ حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہِ طلبی کی ایک باہِ طلبی کی۔

عصمتِ اطفال..... بچوں میں جاہِ طلبی اور باہِ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتی، نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں صرف کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر ابھرا ہوا بیدار نہیں ہوتا۔ بلوغ سے قبل اس میں ابھار نہیں ہوتا۔ لہذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی ابھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشاء ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام..... انبیاء علیہم السلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں۔ پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے جبر سے، کمال نیت سے اور کمال استقلال سے اور کمال عظمتِ خداوندی سے۔ یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام مجبور ہیں گناہ کرنے سے وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا کمال یہی ہے کہ ہر قسم کی قوت ہے اور پھر بچتے ہیں حکمِ خداوندی کی عظمت میں اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی مجبور کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ مگر سارے مادوں کو وہ کلینتہ تابع کر لیتے ہیں حق تعالیٰ کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کریں گے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رک جائیں گے۔ تو انبیاء میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان کے حق میں کمال ہے اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا۔

کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ دوسرا کہے گا کہ کبخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے۔ تو مجبوری میں بچا ہوا ہے۔ تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو۔ اور پھر آدمی خوفِ خداوندی کی وجہ سے بچے۔ ایک لنگڑا لولا آدمی جو چار پائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا۔ اس سے پاک ہوں۔ لوگ کہیں گے تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے۔ تجھے آج قوت مل جائے تو ذکیٹیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں۔ تو تو کرے گا کیا۔ محض چار پائی پر بیٹھا رہے گا۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچنا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم و عقل کی روشنی میں بچے اسے تو بچنا کتے ہیں اور جہاں روشنی ہی نہ موجود ہو اور بچے اسے بچنا نہیں کہتے۔

عصمتِ انبیاء اور عصمتِ اطفال کا فرق..... بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں وہ سامی قوتیں موجود ہیں۔ پھر

وہ معصوم ہیں ارادے سے، اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔

یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم وہ ناطقین سے معصوم اور انبیاء کمال طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں۔ اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے۔ لہذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں۔ اس لئے وہ بچہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال۔

باعث تعجب ایمان..... اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے۔ اور ایک ہے یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی موجود ہیں۔ تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں، زیادہ قابل قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تِلَاوُ "وَأَيُّهُمْ أَحَبُّ إِلَيْنَا" ① سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہو گیا جو وہ ایمان نہ لائیں؟ عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے، جنت ان کے سامنے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہوگا؟ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر عرض کیا یا رسول اللہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انبیاء کو کیا ہو گیا جو وہ ایمان نہ لائیں گے؟ وحی ان کے اوپر آ رہی ہے۔ فرشتے انہیں نظر آ رہے ہیں۔ مشاہدہ حق میں وہ مشغول ہیں۔ جلال و جمال کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے وہ بھی انکار کریں گے تو کون اقرار کرے گا اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب؟ پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ؟ پیغمبر تمہارے سامنے موجود۔ وحی تمہارے سامنے اتر رہی ہے۔ معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا؟ اس لئے تمہارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔ پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد میں آئیں گے نہ رسول ان کے سامنے، نہ معجزے ان کے سامنے، نہ ان کے سامنے وحی اتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ اور موانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے۔ کوئی دل میں تردد پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کفار، کہیں

① المعجم الكبير للطبرانی، ج: ۱۰، ص: ۲۳۶. دلائل النبوة للبيهقي، جماع ابواب اخبار النبي ﷺ بالكواثر بعده،

ج: ۸، ص: ۲. حدیث صحیح ہے۔ السلسلة الصحيحة (مختصرة) أول الكتاب ج: ۸، ص: ۲۳۰.

منافقین، کہیں نفس کے جذبات ہزاروں رکاوٹیں موجود اور داعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جتے ہوئے ہیں۔ تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

جبری عصمت..... اس سے معلوم ہوا کہ کثرت موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابل قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ داعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں ہوں گی، تو بچے اگر گناہ سے بچتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتے ہو جھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کر کے بچتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ نفس میں تو ان کے جذبہ ہی نہیں ہے گناہ کا۔ نہ شہوت کا جذبہ ہے۔ نہ کبر و نخوت کا جذبہ ہے۔ لہذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں اسے بچنا نہیں کہتے ہیں وہ تو گناہ سے الگ تھلگ ہیں۔ بچنا اس کو کہتے ہیں کہ قوت ہو۔ ارادہ بھی ہو۔ قوی کی اس پر قدرت بھی ہو کہ اس کام کو کر گزرے اور پھر بچے، تو بچوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاء کے اندر عصمت ہے ارادی اور اختیاری۔ تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا ارادے کا اور غیر ارادے کا خبر کا اور بے خبری کا۔

حفاظت اولیاء کرام..... رہے اولیاء اللہ، صلحاء متقین جو گناہ سے بچتے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاء بھی بچتے ہیں اور بچنے بھی اور اولیاء اللہ بھی فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس معنی میں وہ معصوم ہیں۔ اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں اس معنی پر کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں۔ لہذا وہ بھی معصوم ہیں۔ اب رہے اولیاء اللہ ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ حتی الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے۔ منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور بناء حفاظت کی کثرت ذکر ہے۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ رہتا ہے ان کو جلال و جمال کا قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصور اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کریں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار میں بعض دفعہ غلبہ نفس ہوا اور معصیت سرزد ہو گئی۔ خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا عبرتناک واقعہ..... حضرت شبلیؒ اکابر اولیاء میں سے ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ سرداران اولیاء میں سے ہیں اور ہزاروں خانقاہیں حضرت شبلیؒ کی خانقاہ سے آباد تھیں اور تقویٰ و طہارت کا ایک کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔ وقت کے تمام اولیاء ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک روز وہ مریدین کے ساتھ سیر و تفریح کو نکلے جب ایک بستی پر گزر رہا جو نصاریٰ و مجوسیوں کی بستی تھی۔ دیکھا کہ وہ لوگ خنزیر چراہے ہیں۔ دل میں خیال آیا کہ ”یہ کیا انسان ہیں۔ نہ ان میں ایمان ہے نہ انہیں گندگی اور پاپ کی تیز۔ سو چراہے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں۔ اصل میں مومن ہم لوگ ہیں کہ ہر برائی سے اللہ نے ہمیں بچالیا ہے اور ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں اور دین کے اندر ہم غرق ہیں۔“ دل میں یہ خیال پیدا ہوا ایک دوسرے کے درجہ میں تھا۔ ع

نزدیکان رائیش بود حیرانی

کے اصول سے جو جتنا مقرب ہوتا ہے اسکے دل میں اگر خطرہ بھی آتا ہے تو اس پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ یوں کہنے کہ عمل پر اتنی گرفت نہیں ہوتی جتنی کہ مقربین کے خطرات پر ہوتی ہے اور عتاب ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بستی میں جب یہ پہنچے تو دیکھا کہ کنوئیں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں عیسائی کی ایک لڑکی بہت ہی حسین و جمیل تھی۔ شیخ کی طبیعت اس پر مائل ہو گئی اور اتنی مائل ہو گئی کہ ضبط نہ کر سکے جا کر اسے نکاح کا پیغام بھی دے دیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نکاح جب کروں گی جب میرا باپ اجازت دے دے۔ شیخ نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں ہے۔ تو اس کے گھر پہنچے اس سے جا کر درخواست کی۔ اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر نکاح کر سکتا ہوں وہ یہ کہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنی ہوگی۔

شیخ نے کہا منظور ہے اور اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور مرتد ہو گئے۔ معتقدین اور مریدین نے آ کر شیخ سے منت لپاجت کی لیکن شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور شیخ مہبوت سے رہ گئے۔ خدام نے پوچھا کہ فلاں آیت آپ کے ذہن میں ہے۔ شیخ نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی آیت نہیں گویا پورا قرآن ذہن سے نکل گیا کوئی آیت ہی یاد نہیں آتی۔ پھر مریدین نے احادیث کے حوالے دے کر سمجھانا چاہا۔ شیخ نے اس پر بھی یہی کہا کہ مجھے کوئی حدیث بھی معلوم نہیں۔ گویا حدیث بھی ذہن سے نکل گئی اور اس کے عشق میں مستغرق ہیں۔ حتیٰ کہ کل جس لکڑی سے سہارا دے کر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تھے۔ آج دیکھا گیا کہ اسی لکڑی سے خنزیر چرا رہے ہیں۔ شیخ کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ رو دیئے۔ چنچیں نکل گئیں اور پورے ملک میں خانقاہیں غیر آباد ہو گئیں اور جہاں جس مرید کو پتہ چلتا رہا وہیں وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ خبر سنتے ہی اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ کچھ معمولی صدمہ نہ تھا کہ ایک شیخ وقت مرتد ہو گئے۔ فکر تھی کہ دوسروں کے ایمان کے کیا ہوگا۔ اس لئے سب لوگ دعا کر رہے ہیں۔ کہیں انفراداً کہیں اجتماعاً اور ایک خاص تعداد تو ہر وقت شیخ کے پاس ہی خدائے مالک الملک کے دربار میں دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

کچھ دن گزر گئے کے بعد شیخ کو خنبہ ہونا شروع ہوا کہ میں کس حالت میں ہوں اور مریدین سے دریافت فرمایا کہ میں کس حالت میں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ عیسائیت میں ہیں۔ شیخ نے کہا معاذ اللہ، استغفر اللہ، توبہ و استغفار کی اور اسی وقت کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤ۔ کلمہ تو تھا ہی ذہن میں بس ایک چیز غالب آ گئی۔ اب جو دھیان دیا تو پورا قرآن شریف ذہن میں موجود ہے۔ پوری احادیث محفوظ۔ کہا کہ میں یہاں آ کر کیسے پھنس گیا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ واقعہ ہے فوراً توجہ کر کے وہاں سے واپس ہوئے اور استغفار میں مصروف رہے۔ تمام خانقاہوں میں خوشیاں منائی جانے لگی اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اللہ نے شیخ کو پھر اسلام میں لوٹا دیا۔

ادھر تو یہ واقعہ ہوا اور ادھر یہ ہوا کہ اس عیسائی گھرانے پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود اپنی لڑکی کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ حضرت اس کو مسلمان کر لیں اور اپنے نکاح میں قبول فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو نکاح کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو بیوی موجود ہے نہ وہ عشق، نہ وہ محبت۔ بعد میں جب سوچا تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو خطرہ آیا تھا ایک زعم کا کہ ”اصل میں ہم ہیں انسان۔ یہ عیسائی کیا کرتے ہیں“ اس کا جواب دیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے ولی سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔

حفاظت اولیاء کا طریقہ..... چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَافٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ﴾ ① جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو درغلا لیتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ بتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوت ایمانی سامنے آتی ہے تو لا حول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جا رہا ہے۔ جیسے (معاذ اللہ) زنا کاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں۔ اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا۔ البتہ ماحول سے متاثر ہو کر گھر گھر کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو وہ ہزار توبہ کرے گا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہوگی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ و استغفار سے بلند ہوئے۔ اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کر لیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

وجوہ عصمت..... مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہو جائے۔ ہاں خطا فکری ہو سکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو۔ اس سے وہ بری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو بدن تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے۔ تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خیر بھی پاک۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبیعت میں پاکی ہوگی اور ظاہر بات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے۔ شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے، لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہوگا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہو سکی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گزرے گا۔ تو مادہ پاک ہے۔ بدن بھی پاک ہے۔ لازمی بات ہے کہ ان بدنوں سے جو اعمال اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

جب ابدان ظاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہر بات ہے ارواح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ترین ہیں

اور ان روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالات حق کا ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے حضوری ہے کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصور کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو۔ اس کی عظمت، اس کا جلال دیکھ رہا ہو، وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انبیاء علیہم السلام تو ہر وقت مشاہدہ کی حالت میں ہیں۔ ملائکہ ان کے سامنے وحی ان پر آ رہی ہے۔ تو وہ بیچارہ نفس کرے گا کیا۔ گو مادے سارے موجود ہوں۔ نفس مغلوب ہی رہے گا تو مادہ بھی پاک، روح بھی پاک اور اوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالم غیب کا اور وحی کا نزول اور علم الہی براہ راست اتر رہا ہے اوپر سے پھر حفاظت خداوندی بھی شامل ہے۔ چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لینا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہو تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کو بری رکھا گیا ہے، ان کے مادے پاک، روہیں پاک، احوال پاک، ماحول پاک اور اوپر سے مشاہدات اور ہر وقت حضوری شاہی دربار میں اس لئے وہاں عادتاً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو۔ زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ سے صدور گناہ خلاف تقویٰ نہیں..... اولیاء اللہ سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادتاً بھی اس لئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں۔ من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں۔ نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں۔ اور نہ وحی ان پر اتر رہی ہے۔ اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے۔ بعض ائمہ صحابہؓ سے گناہ سرزد ہوا۔ جیسے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا۔ اور ان کو رجم کیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوئے بھی نہیں۔ ماحول سے متاثر ہو کر ایک حرکت سرزد ہو گئی۔

لیکن پھر اتنی توبہ کی اتنی توبہ کی کہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالکؓ نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلا دی جائے تو سب کے گناہ معاف ہو جائیں ① اس ایک توبہ کے اثر سے۔ تو اولیاء کے اندر فقط امکان عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے، کہ گناہ سرزد ہو جائے، مگر حفاظت خداوندی شامل ہوتی ہے، تو گناہ ہوتا نہیں۔ اور اگر ہو جائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہنچائے۔ تہجد کے لئے آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا۔ حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں۔ اس لئے کہ امتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب۔ مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا اگر ایک تہجد بھی قضا ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہو گئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آ پڑا۔ تو حضرت امیر معاویہؓ اس تہجد کے قضا

① الصحيح لمسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه الذنوب، ج: ۹، ص: ۶۸، رقم: ۳۲۰۷۔

ہونے پر تمام دن روئے۔ استغفار کیا دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔
غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انکوٹھایا کہ ”حضرت امیر! تہجد کا وقت ہو گیا ہے اٹھئے تہجد پڑھ لیجئے“۔ حضرت امیرؑ نے اجنبی آواز محسوس کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میری مجلس رائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنان خانے میں تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہے؟ اس نے کہا کہ ”میں شیطان ہوں“ تہجد کیلئے اٹھانے آیا ہوں“ فرمایا کہ کم بخت تو اور تہجد کیلئے اٹھائے۔ اس نے کہا جی ہاں خیر خواہی کا جذبہ ابھر اور مجھے گوارا نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا ہو۔

فرمایا کہ تو اور خیر خواہی کرے۔ اللہ نے فرمایا ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا ہے اس لئے تو اور دوستی کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ سچ بتاؤ کیوں آیا ہے؟ ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ تیری گردن مروڑ دوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تب وہ اصلیت کھلی۔ اس نے کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے ہی کل ایسی حرکت کی تھی کہ آپ کا تہجد قضا ہو گیا۔ میں نے کچھ ایسے وسوسے اور آٹار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آ گئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا تو تہجد سے اتنے درجے بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے۔ اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج قضا ہو گیا پھر توبہ کریں گے پھر درجے بلند ہوں گے۔ تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو یہی اچھا ہے کچھ تو درجات میں کمی ہوگی۔ جب اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؑ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ بہر حال اولیاء کا ملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادتاً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں۔ وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھر کر شاذ و نادر واقع ہو سکتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام سے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔

مقام عصمت اور شیطان..... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ یہ خیر کے وعدے دیتا ہے۔ اور شیطان شر سمجھاتا ہے۔ دونوں کی جنگ ہوتی ہے۔ صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے؟ فرمایا کہ ہاں لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہو گیا۔

اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں کہ ہے وہ شیطان ہی، مگر میں اس سے بچا لیا جاتا ہوں۔ اس کا کید و کمر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ان کی صورت بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر تو اب میں کسی نے مجھے دیکھا

تو اس نے مجھے ہی دیکھا۔ شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لے کر کہے کہ میں ہوں۔ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ صورت بھی نہیں بنا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کے حقائق میں اثر انداز ہو سکے۔ حفاظت اولیاء اور شیطان..... شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں۔ اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے، لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آکر یا تو اس گناہ سے بچا دیتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

حاصل کلام اور درجات عصمت..... مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ عصمت اختیاری کے ساتھ۔ اولیاء اللہ محفوظ ہیں، حفاظت خداوندی کے ساتھ۔ اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادتاً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام میں عادتاً ممکن نہیں۔ صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہوگا نہیں اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطا فکری ہے۔ جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ عصمت اضطرابی کے ساتھ کیونکہ ان میں مادہ ہی ابھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا، نہ شہوانی قوتیں ابھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے۔ کھیل کود کرتے ہیں لیکن کوئی ارادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکر و فریب کر کے دنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی طبیعتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں۔ تو عصمت دونوں میں ہے ایک میں خلقی عصمت ہے ایک میں ارادی عصمت ہے، ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں قوت و تمام و کمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی نامتائی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام میں بھی مگر یہ فرق ہے اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

بندہ حکم پر انکشاف اسرار ہوتا ہے..... ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اس پرچہ کو پڑھا۔ سوال یہ تھا کہ کفار و مشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کر جائے ان کا کیا حشر ہوگا۔ آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اسرار و حکم بیان کیجئے۔

سوال کا آخری جز ”مع اسرار و حکم بیان کیجئے“۔ حضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اس لئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے ”مع اسرار و حکم بیان کیجئے“۔ اسرار و حکم ہم پر کب ضروری ہیں ہم تو ناقل ہیں احکام کے، حکم بیان کر دیں گے۔ یہ اسرار و حکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالب اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتے۔ خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جا کر یوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے۔ اور بیگمات

شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے۔ اور یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں؟ تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو۔ یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا؟ اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع و فرماں بردار ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا۔ حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ وہ کہتے بہت اچھا۔ حکم دیا کہ گھر چلے جاؤ وہ کہتے بہت اچھا حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہو جاؤ۔ وہ کہے بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ہر وقت ماننے کو تیار ہے۔ بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر اطاعت کرتے کرتے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے۔ بڑا مطیع ہے۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرانے میں ہر وقت آ سکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں۔ تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔

اگر وہ گھروں میں آ رہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح کی جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے۔ اسی طرح دو برس گزر گئے تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے۔ اس پر بادشاہ خوش ہو کر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمہیں اپنے خزانے دکھلائیں گے، خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں یہ سونا ہے، یہ چاندی ہے۔ لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری و ساری ہے، چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ ہے اور یہ بھی ہے، اور یہ حکمت عملی ہے تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کو کان پکڑ کر باہر نکال دو، اس کو پھانسی دے دو یہ کون ہے اسرار طلب کرنے والا؟

تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ حکم معلوم کرے یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ! اس کا راز بھی بتاؤ؟ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے؟ جب اللہ کا حکم آ گیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز معلوم نہ ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل سے راز مجھ میں آ گیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو رہ گئے۔ یہ نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتائیے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرتے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے۔ دین پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ فرائض و واجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم، عقل بھی خادم اور ارادہ بھی اللہ کا غلام، مشیت بھی غلام، پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے۔ تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے؟

مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی ہے یا جہنمی؟..... اولاد مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدثین ذراری مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں کہ مشرکین کی نابالغ اولاد آ یا جنتی ہے یا جہنمی؟ اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں۔ ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فطرت پر حکم لگا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا اور جنت و نار عمل کے اوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اس لئے فطرت پر حکم لگا کر داخل

جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزایا جزا کے طور پر نہ ہوگا بلکہ محض انعام و تکریم کے طور پر ہوگا اور انہیں خدمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا۔ وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خادم کے رہیں گے اور یہ ہی ان کے حق میں بڑے اعزاز کی بات ہوگی کہ انہیں جنت میں خدمہ بنا کر داخل کر لیا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی ہیں۔ ٹھیک نہیں، اس لئے سکوت اختیار کیا جائے معاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالیٰ کے اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوگا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا۔ ان کے آباؤ اجداد کے یعنی ملحق کر دیا جائے گا۔ اگر آباؤ اجداد جہنمی ہیں تو وہ بھی جہنمی ہیں۔ اور اگر آباؤ اجداد جنتی ہیں تو وہ بھی جنتی ہیں۔ تو وہ بھی جنت میں جائیں گے۔ اس دنیا میں جب مردم شماری ہوتی ہے تو نابالغ بچوں کو بھی گنتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہیں اسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ اہل مذہب قیاس کرتے ہیں قرآن کی اس آیت پر ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباؤ اجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے۔ گوئل ان کے ٹھیک نہیں۔ تو جب مومن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جاویں گے لہذا وہ بھی جہنمی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار۔ وہ حقیقت میں نفس کا جز ہوتا ہے ماں باپ کے۔ ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں اور باپ کا کما کے کھاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب کہا جائے گا کہ اب اس میں استقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا وہ مسلم ہیں تو یہ بھی مسلم وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر و اسلام جب ہی معتبر ہوگا جب وہ عقل و ارادے اور اختیار سے قبول کرے گا۔ تو نابالغ اولاد ماں باپ کے تابع ہیں لہذا جو ان کا حکم ہے وہ ہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنتی ہیں نہ وہ دوزخی بلکہ وہ بیچ میں اعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ جنت ہے نہ دوزخ۔ ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائے گی اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی جانب سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ آگ میں کود پڑو تو جن کے مزاج میں سلامتی ہوگی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ حکم خداوندی سے باغ و بہار بن جائے گی۔ اور بعضے تامل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں۔ ڈریں گے جھکیں گے ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کودو اور وہ کودتے نہیں۔ معلوم

ہوگا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔ ایک مذہب یہ ہے اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا عمل سرزد نہیں ہوا۔ صرف جانچ کر لی جائے گی کہ فطرتوں کا رخ کیا ہے؟ اسی اعتبار سے وہ جتنی یا جتنی ہوں گے۔

اسلم ترین مذہب..... بہر حال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے۔ حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگادیں۔ چاہے وہ عمل پر حکم لگادیں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ شریعت نواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کاہے پر حکم لگادیں۔ رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا۔ اور ہم حکم لگانے والے۔ تو اسلم طریق یہی ہے کہ توقف کیا جائے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہل جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

نس بندی..... سوال: آج کل مسلمانوں میں ضبط ولادت اور نس بندی کا رجحان پایا جا رہا ہے۔ شرع میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ نس بندی شرعی اصول کے تحت ممنوع ہے اس لئے کہ شریعت کا منشاء نکثیر اولاد ہے۔ اسی بناء پر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ ”تَزَوُّجُوا الْوُدُودَ الْوُلُودَ فَإِنِّي مُكَافِّرُ بِكُمْ الْأَمَمَ“ ① یعنی ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن سے اولاد زیادہ پیدا ہوتا کہ قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں۔ اس لئے قانون عام نکثیر نسل ہے اور اسلام چونکہ جامع اور معتدل مذہب ہے اسی لئے اس نے دوسری جانب کی بھی رعایت رکھی وہ یہ کہ اگر خاوند اور بیوی اتنے کمزور ہو جائیں کہ اولاد ہوگی تو جان کا خطرہ ہے اور وہ آپس میں طے کر لیں اور اولاد نہ ہونے کی دوا کھالیں تو وہ کر سکتے ہیں۔

استثنائی حکم..... استثنائی کو کوئی قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے نس بندی کو جائز قرار دیا ہے تو یہ خیانت ہوگی۔ اور یہ ایسے ہوگا، جیسے کہ شراب ہے اور نجس العین ہے اور نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کی جان بچ نہیں سکتی جب تک یہ شراب نہ پی لے۔ تو شراب پلانے کی اجازت ہے اس لئے کہ جان بچانا فرض ہے۔ یہ ایک استثنائی حکم ہے لیکن اگر کوئی اس کو قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے شراب جائز قرار دی ہے۔ یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہوگی۔ اسی وجہ سے قانون عام اپنی جگہ ہوتا ہے اور استثنائی حکم اور ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں موجود ہے کہ اپنی زبان سے کلمہ کفر مت نکالو اس قسم کا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن آگے فرماتے ہیں۔ کہ اکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دل میں اطمینان کے ساتھ ایمان موجود ہو اور کسی نے گلے پر تلوار رکھ دی اور کہنے لگایا تو کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دو ورنہ ابھی ذبح کر دوں گا تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ کفر کا کلمہ کہہ دو اور دل میں ایمان رکھو اور مطمئن رہو تہماری کوئی گرفت نہ ہوگی۔

اب کوئی کہے کہ اسلام میں کفر کا کلمہ کہنا جائز ہے اور قانون عام بنا کر پیش کرے تو سراسر خیانت ہے یہ

صرف ایک استثنائی حکم ہے۔ خاص حالت میں اس کی اجازت ہوگی اسی بناء پر حکم عام اور قانون عام اور ہوتا ہے اور استثنائی احکام الگ ہو جاتے ہیں۔ استثناء کو استثناء رکھا جائے گا اور قانون کو قانون عام رکھا جائے گا۔ اسلام میں فرض ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھو۔ اگر بیماری غالب ہے اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔ اب اگر اس کو کوئی قانون کے طور پر یوں کہہ دے کہ اسلام کا قانون ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ تو یہ خیانت ہوگی۔ حکم عام وہی رہے گا کہ کھڑے ہو کر پڑھو اور اگر کوئی خاص حال پیش آ جائے تو اس کی وجہ سے اجازت ہے مگر وہ شخصی بات ہوگی عام حکم نہ ہوگا یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک تو تکثیر نسل ہے یہ تو قانون عام ہے۔ اور ایک ہے استثناء وہ شخصی حالت کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی فتویٰ ہوتا ہے اور اگر مفتی اجازت دے دے تو وہ حکم عام سے نکل کر اجازت شخصہ کے اندر آ جاتا ہے۔ قانون عام اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔ یہ تھی واقعہ کی قانونی بحث!

منظم فساد سے روٹی کی بچت..... میرے پاس سہارنپور کے دوڑ پٹی کلکٹر آئے اور نس بندی کے سلسلے میں گفتگو کرنی شروع کی۔ اس بارے میں انہوں نے سوال کیا جس کا ایک جواب میں نے ہنسی کا دیا اس سے وہ بے حد شرمندہ ہوئے۔ وہ یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ فکر لاحق ہے کہ اولاد اور آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور روٹی گھٹتی جا رہی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط بہر حال آپ کو فکر آبادی کے بڑھنے اور روٹی گھٹنے کی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ مصیبت جو پیش آرہی ہے۔ موجودہ نسل ہی سے پیش آرہی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ آنے والوں کا راستہ تو بعد میں روکنا۔ ان کی پہلے (موجودہ) میں کمی شروع کر دو۔ اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ جو ملک میں فسادات پیش آرہے ہیں ان کو منظم اور باقاعدہ کر دیجئے۔ ہر ایک شہر میں رواز نہ ایک دو فساد ہوتے رہیں اور معتدبہ افراد قتل ہوتے رہے تو دس برس میں انشاء اللہ کافی کمی ہو جائے گی اور آپ کی روٹی بچ جائے گی اس جواب سے وہ جھینپ گئے۔

تقسیم دولت میں عدم توازن..... اس کے بعد میں نے کہا کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ تو اصل میں آپ لوگ کرتے نہیں۔ اور نہ کرنے کے کاموں میں آپ لوگ چل رہے ہیں۔ روٹی کی کمی اس لئے نہیں کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔ آج تو زمینوں میں اتنی کاشت ہو رہی ہے جتنے افراد بڑھ رہے ہیں رزق بھی بڑھ رہا ہے۔

پھر بھی جو کمی ہے اس کی بناء یہ ہے کہ آپ کے ملک میں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ جو غریب ہے وہ بے حد غریب ہے۔ اور جو امیر ہے وہ بے حد امیر ہے۔ ملک کے وہ خاندان جو اربوں کھربوں کے مالک ہیں قانون پر ان کا قبضہ ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران ان کے ممنون ہیں وہ قانون ایسا بنواتے ہیں کہ ان کا سرمایہ بڑھتا رہے۔ اور غریب فٹ پاتھ پر پڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ دولت کی تقسیم صحیح کر دیں کہ امیر اور سرمایہ دار کو ذرا نیچے اتار دیں۔ اور غریب کو ذرا اونچا اٹھائیں۔ اس سے توازن

پیدا ہو جائے گا اور یہ شکایت رفع ہو جائے گی۔ یہاں ہزاروں بورے غلے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔ جب وہ غلہ پرانا ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ غلہ اور رزق کی کمی نہیں بلکہ نیتوں کی خرابی ہے۔ یا طرز عمل کی خرابی ہے۔ آپ ان دولت مندوں پر اور سرمایہ داروں پر پابندی عائد کر دیں اور ان کی دولت میں ایسے راستے نکالیں کہ غرباء پلین اور ملک میں ایک بھی فٹ پاتھ پر پڑنے والا نہ رہے۔

آج بمبئی کے فٹ پاتھ پر آٹھ لاکھ آدمی سوتے ہیں جن کا نہ گھر ہے نہ در ہے وہیں ان کے بچے روتے رہتے ہیں بارش ہوتی ہے تو ایک طرف کو سکر جاتے ہیں کوئی کھلی اوستا تھ لیتا ہے کوئی کسی کا سہارا لیتا ہے تو ایک ایک شہر میں آٹھ آٹھ لاکھ آدمی فٹ پاتھ پر پڑنے والے ہیں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں غرباء کتنے ہیں ان کی کیا حالت ہے؟ نہ ان کے پاس روٹی نہ کپڑا نہ گھر نہ در۔ اور دوسری طرف دیکھو، برلا، ٹاٹا، بامنا وغیرہ کو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ دولت کتنی ہے۔ وہ بڑھ رہے ہیں دولت میں۔ اور یہ بڑھ رہے ہیں غربت میں۔ یہ نظم کی خرابی ہے آپ اس خرابی کو ڈالنا چاہتے ہیں ماؤں کے پیٹوں پر کہ آنے والوں کو روک دو، اس کا ان سے کیا تعلق اپنا نظم صحیح کیجئے۔ اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے کچھ بیان حاصل کریں۔ میں ان کو بیان تو کیا دیتا، مگر وہ وہاں سے چپ ہی ہو کر اٹھے، میں نے ان سے کہا کہ بس دو ہی صورتیں ہیں یا فسادات کو منظم کرو۔ اچھے خاصے افراد ہر روز قتل ہوتے رہیں دس بارہ سال میں کی آجائے گی۔ اور یہ نہیں کرتے تو نظام صحیح کرو، دولت کی تقسیم صحیح کرو۔

سرمایہ دار کا طریق واردات اور میں نے یہ بھی کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان سرمایہ داروں نے اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ شوشے چھوڑ رکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نس بند کرو یہ کرو اور وہ کرو تا کہ ان کی دولت پر زور نہ آئے اور ان کے پیسے میں کمی نہ آئے۔ یہ اس کو چھپانے کے لئے چالاکی کرتے رہتے ہیں تاکہ پبلک دھوکہ میں مبتلا رہے۔ ہم دھوکہ میں آنے والے نہیں۔ اپنا نظم درست کیجئے آپ کا نظام صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی کیا تو بیس برس کے بعد سر پکڑ کر روئیں گے جب اولاد کی کمی ہوگی نہ فوج میں آدمی ڈھنگ کا ملے گا اور نہ پولیس میں پھر بعد از خرابی بسیار اضافہ نس پر سوچیں گے۔

کثرت اولاد پر انعام میں نے کہا کہ آپ یہاں رزق کی کمی کی وجہ سے آنے والوں پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ قانون ہے کہ جتنی اولاد زیادہ ہوگی اتنا ہی والدین مستحق انعام سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی اگر کسی کے یہاں دس بچے ہیں تو اتنے فی صد انعام دیا جائے گا۔ اور بارہ ہیں تو اتنا۔ یہ رزق کی کمی وہاں کیوں نہیں؟ وہاں لوگ کیوں فاقے نہیں بھرتے۔ اس لئے کہ دولت کی تقسیم میں نابرابری نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس مصیبت سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

استثنائی اجازت سوال: استثنائی شکل میں نس بندی کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب: استثنائی شکل دوسری بات

ہے اس میں نس بندی ہی کیا بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے کھانے سے اولاد نہیں ہوتی جب آدمی اس حال پر پہنچ جائے کہ بیوی اس قابل نہ ہو اور اس کی جان کا خطرہ ہو اور وہ کہے کہ مجھے تحمل نہیں اور آئندہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف سے جان جانے کا اندیشہ ہے تو اسے شریعت کی جانب سے اجازت ہے کہ کوئی ایسی دوائی کھالے جس سے بچہ پیدا نہ ہو مگر استثنائی حکم استثنائی رہے گا اور اس کو قانون عام کی شکل نہیں دی جاسکتی ہے۔

انٹرویو

ضبط و تحریر..... حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ
علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس اللہ سرہ سے ایک ملاقات
حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام
دعوت و تجدید، علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارنامے

① پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پر نور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ ”الحق“ کے لئے مرکز اسلام کے مدیر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم و اسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ ادھر یہ خواہش ادھر حضرت کی مصروفیات ارد گرد پر دانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تنکان سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد، مگر خدا کی خاص سنگیری تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

دارالعلوم کا مستقبل..... حضرت والا سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز ہی سہی۔ لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں۔ اور پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ کہ:

عشق ست و ہزار بدگمانی

جس شجرہ طوبی کے لئے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین، ہمواری کی جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اسلام مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام

① حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم نے یہ انٹرویو حاصل کیا۔ عنوانات کا اضافہ مرتب کی طرف سے ہے۔ ماہنامہ ”الحق“ کے شکر یہ کے ساتھ اسے جزو کتاب بنایا جا رہا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اجمعین جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی سچ دی۔ آج انوار و معارف کے امین اور بانی دارالعلوم کے حفید رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا۔ جسکی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔

”جی ہاں، اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے ان شاء اللہ۔ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھٹائیاں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا۔ بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا۔“

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکا یک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر اہل دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھایا نہ تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دارالعلوم اپنی زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے، تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوندی اور مسائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارہ میں پوچھا کہ ”حضرت! کسی بزرگ غالباً مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے۔ وہ سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو۔“

حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکا یک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قدیلوں سے روشن ہو گئیں۔ حضرت فرمایا۔ ”نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی امید باندھے ہوئے ہیں۔“ پھر حضرت نے فرمایا ”یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک پوری ہوتی چلی آرہی ہے۔“

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ وضاحت فرما رہے تھے اور چشم تصور نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکت اسلام کے تصور ہی سے جھوم اٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندہ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسری پیرائے میں دہرائی۔

تجدید دین کا مظہر اتم..... حضرت! تجدید دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے۔ تو یہ تو دین اور علوم دین کا ایک مجدد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔ ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ کہ حضرت نے ایسا امید افزاء اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدہ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا۔ ”میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لئے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ اور ان اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدد ہیں۔ جنہوں نے سنت بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی، اور اس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہر اتم یہ دارالعلوم ہے۔ اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدید دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دارالعلوم، اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قطب الریحی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے۔ تو اس کے ارد گرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے، وہی مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ کہ یہ دارالعلوم چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔

ظرافت آمیز شکوہ..... حضرت ابھی اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب ① رحمہ اللہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویو نگاروں کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ ”ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگو گے دن کو بھی نہیں سونا چاہئے آج بھی جاگنا چاہئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تا کہ مجاہدہ مکمل ہو جائے۔“ بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی ہے، اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری ”قدر شناس میزبان حکومت“ نے آپ کے تقریر و بیان پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و حکمت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فروانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کے بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ ”جی ہاں یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے، اور علالت پر خداوند کریم کا فیہی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی۔ گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آ رہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا۔“ عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین سے اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس ”پذیرائی“ کا ذکر چھیڑ کر مجھے خودندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علوم اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا ایک ایک پرزہ جس پر غلٹ میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا۔ حضرت نے ایک اچھٹی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگی دامن کو دیکھ کر مسکرانے

① شیخ الحدیث حضرت محترم مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ تنک (پشاور)

لگے۔ ”ارے بھائی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے۔“ مگر ایک سدا بہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامن سے زیادہ انواع و اقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز و شاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

امام دعوت و عزیمت سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا تعالیٰ نے ظلمت کدہ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا۔ اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم و تہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں، تدبیر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔

ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی، اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ، شعرانی کا علم الکلام، غزالی کا سوز و گداز، ابن تیمیہ کا صولت بیان، ولی اللہ کی حکمت و دانش، احمد سرہندی کی غیرت و حمیت اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کر دی تھیں۔ اور بقول حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ”ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے۔“ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت و عزیمت، سرخیل ارباب صدق و صفا، علمبردار جہاد حریت اور نابغہ روزگار شخصیت کے مقام دعوت و عزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرما رہے تھے کہ۔

تین بڑے کام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ خلافت اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے۔ گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی اس لئے خطرات نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے۔ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ سارے بزرگ و طب اللسان رہے۔ اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے، کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔

تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح

بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا۔

ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے۔ جو اورنگ زیب کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرت نے وعظ فرمایا بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے تھے کہ کیا کہتا ہے؟۔ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجا وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھی، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا میں بہر حال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آج ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنت رسول کی احیاء میری وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجئے۔ فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں کمر جھک گئی۔ ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے تو فرمایا کہ اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور انکے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنادیئے گئے اس میں کچھ دیر لگ گئی۔ پھر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہنے اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟

فرمایا: کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لئے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر اسی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

روح دار العلوم..... تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علوم نبوت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے، مراد آباد میں مدرسہ شاہی، امر وہہ میں مدرسہ عربیہ، بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم، انپٹھ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور اگلاوٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا۔ اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اصلاح معاشرہ اور خلافت اسلامیہ..... ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرت کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود نمود قائم رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا۔

افغانستان سے رابطہ..... اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ”جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں۔ میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہ کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا۔ امیر بڑی عنایت و شفقت سے پیش آئے جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ شاید ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا۔ لیکن یکا یک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آ رہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معافہ دایاں بایاں مونڈھا چومنا، پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا ”بفرمائید“ آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا ”نے نے خلاف ادب است“ فرمایا نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جورسی کرسی تھی، اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ۔ کابل کی یہ حکومت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے، اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے

سے گنگوہ آ کر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرمادیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا ”جاؤ کاہل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا۔“ انہیں حیرت ہوئی کہ کاہل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟

امان اللہ کی حکومت تھی یہ لوگ بنی اعیان میں سے تھے، تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھی۔ مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی۔ امان اللہ خان معزول ہوئے۔ کیونکہ اسی نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے۔ وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدر اعظم نے فرمایا کہ

”ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اوڑھتی تھی اور ہمیں شفاء ہو جاتی۔ آج ڈاکٹر رفتی بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی اور فرمانے لگے۔ کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہو گیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدر اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں۔“

ترکوں سے روابط..... یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور۔ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین نافریت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تو گویا حضرت جوش جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں، شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک عملی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلہ میں سہی مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے۔ انگریزی دور میں محکمہ قضاء کا قیام..... اس سلسلہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر انگریز نے آخر میں توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک

تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا چنانچہ وہ آیا۔ رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا۔ اس نے آکر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کیا اور بہت جرات کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟

حضرت نے بڑی نرمی سے کہا کہ ”یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے۔ ہم نے منٹوں میں فیصلہ کر دیئے۔“ مگر اس نے کہا نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ ”کان پکڑ کر اسے نکال دو“۔ طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ ”جاہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے۔“

بہر حال عید کا دن آیا، تھانیدار کے ہاں دودھ کے ہالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہو گئی ہے۔ اس کو فوری درخواست کیا جائے۔ اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی۔ پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا کہ ”افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی، مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی۔“

تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہو گئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔ تو حضرت کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو۔

اسی کے تحت دارالعلوم کے اکابر رحمۃ اللہ علیہ نے جب لنڈن سے مسٹر مائڈے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ) علماء کا ایک وفد لیکران سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ ”ہندوستان میں محکمہ قضاء قائم کر دیا جائے۔ جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔“ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ وقتی بات تھی نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ..... مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سبھی قائم ہو جائے۔ تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی سابقہ بڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے، تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

رات آدمی گزر چکی تھی شرکاء مجلس ذکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکا یک حضوت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بساط لپٹنی چاہی، سننے والے چونک

پڑے اور حضرت کے ضعف نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مخصوص شان ”علمی کمالات“ کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے مگر دل بضد تھا کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید..... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرط نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ ”سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت قلمی کھولنے کے لئے کافی ہوگی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ جمت سے نہیں کر سکتا۔ اتنی جتیں جمع فرمادیں تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی، جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں“۔ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ”میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا حصہ ہے۔“ حضرت کی ہر چیز کی نہ تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، اور انکے ہاں اخفاء تھا نہیں، جو واردات ہوتی صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا، یہ الہام ہوا، یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ ”بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی“۔ طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات پیش آئی؟ فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ ”میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرے میری طرف متوجہ ہوئے، ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا۔“ اور اس کے بعد خود فرمایا کہ ”جس شخص کی توجہ کا یہ اثر کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہو سکے، تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے۔“

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اساتذہ دارالعلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمہ فنون تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام معقولات سمجھے جاتے تھے۔ ان سب نے مل کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب تو صدر مدرس تھے۔

علوم کا عروج..... تو حضرت نے منظور فرمایا: جھٹہ کی مسجد میں حضرت نے درس شروع کر دیا۔ اہم سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دواڑھا کی گھنٹہ تقریر فرمائی اور عجیب و غریب علوم و معارف ارشاد فرمائے۔ اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہذا تکرار کیا جائے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا، مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر شروع کی۔ بیچ میں ایک جگہ رکے، بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی۔ تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا۔ تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آ رہے تھے تو مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا۔ تو کھڑے کھڑے حضرت نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ تو عرض کیا حضرت ذرا نازل ہو کر فرمائیے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمائیے ہم وہاں تو نہیں پہنچے۔ تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت آئیے گا۔ تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہوگا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آ رہا تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔ فرمایا: ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں۔ اس لئے کہ علماء کی توجہ نہیں وہ کہتے کہ یہ مغلط مضامین ہیں۔ میں نے کہا بھی حمد اللہ اور ملاحسن، اور قاضی تو سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کے مطابق کام کرنے کی صورت نکل آئے، حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی، پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔ الغرض بڑے عجیب و غریب علوم و حقائق ہیں۔

کچھ اپنی زندگی کے بارے میں..... حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرات کی گئی۔

پیدائش کا پس منظر..... حضرت مسکرا کر فرمانے لگے۔ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل چلے، تو دوسری

شادی دیوبند میں کرائی۔ اس سے میرے تین بھائی مجھے سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو۔

تو فتح پورہ سو میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ تو حضرت مولانا عبد السمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ، کہ مولانا حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب اولاد ہوں۔ وہ سفر کر کے گئے۔ جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ”رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا۔“

مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے، صبح آئے اور خوش ہوئے۔ فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔ اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا۔ جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔ مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا اور میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔ اس تانگے میں مولانا عبد السمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور میں تھا۔ مولانا نے کہا کہ بھی! میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ ”جب تو حافظ قرآن ہو گیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمد للہ قبول ہو گیا۔ پھر تو نے قرأت کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا۔ پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا، الحمد للہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا۔ آج تو حج کو جا رہا ہے۔ تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے۔“ آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا۔ میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے، ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، انہوں نے کان میں اذان دی۔ حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاحبزادے جافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دیوبند تشریف لائے اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادا صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دعا کیا کروں، قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہر صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی لیکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی بسم اللہ..... اس کے بعد جب مجھے الف باتا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا۔ دور دور سے مہمان آئے۔ تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہند کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔ اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع۔ مطلع تو یہ تھا۔

حبذا مکتب طیب کے مبارک تقریب کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے تھا۔

رہنما جو کہا اس نے تو بے روئے ریا
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تم بالآخر
ناز برداری..... بہر حال ان اکابر کی توجہات تھیں، میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے گزرتے
ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لیا بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اس
طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں
نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب..... یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمن صاحب
(راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ ”مسلمانوں کے تنزل کے اسباب“ ایک ایسا موضوع جس پر بحث و فکر
تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے
جب تک مرض کے ازالہ کے لئے علمی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و محرکات پر
بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف
کرنے سے خالی نہیں جاتی، منبر و محراب کو لے کر صحافت و انشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے
اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی جہیں جتنی ہی جاری ہیں اور جب سقوط بیت
المقدس کے واقعہ ہائیکہ اور قیامت صغریٰ نے بھی ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت
شعاروں کو بیدار کر سکے۔ مگر۔ ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ
ہو سکے۔ یہی تصور حضرت قاری صاحب مرحوم کے سامنے آچکا ہوگا کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دگداز
سانس بھر کر خود ہی سائل دہرایا۔

”مسلمانوں کے تنزل کے اسباب؟“ اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چھوتے ہوئے فرمایا اس میں تو
سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملا کی رائے کیا معتبر ہوگی۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے
خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا حق سمجھتی ہے۔
حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا۔ تنزل کے اسباب کا ذکر
شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کے بجائے اپنے معاشرہ کی چند جزئیات سے اس
پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا ہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ
جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی
مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ مویشا گافیوں کی آڑ میں پناہ لینی چاہی، اور

نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی۔ بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھند سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی، جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کر سکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے؟

افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر وہ سہ کران کی ساری غور و فکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سکتے ہوئے فلسفہ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال۔ دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ تمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا: ہاں! سبب ہے۔ کہا: کیا سبب ہے؟ میں نے کہا: بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور بر سر اقتدار انسان۔ آپ ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا اور میرا غشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔

مذہبی نقطہ نظر سے اسباب تنزل..... تو میں نے کہا سن لیجئے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کر سکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں۔ اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کر سکتی ہے۔ دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراؤں انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے۔ لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی اس وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہوگی کیا اس میں شرم و حیاء اور غیرت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آ جاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہیں جانور۔ اس قدر بے ہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آ گیا تو سوائے بد اخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں۔ سو پچاس اترے کسی نے سو گئے، کسی نے دو سو گئے کسی نے پچاس، کسی نے گٹھڑی باندھ لی، اور قطعاً انہیں یہ احساس نہیں کہ یہ ہماری چیز ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا باران کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ ہے۔ تو جب تاجروں میں خیانت آ جائے تو ملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانب داری، اقرباء پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آ جائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار ہے گا؟ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔ کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے۔ وہ آ نہیں سکتی بیچ میں۔

نقطہ نظر کا اختلاف..... تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقہ کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے۔ تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہو گا نہیں، میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں۔ اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں۔ بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔

برسرِ اقتدار طبقہ کی اصلاح کا طریق..... اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بھگتہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس پلیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی شان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آپ چاہیں تو ایجنسی نیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستعدانہ طریق سے ان

لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے۔ کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجنسی ٹیشن کی صورت اختیار ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آجائے حکومت، تو وہ پھر چڑھ آتی ہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈال دی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حکومت سے کام لینے کا طریق!..... حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

”پیغام کا مجھے کچھ بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے؟ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے کہا تھا کہ جو مفکر قسم کے لوگ چند علماء ہیں اور بااثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کی بقاء کے لئے فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک وقوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اس سے قائم ہے۔“

اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں۔ مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے۔ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور بازیابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد ہو، نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو، ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔ کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیب کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ پاسند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفا یاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لئے آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ صالحین روحانی اطباء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے؟

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت موخر ہے۔ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں، مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں اور یہ بھی تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں۔ آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزو تمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں۔ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گئے چنے ہیں، ان کے علاوہ عامتہ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا۔ اس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا۔ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ لگے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مرحوم نواب اودہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جاسکتا ہے، تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ نہ وہ طلب کریں گے۔

حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز..... حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے پر گھمنڈ اور غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لاپلحی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو، تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقتدار کی خاطر اس خلا کو پانٹنے میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا ”حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے؟ حضرت نے فرمایا! ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں خارج ہے۔ بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کارآمد ہو۔

اسلام اس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دنیا کے ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں۔ زنا کاری، جوا، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جس کی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلام کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسیع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کی جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو۔ پھر قاری صاحب نے فرمایا۔ مقصد اصلاح حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں۔ اخلاص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے، ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے۔

تعمیری انداز میں اصلاح..... رات ڈھل رہی تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والی ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیر پاتھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی مشین ہے، جو ایک ایسے نامہ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے۔ جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر ”الساعة“ اور زلزلة الساعة کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا۔ ﴿مَّا لِهَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ ①..... ایسی محبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا، مگر بے اختیار رنجی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے اور پوچھ بیٹھا کہ ”الحق“ کے لئے کون سا طریقہ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا وہی پالیسی میں نے جو عرض کر دی۔ توافقی سے کام چلے گا، تقابل سے نہیں۔ تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی۔

حضرت! جب الحاد اور بے دینی غالب ہو چکی ہے، پھر کیسی موافقت۔؟ برجستہ فرمایا۔ اسی کی اصلاح کے لئے تو توافقی کی ضرورت ہے۔ اور یہ توافقی الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافقی ہوگا تا کہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی نضا چھا گئی ہے۔ اصلاح کی مساعی بار آور معلوم نہیں ہو رہی ہیں؟ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

کام کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوا جائے آپ تو ورثہ انبیاء ہیں۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے۔ تب حضرت نوح نے بدو عادی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑو ورنہ ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

دیکر بلاد اسلامیہ تو دہریت، مغربیت اور بے دینی کی پلیٹ میں آ ہی گئے اور ہو گئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلاد اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیر باد کہہ دیا واپسیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے؟ ورثہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم..... حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو ارباب عزیمت اور اولو العزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ ”تَزَكُّتٌ فِيكُمْ الشَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَبَدًا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا“ ①

دارالعلوم کی ترقی..... حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا! آپ لوگ جو اختیار رکھے ہوئے ہیں، بجز اللہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں۔ ہر وقت ”قَالَ اللَّهُ“ اور ”قَالَ الرَّسُولُ“ ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہوگی۔ خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو الحمد للہ دین مجسم ہیں۔

حضرت! مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے اور بجٹ؟..... فرمایا! انقلاب کے وقت سوالا کہ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے، انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے، پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیس شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ اڑتیس تھے، اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی بگنی ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ آخری سوال تھا کہ حضرت! انی پودے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں؟ فرمایا اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قضا الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گئے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دوران گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سیاست اور دین میں بیز ہے۔ اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نفاق گندم نما جو فردشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابلی پر ہیں دین کے جو چیز دین میں حرام ہیں۔ اس کے ہاں

① المحدث أخرجه الامام مالك في ”الموطأ“ ولفظه: تركت فيكم امرين لن تضلوا ماتمسكتم بهما كتاب الله

وسنة نبیه، کتاب القدر، باب النهی عن القول بالقدر ج: ۲ ص: ۸۹۹.

واجب ہیں۔ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ۔ ”مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں پیر ہے۔“
اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادل ناخواستہ اس پر لطف محفل کی بساطِ لیٹنی ہی پڑی۔
وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ